READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

سرگزشت
07 ادبی درویش
ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف

گفت و شنید
08 شہرِ خیال
مدیرِ اعلیٰ
آپ کی باتیں، آپ کے خیال، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت
16 داستان باری
ڈاکٹر ساجد امجد
اردو ادب کے ایک باکمال فنکار کی داستانِ حیات

مشعلِ راہ
47 مسیحائے دوراں
زویا اعجاز
جنگ زدہ سرزمین پر اس نے تعلیم عام کیا

تاریخ
57 تاریخِ عالم
منظر امام
کرۂ ارض پر ہونے والی تبدیلیوں پر ایک نظر

مشرقِ وسطیٰ
73 آسمان چپ رہا
سلمیٰ اعوان
سلگتے ہوئے بغداد سے دلگداز روداد

سفر کہانی
81 شمشال سے ٹورنٹو
ندیم اقبال
جادو بیانی کا شہکار، ایک الگ انداز کا سفرنامہ

روداد
107 جہنم کدہ
شکیل صدیقی
فلم کی شوٹنگ کے لیے وہ آتش فشاں میں اتر گیا تھا

فکشن
112 ہم زندہ ہیں
کشمالہ حسن
ان کرداروں کا تذکرہ جنہیں لوگ زندہ سمجھتے ہیں

تحریرِ خاص
117 ستمبر کی شخصیات
صائمہ اقبال
اس ماہ سے جڑی اہم شخصیات کا ذکرِ خاص

فلم نگری
131 سو سال کی بچی
انور فرہاد
فلم نگری سے دو شخصیت کا دلچسپ تذکرہ

مہم جوئی
145 بپھرے سمندر میں
فرزانہ نکہت
مہم جوئی کے جنون میں وہ زندگی کو داؤ پر لگا بیٹھی تھی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوقِ طبع ونقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصّے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کھیل تماشا
151 — **روڈیو** — علیم شاہد
انسان اور بھیڑیے سانڈ کے درمیان مقابلے کی روداد

معاشرت
154 — **سراب**
بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان

پہلی سچ بیانی
190 — **جواب** — شاہانہ سعید
... عقل سے کام لے ... اگر شوہر ... کے دوست ... لاجواب کر دیا

دوسری سچ بیانی
205 — **شیرو** — محمد ظفر حسین
بقرعید کے حوالے سے ایک چونکا دینے والی سچ بیانی

تیسری سچ بیانی
217 — **دیوانگی** — شازیہ ناصر
اسے حاصل کرنے کے لیے دو کزن ٹکرا گئے تھے

چوتھی سچ بیانی
233 — **فائیو پرسنٹ** — اختر شہاب
سیاسی و معاشرتی ماحول کس قدر بگڑ چکا ہے

پانچویں سچ بیانی
247 — **سکورا** — شمیم احمد
اس کی محبت عشق ہے منصوبے پیڑ تلے بکھر گئی

چھٹی سچ بیانی
257 — **مسافر** — اشرف عباس
اس مسافر کی داستان جو لوٹ کے آیا تو منزل نہ ملی

ساتویں سچ بیانی
263 — **احساس برتری** — صوفیہ
اس کے والد کو برتری جتانے کا خبط تھا

آٹھویں سچ بیانی
271 — **مہلت** — دانیہ صدیقی
اس نے اک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے

نویں سچ بیانی
279 — **من کے میلے** — اظفر علی
اس بچے کی سچ بیانی جو بچپن میں اغوا ہو گیا تھا

سوغات
000 — **پارچے** — قارئین / ادارہ
دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافاتی پارچے

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

جلد 26 ❖ شمارہ 08 ❖ ستمبر 2016ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رضوان خان 0333-2168391

رانا محمد حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور افراز علی تابش 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زر سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

بہت پہلے ایک کہانی پڑھی تھی جو کچھ یوں تھی۔ ”گھر سے دفتر جانے کے لیے صرف دو ہی راستے تھے۔ ایک ڈامر بچھی سڑک کا راستہ، لمبا اور اکتا دینے والا جس پر ہمیشہ بہت ٹریفک رہتا تھا اور دوسرا گورنمنٹ سلک فیکٹری کے بیچوں بیچ سے جاتا ہوا راستہ جس کے آغاز و انجام پر دو آہنی گیٹ تھے۔ یہ گیٹ صبح آٹھ بجے سے شام سات بجے تک فیکٹری کے مزدوروں کے لیے کھلے رہتے تھے۔ گیٹ پر ایک بڑی سی تختی لٹکی رہتی تھی۔ ”یہ شارع عام نہیں ہے۔ خلاف ورزی کرنے والوں پر قانونی کارروائی کی جائے گی۔“ میں ہر روز اسی راستے سے آفس جاتا تھا۔ گیٹ پر لٹکا ہوا بورڈ دیکھتا اور اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتا۔ نوٹس بورڈ آج بھی اپنی جگہ پر لٹکا ہوا ہے لیکن آج تک میرے یا کسی اور کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔“

یہی ہماری فطرت بن چکی ہے۔ قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، اس میں زندگی کے ہر گوشے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہمیں زندگی کیسے گزارنا چاہیے، ہمارا معاشرہ کیسا ہو، کن کن باتوں سے اجتناب کرنا چاہیے، کن باتوں کو اپنانا چاہیے، سب کچھ کھل کر بیان کیا گیا ہے لیکن ہماری زندگی کیسے گزر رہی ہے یہ ہر ایک کے سامنے ہے۔ پھر بھی ہم کہتے ہیں ”برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر“ اگر وقت رہتے ہم نے اپنی روش نہ بدلی تو یوم حساب میں ہم کس منہ سے کھڑے ہوں گے؟ اس لیے دعا کو ہاتھ بلند کریں

گم کردہ راہ ہوں گے نہ تاریکیوں سے ہم
اک شمع آرزو کی فروزاں کریں گے ہم

معراج رسول

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ادبی درویش

منگلور تحصیل مانسہرہ ضلع ہزارہ میں وہ 1906ء کی صبح پیدا ہوا۔ بزرگوں کا گاؤں شیر بائی تھا جو تحصیل ایبٹ آباد میں ہے لیکن یہ خاندان برصغیر کا نہیں تھا ہجرت در ہجرت کرتے ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ شجرہ نسب کے مطابق یہ خاندان مشہد کے سادات سے تعلق رکھتا تھا۔ خاندان سادات ہونے کی وجہ سے جہاں بھی ہجرت کرتا وہاں اسے خوب عزت ملتی۔ یہاں بھی لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ وہ بہت کم عمر تھا پھر بھی لوگ اسے تعظیم دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ابتدائی تعلیم گھر پر دی گئی پھر مانسہرہ بھیج دیا گیا۔ وہاں سے کچھ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ایبٹ آباد آگیا۔ یہاں کی تعلیم مکمل ہوئی تو اس نے علی گڑھ کا رخ کیا پھر واپس لاہور آگیا۔ کچھ باقاعدہ اور کچھ پرائیویٹ اس طرح سے اس کی تعلیم جاری رہی۔ 1935ء میں اس نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی پھر ملازمت کے سلسلے کی ابتدا کی۔ یونیورسٹی لائبریری میں کلرک لگا۔ جی جان سے محنت کی۔ تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا۔ کلرکی کے بعد لیکچرر بنا پھر اورینٹل کالج کی پرنسپل شپ تک جا پہنچا۔ اس نے لکھنے لکھانے کا سلسلہ پندرہ سال کی عمر سے کر دیا تھا۔ 18 سال کی عمر میں اس نے ''جاٹ اخبار'' کے نام سے ایک پرچہ نکالا مگر وہ محض طفلانہ کھیل تھا تاہم اس کے بعد صحافت اور اہلِ صحافت کے ساتھ مستقل تعلقات رکھنے لگا۔ تاریخی و واقعاتی تحقیق میں دلچسپی لیتا رہا۔ پھر لکھنے لکھانے کا رجحان فکری اور تنقیدی موضوعات کی جانب مڑ گیا۔ فکر کی راہ تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ مولانا احمد علی، خواجہ محمد سلیم، مولانا غلام مرشد نے لیکن سیاسی بالیدگی میں اہم کردار ادا کیا تھا مولانا محمد علی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا محمد سورتی، ڈاکٹر محمد اقبال اور پروفیسر شیرانی نے، پھر اس کے سامنے مسلمانوں کی زبوں حالی بھی تھی جسے دیکھ دیکھ کر اس کا دل کچوکتا تھا لیکن عملی سیاست سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی اسی لیے وہ سیاست سے دور بھاگتا تھا مگر اس کی دلی تمنا تھی کہ کسی بھی طرح مسلمان تعلیمی میدان میں آگے آجائیں کیونکہ ان دنوں یعنی قیام پاکستان سے قبل، ہر سطح پر غیر مسلم آگے تھے۔ تعلیمی اداروں پر بھی انہی کی اجارہ داری تھی۔ وہ اپنے تئیں مسلمان لڑکوں کو تعلیمی میدان میں آگے لانے کا جتن کرتا رہا۔ اچھے برے تجربات سے گزرتا رہا۔ اس کی دو عادتیں ایسی تھیں جو اسے محور سے ہٹنے نہیں دیتیں۔ اسے اللہ سے بہتری کی ہمیشہ اُمید رہی یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی دعا سے اجتناب نہ کرتا۔ یہ دعا ہی تھی جس نے اسے محور سے ہٹنے نہیں دیا۔ دوسری دلچسپی میں شعر ہے جو اس کے شعور کی زندگی کے ہر فارغ لمحے میں اس کی ساتھی رہی۔ وہ برملا کہتا کہ دعا اور شعر اس کے لیے عبادت اور ریاضت ہے۔ شعر سے راحت بھی حاصل کرتا ہوں اور شعر ہی سے اپنا دستورِ حیات مرتب کرتا ہوں۔ زندگی کے ہر مشکل مرحلے میں اشعار ہی میری رہنمائی کرتے ہیں۔ حافظ، میر، غالب، اقبال میرے محسن ہیں۔ خصوصاً حافظ کے اشعار مجھے پست نہیں ہونے دیتے کہ جب زندگی کی فطرت ہی ایسی ہے تو رونے اور برہم ہونے سے فائدہ اور تب میں دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیتا ہوں۔ قرآن سے رجوع کر لیتا ہوں۔ ادب کے اس بلند ستارے کا نام جس کی فکر آپ نے ملاحظہ کی اسے ہم ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام سے پہچانتے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

شہر خیال

☆ فلک شیر ملک نے شاہ گڑھ رحیم یار خان سے لکھا ہے۔ ''ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد دوبارہ حاضر ہوں۔ اس کی وجہ اگست کا شمارہ ہے جو ہر لحاظ سے زبردست رہا۔ معراج رسول کی کہانی اس معاشرے کی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ امجد صابری، عبدالستار ایدھی اور اب شاہد جہانگیر شاہد کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔ بس رب خیر کرے۔ ہر طرف اموات ہی اموات۔ ''شہر خیال'' میں وحید ریاست بھٹی سرگزشت کی تعریفوں کے پل باندھتے نظر آئے۔ بہر کیف جریدہ ہے بھی اسی لائق۔ ناصرہ احمد، یو ایس اے نے پورے خط میں بچوں کی تعلیم پر زور دیا۔ بہت اچھی بات ہے۔ باجی طاہرہ گلزار کا طویل تبصرہ بھی خوب رہا۔ عبدالجبار رومی انصاری ایک دم عرش سے فرش پر کیسے آ پہنچا؟ ابراہیم جمالی نے سرگزشت میں بھی قدم جمانا شروع کر دیا۔ خوش آئند بات ہے۔ ''ماموں بھانجا'' اچھی کاوش تھی (ابراہیم جمالی سرگزشت سے ہی دوسرے پرچوں تک پہنچے ہیں) ''اپنی اپنی دنیا'' واقعی ایمان افروز تھی۔ شاہ بابا جیسے مخلص لوگ اب بھی دنیا میں موجود ہیں۔ ''اگست کی شخصیات'' اور ''شکور پٹھان'' کا مختلف لوگوں اور خاندان سے تعارف ایک اچھا سلسلہ ہے۔ شکر ہے تاریخ عالم اینڈ پر ہے۔ ندیم اقبال کا سفر نامہ دلچسپ مراحل میں ہے۔ ہر قطرہ ذہن پر ثبت ہو جاتی ہے اور شاید ''سراب'' بھی اختتام کی جانب رواں ہے۔ کبھی آزمائش اور بیت بازی دونوں کامیاب سلسلے ہیں۔ شعروں میں یو ایس اے والے پہلے نمبر پر ہیں۔ سچ بیانیاں بہت اچھے انداز میں لکھی گئی ہیں۔ آخری سچ بیانی ''سچ کا آدمی'' نمبر ون تحریر ہے۔ اس میں بہت ہی پیارا سبق دیا گیا ہے اور ایسے انداز میں کہ قاری کی دلچسپی بھی برقرار رہے۔ گھر کا خیال رکھنا، یعنی بیوی، اولاد کی خبر رکھنا بھی گھر کے حاکم کا فرض ہے اور پھر مخلوق خدا جیسی بھی ہو جب اللہ کو پیاری ہے تو ہمیں کسی کو حقیر کہنے یا سمجھنے کی مجال نہیں ہونی چاہیے۔ ''تحفہ'' میں وہی گھریلو رونا دھونا نظر آیا۔ ناظم بخاری کی ''عیدی'' ایک بہترین سچ بیانی کہوں گا۔ اس معاشرے کا بہت بڑا المیہ ہے پیروں فقیروں پر یقین کو خوب صورتی سے اجاگر کیا گیا اور اللہ پر توکل کا جذبہ ابھارا گیا۔ ''کرب زیاں'' بھی کوئی خاص تاثر پیدا نہیں کر سکی۔ اتنی طویل اسٹوری، زن، زر، زمین والا پرانا مقدمہ کچھ خاص نہ تھا۔ ''ذرا سوچیں'' اچھے پلاٹ پر لکھی گئی کہانی تھی۔ سختی کے ساتھ ساتھ اولاد سے نرمی رکھنا بھی ضروری ہے۔ ''دوراہا'' گھریلو انداز کی بہترین کہانی تھی۔ پتا نہیں یہ آدم کا پتلا ایک بیوی سے جلدی کیوں اکتا جاتا ہے؟ ''قصور کس کا'' بھی سبق سے بھرپور تحریر تھی۔ زرینہ جیسی لالچی عورتوں کا حشر ایسا ہی ہوتا تھا مگر غلطی اخلاق کی بھی تھی۔ ''خود گزیدہ'' سانپ کی طرح بل کھاتی تحریر تھی۔ اچھے انداز میں لکھی گئی یہ تحریر بھی خوب رہی۔ دو بیڑیوں پر پاؤں رکھنے والا کبھی کامیاب نہیں ہوا کے مصداق ایک خوب صورت اسٹوری تھی۔ ''روایتوں کے شکار'' سرکار مدینہ نے فرمایا تھا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ پھر یہ اختلاف کیوں؟ میں نے بھی کچھ عرصہ پہلے دو مختصر تحریریں بھیجی تھیں۔ رحم دل اور مقدمہ خاص کے عنوان سے۔ ان کے متعلق بتائیں؟''

(دونوں تحریریں سرگزشت کے مزاج کی نہیں ہیں)۔

☆ قیصر خان کی بھکر سے آمد۔ ''اداریہ میں کہانی نہیں حقیقت تھی، معاشرہ کی بے حسی تھی، بہت اچھے طریقے سے ظلم کو بیان کیا گیا ہے۔ یک صفحی میں قاضی عبدالحمید کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔ واقعی محقق اردو تھے۔ ڈاکٹر صاحب شاعر لکھنوی کے بارے میں بہت خوب صورت مضمون لائے۔ مغالطہ یہ خاصا حیرت میں ڈالنے، بال کی کھال اتارنے، تحقیق کے موتی چننے کا کام ہے۔ جناب محترم عقیل عباس جعفری کا 15/14 اگست قیام پاکستان کی تاریخ ہو یا قائداعظم صاحب کے فرمان کا خوب تحقیق کرتے ہیں۔ شہزاد خان بہت اچھوتا مضمون لائے ہیں۔ صائمہ اقبال بہت اچھا حق ادا کر رہی ہیں، بہت قیمتی معلومات دے رہی ہیں۔ انور فرہاد صاحب بہت خاص مضمون کے ساتھ آئے، فلمی دنیا کے مضمون میں چھا رہے ہیں۔ معلوماتی مضمون کی وجہ سے شکور پٹھان پر بھی ہمیں ناز ہے۔ دیار غیر سے اچھی معلومات کے ساتھ خدمت کر رہے ہیں۔ ہر بار خط میں ندیم اقبال کے سفر نامہ پر تعریف کرنا حق بنتا ہے۔ سچ بیانی ''تحفہ'' میں مسز ندیم کا بروقت فیصلہ اچھا رہا ورنہ ان کے خاوند بری طرح پھنس گئے تھے۔ ''عیدی'' اللہ تعالیٰ ایماندار کو آزمائش میں ڈال کر پھر انعام دیتا ہے۔ ''کرب زیاں'' بہت دکھی کہانی تھی۔ ''ذرا سوچیں'' انا پرست لوگ پچھتاتے ہیں بروقت صحیح فیصلہ کیوں نہیں کرتے۔ ''سچ کا آدمی'' اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ کوئی ذی روح کو حقیر نہ جانو۔ مانا کہ وہ مکمل نہیں تھا پر انسان تھا، اس میں انسانیت تھی بہت سے دوسرے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | PAKSOCIETY

www.paksociety.com

خونخوار درندہ صفت انسانوں سے بہت اچھا تھا۔ ’’شہرِ خیال‘‘ میں کرسیِ صدارت وحید ریاست کے پاس تھی۔ بہت مبارک ہو۔ آپا طاہرہ، شاہ جی بھکر سے حاضر تھے۔ جناب والا آپ آپا طاہرہ صاحبہ کا خط شائع کیا کریں طویل یا مختصر لیکن ہو ضرور۔ بہت سے نئے دوست شامل تھے تبصرے بہت اچھے لکھے انہوں نے پڑھ کر اچھا لگا۔ شاہد جہانگیر شاہد کا دلی افسوس ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں اعلیٰ مقام دیں، (آمین)۔ غیر حاضر بہت تھے ان میں محمد عامر ساحل تو بہت انا پرست نکلے ہم کب سے ملاقات کے خواہش مند ہیں اور جناب حاضر نہیں ہوتے۔ رضا احمد اعوان بھکر، ڈاکٹر قرۃ العین، ڈاکٹر روبینہ نفیس صاحبہ اور بہت سے دوست جو کہ شہرِ خیال کا خاصہ تھے۔‘‘

☆ شاہد حسین کا خط قمبر شہداد کوٹ سے۔ ’’یکم جولائی کو میں نے ایک کہانی کے ساتھ خط بھی بھیجا تھا مگر اگست کے شمارے میں میرا خط تو کیا تاخیر سے موصول ہونے والی لسٹ میں بھی نام نہیں تھا۔ خدا جانے میری دن رات کی بے پناہ محنت سے لکھی گئی کہانی کہاں گئی۔ 29 جولائی کو دفتر فون کر کے معلوم کیا...... ڈاکخانہ سے بھی معلوم کیا ہے۔ کہانی کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ خدا جانے مجھے آپ سے ایک التماس ہے کہ اگر کہانی آپ کو ملے تو برائے مہربانی ایک فون کر کے ضرور بتائیں۔ آپ کی عین نوازش ہوگی۔ (کہانی سرگزشت کے مزاج کی نہیں ہے)‘‘

☆ عبدالرزاق ہری پورسے رقمطراز ہیں۔ ’’میرے حالات کبھی کبھار مجھے اکساتے ہیں قلم اٹھانے پر اور آڑھے ترچھے لفظ وجود میں آنا شروع ہو جاتے ہیں اور جب ہاتھ رکتا ہے تو کہانی مکمل ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کہانی کو جب دوبارہ پڑھتا ہوں تو احساسات مجھے گھیر لیتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ ہے اندر جو باہر چھلکنے کو بے تاب ہے مگر دوسرا احساس اپنی کم مائیگی کا ہے جو پل بھر میں ہی سارے لفظوں کی عظمت داغدار کر دیتا ہے۔ ہمت کر کے آپ کو اپنی ایک تحریر بھیج رہا ہوں۔ اس میں بہت کچھ ٹوٹا پھوٹا ہوگا راہنمائی کر دیجیے۔ (کہانی پر بہت زیادہ محنت کرنی پڑے گی، ابھی آپ منجھے ہوئے لکھاریوں کی تحریر پڑھیں)‘‘

☆ رضا زیدی رقمطراز ہیں لاہور سے۔ ’’آپ کے موقر جریدے کے لیے اپنی سچ بیتی برائے اشاعت بھیجنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ میں خدا اور رسول کو گواہ بنا کر سچ لکھ رہا ہوں۔ میرے لکھے ہوئے لفظوں میں رائی برابر بھی جھوٹ نہیں۔ اب جب کہ ضعیفی اور بیماری کی وجہ سے غلط بیانی کروں گا تو مجھے اجل کا منہ بھی دیکھنا ہے اُمید ہے کہ میری سچ بیتی کو سرگزشت کے کسی کونے میں بشکل اشاعت جگہ مرحمت فرمائیں۔ (اندازِ تحریر نے متاثر نہیں کیا اور پلاٹ بھی غیر دلچسپ ہے۔ کسی دوسری جگہ بھیج سکتے ہیں)۔‘‘

☆ م انور کی آمد باڑی چم ہوتی مردان سے۔ ’’ہفت اقلیم تک رسائی کے شہرِ خیال سے گزرنا پڑتا ہے۔ شہرِ خیال میں شاید میری دوسری انٹری ہے۔ ریٹائرمنٹ لینے کے بعد آپ ہی کے جرائد کا نخچیر ہوا۔ سرگزشت ایک ہمہ جہت اور چھوٹا سا دائرہ معارف محسوس ہوتا ہے۔ اس میں ہر رنگ ہے۔ فکشن کی کمی آپ کے دوسرے جرائد پوری کرتے ہیں۔ سسپنس اور جاسوسی کی مجھے گویا لت پڑ گئی ہے خود تو چلنے پھرنے سے معذور ہوں (ریٹائرمنٹ کے پہلے سال ہی دورانِ لوڈشیڈنگ میں ہوں میں گر کر ٹانگ تڑا اور ہاتھ تڑا بیٹھا ہوں) بیٹوں کو کہتا ہوں کہ سرگزشت اور سسپنس لیتے آنا اور اس طرح جاسوسی کا انتظار 30,31 سے شروع کرتا ہوں۔ ہاں تو شہرِ خیال کی طرف آتا ہوں۔ طاہرہ گلزار! کو تقریباً ہر شہرِ خیال میں قدم رنجہ دیکھتا ہوں۔ داد دیتا ہوں مستقل مزاجی کی لیکن اگر محترمہ اپنی تحلیل نفسی کرائیں تو بہتر ہوگا کیوں صنفِ مخالف کی اتنی مخالفت۔ معاذ اللہ۔ مضامین پر تبصرہ کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا لیکن انور فرہاد صاحب سے استدعا ہے کہ ماضی کے فلم اسٹار رتن کمار پر مضمون لکھیں کیونکہ 60ء کے دہائی میں وہ فلم انڈسٹری پر چھائے ہوئے تھے۔ شاہد جہانگیر کی رحلت پر دل ملول ہوا۔ خدا ان کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔‘‘

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے رقمطراز ہیں۔ ’’چند ماہ پہلے دو دفعہ تبصرہ بھیجا تھا مگر آپ تک نہیں پہنچا تو پھر تبصرہ بھیجنے کو دل ہی نہیں کیا۔ البتہ سرگزشت کا ساتھ رہا۔ اب پھر حاضر ہوں۔ معراج رسول صاحب کا اداریہ حالات کی سنگینی کا ادراک دے رہا تھا۔ ایسا پڑھے لکھے گھرانوں میں بھی ہوتا ہے کہ بیٹی کی پیدائش پر لوگوں کو وہ خوشی نہیں ہوتی جو بیٹے کی پیدائش پر ہوتی ہے۔ وحید ریاست بھٹی کا خط اچھا تھا۔ شاہد جہانگیر شاہد اس دنیا میں نہیں رہے۔ طاہرہ گلزار نے جولائی کے اینڈ پر بتا دیا تھا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شاہد جہانگیر کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے (آمین)۔ سدرہ بانو نا گوری کی طاہرہ گلزار کے حوالے سے لکھی گئی باتیں حقیقت کے بہت قریب لگیں۔ انسان دنیا میں کسی کو اپنا بنا لیتا ہے یا کسی کا ہو جاتا ہے۔ دنیا کے سارے لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ چند بیمار لوگوں کی سزا لاکھوں لوگوں کو نہیں دی جا سکتی۔ ڈاکٹر ساجد امجد اردو کے ایک بڑے محقق کی زندگی کے بہت سے گوشوں سے آگاہ کر رہے تھے۔ کہانی کے انداز میں بیان کرنے سے قاری کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ کاشف زبیر کی ’’اپنی اپنی دنیا‘‘ بہت خوب صورت تحریر تھی۔ آزادی کے مہینے کی مناسبت سے معروف محقق عقیل عباس جعفری کی تحریر مغالطہ نے معلومات میں اضافہ کیا۔ شکور پٹھان کی تحریر ’’جن پر ہے ناز‘‘ بہت منفرد لگی۔ یہ ہستیاں ہی دراصل پاکستان کی آن، بان اور شان ہیں۔ ’’تحفہ‘‘ اس معاشرے کی عام کہانی ہے۔ کچھ لڑکیوں کی نفسیات ہوتی ہے کہ وہ رابطہ ہی صرف تحفے تحائف کے لیے کرتی ہیں۔ آج سے 15 سال پہلے میری چند لڑکیوں سے خط و کتابت تھی۔ ان میں تقریباً سبھی کی کوشش پیسا اور تحائف ہی تھے۔‘‘

☆ تجمل رحمٰن کا خلوص نامہ برٹ لیسٹ امریکا سے۔ ’’محترم معراج رسول صاحب، علامہ آپا جی آپ نے پاک وطن میں علم و ادب کی جو شمع روشن کر رکھی ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ ساری دنیا میں اردو جاننے لکھنے پڑھنے والے لوگ بس رہے ہیں اور اتنی دور سے جب انہیں خوب صورت دلنشیں میگزین ملتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

ہیں۔ایک الگ خوشی ہوتی ہے۔آپ کا پُرسوز اداریہ دل پر ضرب ثابت ہوا، کچھ کہہ کے کچھ بھی نہیں سکتے۔ وطن عزیز میں جو کچھ ہو رہا ہے ہر محب وطن کا دل جلتا ہے۔"شہرِ خیال" کی محفل بہت اچھی لگی ہے۔ہم وطن سے دور سہی لیکن سب کے قریب ہیں۔ڈاکٹر ساجد امجد کی ہر تحریر شروع میں متوجہ کر لیتی ہے۔ شکور پٹھان نے اپنا خوب رنگ جمایا ہے۔ سلمٰی اعوان، ندیم اقبال، صائمہ اقبال، منظر امام، سب کی تحریریں بہت پُراثر اور دل موہ لینے والی ہیں۔ سلمٰی اعوان نے اپریل میں "بھید بھری زمین" میں جالندھر کا ذکر خیر کیا ہے۔ ہمارے بزرگوں کا تعلق بھی ضلع جالندھر سے تھا۔میں بہت چھوٹی تھی جب پاکستان بنا۔چار سال کی بچی کو فیروز پور میں دریائے بیاس کے کنارے صاف شفاف پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھنا یاد ہے۔ پھر اباجی واپس جالندھر آ گئے۔ چھاؤنی کے ساتھ ہمارا بڑا سا قصبہ تھا اباجی M.E.S میں ہیڈ ڈرافسمین تھے۔ مجھے یاد ہے سائیکل پر دفتر جاتے تھے۔وہ بڑا سا سارا گھر کبھی کبھی خوابوں میں آتا ہے۔ شاید کسی کو بھی اپنی جنم بھومی نہیں بھولتی۔ پاکستان کے لیے جو نعرے لگتے تھے مسلم لیگ کا چرچا تھا۔اب اس لیگ کے کتنے ٹکڑے ہو گئے مگر مخلص وطن کوئی نہیں، ہر ایک کو اپنا پیٹ اور خاندان کے لیے اثاثوں کی فکر ہے۔سب کچھ یہیں چھوڑ کر اکیلے جانا یاد نہیں۔ ہر روز آنکھوں کے سامنے جنازے دیکھتے ہیں اور عبرت نہیں پکڑتے۔نواب محی الدین کی وہ داستان میں نے پڑھی جس طرح آپ انہیں دریافت کر کے اپنے ادارے میں لائے تھے۔ آفاقی صاحب اور کاشف زبیر کی کمی تو کبھی پوری نہیں ہو سکتی مگر اللہ نے آپ کی محفل سونی نہیں رکھی کچھ اٹھ گئے کچھ آ گئے۔ آفاقی ہمیں پرانی فلموں کی بامقصد کہانیاں اور پُرسوز گانے بتاتے تھے۔انور فرہاد اچھی کوشش کر رہے ہیں۔باقی سچ بیانیاں بہت پُراثر ہوتی ہیں۔لازوال، ملکہ مار جوری، شمشال سے ٹورنٹو دلچسپ ہیں۔ مس فاطمہ جناح، قدرت اللہ شہاب، عالم چنا، مولانا اشرف تھانوی، ابن صفی، قتیل شفائی۔ سر گنگا رام، نصیر الدین شاہ سب ہی کی بہت اچھی سرگزشت ہے۔شکور پٹھان کی قابلِ فخر شاندار تحریر ہے۔ وقت کی جیت، بدنصیب، تاریخ عالم بھی اچھی ہیں۔باقی کہانیاں بھی پسند آئیں۔اشعار کی محفل میں علیمہ بھٹ، ناز، ابرار احمد، فرحت ندیم، عذرا علی، رضیہ شاہین خاص کر ماہین فاطمہ کے شعر بہت اچھے لگے۔داؤد اللہ کا شعر بھی اچھا ہے۔"

☆نزاہت افشاں کی مہورہ فتح جنگ سے آمد۔"اداریہ بہت سبق آموز تھا۔بیٹیوں کو بوجھ سمجھنا بہت بڑا گناہ ہے۔ "محقق اردو" بہت دلچسپ تحریر تھی۔"شہرِ خیال" اس بار بہت مختصر سا لگا۔ وحید ریاست بھٹی صاحب طویل مگر بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔شاہد جہانگیر شاہد اداس کر گئے۔سب نے جانا ہے۔ ناصرہ احمد کا خط فکر انگیز تھا۔آفتاب احمد نصیر، قیصر خان، مسرت حسین رضوی، سدرہ بانو نا نوری اور عبدالجبار رومی سب بھرپور اور بامعنی آرا کے ساتھ رونق محفل رہے۔اب ذکر ہو جائے بڑی آپی طاہرہ گلزار کا۔ آپ کل اس بار بھی مرد حضرات پر برس رہی تھیں۔ کہانیوں میں تحفہ، عیدی، دوراہا سب اچھی کہانیاں تھیں۔خود گزیدہ بہت ہی سبق آموز کہانی تھی۔ایسی ہی کہانیوں کی وجہ سے میں سرگزشت پڑھتا ہوں۔ "ذرا سوچیں" بھی اچھی کہانی تھی۔"نغمہ نگار" میں شاعر صدیقی سے واقعی زیادتی ہوتی رہی۔ جلال لکھنوی کا تذکرہ اچھا لگا۔ بہرحال جلال لکھنوی، امیر مینائی سے بڑے شاعر نہیں۔ میں نے اردو ادب کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔جلال کی زبان آج کی اردو زبان کے بہت قریب ہے۔ بہرحال امیر مینائی، داغ دہلوی، جلال لکھنوی اس عہد کے شاعر ہیں جب اردو زبان ڈھائی سو سال کی مشق کے بعد بالکل صاف ستھری ہو چکی تھی۔"اگست کی شخصیات" بھی اچھا سلسلہ ہے۔علم میں اضافہ ہوتا ہے۔"اپنی اپنی دنیا" بہترین کہانی تھی۔ لیکن مشتاق کو صبر کرنا چاہیے تھا۔"جن پہ ہے ناز" محمد برادرز کا ذکر بہت بھلا لگا۔تمام قارئین کرام کو سلام، آخر میں یہ دریافت کرنا چاہوں گا کہ جون میں ایک تحریر ناصر کاظمی، مصطفٰی زیدی اور شکیب جلالی کے حوالے سے بھیجی تھی۔ کیا وہ قابلِ اشاعت نہیں؟ (ان سب پر مفصل تحریر چھپ چکی ہے)۔ڈاکٹر ساجد امجد سے مشہور شاعر حضرت قمر جلالوی پر بھی کوئی تحریر لکھوائیں۔"

☆اویس شیخ کا ٹوبہ ٹیک سنگھ سے اظہار۔ (اس خط کے ساتھ جون اور جولائی کا تبصرہ بھی آج ہی ملا اور محکمہ ڈاک کو دعا دی)۔"آپ کا تازیانہ عبرت اداریہ پڑھا۔"محقق اردو" کی ابتدائی لائنیں پڑھ کے معلومات میں مزید اضافہ ہوا۔"شہرِ خیال" کی محفل اس بار سوگوار اور غم ناک تھی۔ شاہد جہانگیر رحلت فرما گئے۔ان کی فیملی سے تعزیت کرتا ہوں۔ طاہرہ گلزار نے ان کے متعلق جو باتیں لکھیں سمجھنے کے لیے کافی تھیں۔ اللہ انہیں جنت میں جگہ دے (آمین)۔بھٹی صاحب! اپنے بہترین نامے کے ساتھ صدارت پر براجمان، شاہد جہانگیر شاہد کی رحلت پر مغموم تھے۔ناصرہ احمد انتہائی اہم مسئلے پر ڈسکس کر رہی تھیں۔ بیک ورڈ تھنکنگ اس مسئلے کی اصل رکاوٹ ہے۔آفتاب صاحب کے "قصیدہ گو" کے متعلق ریمارکس پسند نہیں آئے۔ ان کا باقی نامہ محبت شاندار تھا۔قیصر خان، سدرہ اور محفل کے نئے مہمان مسرت رضوی کی وجہ سے اور بھی پُررونق ہو گئی۔"اپنی اپنی دنیا" کے طرز کی کہانی کورس کی کتابوں میں کافی بار پڑھی ہے۔سبق آموز کتھا تھی۔"مغالطہ" زبردست تحقیقی کاوش تھی۔میں نے اسے اپنی لائبریری کے مضامین پیپر میں نوٹ کیا۔"ماموں بھانجا" انسانوں کے ساتھ تحقیر اور حقارت آمیز رویے کی شرمناک داستان تھی۔ کیپٹن صاحب کے خیالات سے بالکل متفق ہوں۔ "شمشال سے ٹورنٹو" نے تو اسیر کر لیا ہے۔ماہ اگست کی دل موہ لینے والی شخصیات کے حالاتِ زندگی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔"تاریخ عالم" منظر امام اختتام پر لے آئے ان کو مبارک باد۔"نغمہ نگار" کہاں ہو تم چلے آؤ۔جب پڑھا تو سوچا اتنی خوب صورت غزل گو کے حالات زیست نہ پڑھنا ان سے بےوفائی ہوگی۔ برسوں بعد فلمی لٹریچر پڑھا۔ دل کو بہت سرور آیا۔شکور پٹھان بالکل جداگانہ یادیں شیئر کر رہے ہیں۔تحریروں میں خلوص ہی خلوص اور محبت ہی محبت رچی ہوئی ہے۔سچ بیانیوں میں "تحفہ" کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ایسی بےوقوفانہ سوچ کی حامل لڑکیاں خاندان اور معاشرے کے لیے آزمائش سے کم نہیں ہوتیں۔"عیدی" سچ بیانی میں غربت، لاچاری، بےبسی اور معاشرتی بےحسی کی جھلک صاف نظر آئی۔انسان جس حال میں بھی ہو اچھا ہو یا برا، خدائی اعتقاد کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ وہ ذات ہر چیز پر قادر ہے۔"دوراہا" بھی کتنی تلخ اسٹوری تھی۔ مجھے ایسے مردوں پر سخت حیرانگی ہوتی ہے جب ان کے سروں پر شوہر کا تاج سجتا ہے تو یہ بیوی کو وہ مقام کیوں نہیں دیتے جس طرح پہلے اپنی ماں اور بہن کو دیا جاتا تھا۔" خود

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

گزیدہ“ پڑھی جو لوگ اپنی راہوں کا تعین کرنے کی بجائے اسے بے لگام چھوڑ دیتے ہیں انہیں زمانے کی خوشیاں اور رعنائیاں کم ہی راس آتی ہیں۔ ”روایتوں کا شکار“ میں زیتون خان کا کردار مثالی اور جرأت مندانہ تھا۔ اس کا بروقت فیصلہ پٹھان قوم کی روایت پسندی کا ثبوت تھا۔ ”سچ کا آدمی“ اس اسٹوری کو پڑھنے کے بعد کہنا پڑ رہا ہے کہ اس سچ بیانی کو ٹائیٹل اسٹوری ہونا چاہیے تھا۔“

☆ انور عباس شاہ کا نامہ شوق بھکر سے۔ ”سب سے پہلے ہردلعزیز جناب شاہد جہانگیر شاہد کے انتقال کی خبر پر نظر پڑی تو ہم پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ہم تو اس انتظار میں تھے کہ یہ جلد صحت یاب ہو کر ”شہر خیال“ کی زینت بنیں گے۔ خداوند کریم سے دعا ہے کہ وہ ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین)۔ ”شہر خیال“ میں وحید ریاست بھٹی کرسی صدارت پر براجمان نظر آئے۔ بہت ہی جاندار تبصرہ تھا۔ ناصرہ احمد اتنی دور سے آتی ہیں اور چھا جاتی ہیں۔ آپ کے خیالات بہت ہی بلند ہیں۔ یقیناً ہمارے مستقبل کے معمار بہتر ہوں گے تو مستقبل میں ہمارا ملک بہتر ترقی کر سکے گا۔ ارے سید امتیاز حسین بخاری صاحب آپ تو چھپے رستم نکلے۔ آپ نے اتنا مشہور و مقبول گانا تخلیق کیا، ویسے یہ گانا میرے پاس بھی محفوظ ہے۔ قیصر خان بھی اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ ”شہر خیال“ کی زینت بنے ہوئے تھے باجی طاہرہ گلزار بھی اپنے دلکش تبصرے کے ساتھ حاضر تھیں۔ جناب شاہد جہانگیر شاہد کے بارے میں تعزیتی کلمات اور ان کے بارے میں مختصر سی معلومات ہمارے دل میں اتر گئیں۔ ”فکر و فن“ ایک بیش بہا اور معلوماتی تحریر تھی۔ اس قسم کی تحریریں ہمیں تفریح کے ساتھ ساتھ معلومات بھی میسر کرتی ہیں۔ ایمان افروز تحریر ”اپنی اپنی دنیا“ دل میں اتر جانے والی ایک بے مثال تحریر تھی۔ ”مغالطہ“ میں عقیل عباس جعفری تو ہمارے لیے خزانہ لے کر آئے اس تحریر میں مختلف لوگوز، ڈاک ٹکٹ اور پرانے سکوں کی چھپی تصاویر ہمیں بہت بھلی لگیں۔ ”اگست کی شخصیات“ بھی ایک دلچسپ اور معلومات افزا تحریر تھی۔ اس قسم کی تحریروں سے ہمیں بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔ شکور پٹھان تو بہت ہی نرالے انداز میں آتے ہیں اور چھا جاتے ہیں۔ ہر ماہ ایسی شخصیات و یادداشت کو منظر عام پر لاتے ہیں جن کو تقریباً ہم بھول ہی چکے ہیں۔ ”شمشال سے گورتو“ کا دلچسپ سفر ہم بڑے شوق سے پڑھ رہے ہیں۔ پڑھتے وقت بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس سفر میں ہم بذاتِ خود ندیم اقبال کے ساتھ موجود ہوں۔ بے حد ضروری معلومات دلچسپ انداز میں فراہم کر رہے ہیں۔ ”سراب“ اب ایک نئے موڑ میں داخل ہو چکی ہے۔“

☆ پرنس فاروق احمد کا ای میل چوک سرور شہید سے۔ ”سوچ رہا تھا ایک سچ بیانی لکھ رہا ہوں کیا ای میل کر دوں یا ڈاک سے بھیجوں (ای میل کر دیں) اگست کا شمارہ میں جولائی کو مل گیا سرورق قابلِ دید تھا۔ اداریے میں معراج انکل نے بیٹیوں کے حوالے سے لکھ کر رلا دیا ہے۔ عصر حاضر میں ہم میں سے اکثر لوگ بیٹی کو رحمت کی بجائے زحمت قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہی بیٹیاں اس وقت کام آتی ہیں جب بیٹے چھوڑ کر جا چکے ہوتے ہیں۔ ”شہر خیال“ کی دنیا خوش کن خیالات و افکار کا مجموعہ ہوتی ہے ہر ماہ مبصر حضرات اپنے بے لاگ تبصرے سے اس محفل کو سجاتے ہیں اس بار صدارتی کرسی وحید ریاست بھٹی کو ملی۔ شاندار انداز میں جاندار تبصرہ تھا۔ پشاور سے طاہرہ گلزار کا مخصوص انداز لیے دلچسپ خط بے حد پسند آیا۔ سرگزشت کی سینئر تبصرہ نگار سدرہ بانو ناگوری بھی اپنے محبت بھرے انداز کے ساتھ موجود تھیں۔ منظر امام ”تاریخ عالم“ کی خوب سیر کروا رہے تھے۔ قدیم ادوار کی خوب معلومات مل رہی ہیں۔ اس ماہ آپ بیتیوں میں پوزیشن کے اعتبار سے کچھ یوں ترتیب رہی۔ ”عیدی“ ناظم بخاری۔ ”سچ کا آدمی“ محمد ظفر حسین۔ ”دوراہا“ زویا اعجاز۔“

☆ سلیم رشید کا مکتوب لاہور سے۔ ”جناب معراج رسول کا اداریہ عورت جو ماں، بیٹی، بہو، بہن بنتی ہے اس پر ہونے والے ظلم و ستم کا اظہار بہت اچھے انداز میں کیا ہے۔ واقعی ہم نے حوا کی بیٹی کو ایک بیکار، دردی اور بے وقعت بنا دیا ہے۔ شاہد جہانگیر مرحوم کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ ان کو جنت الفردوس عطا کرے، (آمین)۔ اب رسالہ کے مضامین کے سلسلے میں دو باتیں ہو جائیں محقق اردو جناب قاضی عبدالودود صاحب کے بارے میں خوب صورت اور دل کو چھونے والی تحریر پڑھی۔ ”اپنی اپنی دنیا“ میں ایک بزرگ جس نے دنیا میں رہنے کا صحیح طریقہ پا لیا اور ثابت کیا کہ دنیا ایک قید خانہ ہے اور نیکی میں سکون ہے۔ واقعی ایسے بزرگوں نے دین کو سربلند کیا۔ ”مغالطہ“ میں پہلی دفعہ نایاب سکہ مثلاً 500 روپے، 100 روپے وغیرہ دیکھا کیونکہ اس زمانے میں کلرک کی تنخواہ صرف 175 روپے ماہوار ہوتی تھی اور سونا بھی غالباً 175 روپے تولہ ہوتا تھا اور پائی، پیسے کی بازار سے ریوڑھی، قلفی وغیرہ مل جاتی تھیں اور قائداعظم کے اقوال... Unity faith پر بحث خوب ہے اگر ان تینوں اقوال قائداعظم پر عمل کیا جاتا تو نہ ہم مشرقی پاکستان کو اپنے سے الگ کرتے اور نہ ہی آج کل جو ملکی حالات یعنی بم بلاسٹ، قتل و غارت، رشوت ستانی، عورتوں سے زیادتی، بچوں کو اغواء وغیرہ۔ ایک وزیراعظم لیاقت علی بھی تھے جب شہید ہوئے تو ان کی قمیص کے نیچے سے پھٹی ہوئی بنیان نکلی۔ ان کی ناجائز دولت اور بلڈنگیں نہ تھیں۔ ”ماموں بھانجا“ ایک خوب صورت تحریر ہے۔ واقعی سفارش کے بغیر کوئی کام اس ملک میں نہیں ہو سکتا۔ اسپتال میں انجیو گرافی کے لیے دو تین سال کا وقت دیا جاتا ہے اگر کسی سیاسی شخصیت کو دل کا دورہ پڑ جائے تو فوراً پاکستانی اسپتال میں تمام قواعد و ضوابط نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ خدا بھی اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو خود بدلنا نہ چاہتی ہو۔ ملائیشیا میں ٹیلی فون لگوانے کا واقعہ بہت خوب ہے اور ہم لوگوں کے لیے ایک طمانچہ ہے۔ کیونکہ یہاں تو ہر کام رشوت سے کروانا پڑتا ہے۔ حج کے لیے بھی اگر قرعہ اندازی میں نام نہیں نکلتا تو لوگ ایجنٹ کو زیادہ رقم ادا کر کے حج کرتے ہیں۔ خیر شاعر صدیقی کے بارے میں معلومات ہوئیں اور فلم انڈسٹری کی تباہی اور زوال ایسی شخصیات کو نظر انداز کرنے سے ہوئیں۔ کئی اچھے فنکار اس ملک میں ناقدری کا شکار ہو کر بھارت جا کر نام کما رہے ہیں۔ اعضاء“ کی شاعری“ مضمون اچھا ہے اور ”اگست کی شخصیات“ پڑھ کر بہت سے لوگوں کے بارے میں کچھ واقعات کا پتا چلا۔ باقی مضامین زیر مطالعہ ہیں۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆ حنیف ادیب نے لاہور سے لکھا ہے۔ ”حسن انتخاب کے تحت آپ نے جو میرے منتخب کیے گئے چند اشعار شائع کیے اس کے لیے شکریہ۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اس شمارے میں جس تحریر کو اول نمبر دیا وہ سفرنامہ ''شمشال سے ٹورنٹو'' ہے۔ یقین کیجیے اس بے حد اثر انگیز تحریر نے شروع سے آخر تک مجھے اپنے سحر میں جکڑے رکھا اور جب تک میں پوری کی پوری پڑھ نہ چکا ایک سحر کی سی کیفیت دل و دماغ پر طاری رہی۔ مضمون نگار نے حسین انداز سے، اپنے خوب صورت انداز سے شروع سے آخر تک متوجہ کیے رکھا اور محویت کا ایک ایسا عالم طاری رہا کہ جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ شمارہ جولائی میں اس سفرنامہ کی قسط میں نے تاخیر سے پڑھی اس میں سفرنامہ نگار کا جذباتی اندازِ بیان اور خوب صورت الفاظ اور فقروں سے سجی دھجی تحریر بھی سحر انگیز تھی۔ بالخصوص اپنے اہل خانہ سے بچھڑ کر دور دیس جانے کی جو درد و بھری تصویر پیش کی اور اپنے پیاروں سے جدا ہونے کا جو منظرنامہ پیش کیا اس نے بہت متاثر کیا اسے پڑھتے ہوئے یقیناً قاری کی آنکھیں بھی نم ہو جاتی ہیں۔ اپنے عزیزوں سے بچھڑنے کا لمحہ بہت اداس کرنے والا ہوتا ہے اس لمحے کی منظر کشی جو مضمون نگار نے کی وہ قاری پر ایک سحر طاری کر دیتی ہے اور اس کی آنکھ بھی نم ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ شعر و ادب کے سلسلے میں محقق اردو فکر و فن اور ایک ذرا مختلف قسم کا مضمون ''اعضا کی شاعری'' بھی ایک اچھا مضمون ہے اور لکھنے والے قابلِ تحسین ہیں۔ اُمید ہے آیندہ بھی آپ شعر و ادب کے موضوع کو جاری رکھیں گے۔''

☆ سید مسرت حسین رضوی نے کراچی سے لکھا ہے۔ ''ورق پلٹنے پر آپ کی کہانی ایک لڑکی کی ڈائری سامنے تھی۔ جدید دور میں آج بھی گوٹھ دیہات میں یہ واقعات وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ لڑکے پیدا ہونے کی صورت میں تو خزانوں کے منہ کھل جاتے ہیں مگر لڑکی کی پیدائش پر نفرت سے ہونٹ سکڑ جاتے ہیں۔ اس رسم کو کوئی بھی ختم نہیں کر سکتا کیونکہ یہ رسم پڑھے لکھے وڈیروں اور جاگیرداروں کے متکبرانہ ذہنوں کی پیداوار ہے۔ ''معتبر خیال'' میں آفتاب احمد نصیر اشرفی کے خیال سے آگاہ ہوئی جو سرگزشت ڈائجسٹ میں دو سلسلہ وار کہانیوں کے شائع کرنے یا شروع کرنے پر برہم ہیں۔ تعجب ہوا کہ وہ اس قدر بیزار ہیں۔ میں چونکہ سرگزشت کے ساتھ جاسوسی ڈائجسٹ اور سسپنس ڈائجسٹ اور بیگم کے لیے عورتوں والے پرچے بھی لاتا ہوں تو مجھے علم ہے کہ سلسلہ وار کہانیوں کا کیا لطف ہے۔ بہر حال دعا ہے خوش رہیں۔ ''معتبر خیال'' ہی میں اسلم فاروق حیدر آباد و عبدالجبار رومی انصاری کا بہت بہت شکریہ جو انہوں نے میرے تبصرے کو پسند کیا۔ دعا کریں کہ میں بہتر تبصرہ لکھ سکوں جو قارئین کو پسند آئیں۔ ماموں بھانجا، سرکاری دفاتر میں اسی طرح کے معاملات دیکھنے کو ملتے ہیں اور آج بھی دفتروں میں کام کو التوا میں رکھا جاتا ہے۔ مطلب صرف اور صرف رشوت وصول کرنا ہوتی ہے۔ ''اگست کی شخصیات'' انوکھا اور دلچسپ سلسلہ ہے جس سے اہم اور غیر اہم شخصیات کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں اسے جاری رہنا چاہیے تاکہ معلومات میں اضافہ ہوتا رہے۔ ''تاریخ عالم'' یہ سلسلہ بھی منظر امام کے توسط سے قارئین کے گوش گزار ہو رہا ہے جو تمام ادوار کا احاطہ ہے۔ قابلِ تعریف سلسلہ ہے۔ ''نقش نگار'' دلچسپ ہے اور ماضی میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے۔ ''جن پہ ہے ناز'' شکور پٹھان کے بیان کردہ واقعات اب تو ماضی کی دھند میں غائب ہو گئے ہیں اب وہ رونقیں کہاں ایک قصہ پارینہ بن چکا ہے صرف تصور میں بند آنکھوں کے پیچھے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور مسکراتے ہیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' ندیم اقبال کی وجہ سے سفرنامہ پڑھنے کو مل جاتا ہے جس سے غیر ممالک میں جانے آنے اور وہاں کی مشکلات کا علم ہوتا ہے اور نوجوانوں کے لیے جو طرح طرح کے طریقے سے باہر جانے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر دیارِ غیر میں اپنوں سے دور ہو کر زندگی داؤ پر لگا دیتے ہیں ان کے لیے اس سفرنامہ میں نصیحت اور عبرت ہے۔ ''سراب'' دلچسپی کے عروج پر ہے۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری کراچی سے رقمطراز ہیں۔ ''اداریہ میں انکل نے ایک لڑکی کی مختصر کہانی سنائی ان مردوں کی بے حسی کی کہانی جو عورت کے بطن سے جنم تو لیتے ہیں لیکن عورت کو بیٹی کے روپ میں برداشت نہیں کر پاتے۔ اللہ کے نبی جسے رحمت قرار دیتے ہیں۔ آج وہ زحمت بننے پر مجبور ہے کہ دل سے بے اختیار یہی شکوہ نکلتا ہے کہ ''جانے کب ہوں گے کم ان بیٹیوں کے غم'' شاہد جہانگیر تو چلے گئے لیکن شاہد بھائی آپ ہمارے دست دعا میں ہیں۔ طاہرہ آپا! آپ نے میری تعریف کی اچھا لگا آپ کا یوں بے تکلفی سے سدرہ کہنا بہت بھایا۔ محبتیں بڑھ جائیں تو تکلفات پیچھے رہ جاتے ہیں شکریہ آپا۔ میں نے سلمیٰ اعوان سے لاعلمی کا اظہار کیا اس کے بعد میں ان کی تلاش میں نکلی تو ان کی کتنی ہی لازوال تحریریں پڑھنے کو ملیں یہ حقیقت ہے کہ ان کی تحریریں پڑھیں تھیں مگر ان کے مقام سے ناواقف تھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے ہمیشہ کی طرح اردو ادب کا ایک بڑے نام سے متعارف کروایا۔ ''مغالطہ'' پڑھ کر حیرت میں پڑ گئے۔ اتحاد، یقین، تنظیم کی ترتیب نے چکرا کر رکھ دیا۔ ''ماموں بھانجا'' دلچسپ تحریر ہے پڑھ کر مزہ آ گیا۔ الطاف شیخ کا اندازِ تحریر اور ماموں بھانجے کے رشتے کو خوب انجوائے کیا۔ ''اگست کی شخصیات'' میں بڑے بڑے ناموں کے مختصر مختصر تذکرے اچھے لگے۔ ''فلم نگری'' سے انور فرہاد آئے اور چھا گئے۔ میڈیا سے آپ کا شکوہ بجا ہے۔ ہم نے بھی پہلی دفعہ شاعر صدیقی کو پڑھا اور بہت خوب پڑھا۔ اتنا مشکل نام مرتجس اس کا مطلب بھی بتا دیں (حیرت ہے، یہ نام نہیں معلوم؟ دو گھوڑے اسلامی تاریخ میں اہمیت کے حامل ٹھہرے۔ براق رسول کی سواری، مرتجس سیدنا حسینؓ کی سواری)۔ شفیق بھٹی صاحب آپ نے واقعہ معراج اور ''تخت بلقیس'' والے واقعے کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیا مگر میں آپ سے اختلاف کرتی ہوں کیونکہ واقعہ معراج کو کسی بھی لحاظ سے تخت بلقیس والے واقعے سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ آپ دونوں واقعات کا دوبارہ مطالعہ کریں۔ ''عیدی'' پڑھ کر وہی بات یاد آ گئی کہ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ وہ دیتا ہے مگر آزما کر گویا کندن بناتا ہے حالات کی بھٹی میں جلا کر ''جن پہ ہے ناز'' پر پھر اپنی لاعلمی کا اظہار کروں گی کہ میں ہمیشہ بھولو پہلوان کا تعلق پنجاب سے سمجھتی رہی مگر شکور پٹھان نے بتایا کہ وہ بھی میرے شہر کراچی سے تھے، شکریہ پٹھان صاحب۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں وہ جملہ اچھا لگا کہ ''بعض لوگ ان کے نظام کو سمجھ کر اپنے آپ کو حکومتی وظیفے میں رکھ لیتے ہیں اور تمام عمر کوئی کام نہیں کرتے مگر ایک بہتر زندگی سے ہمیشہ کے لیے خود کو محروم کر لیتے ہیں'' لاجواب سفرنامہ۔ ''خود گزیدہ'' کیا تبصرہ کریں اس کا عنوان ہی اس پر تبصرہ ہے بس یہی کہیں گے کہ خدا ہی ملانہ وصالِ صنم۔ ''سچ کا ادھورا سچ'' دے گیا کہ اپنے بچوں پر نظر رکھیں خاص طور پر جب وہ ...

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

☆ ندیم اقبال کا ای میل مشی گن یو ایس اے سے۔ ”ہر ماہ ”شہر خیال“ میں آپ دوستوں کے تبصرے پڑھتا ہوں لیکن کاہلی کہ شکریہ کا خط نہیں لکھ پاتا۔ جن دوستوں نے میرے فیس بک پر فوٹوگرافی کے پیج پر مجھے جوائن کرکے ”شمشال سے ٹورنٹو“ تک کی تعریف کی۔ ان کا وہیں شکریہ ادا کرتا رہتا ہوں۔ باقی قارئین کا شکر گزار ہوں کہ آپ اس ناچیز کی ٹوٹی پھوٹی تحریر کو پسند کررہے ہیں۔ ویسے میں بتادوں کہ میں نے زندگی میں پہلی بار کوئی طویل تحریر لکھی تھی جسے سرگزشت نے ”نانگا پربت کا عقاب“ کے عنوان سے شائع کرکے حوصلہ دیا ورنہ میں تو عکاس ہوں، فوٹوگرافی سے جنون کا عشق ہے، فطرت کے مناظر کو کیمرے میں مقید کرتا رہتا ہوں جس کی عالمی طور پر پذیرائی ملتی ہے کہ ہر ملک وقوم کے لوگ پسندیدگی کی سند دیتے ہیں۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ ان معروف شخصیتوں کے اصرار پر قلمبند کیا ہے جو میرے ساتھ ہمسفر رہے اور بار بار تقاضا کرتے ہیں، جن کا ذکر سفرنامے میں آتا جارہا ہے۔ اگر آپ لوگوں نے پسند کیا تو اس سفرنامے کے بعد بھی کوئی اور سفرنامہ تحریر کروں گا لیکن یہ بتادوں کہ میں حقیقت کی دنیا میں سانس لینے والا بندہ ہوں اس لیے دیگر سفرنامہ نگار کی طرح رومان وغیرہ نہیں ملے گا، تجربے کی دولت میں آپ سب کو حصے دار بناتا رہوں گا۔ تجربے تلخ ہی ہوتے ہیں اس لیے مٹی کی تلاش عبث ہے۔ دنیا نے جو دیا اسی شکل میں لوٹاتا جارہا ہوں۔ اس اُمید پر کہ جو کوئی بھی کینیڈا، امریکا آئے تو میرے تجربے اس کے کام آجائیں۔ میری کھینچی گئی فطرت کے مناظر کی تصویر کیسی ہوتی ہے جو دیکھتے رہتے ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ ”شمشال سے ٹورنٹو“ بھی لفظی تصویر کشی۔ آخر میں ایک بار پھر طاہرہ گلزار، آفتاب احمد نصیر اشرفی، اعجاز حسین سنجار، احمد رضا انصاری، اویس شیخ، سدرہ بانو ناگوری، سیف اللہ، سعید احمد چاند، انور عباس شاہ، عبدالجبار رومی، قیصر خان، محمد سلیم قیصر، وحید ریاست بھٹی، امتیاز حسین بخاری، سید مسرت حسین رضوی کے علاوہ بھی ان تمام دوستوں کا شکریہ جن کے نام اس وقت یاد نہیں آرہے اور وہ میری تحریر کو پسند کررہے ہیں۔“

☆ عبدالجبار رومی انصاری کا خط لاہور سے۔ ”محقق اردو قاضی عبدالودود کی سرگزشت زبردست رہی۔ ”شہر خیال“ سے وحید ریاست بھٹی کی تبصرہ نگاری بے حد عمدہ ہے۔ شاہد جہانگیر شاہد کے انتقال کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ ناصرہ احمد کا خط بہت اچھا لگا۔ حسین بخاری کا خط حیران کن تھا۔ آفتاب احمد نصیر، ہمارے موجودہ رہنماؤں میں سے کوئی بھی عبدالستار ایدھی نہیں، وہ تو بہت ہی عظیم شخصیت تھی۔ طاہرہ گلزار آپ کا تبصرہ سچ بیانی لگ رہا تھا۔ محمد شفیق بھٹی آپ نے مختصر لکھا پر خوب لکھا اور حضرت سلیمان کے درباری آصف برخیا تھے۔ سید مسرت حسین رضوی کا بھرپور تبصرہ اور انداز اچھا لگا۔ محمد ریاض احمد کی رقمطرازی بھی عمدہ رہی۔ سدرہ بانو کا اظہاریہ بے حد اچھا لگا جو نیک لوگ دنیا سے چلے جاتے ہیں تو وہ اپنے کام اور مقاصد دوسروں کے لیے آئیڈیل بناجاتے ہیں۔ شادی کی خیر مبارک اور جس نے بھی مجھے مبارک باد دی ان سب کا دل کی گہرائی سے شکریہ۔“

☆ فہیم احمد عباسی کا مکتوب سکھر سے۔ ”سرگزشت کا ملنا تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوا۔ فہرست پر نظر ڈالی تو چار دوست نظر آئے۔ اعجاز احمد راحیل، جنید احمد، زویا اعجاز اور کبیر بھائی نے تو اپنی سیٹ پکی کرلی ہے۔ سب سے پہلے صائمہ اقبال صاحبہ کو پڑھا۔ آغاز ہی میرے پسندیدہ سنگر سے ہوا۔ آہ جب وہ گاتے تھے لوگ محسور ہوجاتے تھے۔ نصرت فتح علی خان کا ساری دنیا میں ڈنکا بجتا رہا۔ ”سراب“ اچھی جارہی ہے۔ سچ بیانیوں میں سب سے پہلے کبیر عباسی کی ”قصور کس کا“ پڑھی جو اچھی لگی۔ اعجاز احمد راحیل اور سید شکیل کاظمی بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔“

☆ سیف اللہ ملک وال سے لکھتے ہیں۔ ”طاہرہ گلزار نے تعریف کردی۔ ان کی تعریف ایک اعزاز بن گیا۔ معراج رسول صاحب کی کہانی چونکا گئی اور ساتھ ہی قاضی عبدالودود صاحب کی زندگی سے بطور محقق اردو آگاہی ہوئی۔ فکروفن میں ساجد امجد صاحب نے ادب کے ایک گمنام گوشہ کو بصورت امیر علی جلال آشکار کیا اور ان کی خدمات کا پتا چلا۔ مضمون ”مغالطہ“ میں عقیل عباس جعفری نے بیش قیمت معلومات پیش کیں۔ ابراہیم جمالی کی آمد مزہ دے گئی۔ ماموں بھانجے کے اتفاق پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی۔ دفتروں میں عوام کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے۔ یقیناً ٹھیک لکھا ہے۔ صائمہ اقبال صاحبہ ہر ماہ اپنے اپنے شعبے کی کہ ہم لوگوں کے حالات زندگی محدود لیکن جامع انداز میں پیش کررہی ہیں۔ علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ ”تاریخ عالم“ تو ہے علم کا خزانہ اور اس خزانے میں اس دفعہ تاریخ پاکستان کی شکل میں اضافہ ہوا۔ ”قلم نگری“ کے مضمون میں انور فرہاد نے شاعر صدیقی کی ادبی خدمات سے آگاہ کیا اور ان کے ساتھ ادبی زیادتیوں کا بھی بتایا۔ جن پہ ناز ہے کے مصنف شکور پٹھان نئے نئے گوشے آشکار کررہے ہیں جانے اور کیا کیا نکلیں گے اپنے شہر سے سرگزشت پڑھنے والوں کے لیے۔ پاکستانی غیر ملک جاکر کیا کیا حرکتیں کرتے ہیں یہ بتایا ندیم اقبال نے اور مادر پدر آزاد اور مغرب کی اندھی تقلید کرنے والے معاشرے کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے ملک میں مستقبل کی جو تصویر دکھائی ہے وہ پریشان کن ہی لگتی ہے۔ سلمٰی اعوان کا مضمون ہر ماہ پڑھنے کی عادت پڑگئی ہے۔ اس دفعہ میری طرح تمام سرگزشت پڑھنے والوں کو ان کی کمی محسوس ہوئی ہوگی۔“

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی نے کورنگی کراچی سے لکھا ہے۔ ”حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ سے زیادہ محبت کسی سے نہیں کرتے تھے۔ بیٹی کی عزت وتوقیر اور اس سے محبت ہم پر لازم ہے۔ چیف صاحب آپ کے سندیسے نے کئی بند اور ادھ کھلی آنکھوں کو کھول دیا ہوگا۔ ہم نے تو یہ بھی پڑھا ہے کہ رب کائنات جس سے خوش ہوتا ہے بلکہ جس سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہے اسے انعام میں بیٹیاں عطا کرتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا شکریہ کہ فکروفن کے ذریعے عہد ساز شاعر میر ضامن علی کا دیدار کرادیا۔ ان کے اس شعر نے تو کتنی دیر ہمیں مبہوت کیے رکھا۔ ہم 69 واں یوم آزادی منا رہے ہیں۔ قائداعظم کے ارشادات وفرمودات بھلا کر ہم توقع کررہے ہیں کہ ہم اقوام عالم میں خود کو منوالیں گے۔ یہ مغالطہ نہیں تو اور کیا ہے؟ عقیل عباس جعفری جس مغالطے کی بات کررہے ہیں اس کی تو صرف ترتیب ہی بگڑی ہے۔ ایمان اتحاد تنظیم میں ایمان کو فوقیت دے کر اسے سنوارا جاسکتا ہے لیکن بحیثیت قوم ہم جس بے ترتیبی کا شکار ہیں اسے ایمانداری و مسلسل جدوجہد سے ہی ترتیب میں لایا جاسکتا ہے۔ ناصرہ احمد کی تجویز پر عمل تعلیم قابل عمل پر

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بہت مشکل ہے۔ ہماری تین بھابیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں لیکن اپنے دو دو بچوں کو پڑھانے سے قاصر بلکہ عاجز ہیں ہم خود بھی اپنے آئیڈیلزم کے دور میں ایک کچی پکی آبادی میں اکیڈمی کھول کر بمعہ ساز و سامان پچاس ساٹھ بچوں کو مفت پڑھانے کی کوششوں میں ان کے ان پڑھ والدین کے تعاون سے محروم رہے ہیں۔ سید امتیاز حسین بخاری کے اپنے گانے کے مشہور ہوتے پر ان کی لاعلمی ہمیں ایک آنکھ نہ بھائی۔ کاش طاہرہ گلزار صاحبہ کی طرح ہم بھی شاہد جہانگیر شاہد صاحب سے مل لیتے۔ قیصر خان کا خط بہت ہی خوبصورت تھا۔ اسلم فاروق، انور عباس شاہ اور عبدالجبار رومی کو بہت بہت سلام۔''

☆ اعجاز احمد ستھار کا مکتوب خاص۔ ''شاہد جہانگیر بھی ہمیں زمانے کے ظلم و ستم اور ناانصافیوں کے مقابل اکیلا چھوڑ کر چل بسے۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے۔ وحید ریاست بھٹی مسند صدارت پر سج رہے ہیں۔ دیگر میں ناصر احمد، امتیاز حسین بخاری، آفتاب نصیر اشرفی، قیصر خان، طاہرہ گلزار، مسرت حسین رضوی، سدرہ بانو ناگوری اور عبدالجبار رومی نے محنت سے تبصرے لکھے۔ ''اگست کی شخصیات'' نے کمال کر دیا۔ ''جن پہ ہے ناز'' معلومات بھرا خزانہ ہے۔ اب صرف ماضی پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ ''سراب'' پڑھتے ہوئے خیالوں میں کھو جاتا ہوں۔ اب سراب اپنے اختتام کی جانب بڑھ رہی ہے لیکن شہباز کے راستے کی رکاوٹیں ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہیں۔ اب سچ بیانیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ اوّلین تحریر ''تحفہ'' زندگی کو تماشا گاہ سمجھنے والی لڑکیوں کے لیے آئینہ ہے۔ ''عیدی'' عقیدہ اور یقین کو آزمانے والی حقیقت ہے لیکن انسان جلد ہمت ہار کر الٹی سیدھی سوچوں کو دماغ میں جگہ دے کر ناشکری کا مرتکب ہوتا ہے۔ ''ذرا سوچیں'' میں سارا الزام والدین پر نہ رکھیں۔ ساجدہ اور جنید برابر کے مجرم ہیں وہ والدین کی پرانی دشمنی دیکھتے ہوئے بھی پیچھے نہ ہٹے پھر اس انتہائی قدم اٹھانے پر منزل پر پہنچ گئے۔ ''دوراہا'' میں ثمینہ کا اٹل لہجہ، نرم رویہ اور ذمہ دارانہ مزاج دل و روح کو شانت کر گیا ہے۔ اپنا موقف انا کو مقدم رکھتے ہوئے مناسب انداز میں پیش کیا کہ حسن علی جو اپنے نظریات اور فطرت میں پتھر کی طرح سخت تھا وہ بھی سوچنے اور اپنے رویے پر نظرثانی پر مجبور ہو گیا ہے۔ میں ایسی عورت کی عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں۔ ''قصور کس کا'' واقعی الجھا ہوا اور مشکل سوال ہے کئی محرکات شامل ہو کر سانحہ کو جنم دیتے ہیں۔''

☆ محمد انعام کی آمد لودھراں سے۔ ''سرگزشت کی محفل میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں۔ معراج رسول بیٹیوں کے حقوق کے بارے میں آواز بلند کرتے نظر آئے۔ وحید ریاست، شاہد جہانگیر کی موت کا افسوس کرتے ہوئے نظر آئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت میں جگہ عطا کرے۔ ناصرہ احمد یو ایس اے پاکستان کے ناقص تعلیمی اداروں کے لیے آواز بلند کرتی نظر آئیں۔ سید امتیاز حسین صرف اپنی نظم کی خاطر محفل میں نظر آئے وہ کہانیوں پر تبصرہ نہ خطوط پر تبصرہ۔ طاہرہ گلزار تفصیل کے ساتھ اچھے تبصرے کے ساتھ حاضر تھیں۔ سب سے پہلے ''شمشال سے تورتنو'' پڑھی۔ بہت مزے کی کہانی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تورتنو کے حالات پڑھتے ہوئے ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ''سراب'' تسلسل کے ساتھ بہت اچھی جا رہی ہے۔ اس کے بعد سچ بیانی میں سے ''تحفہ'' پڑھی۔ نورین اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے مردوں کو بے وقوف بناتی رہی۔ عیدی میں بے صبری کا مظاہرہ کرنے سے نگہت کے شوہر نے کتنا نقصان اٹھایا اللہ سے تعلق تک توڑ لیا۔ شاید خدا کو رحم آ گیا۔ اس لیے جیل میں پہنچائی جانے والی رشوت واپس مل کر عید کی خوشی کو دوبالا کر گئی۔''

☆ محمد یاسر اعوان رحیم یار خان سے لکھتے ہیں۔ ''تبصروں میں وحید ریاست بھٹی کا طویل اور مدلل خط زبردست تھا۔ طاہرہ گلزار آپی کا اس سے بھی طویل تبصرہ اف توبہ۔ ناصرہ احمد نے جس طرف اشارہ کیا قابل تعریف بات ہے۔ قیصر خان بھی پیچھے نہیں رہے۔ بہترین تبصرہ تھا۔ معراج رسول صاحب ہر دفعہ ایک خوب صورت انداز میں جو کہانی سناتے ہیں کیا خوب ہوتی ہے۔ اس دفعہ بھی انہوں نے معاشرے کے منہ پر جو طمانچہ مارا ہے سمجھداروں کے لیے کافی ہے۔ شکور پٹھان کی کچھ بھولے بسرے لوگوں کے بارے میں آگاہی اچھی لگی۔ ''شمشال سے تورتنو'' سفرنامہ اچھی سمت رواں ہے۔ ایسے سفرنامے پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ ''مغالطہ'' میں ایمان، اتحاد، تنظیم پر مفصل طور پر بیان کیا گیا۔ معلوماتی طور پر رسالہ زبردست رہا۔ (معذرت ''لعنتی کردار اور خاندانی ساز'' کا انداز بیان سرگزشت کے مزاج کا نہیں ہے)۔''

جریدہ۔ ڈالڈا کا دسترخوان۔ ہم شہری جیسے بہت سے پرچوں کے شعبہ ادارت سے وابستہ رہنے والے معروف قلمکار جناب مختار آزاد کے انتقال پر جن حضرات نے تعزیتی پیغام بھیجا فون کیا۔ ان کے ہم مشکور ہیں۔ مندرجہ ذیل افراد کے علاوہ بھی بہت سے احباب نے فون کیا جن کے نام نوٹ نہیں کیے جا سکے۔

انوار مجتبیٰ صدیقی۔ سید انور فراز۔ احمد اقبال۔ جاوید صبا۔ عثمان جامعی۔ اقبال خورشید۔ زرین قمر۔ صدف آصف۔ عمران جونانی۔ امجد رئیس۔ شکیل صدیقی۔ صبیحہ شاہ۔ منظر امام۔ غزالہ عزیز۔ دانیہ صدیقی۔ حسام بٹ۔ عینی زبیر خان۔ تنویر ریاض۔ مرزا افتخار بیگ۔ جاوید قیصر۔ نزہت سمن۔ محمد حنیف۔ فیصل قریشی۔ احمد محمود۔ اقبال بھٹی۔ نوید قریشی۔ اختر شہاب۔ مہتاب خان۔ پیرزادہ حسن اختر خان۔ ثمرین ساجد محمد عارف (کراچی) طاہرہ گلزار (پشاور) قیصر عباس (بھکر) غلام حسین (حیدرآباد) تفسیر عباس بابر (اوکاڑہ) کبیر عباسی (مری) عرفان راے۔ مظہر سلیم موجکا۔ شازیہ ستار نایاب۔ زویا اعجاز (لاہور) جاوید رشید صدیقی۔ کے ایم خالد (اسلام آباد) ظہیر عباس (ملتان) مہران سہیل عیسیٰ خیلوی (عیسیٰ خیل) شاہد زمان (سیالکوٹ) ارشاد العصر جعفری (مظفرگڑھ) ام سہیل۔ احسان سحر (میانوالی) ندیم اقبال (مشیگن۔ یو ایس اے) ناظم بخاری (لودھراں) شاہد بشیر چودھری (بہاول پور) کبیر خان جالڑکی (لورالئی) وحید ریاست بھٹی (کلر سیداں) مظہر سلیم (رحیم یار خان) فاروق انجم (فیصل آباد) ارشد علی ارشد۔ سعدیہ سراج (جدہ۔ سعودی عرب) حسن انور (ابوظہبی۔ یو اے ای)۔ طلعت مسعود (دبئی۔ یو اے ای) سرور غزالی (جرمنی) اعجاز احمد راحیل (ساہیوال) ناصر ملک (لیہ) فہیم احمد عباسی۔ سرفراز قمر (جتوئی۔ پنجاب) داؤد اصغر (بری۔ یو کے) امین بھایانی (لورینس ویلا۔ یو ایس اے) عبداللہ احمد بیگ (درسیت۔ مسقط، سلطنت اومان) امجد علی شاہ (اسکارا ننو۔ کیلی فورنیا) سہیل عابدی (ملتان) تحسین علی (جدہ، سعودی عرب) سید غلام حسین جعفری (یو کے)

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

آہ......مختار آزاد

صیغۂ ماضی استعمال کرتے ہوئے دل دکھ رہا ہے مگر مشیت ایزدی یہی تھی۔ سانس گنے جا چکے تھے اور جمعرات و جمعہ کی درمیانی شب اس نے اپنے سانس پورے کر لیے۔ عجب آزاد مرد تھا، نام کا بھی اور کام بھی۔ مختار آزاد نے کبھی کسی چیز کی پروا نہیں کی۔ بس اپنے بچوں سے ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ آزاد منش تھا اس لیے کبھی کہیں ٹک کر کام نہیں کیا۔ جب بھی مصلحت کوشی سامنے آئی اس نے اپنا راستہ بدل لیا۔ بہت بارسوخ لوگوں سے بے تکلفی تھی لیکن کبھی کسی کی کاسہ لیسی نہیں کی۔ بڑوں کی خوشامد نہ کرنے کا نتیجہ یہ تھا کہ اکثر و بیشتر اپنی مسہری پر دراز، اپنے لیپ ٹاپ کو سینے سے لگائے فری لانسر کے طور پر اپنی روزی کماتا رہا۔ متعدد سرکاری و نیم سرکاری ادارے، این جی اوز اور افراد اس کے ہنر سے فیض یاب ہوتے رہے۔ سندھی، اردو اور انگریزی میں اس کی یکساں مہارت نے اسے بہت سے حلقوں میں مقبول بنایا ہوا تھا۔ بی بی سی سے نیشنل بک فاؤنڈیشن جیسے معتبر اور خوش حال اداروں میں کام کیا۔ اس ادارے کے لیے اس کی دہری اہمیت تھی۔ وہ جاسوسی ڈائجسٹ کی مدیرہ لبنیٰ خیال کا شوہر اور ایک اچھا لکھاری تھا۔ لبنیٰ کے سر کا تاج چلا گیا، ادارہ ایک اچھے کہانی کار اور مترجم سے محروم ہو گیا۔ وہ مدت سے اندر ہی اندر ایک شوگر مل پال رہا تھا۔ یہ فیکٹری دن رات اس کے وجود میں برسرِ کار رہتی تھی۔ دل میں آتی تو روز پیداواری ریکارڈ دیکھتا ورنہ ہفتوں خبر نہ لیتا اور اسی شکر سازی کے طفیل اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب اس کے دل پر ایک کاری وار ہوا ہے۔ لیاری جنرل اسپتال سے ہوتا ہوا امراض قلب کے ادارے میں پہنچا تو پتا چلا کہ دل کی گلیاں لہو کی آبیاری سے تقریباً محروم ہیں۔ سینہ چاک ہوا، نشتر چلے، تین شہ رگوں میں پیوند کاری ہوئی، چراغ سحری کی لو تیز ہوئی۔ اس کی صحت یابی کی اُمیدیں بندھیں پھر یکایک علم ہوا کہ گردے تھک چکے ہیں اور وہ اپنے بیوی بچوں اور ہم سب سے بچھڑ گیا۔ اللہ اس کی مغفرت فرمائے اور اس کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | PAKSOCIETY

www.paksociety.com

داستانِ باری

ڈاکٹر ساجد امجد

اس نے اردو ادب کے دامن کو بھرنے کے لیے سعادت حسن منٹو کے علاوہ بھی کئی افسانہ نگار دیے، کئی نامور نقاد سامنے لائے، اسی لیے ادیب گر کہلایا کیونکہ اس کی پارکھی نگاہیں دور سے پرکھ لیا کرتی تھیں۔ خود اس کا قلم بھی گہر آبدار پیدا کرنے میں ثانی نہیں رکھتا تھا لیکن ضروریاتِ زندگی نے اسے ایسے مجبور کردیا۔ الم نصیبی کی اس منزل پر پہنچا دیا کہ خوشی کی بات سن کربھی وہ خوش نہ ہوتا۔ اسے لگتا کہ تمنائوں کی دنیا میں سکوتِ مرگ طاری ہے اور اب جھوٹی تسکین سے بھی دل کو بہلایا نہیں جاسکتا، ہر سمت گھنا ٹوپ تیرگی ہے۔ مہ و نجوم کی قندیل بھی روشن نہیں۔ یہ مصائب کے خار بالیدہ، قدم قدم پہ دامنِ زیست کو الجھا رہے ہیں۔ نتیجہ، اس کی حق گوئی و بے باکی رکنے لگی اور تب اس نے ترقی پسندی پر قفل ڈالنا بہتر سمجھا مگر موت نے موقع نہ دیا کہ وہ خود پر لگے اشتراکی کا لیبل اتار سکے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

اردو ادب کے ایک بے مثال قلم کار کے شب و روز کا بیان

ایک لڑکا نہر میں نہا رہا تھا۔ دوسرا کنارے پر کھڑا نہر میں اترنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی نظر اچانک کنارے پر رکھے ایک پتھر پر پڑی۔ پتھر پر اس لڑکے کے کپڑے رکھے تھے جو نہر میں اتر چکا تھا۔ کنارے پر کھڑے لڑکے کی آنکھیں کسی خیال سے چمکنے لگیں۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ نہر میں اترا ہوا لڑکا جیسے ہی ڈبکی لگا کر پانی کے اندر گیا۔ کنارے پر کھڑے ہوئے لڑکے نے کپڑے اٹھائے اور پانی میں ڈال دیے اور بھاگ کھڑا ہوا۔

لڑکا آرام سے نہاتا رہا اور پھر پانی سے باہر آنے سے پہلے اس نے اس پتھر کی طرف دیکھا جس پر اس کے کپڑے رکھے تھے۔ پتھر خالی تھا۔ کپڑے غائب تھے۔ لڑکے کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا وہ پھر بھی چیخ اٹھا ”میرے کپڑے“۔ اچانک اس نے دیکھا کہ اس کے کپڑے پانی میں بہتے ہوئے دور چلے جارہے ہیں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ وہ زبردست تیراک تھا۔ وہ پانی کے اندر گیا اور کپڑے اس کے ہاتھ میں آگئے۔ وہ باہر نکلا اور گیلے کپڑے پہن کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا کہ کپڑے سوکھ جائیں تو وہ گھر جائے۔

کچھ دیر بعد اس لڑکے کے حواس بحال ہوئے تو اسے یاد آیا کہ جب وہ پانی میں تھا تو اس نے کنارے پر غلام باری کو دیکھا تھا۔ اب نہ وہ پانی میں ہے نہ کنارے پر۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ حرکت اسی کی ہے۔ اس نے میرے کپڑے پانی میں پھینکے اور خود غائب ہوگیا۔

وہ لڑکا غصے میں بھرا ہوا گھر پہنچا اور اپنے باپ کو پوری روئیداد سنائی۔ باپ کو بھی غصہ آگیا۔

”یہ صاحبزادے رہتے کہاں ہیں۔ تم نے اس کا گھر دیکھا ہے؟“

”مجھے اس کا نام معلوم ہے۔ ہمارے قریب ہی محمد پورہ میں رہتا ہے۔“

”چلو میرے ساتھ۔ وہاں پہنچ کر مکان کے بارے میں بھی معلوم ہوجائے گا۔“

وہ صاحب اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر محمد پورہ پہنچ گئے۔ خوش قسمتی تھی یہ ہوئی کہ زیادہ گھومنا نہیں پڑا۔ ایک دو

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

گلیاں گھومنے اور بچوں سے معلوم کرنے کے بعد مکان مل گیا۔ انہوں نے دستک دی۔ اس کے جواب میں بھاری بھرکم نہایت بارعب چہرے والے غلام محمد باہر نکلے یہی غلام باری کے والد تھے۔

''کیوں جناب، غلام باری آپ ہی کا لڑکا ہے؟''

''جی ہاں، خیر تو ہے۔''

''خیر کہاں سے ہوگی۔ میرا بیٹا نہر پر نہانے گیا تھا۔ آپ کے بیٹے نے اس کے کپڑے اٹھا کر پانی میں پھینک دیے اور خود بھاگ آیا۔ وہ ہے کہاں۔ یقیناً گھر پہنچ گیا ہوگا۔''

''آپ کو کیسے معلوم کہ وہ غلام باری ہی تھا۔''

''میرا بیٹا اسے شکل سے جانتا ہے۔ اس نے اسے کنارے پر منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر وہ غائب ہو گیا۔ ذرا بلایے تو اسے، وہ اپنا جرم خود قبول کرے گا۔''

''جناب اسے کیا بلاؤں۔ خود مجھے اس کا یہ جرم قبول ہے۔ ایسی حرکتیں وہ روز کرتا رہتا ہے۔ میں خود اس کی شرارتوں سے تنگ ہوں۔''

''بھئی آپ تنگ ہوں دوسروں کو تو تنگ نہ ہونے دیں۔ آپ اسے سمجھاتے کیوں نہیں۔''

''جتنی ڈانٹ ڈپٹ بچوں کو ہونی چاہیے ہوتی رہتی ہے لیکن شرارتیں اس کے مزاج کا حصہ بن گئی ہیں اس کی اکثر شرارتیں بے ضرر ہوتی ہیں لیکن یہ تو بہت ہوگئی آپ بے فکر ہیں میں اس کا دماغ ٹھیک کردوں گا۔''

''یہ کام تو اب تک آپ کو کر لینا چاہیے تھا۔''

''جناب! بات یہ ہے کہ اس کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا ہے۔ وہ ہمیشہ ہر کلاس میں فرسٹ آتا ہے۔ شرارتیں بھی کرتا ہے لیکن پڑھائی کی طرف سے غافل نہیں۔ بس اسی لیے کچھ رعایت مل جاتی ہے مگر اب نہیں۔ آپ نے توجہ دلائی ہے تو میں اس سے باز پرس ضرور کروں گا۔''

وہ صاحب بہت غصے میں آئے تھے لیکن جب غلام محمد صاحب نے اپنے بیٹے کی غلطی مان ہی لی تو پھر جھگڑے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

غلام باری اس وقت بھی گھر پر نہیں تھا۔ مختلف کھیل کھیلنے کے بعد کچھ دنوں سے اسے ہاکی کا شوق ہوا تھا۔ وہ لڑکوں کے ساتھ ہاکی کھیلنے نکلا ہوا تھا۔ غلام محمد اس کے انتظار میں گھر کے باہر ہی بیٹھ گئے کہ جیسے ہی وہ آئے گا اس کے کان کھینچیں گے۔ شرارتیں تو وہ کرتا ہی رہتا تھا لیکن اس دن تو گھر پر شکایت آگئی تھی اور وہ بھی دوسرے محلے سے۔ وہ سخت غصے میں تھے۔

غلام باری کی قسمت اچھی تھی کہ وہ اس وقت گھر پر نہیں تھا اور جب آیا تو اس وقت تک غلام محمد کا غصہ کسی حد تک کم ہو چکا تھا۔

''صاحب زادے میں پوچھ سکتا ہوں آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟''

''ہاکی کھیلنے گیا تھا۔ آپ سے پوچھا تو تھا۔''

''یہ تو پوچھ لیا تھا لیکن کیا کسی کے کپڑے بھی مجھ سے پوچھ کر نہر میں پھینکے تھے؟''

غلام باری کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ باپ کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ وہ خاموش تھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ مسلسل فرش کو گھورے جارہا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے جان چھڑانے کے لیے جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔

''بس مجھے اس لڑکے کو دیکھ کر شرارت سوجھ گئی تھی۔''

''تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ کتنے شرم کی بات ہے اگر اس کے کپڑے پانی میں بہہ کر دور چلے جاتے تو کیا وہ پانی میں رہتا یا وہ ننگا اپنے گھر کو جاتا؟''

''ایسا کبھی نہیں ہوتا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک اچھا تیراک ہے۔''

''پھر بھی تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جانتے ہو تمہاری وجہ سے آج میری کتنی بے عزتی ہوئی ہے۔''

''میں بہت شرمندہ ہوں ابا جان۔ کوشش کروں گا کہ آئندہ اپنی شرارتوں پر قابو رکھ سکوں۔''

''تمہاری یہی سعادت مندی مجھے اچھی لگتی ہے۔ ورنہ آج میں بہت غصے میں تھا مگر یاد رکھو اگر تم نے کبھی تعلیم میں کوتاہی دکھائی تو میرا غصہ کبھی کم نہ ہوگا۔''

''میں اپنی کلاس میں ہمیشہ سب سے زیادہ نمبر لیتا ہوں۔''

''اپنی قابلیت پر کبھی غرور نہ کرنا بس دل لگا کر پڑھتے رہو۔''

اس نے بھی اسی میں عافیت سمجھی کہ پڑھنے بیٹھ جائے تاکہ باپ کا غصہ بالکل ہی ختم ہو جائے کیونکہ وہ اس پر بے جا پابندیاں لگانے کے قائل نہیں تھے مگر پڑھائی کے اوقات کی سختی سے تلقین کرتے تھے۔

اس رات وہ بستر پر لیٹا تو نیند کو آواز دینے سے پہلے اپنے خیالوں کو آواز دے لی۔ اس کے سامنے وہی لڑکا روتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

صورت بنا کر کھڑا ہو گیا جس کے اس نے کپڑے نہر میں پھینک دیے تھے۔ غلام باری اسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا اور وہ واقعی ہنسنے لگا تھا اتنا کہ اس کا بستر بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگا تھا۔ وہ دوسروں کو زچ کر کے اسی طرح خوشی محسوس کرتا تھا۔ مزہ تو تب آتا جب وہ ننگا گھر جاتا۔ وہ پھر ہنسنے لگا اور پھر اسے نیند آ گئی۔

دوسرے دن وہ اسکول سے واپس آ رہا تھا۔ راستے میں چند لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک انجانی سی مسرت چمک آئی۔ وہ ایک طرف کھڑا ہو کر کھیل دیکھنے لگا۔ اسی وقت ایک لڑکے نے شارٹ مارا۔ گیند لڑھکتے ہوئی اس کے پاس آ گئی۔ اس نے گیند پاؤں سے دبا لی پھر اس پر بستہ رکھ دیا۔ لڑکے گیند ڈھونڈ رہے تھے کہ اس نے آنکھ بچا کر گیند بستے میں رکھ لی۔ لڑکے حیران تھے کہ گیند یہاں تک تو آئی تھی پھر کہاں گئی۔ وہ مزے سے ان کی گھبراہٹ ملاحظہ کر رہا تھا۔ ایک دو لڑکوں نے اس سے پوچھا بھی لیکن وہ صاف مکر گیا۔ لڑکوں کو پورا شک تھا کہ گیند اس کے پاس ہے لیکن وہ ہاتھ پیروں کا ایسا مضبوط تھا کہ سب لڑکے اس سے ڈرتے تھے۔

لڑکے کچھ دیر تو گیند ڈھونڈتے رہے اور پھر مایوسی سے کھیل ختم کر دیا۔ اسی وقت اس نے گیند ہوا میں اچھال دی اور ہنستا ہوا اپنی راہ چل دیا۔ لڑکے پھر سے تازہ دم ہو گئے۔ وہ ان سے زیادہ تازہ دم ہو گیا۔

ایسی ہی بے ضرر سی شرارتیں اس کا روز کا معمول تھیں۔

☆......☆

غلام محمد ککے زئی پٹھان تھے۔ پٹھانوں کی یہ شاخ صدیوں پہلے کاکیشیا سے افغانستان آئی اور پھر اس شاخ کے بہت سے افراد محمود غزنوی کی فوج کے ساتھ اور پھر لودھیوں اور دوسرے فاتح حکمرانوں کی فوج کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئے۔ افغانستان سے ہجرت کے بعد اکثر ککے زئیوں کا مسکن سوہدرہ اور گورداسپور تھا۔ غلام محمد بھی افغانستان سے ہجرت کے بعد مشرقی پنجاب کے ضلع گورداسپور کی نواحی بستی کلانور میں آ کر آباد ہو گئے۔ تعلیم واجبی سی تھی یہاں آ کر انہوں نے انڈین پولیس میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہیں شادی کی۔ چار بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ غلام باری انہی غلام محمد کا بیٹا تھا جو بعد میں باری علیگ کے نام سے دنیا کے ادب میں اپنا نام پیدا کرنے کے لائق ہوا۔

باری علیگ کے والد غلام محمد معاشی مجبوریوں کے سبب گورداسپور سے فیصل آباد آ گئے تھے۔ غلام باری کی شرارت بھرا بچپن فیصل آباد میں گزرنے لگا جو اس وقت لائل پور کہلاتا تھا۔

وہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ لہٰذا سب سے پہلے اسی کو مدرسے کا منہ دیکھنا پڑا۔ منشی محلہ میں واقع ایک اسکول مدرسہ شیناں دی حویلی میں تھا۔ اسے اسی اسکول میں بٹھا دیا گیا۔ مڈل تک آتے آتے اس کے جوہر کھلنے لگے۔ باپ کو بھی ڈھارس بندھی کہ اس کا بیٹا پڑھائی میں تیز ہے۔ خوب ترقی کرے گا اور بڑا ہو کر بہت بڑا افسر بنے گا... وہ صرف تعلیم ہی کا شائق نہیں تھا بلکہ ادبی سرگرمیوں، تقاریر، مباحثوں اور شعروشاعری کے مقابلوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا اور ہمیشہ انعام پاتا۔

اس کے اساتذہ اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھے اور اس کے والد سے مل کر اکثر اس کی تعریفیں کرتے تھے اور مشورے دیتے تھے کہ وہ اسے جتنی تعلیم دلا سکتے ہیں دلائیں۔

وہ میٹرک کا طالب علم تھا کہ ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ اسکول کی چھٹی ہوئی تھی لڑکے اسکول سے باہر آ رہے تھے کہ دو لڑکوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ دونوں اسی کی کلاس کے تھے۔ انہیں لڑتے دیکھ کر انہیں چھڑانے کے لیے درمیان میں آ گیا۔ اسی دوران ان میں سے ایک نے چھری نکالی اور اپنے مخالف کو مارنا چاہی جو غلام باری کو لگ گئی۔ اس کا داہنا کندھا شدید زخمی ہو گیا۔ میٹرک کے امتحان ہونے والے تھے۔ اس کے زخمی ہونے سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ وہ امتحان نہیں دے سکے گا اور اس کا ایک سال یقیناً ضائع ہو جائے گا لیکن اس نے زبردست قوت ارادی کا مظاہرہ کیا اور گھر میں اعلان کر دیا کہ وہ امتحان میں ضرور شریک ہو گا۔

”بیٹا تم کیسے امتحان دے سکو گے۔ تمہارا ہاتھ زخمی ہے اور وہ بھی سیدھا ہاتھ، کیسے لکھ سکو گے۔“

”میری بات مانو تو اس سال رہنے دو اگلے سال خوب تیاری کے بعد امتحان دے لینا۔“

”اس طرح میرا ایک سال ضائع ہو جائے گا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میرا تعلیمی سال ضائع ہو جائے۔“

”تو بڑا ضدی ہے۔ آخر کو ہے نا پٹھان۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی طالب علم لکھنے سے معذور ہے تو اپنے ساتھ اپنے سے کم کلاس کا کوئی لڑکا بطور ''رائٹر'' لے جاسکتا ہے۔''اس نے امتحان میں لکھنے کے لیے آٹھویں جماعت کے ایک طالب علم کی خدمات حاصل کیں اور امتحان میں بیٹھ گیا۔ باری بولتا جاتا تھا اور وہ لڑکا لکھتا جاتا تھا۔

رزلٹ آیا تو اس نے پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ اب سب کو یقین تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بیورو کریسی میں کوئی اعلیٰ مقام حاصل کرے گا۔

جب اس نے انٹر کا امتحان بھی اعلیٰ نمبروں سے پاس کرلیا تو خاندان والوں نے مشورہ دیا کہ فیصل آباد میں اعلیٰ تعلیم کے مواقع نہیں ہیں، باری کو تعلیم کے حصول کے لیے علی گڑھ بھیج دیا جائے۔ علی گڑھ کا نام اس کے لیے بھی اجنبی نہیں تھا۔ ہندوستان بھر میں یہی ایک ادارہ تھا جو اعلیٰ تعلیم و ادب اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ بے شمار عظیم ہستیوں نے اسی ادارے سے تعلیم حاصل کر کے بڑے بڑے مرتبے حاصل کیے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بھی کچھ کر گزرنے کے خواب جگمگانے لگے۔

وہ ایک متوسط طبقے کا فرد تھا لیکن اس کے بڑوں نے کسی نہ کسی طرح انتظام کر کے اسے علی گڑھ بھیج دیا۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ اتنا شاندار تھا کہ داخلے میں کوئی دقت نہ ہوئی، ہاسٹل میں رہائش بھی مل گئی۔ دل لگا کر پڑھنا بھی شروع کر دیا لیکن پھر مالی مشکلات راہ میں حائل ہوتی چلی گئیں اور اسے علی گڑھ سے واپس آنا پڑا۔

وہ علی گڑھ سے کوئی ڈگری تو حاصل نہ کرسکا لیکن علی گڑھ میں چند دن گزارنے کا نشہ ایسا طاری ہوا کہ اپنے نام کے ساتھ علیگ لکھنے لگا اور ہمیشہ کے لیے باری علیگ ہو گیا۔

علی گڑھ اس سے چھوٹ گیا تھا لیکن پڑھنے کا شوق ختم نہیں ہوا تھا۔ اب وہ نصاب کی قید سے بھی آزاد ہو گیا تھا۔ جو چاہتا پڑھ سکتا تھا۔ اس نے اپنی فطری مناسبت کو دیکھتے ہوئے تاریخ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ دنیا بھر کی تواریخ کو اس طرح کھنگال ڈالا کہ بقول شخصے گھول کر پی گیا۔ ادب کا مطالعہ شروع کیا تو بڑے بڑے ادیبوں میں بیٹھنے کے لائق ہو گیا۔ مباحث میں ان دنوں دینی بحثیں بہت ہوتی تھیں۔ اس نے یکسوئی کے ساتھ ادیان کا مطالعہ شروع کر دیا اور جلد ہی مختلف مذاہب پر اتھارٹی سمجھا جانے لگا۔ دراصل قدرت نے اس کا ذہن ایسا بنایا تھا کہ تھوڑے وقت میں بہت کم مطالعے سے اس مضمون پر عبور حاصل کر لیتا تھا۔ اردو، پشتو، پنجابی اور انگریزی پر برابر کا عبور تھا۔ سونے پر سہاگا یہ کہ ذہانت کا وافر ذخیرہ عطا ہوا تھا۔ اس ذہانت سے اپنی کم مائیگی کو اکثر چھپالیتا تھا اور مخاطب پر اپنا رعب برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

ایک مرتبہ راجندر سنگھ بیدی روسی ناول نویس شولوخوف کے ناول ''اینڈ کویٹ فلوز دی ڈون'' کے متعلق بات چیت کر رہا تھا۔ بیدی اس انداز سے گفتگو کر رہا تھا جیسے وہ اس ناول کو پڑھ چکا ہے لیکن باری کے سامنے بات کرتے ہوئے اس پر ایک خاص قسم کی گھبراہٹ طاری تھی۔ باری کی ذہانت نے بھانپ لیا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے شولوخوف کی ناول نویسی پر لیکچر دینا شروع کر دیا۔ درمیان میں سوالات بھی اٹھاتا جا رہا تھا جن کے جواب دینا بیدی پر بھاری پڑ رہے تھے بالآخر اسے اقرار کرنا پڑا کہ اس نے یہ ناول پڑھا ہی نہیں۔ یہ سننا تھا کہ باری بے تحاشا ہنسنے لگا۔ اس پر جیسے ہنسی کا دورہ سا پڑ گیا تھا۔ ہنسنے کے دوران ہی اس نے اپنے مخصوص انداز میں بتایا کہ ناول تو کیا شولوخوف کا نام ہی اس نے پہلی مرتبہ سنا ہے۔

''اور جو لیکچر ابھی تم دے رہے تھے۔''

''وہ میری ذہنی اختراع تھی۔''اس نے کہا اور پھر ہنسنے لگا۔

اتنی ذہانت اور قابلیت کے باوجود معاملہ پھر وہیں کا وہیں تھا کہ روٹی کے بغیر زندگی نہیں گزرتی۔ معاش کا ذریعہ کیا ہو۔ اس نے فیصل آباد کے ایک پرائمری اسکول میں تیس روپے ماہوار کی ملازمت کرلی۔

بچوں کو پڑھا کر تو ادبی شغل کی سیرابی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے اندر چھپے ہوئے ادیب نے اپنے لیے ایک راستہ ڈھونڈ نکالا۔ اس نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھ کر اخبارات کو بھیجنے شروع کر دیے۔ اس کے مضامین معلومات کا خزانہ تھے۔ اسلوب سادہ بھی اور ادبی بھی۔ اس کے کالموں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کوئی ادیب دنیائے ادب میں داخل ہو رہا ہے۔

فیصل آباد ہی کے ایک بزرگ حکیم نور الدین اس کے دوستوں میں تھے۔ اس کی تحریروں کو پسند کرتے تھے اور اس کی شخصیت سے بھی متاثر تھے۔ اس کے علمی پس منظر سے بھی واقف تھے۔ باری علیگ بھی ان کے علم و فضل کا قائل تھا اور تقریباً روز ہی ان کی قربت سے فیض اٹھاتا تھا۔ ایک روز وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ان کے پاس پہنچا تو اس نے نوید سنائی۔

''لو بھئی تمہاری ملازمت کا بندوبست ہو گیا۔''

''حکیم صاحب میں تو ملازمت کا طوق گلے میں ڈال چکا ہوں۔ پرائمری اسکول زندہ باد۔''

''تو کیا ساری زندگی یہیں پڑے رہو گے۔ تمہارے معیار کے مطابق تمہاری نوکری کا بندوبست ہوا ہے۔''

''حکیم صاحب کیا اخبار نکالنے کا ارادہ کر لیا ہے۔''

''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اسے یوں کر لو کہ اخبار میں نہیں میرے دوست غازی عبدالرحمٰن نکال رہے ہیں بلکہ نکال چکے ہیں۔ اس کی ادارت کے لیے ان کے ذہن میں تمہارا نام آیا ہے۔''

''قبلہ مجھے تو معمولی قسم کا اخباری تجربہ حاصل ہے۔ میں اس اخبار میں جا کر کیا کروں گا۔''

''تمہارے مضامین اخباروں میں چھپتے رہے ہیں۔ بس یہی تجربہ کافی ہے۔ اب تک معاوضے پر لکھتے رہے ہو اب باقاعدہ ملازمت کرو گے۔''

''حکیم صاحب! مضمون لکھنے اور اخبار مرتب کرنے میں بڑا فرق ہے۔''

''اچھا مضمون نویس ہی اچھا اخبار نویس بنتا ہے۔ جاؤ بس اب جانے کی تیاری کرو۔''

''آپ نے یہ تو فرمایا ہی نہیں کہ یہ اخبار نکل کہاں سے رہا ہے مجھے جانا کہاں ہے؟''

''بھائی یہ رہا پڑوس میں امرتسر، مساوات اس اخبار کا نام ہے اور امرتسر سے نکل رہا ہے۔ خوش قسمت ہو کہ درخواست دینی نہیں پڑی اخبار کا مالک خود تمہیں بلا رہا ہے۔''

''یہ آپ نے ایک اور مشکل کھڑی کر دی۔ امرتسر میں کبھی گیا نہیں۔ وہاں نہ کوئی دوست نہ شناسا۔ میں وہاں جا کر کیا کروں گا۔''

''مجھے تعجب ہے کہ یہ بات تم کہہ رہے ہو۔ تم تو وہ ہو کہ راہ چلتوں کو دوست بنا لو۔ تم وہاں جاؤ تو سہی، تم جیسے کئی بے فکرے مل جائیں گے۔''

وہ گھر پہنچا اور خوب سوچ سمجھ کر امرتسر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اردگرد نظر ڈالی جتنے بڑے ادیب تھے وہ کسی نہ کسی طرح صحافت سے وابستہ تھے۔ یہ ابوالکلام آزاد ہی تو تھے جنہوں نے اخبار نکالا تھا۔ عبدالمجید سالک ہی تو تھے جو انقلاب کے روح رواں تھے۔ دراصل اس وقت ادب اور صحافت میں فاصلہ نہیں ہوا تھا۔ باری ایک اچھا ادیب تھا لہٰذا اچھا صحافی بھی ہو سکتا تھا۔ پس یہی سوچ کر وہ امرتسر چلا گیا اور اخبار ''مساوات'' سے وابستہ ہو گیا۔

مساوات کوئی اعلیٰ معیار کا اخبار نہیں تھا لیکن باری علیگ کی ادارت میں رہ کر یہ اخبار مقبول ترین اخبار بن گیا۔

اس نے حصہ نثر اور حصہ نظم کے لیے الگ الگ صفحات مخصوص کیے۔ مضامین کی تعداد اور موضوعات میں اضافہ کیا۔ سیاسی، معاشی، اخلاقی اور علمی و ادبی مضامین خود بھی لکھے اور دوسروں سے بھی لکھوا کر شائع کیے۔ اس طرح ہر مزاج کا قاری اس اخبار میں دلچسپی لینے لگا۔

اس کے دماغ میں معلومات کا بیش بہا خزانہ دفن تھا۔ وہ تاریخی، سماجی اور سیاسی علوم کا شعور رکھتا تھا۔ رومی، سعدی، میر، غالب، آتش کے افکار و نظریات کو پڑھ چکا تھا۔ ارسطو، شیکسپیئر، ہیگل، مارکس، برگساں، برنارڈ شا، دوستو فسکی، ہومر، سارتر وغیرہ کی نگارشات کا تفصیلی مطالعہ کر چکا تھا۔ اس کا فائدہ اسے مضمون نویسی میں بھی ہو رہا تھا اور گفتگو سے بھری محفلوں میں بھی۔ کثرت مطالعہ نے اس کے ذہن کو اس طرح کھول دیا تھا کہ وہ انسانوں میں چھپے ہوئے انسان کو تلاش کر لیتا تھا اور پھر وہ اس طرح اسے آراستہ کرتا تھا جیسے ہیرے کو تراشا جاتا ہے۔

وہ امرتسر میں بچے کے ہوٹل پر بیٹھا ہوا تھا کہ اس کی نظر ایک لڑکے پر پڑی جو چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دوست کسی طرح بھی اس کے شایانِ شان نہیں تھے۔ وہ لڑکا ان سب سے مختلف نظر آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ اس لڑکے کو اپنا دوست بنا لے لیکن درمیان میں کوئی دوست بھی نہیں۔ تعارف ہو تو کیسے، پھر اچانک جیسے اسے موقع مل گیا۔ اس لڑکے کے دو دوست جو اس کے ساتھ بیٹھے تھے اٹھ کر چلے گئے اور وہ اکیلا بیٹھا رہ گیا۔ باری اپنی نشست سے اٹھا اور اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

''میرا نام باری علیگ ہے۔''

''اچھا۔''

''اور تمہارا؟''

''مجھے سعادت حسن منٹو کہتے ہیں۔''

''کیا کرتے ہو؟''

''آوارگی۔''

''اس کے علاوہ۔''

''کبھی کبھی کوئی افسانہ لکھ لیتا ہوں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''ادب میں کبھی کبھی کی کوئی گنجائش نہیں، یہ تو فل ٹائم جاب ہے۔''

''آپ ہیں کون اور مجھے کیوں لیکچر دے رہے ہیں؟''

''میں تمہارے شہر سے نکلنے والے اخبار مساوات کا مدیر ہوں۔''

''اچھا آپ وہ باری علیگ ہیں۔ میں نے آپ کا ایک آدھ مضمون پڑھ رکھا ہے۔''

''یار مجھے لگتا ہے ہم دونوں دوست بن سکتے ہیں۔''

''بن کیا سکتے ہیں بن گئے۔'' منٹو نے کہا اور زور سے قہقہہ لگایا۔

''اشتراکیت کے بارے میں جانتے ہو؟''

''کچھ زیادہ نہیں، آپ بتائیں۔''

''اشتراکیت محنت کشوں کی اس تنظیم کا نام ہے جو سیاسی قوت اور اقتدار کو اس لیے اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتی ہے تاکہ سرمایہ ملکیت کی بجائے سماجی ملکیت قائم کرے یعنی زمین اور سرمائے پر نجی ملکیت کو ختم کر کے سماجی ملکیت قائم کی جائے۔''

''اس گاڑھے فلسفے کو سمجھنے کے لیے وقت درکار ہو گا۔''

''اس کا سرچشمہ روس ہے۔ تم روسی تحریریں پڑھو، ہندوستان میں تو ابھی اس کی ہوا پہنچی نہیں ہے۔''

''کوشش کروں گا کہ آپ سے متاثر ہوں۔''

''کسی دن مساوات کے دفتر آؤ۔ گپ شپ رہے گی۔''

ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ منٹو اس سے ملنے آ گیا۔ اس ملاقات میں بھی اشتراکیت پر گفتگو ہوتی رہی۔ گفتگو کے دوران ہی باری کے علم میں یہ بات آئی کہ منٹو کا اٹھنا بیٹھنا اوباش قسم کے لڑکوں کے ساتھ ہے جب کہ اس میں ایک اچھا افسانہ نگار بننے کی پوری صلاحیت ہے اگر اس کا رخ ادب کی طرف موڑ دیا جائے تو وہ بہت نام پیدا کر سکتا ہے۔ حضرت رات رات بھر فلش (تاش) کھیلتے ہیں۔ اسے اس دلدل سے نکالا جائے۔ باری کوشش کرنے لگا کہ منٹو کا زیادہ وقت اس کے ساتھ گزرے۔ منٹو کو بھی اس کے ساتھ ایسا لگاؤ ہو گیا کہ جو وقت شراب نوشی اور قمار بازی میں صرف ہوتا تھا اب مساوات کے دفتر میں کٹنے لگا۔ اس کا مزید دل لگانے کے لیے کچھ کام دیا جانے لگا۔ باری وہ

سوانحی خاکہ

نام: غلام باری
قلمی نام: باری علیگ
پیدائش: قصبہ کلانور ضلع گورداس پور
والد: غلام محمد
تعلیم و تربیت: لائل پور (فیصل آباد)
تعلیم: انٹر
ادھوری تعلیم: علیگڑھ کالج
مشغلے: صحافت، تصنیف و تالیف
سن پیدائش: 1907ء
وفات: 1949ء
تدفین: فیصل آباد

تصانیف

انقلاب فرانس، کمپنی کی حکومت، جرم و سزا، معاشیات کا مطالعہ، مشین اور مزدور، کارل مارکس، لینن، محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کمیونزم، تاریخ کیا ہے، تاریخ کا مطالعہ، انسانی تمدن کی داستان، اسلامی تاریخ و تہذیب۔

تراجم

بیکار، کمیونسٹ مینی فیسٹو، انتہا پسند کمیونسٹ فاشزم، مسٹر جناح، تزک بابری، تاریخ اسلام، سوشلزم۔

منٹو کو ایک آدھ خبر ترجمے کے لیے دے دیتا۔

''منٹو ذرا اس کا ترجمہ تو کر دو۔''

منٹو ٹوٹی پھوٹی زبان میں اس کا ترجمہ کر دیتا۔

اسے مزید مصروف رکھنے کے لیے باری نے اسے ایک روسی ناول پڑھنے کو دیا۔ یہ ناول ظاہر ہے کسی اشتراکی ادیب کا تھا۔ باری خود کو اشتراکی ادیب کہتا تھا اور چاہتا تھا وہ اپنی تبلیغ سے اشتراکی ادیبوں میں اضافہ کرتا رہے۔ اس نے منٹو کو کئی روسی ناول پڑھائے۔

اب منٹو اشتراکی فلسفے کو اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔

ایک دن باری اور منٹو فلم دیکھنے کے لیے سنیما گئے۔ واپسی پر باری نے منٹو سے اس فلم پر تبصرہ لکھنے کو کہا۔

''اس فلم پر اپنے خیالات کا اظہار کر دو۔''

''اظہار کر رہا ہوں سنیما ہاؤس سے نکل کر برابر اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

قلم ہی سے متعلق باتیں کررہا ہوں۔''

''باتیں کرنے کو نہیں باتیں سمجھنے کو کہہ رہا ہوں۔''

''بھلا یہ بھی کوئی لکھنے کی چیز ہے۔''

''تم نہیں سمجھو گے۔ تمہاری یہ تحریر ''مساوات'' میں شائع ہوگی۔ تمہارا نام بھی ہوگا اور تمہیں لکھنے کی عادت بھی پڑے گی۔''

اگلے دن مساوات میں ہمارے فلمی نامہ نگار کے قلم سے چند سطریں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد فلمی خبروں کا کام منٹو کے سپرد ہوگیا۔

اب ہر وقت دونوں کا ساتھ رہنے لگا۔ اوباش دوستوں سے اس کا پیچھا چھوٹ گیا لیکن شراب کی عادت نہ چھوٹ سکی۔ اس کے لیے مشکل یہ تھی کہ باری شراب کے قریب بھی نہیں پھٹکتے تھے بلکہ منٹو کو بھی نصیحت کرتے رہتے تھے۔ انہی دنوں اختر شیرانی امرتسر آئے اور آتے ہی منٹو کو تلاش کرلیا۔ منٹو کی خواہش ہوتی تھی کہ باری بھی ان محفلوں میں شریک ہو لیکن باری ان محفلوں میں جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اب منٹو اس فکر میں تھا کہ کسی طرح باری کو بھی مے نوش بنا دے۔ ایک دن دونوں چہل قدمی کو نکلے ہوئے تھے۔ پھرتے کرتے ریلوے اسٹیشن کے ریفریشمنٹ روم میں پہنچ گئے۔

''باری صاحب آپ کے لیے کیا منگواؤں؟''

''میں کچھ نہیں پیوں گا۔ میرا معدہ خراب ہے۔''

''ارے آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ آپ نے ادرک کا نام تو سنا ہوگا۔ بڑی ہاضم اور بڑی مفید چیز ہے۔ معدے میں کیسی ہی خرابی ہو ادرک سے دور ہوجاتی ہے۔''

''بھئی یہ ادرک کا ذکر کہاں سے نکل آیا۔ کیا ادرک چبالوں۔''

''ارے باری صاحب میں آپ کے لیے جنجر منگواتا ہوں۔ جنجر میں ادرک کا پانی ہوتا ہے۔ یہ پانی چٹکی بجاتے معدے کی تمام خرابیاں دور کردے گا۔''

''چلو تم کہتے ہو تو منگوالو۔ ویسے بھی تم اپنا شغل کرو گے۔ میں خالی بیٹھ کر کیا کروں گا جنجر ہی پی لوں۔''

''میں ویٹر کو آرڈر دے کر ابھی آیا۔''

قیام پاکستان سے قبل کا زمانہ تھا۔ انگریزوں کی حکمرانی تھی اور شراب نوشی پر پابندی نہیں تھی۔ منٹو اٹھ کر گیا اور اسے سمجھایا۔

''میرے لیے وسکی لے کر آؤ اور یہ صاحب جو میرے ساتھ بیٹھے ہیں ان کے لیے جنجر میں ''جن'' (شراب کی ایک قسم) ملا کر لے آنا۔

بیرے نے اس نصیحت پر عمل کیا۔ منٹو کے گلاس میں شراب انڈیل دی اور باری ''جنجر'' پینے لگا جس میں جن شامل تھی۔

جب منٹو دوسرا پیگ بنانے لگے تو باری صاحب نے جنجر کی ایک اور بوتل طلب کی۔

''یار منٹو اس محلول نے طبیعت پر اچھا اثر کیا ہے۔ ایک جنجر اور منگواؤ۔''

منٹو کے ہونٹوں پر ایک شوخ مسکراہٹ ابھری اور اس نے ویٹر کو ایک ویسی ہی جنجر لانے کو کہہ دیا۔ باری نے وہ بوتل بھی ختم کردی۔

''منٹو یہ ادرک واقعی کمال کی چیز ہے۔ صبح سے جو گرانی محسوس کررہا تھا یکدم غائب ہوگئی۔''

منٹو کو اب باقاعدہ ہنسی آگئی۔

''مولانا! جانتے بھی ہیں یہ معرکے کی چیز کون سی تھی جس نے آپ کے معدے کی گرانی دور کردی؟''

''جنجر ہی تو تھی۔''

''یہ جنجر کا نہیں ''جن'' کا کمال ہے جو اس میں شامل تھی۔''

''منٹو تم نے مجھے شراب پلا دی۔ مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی کہ تم بھی میرے ساتھ دھوکا کرسکتے ہو۔''

اس کے بعد وہ اس قدر نادم ہوئے کہ منٹو کو ان سے معافی مانگنی پڑی۔

''باری صاحب اب میری سزا یہ ہے کہ میں آج سے شراب نہیں پیوں گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔''

باری کو ایسی سخت روحانی کوفت ہوئی تھی کہ منٹو سے اس کی حالت دیکھی نہیں جارہی تھی۔ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کے لیے بھی اس نے شراب سے توبہ کی تھی لیکن وہ شراب کا عادی تھا لہٰذا چند ہی روز میں اس کی حالت غیر ہوگئی۔ باری نے اس کی اس تبدیلی کو شدت سے محسوس کیا۔

ایک دن شام کو باری اس کے گھر پہنچ گیا۔ اتفاق سے منٹو کھڑکی میں بیٹھا تھا۔ علیک سلیک ہوئی۔ منٹو نے دروازہ کھول دیا اور اسے لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ یہ دیکھ کر منٹو پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ گئے کہ باری اپنے ساتھ شراب کی بوتل لے کر آیا تھا۔

''مولانا آپ اور یہ......''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

"مجھ سے تمہاری اداسی دیکھی نہیں گئی۔"

"ایک شرط پر۔"

"مجھے معلوم ہے ایک نہیں دو گلاس لے کر آؤ۔"

باری نے اس کا دل رکھنے کے لیے اس کے ساتھ بیٹھ کر پی لی۔ اس محفل کے بعد باری کا خوف دور ہو گیا۔ پٹھان ہونے کے ناتے وہ شدت پسند تھا۔ لہٰذا جب پینا شروع کی تو گلے گلے ڈوب گیا۔ سگریٹ تو وہ پہلے ہی بے تحاشا پیتا تھا اب شراب بھی پینے لگا وہ کہا کرتا تھا شراب تمام برائیوں کی ماں ہے۔ شراب نہ صرف انسانی اعصاب کو مضمحل کر دیتی ہے بلکہ شرابی کے ہاں عزم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ عقل و خرد کھو دینا کتنی بڑی حماقت ہے۔"

افسوس کہ وہ خود ان نصیحتوں پر عمل پیرا نہ ہو سکا۔

منٹو کے بعد ابو سعید قریشی اور حسن عباس بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔

☆......☆

اس کی تخلیقی صلاحیتیں محض صحافی سرگرمیوں تک محدود نہیں رہ سکی تھیں۔ یہ دور برصغیر کے لوگوں کے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص استحصال کا دور تھا۔ بہ حیثیت ادیب اس پر یہ فرض عاید ہوتا تھا کہ وہ حق کی آواز بلند کرے اور ہندوستان کے لوگوں کو ایک راہ دکھائے کہ انقلاب کیسے برپا کرنا ہے۔ وہ براہ راست یہ نہیں لکھ سکتے تھے کہ ہندوستان میں انقلاب کیسے برپا کیا جائے۔ اس نے "انقلاب فرانس" کے پردے میں دراصل ہندوستان کے حالات کی ترجمانی کی اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ انقلاب فرانس کی طرح یہاں بھی ایک انقلاب کی ضرورت ہے۔

منٹو نے اپنے وسیع مکان میں ایک کمرا اسے دے دیا تھا۔ یہاں چند دوست جمع ہو جاتے تھے۔ یہیں وہ لکھنے پڑھنے کا کام کر لیتا تھا۔ اسی کمرے میں جسے دارالاحمر کا نام دیا گیا تھا اس نے انقلاب فرانس نامی کتاب لکھنی شروع کی اور برسوں کا مطالعہ اس مختصر تصنیف کے حوالے کر دیا۔

وہ فطرتاً انقلاب پسند تھا اس لیے وہ انقلاب روس کا مداح اور انقلاب فرانس کا شیدائی تھا۔ اسی لیے اس نے اپنی پہلی تصنیف کے لیے اس موضوع کو پسند کیا۔

اس کے نزدیک انسان کو انسان کی لوٹ اور استحصال سے بچانے کے لیے اشتراکیت واحد ذریعہ تھا اور انقلاب فرانس اس کی مثال تھا۔ وہ ہندوستان کے نوجوانوں سے بھی ایسے ہی کسی انقلاب کی توقع رکھتا تھا۔ اسی لیے اس نے انقلاب فرانس، پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔

اس مختصر سی تصنیف کو اس نے 10 ابواب میں سمیٹا۔ پہلے باب میں استبداد کے بارے میں سیر حاصل بحث کی دوسرے باب میں یہ بتایا کہ انقلاب کیوں ہوتا ہے اور اس کے اسباب کیا ہیں۔ اس طرح ہر باب کے ذریعے انقلاب فرانس کی پوری تاریخ بیان کر دی۔

اس انقلاب کے اسباب بیان کرتے ہوئے اس نے لکھا۔

"انقلاب فرانس انتقام تھا ان اصلاح پسندوں کے خون کا، ان اصلاح پسندوں کا جن کے برہنہ جسموں پر کوڑے لگائے گئے جن کے ساتھ حیا سوز سلوک کیا گیا، جنہیں زندہ آگ میں کودنے کا حکم دیا گیا، جن کی گردنوں پر چاقو چلائے گئے، جنہیں بازاروں میں کتوں کی طرح گھسیٹا گیا۔"

اس طرح اس نے ہندوستان پر حکمرانی کرنے والے انگریزوں کو یہ بتایا کہ اگر ہندوستانیوں پر ان کے مظالم جاری رہے تو دور نہیں کہ وہ بھی ایسے ہی کسی انقلاب سے دوچار ہوں۔

اس نے ابھی اس کتاب کے چند ہی صفحات رقم کیے تھے کہ اس کی حتی المقدور کوشش کے باوجود یہ اخبار بند ہو گیا۔ یوں صرف چھ ماہ کے مختصر عرصے میں مساوات کی اشاعت بند ہو گئی۔ اب اس کا امرتسر میں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا چھ مہینے ہو گئے تھے وہ گھر سے دور بھی تھا۔ اس نے امرتسر کو خیر باد کہا اور فیصل آباد (اس وقت لائل پور کہلاتا تھا) آ گیا۔

اس کے آتے ہی امرتسر تو جیسے ویران ہو گیا۔ منٹو، ابو سعید قریشی، حسن عباس اور باری علیگ کی امرتسری ادبی ٹولی تھی۔ یہ چاروں شام کے وقت رام باغ میں سیر و تفریح کے لیے جاتے تھے۔ "بجے" کے ہوٹل میں ادبی محفلیں جمتی تھیں۔ منٹو کے گھر کے ایک کمرے میں ناؤ و نوش کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ باری ان کا ادبی گرو بنا ہوا تھا۔ انہیں لکھنے کی طرف مائل کرتا تھا۔ اشتراکیت کا پرچار کرتا تھا، یہی وہ امرتسر تھا جہاں رہ کر اس نے منٹو کو عام آدمی سے ادیب بنا دیا تھا۔ منٹو خود کہا کرتے تھے۔

"آج میں جو کچھ ہوں اس کو بنانے میں سب سے پہلا ہاتھ باری علیگ کا ہے۔ اگر امرتسر میں میری ان سے ملاقات نہ ہوتی تو ہو سکتا ہے میں ایک غیر معروف آدمی کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

حیثیت میں مرتکب کیا ہوتا یا چوری، ڈکیتی کے جرم میں بھی قید کاٹ رہا ہوتا۔''

باری کے آتے ہی امرتسر ویران ہوگیا۔ اس کے دوستوں کے دل پر اس کی جدائی ایسی شاق گزری کہ اسے پھر بلا بھیجا۔ بلاوے پر بلاوے آنے لگے۔ اسے بھی امرتسر کی محفلیں یاد آرہی تھیں۔

وہ ایک مرتبہ پھر امرتسر چلا گیا۔

☆......☆

باری علیگ صحافی کے ساتھ ساتھ یکتائے روزگار مترجم بھی تھا بلکہ اخبار نویس سمجھا ہی اسے جاتا تھا جو ترجمے کے فن سے آگاہ ہو۔ اسے عربی، فارسی، فرانسیسی، پشتو وغیرہ پر عبور حاصل تھا۔ انگریزی پر مکمل دسترس تھی لہٰذا وہ اعلیٰ درجے کے تراجم کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں منٹو، ابو سعید قریشی اور حسن عباس کو بھی ترجمے کی طرف راغب کیا۔ لہٰذا ان تینوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا ترجمہ نگاری سے کی۔ منٹو نے باری علیگ کی رہنمائی میں فرانسیسی شاعر اور ناول نگار وکٹر ہیوگو کے ناول کا ترجمہ کیا۔ یہ منٹو کا پہلا باقاعدہ ترجمہ تھا۔ باری نے اسے شائع کرایا اور منٹو صاحب کتاب ہوگیا۔

باری علیگ جب دوبارہ امرتسر آیا تو ایک مرتبہ پھر تراجم کی بات چلی۔ کرنے کو کچھ تھا نہیں۔ سب کے سب نئے تھے۔ اشتراکی بنے ہوئے تھے۔ روس ان کا اولیٰ قبلہ تھا۔ روس کی طرح یہاں کے گلی کوچوں میں انقلاب کی صدائیں گونجتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے باری نے انقلاب فرانس لکھی تھی۔ اب اس کے ہاتھ آسکر وائلڈ کا ایک ڈراما ''ویرا'' لگ گیا تھا۔ یہ ڈراما روس کے دہشت پسندوں کی سرگرمیوں کے متعلق تھا جن کے پاس ہر قسم کے ہتھیار موجود تھے۔ اس نے منٹو کو مشورہ دیا کہ وہ اس ڈرامے کا اردو ترجمہ کرے۔

''اس ترجمے سے فائدہ کیا ہوگا؟''

''قائد کا حکم ہے اسے ماننا ہوگا۔ انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔''

منٹو نے سر جھکا دیا اور حسن عباس کے ساتھ مل کر ویرا کا ترجمہ کرنے میں مشغول ہوگیا۔ ترجمہ کرتے ہوئے دل کی دھڑکن تیز بھی ہو رہی تھی کیونکہ پورا ڈراما باغیانہ سرگرمیوں پر مشتمل تھا۔ اشتراکی خیالات ہندوستان میں نئے نئے داخل ہو رہے تھے۔ انگریزوں کے خلاف ایک فضا

نمونہ نثر

ہندوستان کی تاریخ میں مرہٹے ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے پندرھویں صدی کے اختتام پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے پہلے ہندوستان کے مورخوں نے ان کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ لفظ مرہٹہ سب سے پہلے فرشتہ نے استعمال کیا۔ سولھویں صدی کے وسط میں بیجاپور کے بادشاہ نے اپنی حکومت کے شعبہ مال کی زبان فارسی کی جگہ مرہٹی کر دی۔ (کمپنی کی حکومت)

شہنشاہ اکبر نے گورو امرداس سے ملاقات کی۔ گورو امرداس کی وفات 1574ء کے بعد اس بستی کی بنیاد ایک تالاب کے کنارے رکھی گئی جسے آج کل امرتسر کہتے ہیں۔ (کمپنی کی حکومت)

اسلام تاریخ عالم کا ایک حیرت انگیز اور اہم ترین باب ہے۔ اسلام نے نہ صرف عربوں کی کایا پلٹ دی بلکہ اس نے نوع انسانی پر بہت بڑا احسان کیا۔ اسلام نے علم کو عوام کی ملکیت بنا دیا اس نے انسان اور خدا میں براہِ راست رشتہ قائم کیا۔ بتوں اور پروہتوں کا اقتدار ختم کر دیا۔ پرانی اور فرسودہ حکومتوں کو خاک میں ملا دیا۔ گبن کے الفاظ میں ''اسلام ایک ایسا انقلاب تھا جس نے اقوام عالم کی سیرت پر ایک نئی اور پائیدار مہر ثبت کر دی۔ (اسلامی تاریخ و تہذیب)

تیار ہو رہی تھی۔ حکومت اس سے خائف تھی۔ ترقی پسند تحریک ابھی شروع نہیں ہوئی تھی لیکن ان خیالات کے حامل نوجوان سامنے ضرور آنے لگے تھے۔ اسی قسم کا باغیانہ لٹریچر حکومت کو کبھی برداشت نہیں ہو سکتا تھا لیکن گرو (باری) کا حکم تھا لہٰذا منٹو نے یہ ترجمہ کر دیا۔ اختر شیرانی نے اس کا مسودہ صاف کیا اور باری نے اسے کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ اس کتاب کے اشتہار تیار کیے گئے اور رات کی تاریکی میں دیواروں پر چسپاں کر دیے گئے۔

صبح ہوگئی بازاروں میں کچھ رونق بڑھی تو لوگوں کی نظریں اسی اشتہار پر پڑیں۔

جابر حکمرانوں کا عبرت ناک انجام
روس کے گلی کوچوں میں صدائے انتقام
زاریت کے تابوت میں آخری کیل

امرتسر کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ پولیس کو اطلاعات مل رہی تھیں کہ کچھ اشتراکی خیالات کے حامی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

نوجوان حالات خراب کرنا چاہتے ہیں۔ اشتہار چسپاں کرنے کے بعد منٹو اور حسن عباس کو بھی خطرے کا احساس ہوا۔ وہ رات بھر کچھ سوتے کچھ جاگتے رہے تھے۔ ہر آہٹ پر ان کا دل دھڑکتا تھا کہ پولیس آگئی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ دونوں گھر سے نکلے تا کہ باری سے آیندہ کا لائحہ عمل پوچھیں لیکن باری ان سے زیادہ ڈرے ہوئے تھے کہ کچھ دنوں کے لیے غائب ہونے ہی میں عافیت سمجھی۔ باری فطری طور پر بزدل واقع ہوا تھا۔ بنتا انقلابی تھا لیکن پٹاخے کی آواز سن کر ڈر جاتا تھا۔ کہتا یہ تھا کہ انقلابی بننے کے لیے جیل جانا ضروری ہے لیکن جیل کا نام سن کر کانپنے لگتا تھا۔ اس وقت بھی یہی ہوا کہ اشتہار تو چسپاں کرا دیے لیکن ممکنہ گرفتاری کے خوف سے ایسا غائب ہوا کہ پندرہ روز تک دوستوں کے ہاتھ بھی نہ لگا۔ ایک روز اچانک نمودار ہوگیا۔

''مولانا کہاں غائب ہوگئے تھے۔ ہم تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے۔''

''میں آپ لوگوں کی طرح بے کار نہیں ہوں۔ میں عنقریب ایک پرچہ خلق کے نام سے جاری کرنے والا ہوں سارے انتظامات مکمل کر لیے ہیں بس ڈیکلریشن داخل کرنا ہے۔''

منٹو اس کی عادت کو جانتا تھا۔ وہ بڑے بڑے منصوبے بناتا تھا اور پھر چائے کی پیالی میں گھول کر پی جاتا تھا۔ بڑی مشکل سے کوئی راستہ تلاش کرتا اور پھر اچانک پٹڑی بدل لیتا۔ منٹو نے اس منصوبے کو بھی اسی نظر سے دیکھا لیکن اس مرتبہ باری واقعی سنجیدہ تھا۔ بھاگ دوڑ کر کے خلق کا ڈیکلریشن لے لیا اور پرچہ مرتب کرنے کی تیاریاں شروع کردیں۔

''بھئی تم لوگ اپنی اپنی تخلیقات ہفت روزہ خلق میں شائع کرانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''ہم کیا اور ہماری تخلیقات کیا۔''

''تم لوگوں کی آسانی کے لیے میں نے اسے روزنامہ نہیں ہفت روزہ رکھا ہے۔ تم بہ آسانی تیاری کر سکتے ہو۔''

تیاریاں شروع ہوگئیں۔

پہلا شمارہ آیا اس کے لیے باری علیگ نے اپنا مضمون ''ہیگل سے مارکس تک'' لکھا۔ منٹو کا پہلا طبع زاد افسانہ ''تماشا'' اسی شمارے میں شامل تھا۔ ابو سعید قریشی نے بھی ایک مضمون ''مزدور'' لکھا اور اس مضمون کو انہوں نے ابن آدم کے فرضی نام سے شائع کرایا۔ منٹو نے بھی اپنے افسانے پر مصنف کا نام دینا ضروری نہ سمجھا۔

خفیہ پولیس کے لوگ ''ابن آدم'' کو تو تلاش نہ کر سکے لیکن باری کا مضمون قابلِ اعتراض ٹھہرا اور باری کی گرفتاری کے لیے منٹو کے گھر پر چھاپا مارا گیا۔ باری تو ان کے ہاتھ نہ آسکا ان کی ملاقات منٹو کے بہنوئی خواجہ عبدالحمید سے ہو گئی۔ خواجہ صاحب پولیس کے محکمے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی شناخت کرائی اور خفیہ پولیس سے ان کے آنے کا سبب پوچھا۔

''آپ کے مکان میں ایک خطرناک باغی روپوش ہے۔ ہمیں اس کی گرفتاری مقصود ہے۔''

''اس کا نام پوچھ سکتا ہوں۔''

''جناب والا، وہ کوئی مجرم نہیں بلکہ صحافی اور ادیب ہے۔ آپ نے یہ سوچا بھی کیسے کہ میں کسی مجرم کو اپنے گھر ٹھہرا سکتا ہوں۔''

''آپ نے شاید لاعلمی میں اسے ٹھہرالیا ہو۔ خلق میں اس کا مضمون ہیگل سے مارکس تک شائع ہوا ہے۔ یہ ایک باغیانہ مضمون ہے۔''

''آپ بھی کیا قصہ لے کر بیٹھ گئے۔ آپ نے وہ مضمون پڑھا بھی ہے؟ اگر آپ نے پڑھا ہے تو آپ کی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ یہ نہایت اعلیٰ درجے کا ادبی مضمون ہے۔ اس میں ہیگل اور مارکس کے فلسفے کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ الگ بات کہ کارل مارکس اشتراکی تھا۔ باری صاحب کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ انہوں نے تو دانشوروں کے اقوال قلم بند کردیے ہیں۔ آپ ان پیچیدہ باتوں کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں جو حکومتِ برطانیہ کے خلاف ہو یا اس کا تختہ الٹنے کا باعث بن سکے۔''

''یہ صفائی وہ گرفتاری کے بعد بھی پیش کر سکتے ہیں۔''

''میں آپ کے افسروں سے بات کرلوں گا۔ اس وقت آپ چلے جائیں۔''

ان کے سمجھانے بجھانے سے معاملہ رفع دفع ہوگیا اور پولیس واپس چلی گئی۔ باری کو معلوم ہوا تو سخت فکر مند ہوا۔ اس نے سوچا اس وقت تو معاملہ رفع دفع ہوگیا لیکن اب وہ پولیس کی نظروں میں آگیا ہے۔ کسی وقت یہ معاملہ پھر اٹھے گا۔ اس کی فطری بزدلی حرکت میں آئی۔ ''خلق'' کا دوسرا شمارہ آچکا تھا۔ یہ شمارہ اس نے منٹو کے پاس چھوڑا اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

خود بھاگ نکلا۔

"وخلق" دو ہی شماروں کے بعد اپنی موت آپ مر گیا۔ اس کے بعد کون تھا جو اس پرچے کو سنبھالتا۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کا پرچا صحافت کی دنیا میں انقلاب برپا کردے گا۔ یہ دعویٰ محض خواب ثابت ہوا۔

وہ امرتسر سے نکلا اور سیدھا لاہور پہنچا۔

لاہور ہندوستان میں اردو صحافت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اتنے ماہانہ ادبی رسائل اور سیاسی ہفتہ وار نکل رہے تھے کہ سارے ہندوستان کے اردو جرائد بھی مجموعی طور سے ان سے کم تھے۔ مخزن، ہمایوں، نیرنگ خیال، عالمگیر، ادبی دنیا، کارواں، ادب لطیف، اختر شیرانی کے خیالستان اور رومان کے علاوہ مستانہ جوگی، چندن اور مست قلندر قسم کے کئی رسائل نکل رہے تھے اور روزناموں میں زمیندار، انقلاب، احسان، شہباز وغیرہ قابلِ ذکر تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ لاہور نامور ادیبوں، شاعروں اور سیاست دانوں کا مسکن تھا۔ علامہ اقبال کے علاوہ مولانا ظفر علی خان، سرعبدالقادر، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، امتیاز علی تاج، پطرس بخاری، صوفی تبسم، حفیظ جالندھری، احسان دانش، اختر شیرانی، فیض احمد فیض، شورش کاشمیری وغیرہ جیسے نام تھے جو لاہور کی رونق بنے ہوئے تھے۔ ان میں ایک نام کا اور اضافہ ہو گیا باری علیگ۔

یہ وہ زمانہ تھا جب چراغ حسن حسرت نے زمیندار چھوڑ کر ایک صاحب سرمایہ ملک نور الٰہی کی معاونت سے ایک معاہدے کے تحت اخبار "احسان" جاری کیا تھا۔ اسے علامہ اقبال کی سرپرستی حاصل تھی۔

احسان اس دور میں منظر عام پر آیا جب ملک سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے نہایت اہم دوراہے پر کھڑا تھا اس وقت ایک ایسے اخبار کی سخت ضرورت تھی جو مسلمانوں کے مؤقف یعنی تقسیم ہند کی بھرپور ترجمانی کر سکے۔ احسان یہ کام بخوبی انجام دے رہا تھا۔ چراغ حسن حسرت کا کالم "مطائبات" عروج پر تھا۔ اس کالم کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ جہاں دو ادیب مل جاتے اس کا ذکر ضرور چھڑ جاتا۔

باری نے لاہور میں پہلا قدم رکھا تو پہلی نظر "احسان" پر پڑی۔ وہ اس کی سرخیوں، اس پر شائع ناموں سے متاثر ہوا اور سیدھا احسان کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ اپنی تصنیف "انقلاب فرانس" سے مشہور ہو چکا تھا۔ اخباری تجربہ بھی رکھتا تھا۔ کئی مرتبہ لاہور آ چکا تھا کئی دوستوں سے شناسائی تھی۔ چراغ حسن حسرت کے لیے بھی اس کا نام نیا نہیں تھا۔

اسے نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے "احسان" میں ملازمت مل گئی۔ اداریہ بھی وہی لکھنے لگا۔ سیاسی مسائل پر اس کو پوری دسترس حاصل تھی۔ اس نے حق گوئی کا ساتھ نہیں چھوڑا لیکن دلائل کے ساتھ۔ اس کی کامیابی اس میں تھی کہ وہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتا تھا جس سے ایک عام قاری کے ساتھ ساتھ ایک عالم دین بھی حظ اٹھا سکے۔ اس کے اداریوں نے احسان کو مقبول بنانے میں بے پناہ حصہ لیا۔

دو تین تحریکیں اس دھوم دھام سے چلیں کہ جن کا ساتھ دے کر روزنامہ احسان ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ ایک وہ تحریک جو احمدیوں کے خلاف شروع ہوئی۔ دوسری مسجد شہید گنج کی واگزاری کی تحریک۔ تیسری تحریک خود احسان کی وضع کردہ تھی کہ اس نے مسلم لیگ کے اس گروہ کا ساتھ دیا جو اتحاد پارٹی کا مخالف تھا۔ باری نے "گرودیپ" کے عنوان سے خبروں کا پس منظر دینا شروع کیا جو اس عہد میں ایک نئے قسم کا فیچر تھا۔

☆......☆

ایک رات جب دوستوں کی بھیڑ چھٹی تو چراغ حسن حسرت کو چائے کی طلب ہوئی، آس پاس کے ہوٹل اور قہوہ خانے اپنی دکانیں بڑھا چکے تھے۔ حسرت اپنی ترنگ میں چلتے چلتے اسلامیہ کالج تک پہنچ گئے۔ اس کے سامنے ایک ہوٹل انہیں نظر آ گیا۔ اس کا نام عرب ہوٹل تھا۔ ہوٹل کیا تھا سڑک کی فٹ پاتھ سے ملحق ایک دکان نما جگہ تھی جسے دو تین کمروں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ سیمنٹ کے ننگے میلے فرش پر لکڑی کی چکنی میلی میزوں کے گرد جھکی ہوئی کرسیاں رکھی رہتی تھیں۔ حسرت نے یہاں بیٹھ کر چائے پی۔ اس چائے میں کچھ ایسی لذت تھی کہ حسرت دوسرے دن پھر پہنچ گئے اور پھر مستقلاً یہیں بیٹھنے لگے۔ حسرت کی وجہ سے کئی اور ادیب بھی یہاں آنے لگے۔ پھر تو اس ہوٹل کو ایسی برکت ملی کہ ادیبوں، شاعروں کا مرکز و محور بن گیا۔ جو یہاں نہیں بیٹھا گویا وہ ادیب ہی نہیں۔

باری جب لاہور آیا تو اسے اس ہوٹل کو دریافت کرنے میں دیر نہیں لگی۔ روزنامہ احسان میں ملازمت ہوئی تو چراغ حسن حسرت سے ملاقات ضروری تھی۔ ان کی ہمراہی میں وہ بھی عرب ہوٹل پہنچ گیا اور پھر جیسے یہیں کا ہو کر

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | PAKSOCIETY

www.paksociety.com

رہ گیا۔ اس کے چوبیس گھنٹوں میں سے بارہ گھنٹے یہیں گزرنے لگے۔ یہ سستا ہوٹل تھا اور پھر قرض کی سہولت بھی حاصل تھی۔ چائے کے ساتھ ساتھ شراب بھی پی جاسکتی تھی لہٰذا یہاں رات گئے تک محفلیں جمنے لگیں۔ لاہور کی ایسی نامور ہستیاں بھی یہاں آتی تھیں جن سے ملاقات باری کے لیے روح کی غذا تھی۔

اس کی شراب نوشی میں بھی اس وقت اضافہ ہو جاتا جب منٹو اس سے ملنے امرتسر سے لاہور آتا۔ منٹو نے تو جیسے ہوش میں نہ رہنے کی قسم ہی کھا رکھی تھی۔ وہ باری کو بھی اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا۔ باری کے ہمدرد دوست اس کے اتنا تیز دوڑنے پر اسے ملامت کرتے رہتے تھے لیکن وہ اپنی غربت اور تنگ دستی کے باوجود اپنی روش بدلنے پر تیار نہیں تھا البتہ یہ ضرور تھا کہ دونوں دیوانے نہایت ہوش مند تھے۔ منٹو کا عالم بھی یہ تھا کہ وہ نہایت شاندار افسانے لکھ کر ادب میں اپنے لیے جگہ بنا رہا تھا اور باری بھی اپنی صحافتی ذمہ داریاں نہایت پابندی سے ادا کر رہا تھا اس کے لکھے ہوئے اداریے زیر بحث رہتے تھے۔ اس کا کالم گرد و پیش ادیبوں کے لیے سرمہ نظر بنا ہوا تھا۔ ان دنوں اخبارات بہت کم معاوضہ دیا کرتے تھے اور وہ بھی پابندی سے نہیں۔

منٹو ایک مرتبہ لاہور آیا تو باری کی حالت اس سے دیکھی نہیں گئی۔ اس جیسے لاابالی نے ترنگ میں آکر مشورہ دے ڈالا۔

”مولانا! یاد ہے آپ نے ادبی تربیت کرتے ہوئے مجھے ترجمے کی طرف راغب کیا تھا اور میں نے وکٹر ہیوگو کے ناول کا ترجمہ کیا تھا۔“

”میں ایسی باتیں یاد نہیں رکھتا کہ میں نے کس کے ساتھ کیا کیا تھا۔“

”آپ مشہور کتابوں کے ترجمے کی طرف خود کو راغب کیوں نہیں کرتے۔“

”اس سے کیا ہوگا۔“

”اس سے آپ کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ دوستوں کے لیے وہسکی خریدنے میں آسانی ہوگی۔“

”اس کے لیے اخبار کے مالکان کیا کم ہیں۔ ہم نے اپنی قسمت کی دولت بھی ان کے پاس رکھ دی ہے جسے ہم قسطوں میں وصول کرتے رہتے ہیں۔ بس یہ ہے کہ وہ کبھی کبھی ڈنڈی مار جاتے ہیں اور ہم بھوکے مرنے لگتے ہیں۔ اس کا انتظام بھی اللہ نے کر دیا ہے۔ عرب ہوٹل زندہ باد، قرض کھاتے ہیں قرض پیتے ہیں۔“

دونوں نشے میں تھے بات بھی نشے میں بہہ گئی۔

وہ اس دن ”احسان“ کے دفتر گیا تو اتفاق سے وہاں بھی ترجمہ نگاری پر بحث چھڑی ہوئی تھی۔ باری نے بھی اس بحث میں حصہ لیا۔ اس نے اردو میں ترجمہ نگاری کی روایت کو اس مدلل طریقے سے بیان کیا کہ سب اش اش کر اٹھے۔ روایت بیان کرتے ہوئے اس کے ڈانڈے موجودہ دور سے ملا کر اس کی اہمیت کو واضح کیا اور ثابت کیا کہ عالمی ادب کو اردو کے قریب لانے کے لیے تراجم کی سخت ضرورت ہے۔ اچھے تراجم کی اہمیت طبع زاد تصانیف سے کسی بھی طرح کم نہیں۔

جب وہ اچھی طرح لیکچر دے چکا اور اچھے ترجمے کی خصوصیات اچھی طرح بیان کر چکا تو وہاں موجود لوگوں نے اس کی توجہ اس طرف دلائی۔

”جب آپ کے نزدیک ترجمہ اتنا ہی اہم اور مفید ہے تو آپ اس طرف توجہ کیوں نہیں کرتے۔ آپ کو مختلف زبانوں پر عبور بھی حاصل ہے جو ترجمے کے لیے ضروری ہے۔ آپ کا مطالعہ بھی اتنا وسیع ہے کہ آپ کو معلوم ہے کہ کون سی کتاب اس لائق ہے کہ اس کا ترجمہ کیا جائے۔ آپ کو فرانسیسی اور انگریزی پر یکساں عبور ہے۔ آپ کے لیے یہ کام آسان ہوگا۔“

باری نے اپنی عادت کے مطابق ہوں ہاں کر کے بات ٹال دی۔

رات کو کسی وقت اس کمرے میں پہنچا جو اس نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ سونے کے لیے لیٹا تو دن بھر کی معرکہ آرائیوں کا خیال آیا۔ منٹو کا مشورہ اور ’احسان‘ میں ہونے والی گفتگو کا خیال آیا۔ یہ بھی ہوا کہ اس مہینے کی آدھی تنخواہ عرب ہوٹل کو چلی گئی تھی۔ اگر میں کسی کتاب کا ترجمہ کر دوں تو کچھ تو آمدنی ہو جائے گی۔ اس نے سوچا۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ پبلشر غریب مصنفوں کا استحصال کرتے ہیں۔ اس استحصال کے خلاف لڑنے کا نام اشتراکیت ہے۔ میں اگر لڑ نہیں سکتا تو یہ بتا تو سکتا ہوں کہ استحصال کہاں کہاں ہو رہا ہے۔ میں استحصال کے باوجود کوئی کتاب ترجمہ بھی کروں گا اور اسے شائع بھی کراؤں گا۔ اونے پونے کوئی تو خرید ہی لے گا۔ سو پچاس کچھ تو ملیں گے۔

اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ترجمے کے لیے کس کتاب کا انتخاب کیا جائے۔ اسے اپنا کہا ہوا یاد آیا۔ اس نے کبھی کہا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

تھا کہ ترجمہ کرتے وقت دو چیزوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ موضوع اپنی پسند کا ہو اور کتاب اس موضوع کا حق ادا کرتی ہو۔ تیسری شرط کا اس نے اس وقت اضافہ کرلیا کتاب ذاتی ہو تاکہ اطمینان سے ترجمہ کیا جاسکے۔ وہ اس وقت تک اشتراکیت پر سختی سے عمل پیرا تھا۔ اس نے اپنی مختصر زندگی کا طویل عرصہ اشتراکی نظریات کا پرچار کرنے میں گزارا۔ (عمر کے آخری حصے میں اس کے خیالات میں خاصی تبدیلی آئی۔ وہ رفتہ رفتہ اشتراکی نظریات و خیالات سے دور ہوتا چلا گیا کیونکہ وہ سمجھنے لگا تھا کہ اسلامی نظام معیشت ہی تمام مسائل کا حل ہے۔)

اسے یاد آیا کہ اس نے نوبیل انعام یافتہ انگریز ناول نویس اور ڈراما نگار گالز وردی کا ایک ڈراما پڑھا تھا۔ اس نے ذرا ذہن پر زور دیا تو اس ڈرامے کا نفس مضمون بھی اسے یاد آگیا۔ ”ایک کارخانے میں مزدوروں نے کئی ہفتوں سے ہڑتال کررکھی ہے گویا یہ ڈراما سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان ایک کشمکش ہے۔ سوشلزم کا نظریہ اسی کشمکش کے درمیان گھومتا ہے۔ سرمایہ داروں کا رہنما انتھونی اور مزدوروں کا قائد رابرٹس ہے۔ انتھونی کا نظریۂ حیات قطعی طور پر غلط ہے۔ انتھونی کا بیٹا اور بیٹی مزدوروں کی حمایت میں لب کشائی کرتے ہیں لیکن انتھونی مزدوروں کے مطالبات ماننے کو تیار نہیں۔

وہ بستر سے اٹھا اور ایک طرف رکھے کتابوں کے ڈھیر میں کچھ تلاش کرنے بیٹھ گیا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسے زیادہ محنت کرنی نہیں پڑی۔ کتابوں میں دبی ہوئی وہ کتاب اس کے ہاتھ لگ گئی۔ وہ اس کتاب کو لے کر بستر تک آیا۔

وہ یہ کتاب پہلے بھی پڑھ چکا تھا لیکن اب اسے یہ کتاب اس نظر سے پڑھنی تھی کہ اس کا ترجمہ بھی کرنا ہے اس نے یہ کتاب پڑھنی شروع کردی۔

چند روز کی محنت کے بعد اس نے ترجمہ مکمل کرلیا۔ ہر چند کہ اس نے یہ ترجمہ اپنی معاشی مشکلات کو کم کرنے کے لیے کیا تھا لیکن اس نے پوری کوشش کی اور قلم کی کرشمہ سازی کا جادو جگائے۔ وہ ترجمے کے فن کی باریکیوں سے آگاہ تھا۔ اس نے اس کتاب کا بامحاورہ ترجمہ کیا۔ زبان ایسی سلیس اور رواں رکھی کہ ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔

اس کے خیال میں اس نے ایک باکمال کتاب کا باکمال ترجمہ کیا لیکن جب اس نے اشاعت کے لیے پبلشر کی تلاش کی اور ایک پبلشر کا انتخاب بھی کرلیا تو اسے معاوضہ اتنا کم ملا کہ وہ اس ناقدری پر کف افسوس مل کر رہ گیا۔ کیا کرتا ضرورتیں منہ کھولے کھڑی تھیں۔ اس نے مسودہ پبلشر کے حوالے کیا اور کئی دن کے لیے رئیس ہوگیا۔ عرب ہوٹل اس کے قہقہوں سے گونجنے لگا۔

جب جیب میں پیسے ختم ہوگئے تو اسے پھر کسی ترجمے کی سوجھی۔

پہلے ترجمے کی قیمت کم لگی تھی لیکن کتاب کی مقبولیت سے اسے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مکتبہ اردو کے پبلشر چودھری نذیر احمد سے اس کے تعلقات استوار ہوگئے۔ چودھری نذیر احمد، منٹو کے بھی دوست تھے لہٰذا جب منٹو لاہور آتا تو وہ اس کے لیے محفلیں آراستہ کرتے، شراب کے دور چلتے، باری تو منٹو کا گرو تھا۔ وہ ان محفلوں کا صدرنشین ہوتا۔ ایسی ہی ایک محفل میں چودھری نذیر احمد نے تقاضا کیا کہ وہ ان کے لیے کوئی کتاب لکھے یا کم از کم کسی کتاب کا ترجمہ ہی کردے۔

اس مرتبہ باری کی نظر ”کمیونسٹ مینی فیسٹو“ پر گئی۔ یہ وہ منشور تھا جسے فریڈرک اینگلز اور مارکس نے بین الاقوامی اشتمالی جماعت ”انٹرنیشنل آف کمیونسٹ“ کے لیے مرتب کیا تھا۔ جن اصولوں پر مارکسیت اور اشتمالیت بنتی ہے اس میں ان کی عام فہم وضاحت کی گئی تھی۔

باری علیگ نے اس منشور کا نہایت عمدہ ترجمہ کیا۔

اس مینی فیسٹو کے شائع ہوتے ہی پیرس میں انقلاب رونما ہوگیا تھا اور بیلجیم حکومت نے مارکس کو جلاوطن کردیا تھا۔

باری کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کا کیا ہوا ترجمہ جیسے ہی کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس کتاب پر پابندی عائد کردی گئی۔

اس کی محنت اور چودھری نذیر احمد کا سرمایہ دونوں ڈوب گئے۔

اصولاً تو اسے کچھ دنوں کے لیے خاموش ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایک مرتبہ پھر اس نے اسی موضوع کا انتخاب کیا اس مرتبہ اس نے لینن کی کتاب کا ترجمہ ”انتہا پسند کمیونسٹ“ کے نام سے کرنا شروع کیا۔

اس تصنیف کا ترجمہ اس کی قابلیت کا منہ بولتا اظہار تھا کیونکہ اس میں بے حد مشکل اصطلاحات دی گئی تھیں جن کو سمجھنے کے لیے روسی ادب سے واقف ہونا ضروری تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

باری سے یہ چاہتے کہ تحقیق کے بعد ان اصطلاحات کے معنی دریافت کیے اور نہایت دلنشیں انداز میں اس کی وضاحت کی۔

اس کتاب میں لینن نے ان سیاسی مفکروں اور کارکنوں کا ذہنی تجزیہ پیش کیا تھا جو باتیں زیادہ کرتے ہیں اور کام تھوڑا کرتے ہیں۔ باری کے نزدیک اس قسم کے کارکنوں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہی وہ مقصد تھا جو اس کتاب کے ترجمے کا باعث بنا۔

صبح سے شام تک اسے کسب معاش کی الجھنوں میں گرفتار رہنا پڑتا۔ رات کے کچھ خاموش گھنٹے ملتے وہ اس کے مطالعے کے لیے تھے یا پھر تصنیف وتالیف میں مشغول ہو جاتا۔ کئی بلند پایہ تحقیقی کتابوں کے منصوبے اس کے ذہن میں تھے لیکن صحافتی ذمہ داریاں اجازت نہیں دے رہی تھیں کہ وہ ان کاموں میں ہاتھ ڈالے۔ البتہ تراجم میں کسی تحقیق کی ضرورت نہیں تھی۔ کتاب میں جو کچھ ہے اس کی ذمہ داری اس پر نہیں تھی صرف اس کی محنت تھی جو اصل کتاب کو ترجمے کی شکل میں ڈھالتی تھی۔ تراجم مشہور بھی ہورہے تھے لہٰذا پبلشر بھی اس سے یہی فرمائش کرتے تھے۔

اس مرتبہ انگریز عالم سیاسیات لندن کے اخبار ڈیلی ہیرلڈ کے مدیر ہیرلڈ لاسکی کی کتاب ”فاشزم“ اس کے ہاتھ لگی۔ اس نے فاشزم ہی کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا۔ اسے مکتبہ اردو لاہور نے شائع کیا تھا۔ اب تک کے تمام اردو ترجمے اسی مکتبہ کے تحت شائع ہوئے تھے۔

اس کتاب میں بتایا گیا تھا کہ فرسودہ، پُرتشدد اور انقلاب دشمن سرمایہ داری کا نام فاشزم ہے اور اس نظام کے لیے جن طریقوں کی ضرورت ہوتی ہے ان سب کی بنیاد جبر و تشدد پر قائم ہوتی ہے۔ کھوکھلی اور فرسودہ سرمایہ داری کو چلانے کے واسطے ایک جابرانہ طرز حکومت کا قیام لازمی ہے۔ اس نظام میں حکومت ایک ڈکٹیٹر کے ہاتھ میں سونپ دی جاتی ہے۔

باری نے اس کتاب کا نہایت سلیس ترجمہ کیا اور حواشی لکھ کر اس کتاب کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا۔

اس کی زندگی میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب اس نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ”کمپنی کی حکومت“ شائع کی۔ اس کی تصنیف بھی تھی اور دلیرانہ جسارت بھی۔ وہ انگریزوں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں انگریزوں کے خلاف جذبات کا ایک طوفان موجزن تھا۔

اس سے پہلے وہ تاریخ کیا ہے اور تاریخ کا مطالعہ جیسی کتابیں تصنیف کر چکا تھا۔ جب وہ برصغیر کی تاریخ کا مطالعہ کرتا تھا تو اسے سخت مایوسی ہوتی تھی۔ برطانوی عہد میں تاریخ کی جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں انگریز غاصب اور مکار نظر نہیں آتا بلکہ محسن نظر آتا ہے۔ یہ تواریخ مختلف مقاصد حاصل کرنے کے لیے لکھی گئی تھیں اور رائج بھی ہوگئی تھیں۔ بیشتر ہندو مؤرخین تھے جنہوں نے انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے تاریخ کو مسخ کیا تھا۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی چیرہ دستیوں اور ان کے ناپاک مذموم مقاصد کا پردہ فاش کرنا چاہتا تھا۔ برٹش ایمپائر کمپنی کا تسلط قائم کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں تجارتی کوٹھیاں قائم کیں اور خیبر سے راس کماری تک یونین جیک لہرا دیا اور اس ملک کے مالک بن کر صدیوں حکمرانی کرتے رہے۔ مؤرخین نے جان بوجھ کر انگریزوں کے مظالم کی طرف سے چشم پوشی کی تھی۔ باری کی دلیری ان سب مظالم سے پردہ اٹھانے کے درپے تھی۔ اس نے پردہ اٹھایا اور بڑی بے باکی سے لکھا۔

پلاسی کی لڑائی کے بعد کمپنی کے ہاتھ میں تجارت کے ساتھ حکومت بھی آ جاتی ہے۔ حصے داروں کا منافع بڑھنے لگا۔ ملازموں نے لوٹ کھسوٹ بڑھا دی۔ برطانوی حکومت کی آمدنی میں لاکھوں کا اضافہ ہوا۔ ہندوستان سے حاصل کی ہوئی یا چھینی ہوئی دولت نے انگلستان میں مشینی اور صنعتی انقلاب پیدا کیے۔ ان انقلابوں نے جہاں ہندوستان کی عمومی معیشت کو نقصان پہنچایا وہیں پیسوں اور ساہوکاروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کردیا جو بہت سی پابندیوں سے آزاد تھا۔ 1857ء کے بعد برٹش پارلیمنٹ نے کمپنی کے اختیار حکومت کو بھی ختم کردیا۔

تنگ نظر مؤرخوں نے جنگ آزادی 1857ء کی تصویر کا صرف ایک رخ پیش کیا۔ باغی سپاہیوں کے مظالم کو تاریک ترین لفظوں میں بیان کیا جب کہ اس کی ضد مورخوں نے صرف انگریزوں کے مظالم کا ذکر کیا۔ باری نے حقائق کے دونوں پہلو اجاگر کیے مثلاً لکھنو کے نواب واجد علی شاہ کی زندگی کا صرف ایک پہلو پیش کر کے مورخین نے اسے عیش پرست ثابت کیا تا کہ انگریزوں کے اس اقدام کو درست ثابت کیا جائے جو انہوں نے اس کی حکومت ختم کر کے اٹھایا۔ باری نے اس کی زندگی کا صرف ایک پہلو پیش نہیں کیا بلکہ اس کے کارنامے بھی بیان کیے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

''واجد علی شاہ عربی فارسی اور اردو کا فاضل تھا۔ اس نے اردو میں کئی کتابیں لکھیں۔ اسے تاریخ سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ اودھ کی فوجی طاقت کو مضبوط کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے اختری پلٹن اور نادری پلٹن بنائی۔ واجد علی شاہ نے لکھنو میں سلطان پولیس قائم کیا۔ دیوانی اور فوجداری مقدموں کی مزید سماعت کے لیے ہائی کورٹ قائم کیے۔ حفظانِ صحت کا الگ محکمہ قائم کیا۔ دستورات واجدی کے نام سے ایک عدالتی رسالہ شائع ہوتا تھا۔ واجد علی شاہ کے عہد حکومت میں لکھنو ہندوستان کے تمام شہروں میں ترقی یافتہ اور مرفع الحال تھا۔ شہر کے وسطی حصے میں گھنی آبادی تھی۔ خاص سڑکوں کے مناظر بہت دلکش تھے۔ لوگ شاہانہ لباس پہن کر گھروں سے باہر نکلتے تھے۔ سارا شہر ایک تصویر نظر آتا تھا۔''

یہ توازن میں نے انگریزوں کے سلسلے میں بھی برقرار رکھا۔ اس کے دل میں انگریزوں کی طرف سے بے پناہ نفرت تھی جس کا اظہار اس نے کمپنی کی حکومت میں جگہ جگہ کیا۔

اگر اس نے یہ لکھا۔

''ایک اجنبی قوم کے سوداگروں کی ایک جماعت نے جس کے پیش نظر محض نفع اندوزی تھی ہندوستان کے بڑے سے بڑے نقصان کو اپنے مفاد کے لیے نظر انداز کردیا۔''

تو یہ بھی لکھا۔

''ڈلہوزی کے عہد حکومت میں ہندوستان میں پہلی مرتبہ ریل گاڑی چلائی گئی۔ ٹیلی گراف کا سلسلہ بھی پہلی مرتبہ جاری کیا گیا۔ کمپنی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ حکومت ہند نے رفاہ عامہ کا محکمہ جاری کیا۔ اس محکمے نے جرنیلی سڑک کی مرمت کرائی اور نہر گنگا کھدوائی۔ ہندوستان کے طول و عرض کے لیے دو پیسے کے (ڈاک) ٹکٹ کی سروس جاری کی گئی۔''

اس انصاف پسندی کے باوجود حکومتِ ہند کو اس کی یہ جرأت پسند نہ آئی۔ انگریزوں کے دورِ اقتدار کا عروج تھا۔ کسی میں سچ بات کہنے کی تاب و طاقت نہیں تھی۔ اس کی ابتدا باری علیگ نے کی۔ نہ صرف تاریخ کو درست کیا بلکہ انگریزوں کے مظالم اور ناانصافیوں کا پردہ چاک کیا۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ اکلوتی کتاب انگریزوں کی برسوں کی محنت پر پانی پھیر رہی تھی:

''یہ بات واضح ہے کہ برصغیر پر انگریزوں کے قبضے کے ساتھ ہی اس سرزمین کی تاریخ کو مسخ کرنے کے منصوبے پر عمل شروع ہوگیا تھا۔ برصغیر میں عدل جہانگیری کی مثال قائم کرنے والے حکمرانوں کی کردارکشی کی گئی اور انگریزوں کو نجات دہندہ قرار دیا گیا۔ برصغیر کی تاریخ کا یہ روپ ہندوؤں کو بھی منظور تھا کیونکہ وہ مسلمان حکمرانوں کے روشن کارناموں سے خوش نہیں ہو سکتے تھے چنانچہ کئی ہندو مصنفین نے بھی انگریزوں کے ایما پر تاریخ کی ایسی کتابیں لکھیں جو انگریزوں کے منصوبے کے مطابق تھیں۔ باری علیگ نے دلیری سے کام لیتے ہوئے برصغیر کی تاریخ کو صحیح روپ عطا کیا۔

اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذمہ دار لوگوں کی بدکاریوں، چالاکیوں، بدعہدیوں اور زیادتیوں کو مدلل انداز

اعترافات

آج میں جو کچھ بھی ہوں اس کو بنانے میں سب سے پہلا ہاتھ باری علیگ کا ہے۔ اگر امرتسر میں جچے کے ہوٹل میں ان سے ملاقات نہ ہوتی اور متواتر تین مہینے ان کی صحبت میں نہ گزارے ہوتے تو یقیناً میں کسی اور ہی راستے پر گامزن ہوتا۔ (منٹو)

وہ ہمارے پیرو مرشد تھے جن کے روحانی فیضان نے ہمیں اپنے تمام ہم عصروں سے ممتاز کردیا تھا اور تو اور ہمارے پروفیسر بھی جن میں فیض احمد فیض اور صاحبزادہ محمود الظفر جیسے لوگ شامل تھے ہمیں ادب و احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ (ابوسعید قریشی)

مجھے بھی تحریر و تصنیف کے راستے پر ڈالنے والے باری علیگ ہی تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ باری مرحوم نے کبھی کسی کو نہیں جتلایا کہ میں نے تمہارے لیے یہ کیا تھا یا میری وجہ سے تم فلاں مقام پر پہنچ گئے ہو۔ (عاطر ہاشمی)

باری ترجمے کے فن کی باریکیوں سے آگاہ تھے۔ بامحاورہ ترجمے پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ وہ اتنا شگفتہ سلیس اور رواں ترجمہ کرتے تھے کہ اس پر اصل تصنیف کا گمان ہوتا تھا۔ ان کے کئی تراجم طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔ مختلف کتب کے علاوہ انہوں نے بعض ہندی اور فارسی مضامین کے بھی ترجمے کیے۔ بسا اوقات ترجمہ کرتے وقت وہ اچھی خاصی لفاظی سے بھی کام لیتے ہیں جس سے تحریر کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔ (مرزا ادیب)

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

سے بے نقاب کیا۔

اس کتاب کی اشاعت سے برطانوی ایوانوں میں ہلچل مچ گئی۔ اس نے لارڈز کے اچھے کارناموں کی تعریف بھی کی تھی لیکن انگریزوں کی چیرہ دستیوں کی پول بھی کھول دی تھی۔ اس کی یہ جسارت برطانوی حکومت کو کیسے برداشت ہوسکتی تھی۔ مصنف کو اشتراکی قرار دے کر اس پر عتاب نازل کیا جانے لگا۔ خفیہ پولیس سائے کی طرح اس کے پیچھے لگ گئی۔ انگریزوں کی کاسہ لیسی کرنے والے فائدے اٹھاتے رہے اور وہ حصول روزگار کے لیے ادھر ادھر گھومتا رہا۔

اپنوں نے بھی کوئی قابلِ ذکر سلوک نہیں کیا۔ ایسی کتاب لکھنے پر اسے ہیرو قرار دیا جاتا۔ اسے زندگی کی ہر آسائش میسر ہوجاتی لیکن اسے کتاب کا معاوضہ صرف تین سو روپے ملا۔ پبلشر نے لاکھوں کمائے کیونکہ کتاب بے حد مقبول ہوئی۔ لوگ وہ باتیں سننا چاہتے تھے جو اس نے لکھ دی تھیں۔

روزنامہ احسان مسلم دوست اخبار تھا اور مسلم لیگ کی ترجمانی کرتا تھا اس لیے مسلمانوں میں بے حد مقبول تھا۔ احسان کی اس مقبولیت میں باری کی ادبی صلاحیتوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ وہ اعلیٰ پائے کا اداریہ نویس تھا۔ سیاسی مسائل پر اس کی دسترس تھی۔ زبان عام فہم تھی لہٰذا عام قاری میں اس کے اداریے بہت مقبول ہوئے۔ اس کا اثر احسان کی اشاعت پر پڑا اور یہ سب سے زیادہ شائع ہونے والا اخبار بن گیا لیکن ایک ایسے موقع پر چراغ حسن حسرت، سالک، مولانا مرتضیٰ احمد خان وغیرہ کی اخبار کے مالک سے ٹھن گئی۔ یہ لوگ کہتے تھے مالکان نے معاہدہ کیا تھا کہ اخبار سے حاصل ہونے والے منافع سے انہیں بھی حصہ دیا جائے گا جب کہ مالکان کا اصرار تھا کہ ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا ان لوگوں نے استعفے دے دیے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ باری نے بھی استعفیٰ دے دیا۔

☆......☆

بکری اب تک خیریت سے تھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ خیریت کے دن گزر گئے۔ چھری پر دھار رکھی جاچکی ہے اور بس اب وہ چھری کے نیچے آنے ہی والی ہے۔ خطرے کی گھنٹی پہلی مرتبہ اس وقت بجی جب گھر سے خط آیا۔ اس خط میں بڑے ارمانوں سے یہ خبر سنائی گئی تھی کہ ہم نے تمہاری بات پکی کردی ہے۔ کاش اسے کچی ہی رہنے دیا ہوتا۔

وہ ابھی شادی کے حق میں نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ لاہور میں ابھی درجنوں روزنامے ایسے تھے جن میں کام کرنا ابھی باقی تھا۔ اس نے لکھ مارا کہ ابھی اسے شادی کی جلدی نہیں۔ اسے نہ ہو لیکن ماں باپ کو تو تھی۔ اس کی عمر 31 سال ہوچکی تھی۔ شادی کی عمر اور کب آئے گی۔ یہ خط گھر کے بزرگوں کی موجودگی میں پڑھا جارہا تھا۔ اس کے انکار پر بزرگوں کی آنکھیں گردش میں آئیں۔ ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا۔ ”اس کا مطلب ہے خبر صحیح تھی۔“

”مجھے تو اس کی سچائی میں پہلے بھی شک نہیں تھا۔“

”کوئی لاہور میں ہو، اکیلا رہتا ہو اور کوئی لڑکی اس کی زندگی میں نہ ہو۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔“

”سوال تو یہ ہے کہ اب کیا کریں۔“

”ہو کیا سکتا ہے۔ لڑکی والوں سے کچھ مہلت مانگنا ہو گی۔ اس عرصے میں باری کو سمجھایا جائے گا۔“

بات یہ تھی کہ باری کے والدین تک کسی نے یہ خبر پہنچائی تھی کہ باری لاہور میں کسی لڑکی سے عشق فرما رہا ہے۔ اسی لیے شادی سے انکار کررہا ہے۔

ممکن ہے اس خبر میں صداقت بھی ہو۔

باری کے پاس گھر سے خط آتے رہے اور وہ مسلسل انکار کرتا رہا۔ وہ یہ سوچ کر کہ بات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے وہ لائل پور (فیصل آباد) خود گیا اور بہانا یہ کیا کہ کوئی باقاعدہ ملازمت ہو جائے تو وہ شادی کرلے گا۔ وہ اپنی غربت کو جواز بنا رہا تھا لیکن ماں کا اصرار تھا کہ وہ فوراً شادی کرلے۔

”شادی کے بعد تمہاری دلہن میرے پاس رہے گی تم ملازمت ڈھونڈتے رہنا۔ جب ملازمت مل جائے تو اسے اپنے ساتھ لے جانا۔“

وہ بھی ضد پر آگیا اور ماں کو روتا چھوڑ کر لاہور چلا آیا۔

ایک دن اس کے نام کلانور ضلع گورداسپور سے ایک خط آیا۔ وہ کلانور میں پیدا ہوا تھا۔ بہت سی یادیں وہاں سے وابستہ تھیں لیکن وہاں کوئی ایسا دوست نہیں تھا جو اسے خط لکھ سکتا۔ وہ حیران تھا کہ یہ خط اسے کس نے لکھا ہوگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے لفافہ چاک کیا اور پھر حیرتیں پہاڑ بن کر اس کے سر پر آگئیں۔ یہ خط اس کی ہونے والی بیوی کی طرف سے لکھا گیا تھا جس میں چند نصیحتوں کے بعد یہ دھمکی درج

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

تھی کہ اگر اس نے اب شادی سے انکار کیا تو وہ اس کے پیٹ میں چھری اتار دے گی اور اسی چھری سے اپنا بھی خاتمہ کرلے گی۔

فطری بزدلی نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ واہمے طرح طرح سے اس کے دل میں اترنے لگے۔ کہیں واقعی ایسا نہ ہو جائے۔ اس پاگل لڑکی نے اگر واقعی یہ قدم اٹھالیا تو کیسی جگ ہنسائی ہوگی۔ ہمدردی کا جذبہ بھی موجزن ہوا۔ بے چاری بھری جوانی میں موت سے ہمکنار ہو جائے گی۔ نہیں نہیں یہ بڑی خود غرضی ہوگی کہ میں اپنی محبت کے لیے اس بے چاری کی جان لے لوں۔ مجھے شادی کرلینی چاہیے۔ اس کی جان بھی بچ جائے گی اور ماں باپ کی دعائیں بھی مجھے ملیں گی۔

نیند پہلے ہی ہاتھ باندھے الگ کھڑی تھی۔ اس نے بھی بستر چھوڑ دیا۔ اگر شاعر ہوتا تو ٹہل ٹہل کر شعر کہتا مگر وہ تو نثر نگار تھا، کونے میں پڑی ہوئی میز پر بیٹھ کر ہی کچھ لکھ سکتا تھا مگر بیٹھنے کی سکت کہاں تھی۔ اس چھری کا خیال ہر طرف پھیل گیا تھا جو اس کے پیٹ میں اترنے والی تھی۔ وہ جاگتا رہا اور سوچتا رہا، سوچتا رہا اور جاگتا رہا۔

صبح ہوتے ہی وہ عرب ہوٹل پہنچ گیا۔ وہاں اس کا حساب چلتا تھا لہٰذا ادھار میں ناشتا کیا۔ چند دوست آگئے تھے۔ ان سے گپ شپ کرتا رہا۔ جب ذرا دن چڑھ گیا تو وہ فیصل آباد کے لیے بس میں بیٹھ گیا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے اعلان کردیا کہ وہ شادی کرنے کے لیے آیا ہے۔ اس غیر متوقع اعلان پر کسی کو یقین نہ آیا لیکن وہ سنجیدہ تھا۔

جب اچھی طرح جانچ لیا گیا کہ وہ سنجیدہ ہے اور اس اعلان میں کوئی شرارت پوشیدہ نہیں تو چند بزرگ کلانور گئے اور تاریخ طے کرکے آگئے۔

باری نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ لڑکی کون ہے کیسی ہے کس خاندان کی ہے۔ اسے تو بس کسی نادیدہ جذبے کے تحت شادی کرنی تھی۔ وہ چھوٹی سی برات لے کر کلانور چلا گیا اور زینت بی بی کو بیاہ کر فیصل آباد لے آیا۔

لاہور میں اس کا ٹھکانا ہرگز اس قابل نہیں تھا کہ بیوی کو وہاں لاتا۔ احسان سے نکلنے کے بعد کسی ملازمت کا بھی بندوبست نہیں ہوا تھا لہٰذا فیصل آباد میں کچھ دن گزارنے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر لاہور آگیا۔

کسبِ معاش کی تگ و دو پھر شروع ہوگئی۔

انہی دنوں احسان سے فارغ ہونے کے بعد میکش اور ان کے ساتھیوں نے شہباز کے نام سے ایک روزنامہ نکالا۔ باری علیگ شادی کے بعد لاہور پہنچا تو اس روزنامے کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ وہ بھی اس اخبار سے بطور سب ایڈیٹر منسلک ہوگیا۔ اس کے ادارے میں آجانے کے بعد گویا اخبار میں جان سی پڑ گئی۔ ''شہباز'' نے وہی روش اختیار کی جس پر احسان چل رہا تھا یعنی مسلم لیگ کی حمایت اور پنجاب میں مطالبہ پاکستان کی راہ ہموار کرنا۔ باری کی تحریروں نے اسے احسان سے زیادہ شگفتہ، پرشکوہ اور دل آویز اخبار بنا دیا۔ یہ اخبار برابر ترقی کررہا تھا کہ خاکساروں کے ساتھ اختلافات پیدا ہوگئے۔ عنایت اللہ مشرقی نے اپنے ساتھیوں کو شہباز کی اشاعت گھٹانے کے لیے تحریک چلانے کو کہا۔ منظم انداز سے تحریک چلائی گئی۔ مشکلات بڑھنے لگیں۔ اخبار کے پاس سرمایہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ عنایت اللہ مشرقی کی تحریک کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ میکش نے اسے اتحادی پارٹی کے سیکریٹری سید امجد علی شاہ کے پاس فروخت کردیا۔

میکش کے تحریر کردہ ایک اداریہ سے ناراض ہوکر سید امجد علی نے انہیں شہباز سے نکال دیا۔ اپنے ساتھی کی حمایت میں باری نے بھی استعفیٰ دے دیا۔

ایک مرتبہ وہ پھر گھر بیٹھ گیا۔ گھر کیا بیٹھا عرب ہوٹل کو گھر بنالیا۔ دن بھر دوستوں میں گھرا بیٹھا رہتا۔ شام ہوتے ہی انارکلی کے کیلاش ہوٹل کی بالائی منزل پر پہنچ جاتا جہاں وہسکی کے دور چلتے۔ رات ہوتی تو شگفتہ مزاجی کا سرچشمہ بنا ہوٹل سے نکلتا اور گھر پہنچ جاتا۔ ہفتہ دس دن میں فیصل آباد کا چکر لگالیتا۔

ان دنوں وہ بالکل خالی تھا۔ احسان بھی ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ شہباز بھی چھوڑ چکا تھا صرف باتوں پر گزارا تھا۔ چودھری برکت علی اس سے کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ وہ کوئی نئی کتاب لکھ دے تاکہ کچھ پیسے بن جائیں۔ وہ یوں بھی اس کی مدد کرسکتے تھے لیکن انہیں معلوم تھا کہ باری کی خودداری بھی قبول نہیں کرے گی کہ کوئی اس کی مدد کرے اسی لیے وہ کتاب لکھوانے پر اصرار کررہے تھے لیکن اس کی آوارگی عروج پر تھی بالآخر چودھری نے ممتاز مفتی کو درمیان میں ڈالا۔

''دیکھ مفتی باری تو بہت نکما ثابت ہورہا ہے۔ کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں مگر وہ کچھ لکھنے کو تیار نہیں۔ تو اس سے کہہ کر کمپنی کی حکومت پر نظر ثانی کرادے۔ میں اس میں کوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

تبدیلی اور اضافے کے ساتھ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کے موڈ میں ہوں۔ میرا بھلا بھی ہو جائے گا اور اس کو بھی چار پیسے مل جائیں گے۔''

ممتاز مفتی نے باری پر زور ڈالا اور بالآخر باری کو تیار کرلیا۔

''سوچ تو میں بھی رہا ہوں۔'' باری نے کہا۔ ''پہلے ایڈیشن میں کچھ خامیاں ہیں وہ بھی دور ہو جائیں گی۔ طریق تنقید متقمانہ ہے۔ منطق کم اور لفاظی زیادہ ہے۔ اکثر جگہ جذبات غالب آگئے ہیں۔ نظر ثانی میں خامیاں دور ہو جائیں گی۔''

اس نے لکھنے کی میز کو جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ وہ میز کیا تھی ضرورت کے ہر سامان کی آماجگاہ تھی۔ ایک طرف قلم دان رکھا ہے۔ قلم دان کے ساتھ ہی ناخن کاٹنے کی چھوٹی سی قینچی رکھی ہے۔ دوسری جانب شیو کرنے کا استرا پڑا ہے۔ ایک گول چکنا پتھر ہے جسے وہ پیپر ویٹ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ کتابوں کے اوپر کاغذ کے گرد پوش چڑھے ہوئے ہیں۔ ان پر سوئی دھاگا رکھا ہے۔ ایک فائل ہے اس میں مختلف رسالوں سے کاٹی ہوئی تصویریں جمع ہیں جنھیں لکھنے کے دوران وقفے وقفے سے دیکھ لیتا ہے۔

وہ جی کڑا کر کے کمپنی کی حکومت پر نظر ثانی کرنے بیٹھ گیا۔

جب مکمل ہو گیا تو وہ خوش ہونے کی بجائے اداس ہو گیا۔

''میں بھی کتنا احمق ہوں۔ اتنے عرصے میں تو کوئی نئی کتاب لکھ ڈالتا۔ کتاب کی تصنیف پر مجھے صرف تین سو روپے ملے تھے۔ اس پر نظر ثانی کے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو روپے مل جائیں گے۔ خوامخواہ تین مہینے ضائع کر دیے۔'' اس نے ممتاز مفتی سے کہا۔

اس نے نظر ثانی شدہ مسودہ چودھری صاحب کے حوالے کر دیا۔

چودھری صاحب نے بطور معاوضہ نو سو روپے کا چیک کاٹ کر اسے دیا تو وہ حیران رہ گیا۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ یہ چیک اس کے نام لکھا گیا ہے۔ بڑی دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا اور پھر جیب میں رکھ لیا۔

وہ بینک گیا اور سو سو روپے کی نو گڈیاں لے کر گھر آگیا۔ تازہ کرارے چمکدار نوٹ۔ اس نے ان نوٹوں کو حفاظت سے رکھا اور ممتاز مفتی کی تلاش میں نکل گیا۔ ایک جگہ اس نے انہیں ڈھونڈ نکالا۔ ''مفتی کل تم میرے گھر آنا۔ بہت ضروری کام ہے۔''

''خیریت تو ہے؟ کل تک میں کیسے صبر کروں گا۔ ابھی بتا دو کیا کام ہے۔''

''نہیں ہر کام وقت پر اچھا لگتا ہے۔ بس تم کل آجانا۔''

دوسرے دن مفتی اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ اسے لے کر کمرے میں بچھی ہوئی دری پر بیٹھ گیا۔ اس کی حرکتیں اتنی پُراسرار تھیں کہ مفتی کو تشویش ہوگئی کہ بات کیا ہے۔

''مفتی میری بڑی آرزو تھی کہ یک مشت ایک ہزار روپے میرے ہاتھ میں آئیں۔ چودھری صاحب نے وہ آرزو پوری کر دی۔''

اس نے سو سو روپے کے نو پیکٹ کھولے پھر ان نوٹوں کو مٹھیوں میں بھر کر ہوا میں اڑانے لگا۔ اس وقت وہ ایسا بچہ لگ رہا تھا جس کے ہاتھ کاغذ کے کھلونے لگ گئے ہوں اور وہ ان کی اہمیت سے بے خبر ان سے کھیل رہا ہو۔

مفتی صاحب بڑی دیر تک یہ تماشا دیکھتے رہے اور اپنے ملک کے ادیب کی حالت پر افسوس کرتے رہے جس نے کبھی یک مشت ہزار روپے نہیں دیکھے تھے اور یہ معاوضہ بھی اس کی محنت پر نہیں ملا تھا بلکہ چودھری صاحب اس کی مدد کے خواہاں تھے اور اس طرح مدد کی تھی کہ اس کی خودداری کو ٹھیس نہ لگے۔

اس کی پذیرائی اس طرح ہوئی تھی کہ اسے خود بھی یہ شوق ہوا کہ وہ کتابیں لکھ کر پیسے کمائے۔ وہ ایک مرتبہ پھر تراجم کی طرف راغب ہو گیا۔

اس نے راج گوپال کی کتاب ''مسٹر جناح'' کا ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں راج گوپال نے قائداعظم کے خطوط جمع کیے تھے۔ ان میں ایسے خطوط بھی تھے جو کہیں اور شائع نہیں ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی تھی۔ باری نے اس کتاب کا ترجمہ اس وقت کیا تھا جب وہ شہباز میں کام کر رہا تھا۔

اس نے تزک بابری کا بھی اردو میں ترجمہ کیا اور بابر کی سوانح حیات کا خلاصہ اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرایا۔

اس دور کے ترجموں میں سب سے اہم ترجمہ فریڈرک اینگلز کا ترجمہ ہے جو اس نے ''سوشلزم'' کے عنوان سے کیا۔ باری نے اس کتاب کا ترجمہ اس مقصد سے کیا تھا کہ قارئین اشتراکی نظریات کے حامی مصنفین کی کتابوں کو

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

صحیح طرح سمجھ سکیں۔ اس نے اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا تھا۔

اس کتاب کے مفہوم سے واقف ہو جانے کے بعد کارل مارکس، فریڈرک، لینن، اسٹالن اور دوسرے سائنسی سوشلزم پر لکھنے والوں کی کتابوں کے سمجھنے میں کافی حد تک آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔''

اس ترجمے کو بھی چودھری نذیر احمد نے شائع کیا۔

☆......☆

کانگریس کے مشہور لیڈر ڈاکٹر ستیہ پال نے نیشنل کانگریس کے نام سے ایک اردو اخبار نکالا تھا۔ اس اخبار کا مقصد پنجاب میں کانگریس کی پالیسیوں کا پرچار اور فرقہ وارانہ ذہنیت کا مقابلہ کرنا تھا۔ منتظمین چاہتے تھے کہ اس اخبار کو ہندو اور مسلمان دونوں پڑھیں لہٰذا انہوں نے ادارۂ تحریر میں مسلمان اہل قلم اور ہندو اہل قلم دونوں کو شامل کرنا چاہا۔ ان کی نظر چراغ حسن حسرت پر پڑی۔ حسرت، ستیہ پال کو ایک متعصب آدمی سمجھتے تھے۔ پھر بھی ایک شناسا کے کہنے پر کہ ''اخبار کی ترتیب تمہارے سپرد ہوگی، جو چاہنا کرنا۔'' نیشنل کانگریس کے ادارے میں شامل ہو گئے۔ وہ اپنے ساتھ باری علیگ کو بھی لیتے گئے۔ دوسری طرف میلا رام وفا بھی تھے۔

باری اس ادارے میں شامل تو ہو گیا تھا لیکن کچھ دنوں بعد ہی اس اخبار کی پالیسی سے اختلاف ہونے لگا۔ یہی حال حسرت کا بھی تھا۔

یہ اخبار کہنے کو غیر جانبدار تھا لیکن اس میں کانگریس کے کارکنوں کی خبروں کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اخبار کے دفتر میں کانگریسی کارکنوں کا راج تھا۔ ہر علاقے کے کانگریسی چاہتے تھے کہ ان کے علاقے کی خبریں شائع ہوں اس بات پر ہی جھگڑے ہوتے تھے کہ اس کی بھینس چوری کی خبر شائع نہیں کی گئی۔ معمولی معمولی خبروں کے لیے ستیہ پال کے سفارشی رقعے چلتے تھے۔ سفارشی خبریں شائع ہو جاتی تھیں اور اہم خبریں رہ جاتی تھیں۔

یہ اخبار مکمل طور پر کانگریس کا ترجمان نہیں تھا بلکہ کانگریس کے دو دھڑے اس پر قابض تھے۔ یہ دو دھڑے آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ اراکین تحریر بڑی مصیبت میں تھے کہ کس دھڑے کی بات مانیں کس کی نہ مانیں۔ کون سی خبر شائع کریں کون سی نہیں۔

پابندیاں روز بروز بڑھتی جارہی تھیں۔ آزادی جس کر رہ گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسرت، باری اور حمید نظامی تینوں نے بہ یک وقت استعفیٰ دے دیا۔

مسلم اخباروں کے ساتھ ساتھ لاہور سے غیر مسلم روزنامے بھی نکلتے تھے جن میں نیشنل کانگریس بھی تھا اور روزنامہ ملاپ بھی۔ اس نے اپنے نظریات کے برخلاف محض معاشی ضروریات کی تکمیل کے لیے نیشنل کانگریس میں کام کیا اور ملاپ سے بھی منسلک ہوا۔ حالانکہ اس کا کہنا یہ تھا کہ مسلمان صحافی کو کسی بھی ایسے اخبار میں کام کرنے سے گریز کرنا چاہیے جس کی پالیسی اس کے ایمان اور عقیدے سے متصادم ہو۔

وہ ''ملاپ'' میں بہ حیثیت نیوز ایڈیٹر شامل ہو گیا لیکن اس کی پالیسی سے اسے اختلاف ہی رہا۔ یہ اخبار پرلے درجے کا فرقہ پرست تھا اور مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتا رہتا تھا۔

باری مارا باندھی ملاپ میں کام تو کر رہا تھا لیکن برابر اس کوشش میں تھا کہ اسے کہیں اور بہتر تنخواہ پر کام مل جائے۔ حسرت دلی جا چکے تھے جہاں آل انڈیا ریڈیو ان کا منتظر تھا۔ باری بھی اس تلاش میں تھا کہ وہ کسی طرح لاہور سے نکلے۔ اسے یہ موقع جلد ہی مل گیا۔

لاہور ہی سے تعلق رکھنے والے سید کشفی شاہ برما سے دو اردو اخبارات نکالتے تھے۔ ''شب رنگون'' اور ''مجاہد برما'' انہوں نے باری سے رابطہ کیا اور ان دو اخباروں کی ادارت کے لیے اسے برما بلوایا۔

برما ان دنوں ہندوستان کا صوبہ تھا۔ یہاں اردو زبان کا بڑا چرچا تھا، اردو داں طبقہ بھی وہاں بڑی تعداد میں آباد تھا۔ باری نے ان کی پیشکش قبول کر لی۔

وہ اس وقت بھی ملاپ کے دفتر میں بیٹھا اپنے کام میں مصروف تھا کہ سید کشفی شاہ کی طرف سے تار موصول ہوا کہ وہ فوراً برما چلا آئے۔ اسے تار پڑھ کر یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس کا کوٹ کھونٹی پر لٹکا ہے اور اخبار کی طرف اس کے کچھ پیسے بھی نکلتے ہیں۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ سگریٹ لینے کے لیے باہر نکلا اور برما پہنچ گیا اس کا زیادہ قیام ''رنگون'' میں رہا جو مختلف قوموں کا مسکن اور نہایت رنگین شہر تھا۔

یہ دونوں اخبار اپنی پالیسیوں میں آزاد تھے۔ انگریزوں کے خلاف انتہائی بے باکی سے اداریے لکھے جاتے۔ باری کے لیے یہ آئیڈیل صورت حال تھی۔ اس کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

www.paksociety.com

انگریز دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اس نے انگریزوں کے خلاف جی کھول کر اداریے لکھے۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ سے کئی مرتبہ اسے وارننگ ملی لیکن سید کشفی شاہ اس کے دفاع کے لیے موجود تھے۔

باری نے کچھ دنوں کے بعد اپنی شریک حیات کو بھی برما بلا لیا لیکن ابھی دو مہینے ہی گزرے تھے کہ جاپان کی فوجیں برما میں داخل ہو گئیں اور بمباری شروع ہو گئی۔ باری اس وقت رنگون میں مقیم تھا۔ جاپان کی فوجیں رنگون کی طرف پیش قدمی کر رہی تھیں۔ باری سخت خوفزدہ تھا۔ تمام راستے بند ہو گئے تھے۔ برما سے نکلا جائے تو کیسے۔ یوپی اور پنجاب کے بہت سے لوگ رنگون میں مقیم تھے۔ خود اخبار کے ملازمین میں سے بہت سے لوگ تھے۔ کچھ لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ ہندوستانیوں کے بہت سے پیدل قافلے جنگلوں کو عبور کر کے برما سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اخبار کے چند ساتھیوں کے ہمراہ اس نے بھی بیوی کو ساتھ لیا اور ارکان کے بھیانک جنگلوں میں اتر گیا۔ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ وہ کون سی گھڑی تھی جب وہ برما آیا تھا۔ یہ جنگلات طرح طرح کے جانوروں سے آباد تھے اور ایسے گھنے کہ دن میں اندھیرا ہو۔ بہرحال ایک دشوار گزار سفر کے بعد وہ چٹا گاؤں پہنچا۔ وہاں سے کلکتہ اور پھر لاہور آ گیا۔

ایک مرتبہ پھر وہ دشت صحافت کی سیر کو نکلا۔ اس مرتبہ حکومت کا اخبار ہفت روزہ ''پنچایت'' اس کا منتظر تھا۔ ان دنوں پنچایت کے مدیر کی آسامی خالی تھی۔ بہت سے لوگوں نے درخواستیں جمع کرائیں۔ اس نے بھی دوستوں کے کہنے پر درخواست جمع کرا دی۔

درخواستیں اتنی جمع ہو گئی تھیں کہ اُمیدواروں کا امتحان لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ باری امتحان دینے پر تیار نہیں تھا۔

''میں لاہور سے نکلنے والے تقریباً تمام اخبارات میں امتحان دے چکا ہوں۔ میری کارکردگی حکومت کے سامنے ہے۔ میری تصنیفات میری گواہ ہیں۔ اب بھی میرا امتحان مقصود ہے؟''

دوستوں نے سمجھا بجھا کر اسے امتحان دینے پر تیار کر لیا۔

جب تمام اُمیدوار جمع ہو گئے تو میز پر ڈکشنری رکھ دی گئی اور پرچہ دے دیا گیا۔ پرچہ کیا تھا اور اشارہ مرتب کرنا تھا۔ اداریہ، خصوصی کالم، جنگ پر ہفت روزہ تبصرہ، مضمون، دو پیرا گراف نہایت مشکل انگریزی میں تھے جن کا ترجمہ کرنا تھا۔

شرکا میں کئی مانے ہوئے صحافی اور ادیب تھے۔ ان میں باری علیگ بھی تھا۔

پرچہ دیکھتے ہی کئی صحافی و ادیب اٹھ کر چلے گئے۔ چند رہ گئے جن میں باری بھی تھا۔ پرچہ ایسا طویل تھا کہ اسے حل کرنے اور اس کے معیار کے مطابق پرچہ مرتب کرنے میں بارہ گھنٹے لگ گئے۔

اخبار جسے مرتب کرنے میں کئی لوگ شریک ہوتے ہیں یہاں ایک امیدوار سے مرتب کرایا جا رہا تھا۔ وہ بھی کئی دنوں میں تقسیم نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایک ہی نشست میں مکمل کرنا تھا۔ اداریہ بھی لکھنا تھا۔ خصوصی کالم بھی تحریر کرنا تھا، تبصرہ بھی لکھنا تھا۔ مضمون بھی تھا اور ترجمے کی مہارت بھی دکھانی تھی۔

باری سگریٹ کے کش لیتا رہا اور پرچہ حل کرتا رہا۔ بارہ گھنٹے کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد وہ یہ ثابت کر چکا تھا کہ وہ ذہین بھی ہے، محنتی بھی ہے، ترجمے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ صحافت کے مختلف شعبوں پر یکساں قدرت رکھتا ہے۔

اس امتحان میں باری اوّل آیا اور پنچایت جیسے بڑے اخبار کی کرسیٔ ادارت پر جلوہ گر ہو گیا۔

زندگی قدرے آرام سے گزرنے لگی۔

قصوری خاندان کی مہربانی سے اسے پرانی انارکلی میں ایک مکان مل گیا۔

مستقل ٹھکانا ہو گیا تو اس کے قلم نے پھر جنبش کی۔

اسے تاریخ سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ ''کمپنی کی حکومت'' لکھ کر اس نے خود کو مؤرخ ثابت کر دیا تھا۔ سوانح بھی تاریخ کی ایک شاخ ہے لیکن بعض خصوصیات کی وجہ سے اس کا شمار ادب میں بھی کیا جاتا ہے۔ باری ادیب بھی تھا اور مورخ بھی لہٰذا اس نے تاریخ کو ادب میں مدغم کرنے کی بھی کوشش کی۔ ایسی کوشش جس سے اس کے اندر چھپے ہوئے ادیب کی بھی تشفی ہو سکے اور مورخ کی بھی۔ اب تک وہ ترجمہ نگاری میں اپنے فن کا لوہا منوا چکا تھا۔ تاریخ کو بھی ہاتھ لگا چکا تھا۔ اب اس نے کارل مارکس کی سوانح لکھنی شروع کی۔ شخصیت کا انتخاب فن سوانح نگاری کا پہلا اصول ہے۔ باری علیگ، اشتراکیت پسند تھا لہٰذا جدید اشتراکیت کے بانی کارل مارکس سے بہت متاثر تھا۔ اس سے پہلے وہ کارل مارکس کے لکھے ہوئے اشتراکی منشور کا ترجمہ بھی کر چکا تھا۔ اب وہ کارل

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

مارکس کی سوانح لکھنا چاہتا تھا تا کہ لوگ اس کے فلسفے سے نہیں اس کی زندگی سے واقف ہوسکیں۔

کارل مارکس سے نمٹتے ہی شبلی نعمانی کی سیرت النبی اور قاضی محمد سلیمان کی تصنیف ''رحمت اللعالمین'' اس کے زیرِ مطالعہ آ گئیں۔ جن دوستوں کو معلوم تھا کہ وہ آج کل کن کتابوں کا مطالعہ کر رہا ہے۔ وہ حیران تھے کہ اس میں ایسی کیا تبدیلی آ گئی۔ اس کی بیوی زینت بی بی بار بار اس کی لکھنے کی میز کی طرف آتی تھی اور دیکھتی تھی کہ اس کی میز پر اسلامی کتب کی تعداد بڑھتی جا رہی ہیں۔ زینت بی بی نے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی اور پھر ایک ادیب کی بیوی تھی۔ کتابوں کی تبدیلی سے نیت کی تبدیلی کو تو بھانپ ہی سکتی تھی آخر ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔

''باری صاحب، آپ کی میز پر تو میں مارکس اور لینن کی کتابیں دیکھا کرتی تھی۔ اب اسلامی کتابیں دیکھ رہی ہوں۔ اتنا تو میں مانتی ہوں کہ آپ ایک پکے مسلمان ہیں لیکن اس ظاہری تبدیلی کا سبب سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''زینت، میرا دماغ اشتراکی تھا لیکن دل مسلمان تھا۔ اب دماغ نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے۔''

''اس کی بھی تو کوئی وجہ ہوگی مسعود کے ابا۔''

''میں اس لیے اشتراکیت کے قریب گیا تھا کہ اشتراکیت نے سرمایہ دارانہ نظام کو چیلنج کیا ہے۔ میں بنیادی طور پر استحصال کے خلاف ہوں اور انسان کی آزادی پر یقین رکھتا ہوں بس اسی لیے اشتراکیت کے قریب گیا تھا۔ خود کو اشتراکی ادیب لکھتا تھا۔ لوگ مجھے اشتراکی ادیب ہی سمجھتے ہیں۔''

''میں تو آپ کو ادیب ہی سمجھتی ہوں۔ نہ مسلمان نہ اشتراکی۔''

''جو مجھ سے محبت کرے گا وہ یہی سمجھے گا لیکن سب تو محبت نہیں کرتے۔ مجھ پر جو اشتراکی ہونے کی چھاپ لگ گئی ہے۔ اسے ختم کرنے کے لیے حضور اکرمؐ کی سوانح، محمد عربیؐ کے نام سے لکھ رہا ہوں۔''

''میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ میں وجہ کائنات کی سیرت مقدسہ پر بھی اپنے قلم کو جنبش دوں کیونکہ یہ میرے ایمان کا حصہ ہے اور دنیا و آخرت میں میرے لیے سرخروئی کا باعث ہے۔ لوگ مجھے ترقی پسند اور اشتراکی نظریات کا حامی سمجھتے ہیں اور میں اس سے انکار نہیں کرتا لیکن اب میں اس نتیجے پر بھی پہنچ چکا ہوں کہ اسلامی نظام معیشت ہی تمام مسائل کا حل ہے۔''

اس نے مکمل چھان بین اور تحقیق و جستجو کے بعد سیرت النبیؐ کے موضوع پر اپنی کتاب محمد عربیؐ لکھنے کا آغاز کر دیا۔ وہ معروف معنی میں عالم دین نہیں تھا اور نہ کوئی طویل و مفصل سیرت کی کتاب مرتب کرنے کی نیت تھی لہٰذا جب کتاب مکمل ہوئی اور شائع ہوئی تو اسے 75 صفحات کا کتابچہ کہا جاسکتا تھا۔ انقلاب فرانس اور کارل مارکس کے مصنف سے اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ قابل چیز تو یہ تھی کہ یہ ایسا اختصار نہیں تھا جس سے سطحیت ٹپکے۔ اختصار کے باوجود آپؐ کی حیاتِ مقدسہ کے تقریباً ہر پہلو کا احاطہ کرتی تھی۔ آپؐ کی زندگی کے اہم واقعات کو مکمل تحقیق اور چھان بین کے بعد انتہائی دلکش اور سادہ اسلوب میں بیان کیا گیا تھا۔

اس کتاب کا اختصار پیاس نہیں بجھنے دیتا تھا لیکن باری کو اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ جو لوگ اسے اس کے نظریات کی بدولت اشتراکی سمجھتے تھے اور اشتراکی کا مطلب مذہب کا باغی سمجھتے تھے۔ ان کے منہ بند ہو گئے۔

اس کتاب ہی کی برکت تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے خیالات میں تبدیلی آ گئی تھی اور اس نے ہمیشہ کے لیے اشتراکیت سے پیچھا چھڑا لیا۔

اس کی وفات کے بعد بھی یہ بحث چلتی رہی کہ باری اشتراکی تھا یا نہیں۔

☆......☆

اس کی زندگی میں لاہور کے عرب ہوٹل کی بڑی اہمیت تھی۔ اپنی تخلیقات میں سے اکثر کے خاکے اس نے اسی ہوٹل میں بیٹھ کر ترتیب دیے لیکن رنگون سے آنے کے بعد عرب ہوٹل کے پھیروں میں کمی آ گئی۔ چراغ حسن حسرت دلی چلے گئے تھے جو عرب ہوٹل کے روحِ رواں تھا۔ اب وہاں بیٹھنے کا لطف جاتا رہا تھا۔ باری اب پرانی انارکلی میں رہنے لگا تھا۔ عرب ہوٹل وہاں سے دور پڑتا تھا۔ اس نے نگینہ بیکری میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ یہ ہوٹل کم بلکہ چائے کی ایک مختصر سی دکان تھی جس میں بہ مشکل دس بارہ آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ ایک نیم تاریک سا سرنگ نما کمرا تھا۔ یہی کمرا رفتہ رفتہ علم و ادب کا گہوارہ بن گیا۔ باری نے وہاں بیٹھنا شروع کیا تو کئی بڑے بڑے ادیب وہاں بیٹھنے لگے۔ اس کے مالک بجنور کے قصبہ نگینہ کے رہنے والے تھے جو لاہور آ گئے تھے اور اپنے قصبے کی یاد میں انہوں نے بیکری کا کام شروع کر دیا اور اپنے قصبے کی یاد میں ایک چائے خانہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کھولا اور اس کا نام نگینہ بیکری رکھا۔

مولانا صلاح الدین بھی باری علیگ کی وجہ سے روز آنے لگے۔ دوسرے ادیب بھی روز نہیں تو ہفتے میں دو ایک بار یہاں ضرور تشریف لاتے۔

یہاں کانگریسی اور مسلم لیگی دونوں آتے تھے۔ سیاسی مناظرے ہوتے تھے۔ ادبی بحثیں ہوتی تھیں۔ باری یہاں کا روحِ رواں بنا ہوا تھا۔

شادی سے پہلے اس کی گریز پائی اور آوارگی عروج پر تھی لیکن شادی کے بعد وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے لگا تھا۔ اسے کسی جگہ جم کر کام کرنے کی عادت نہیں تھی لیکن اب ملاپ میں بڑی باقاعدگی سے کام کر رہا تھا۔ گھر سے باہر عظیم دانش ور، ادیب اور صحافی تھا لیکن گھر میں داخل ہوتے ہی مخلص شوہر اور شفیق باپ کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ اس کی اس تبدیلی میں اس کی بیوی کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ عسرت اور تنگدستی کے باوجود کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتیں۔ انہیں اگر فخر تھا تو یہ کہ ان کا شوہر ادیب ہے۔ باری اس اعتبار سے خوش قسمت تھا کہ اسے ایسی بیوی ملی تھی ورنہ وہ اس بلندی پر نہ پہنچتا جس پر پہنچ گیا تھا۔ جواب میں وہ بھی اسی سلوک کا مظاہرہ کرتا۔

ابتدا میں زینت بی بی کو اس کے معمولات کا علم نہیں تھا۔ وہ شام کو گھر سے نکلا اور رات گئے تک گھر نہ آیا۔ زینت بی بی نے یہ سوچ کر دروازہ لگا لیا کہ جب وہ آئیں گے تو دروازہ کھول دوں گی۔ رات گزر گئی زینت بی بی نے دیکھا تو بستر خالی تھا۔ اس نے یہی سوچا کہ رات کو باری آئے ہی نہیں ہیں۔ وہ کسی کام سے دروازے تک گئی۔ باری سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے سو رہا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئیں۔ میں ایسی بے خبر سو گئی تھی کہ دروازہ ہی نہیں کھولا۔ میں آرام سے سوتی رہی اور وہ باہر سیڑھیوں پر۔ انہوں نے باری کو جگایا اور انہیں اندر لے کر آئیں۔

''مجھے معاف کر دیں۔ آپ کھٹکھٹاتے رہے ہوں گے اور میں سوتی رہی۔''

''معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔ میں جس وقت آیا تھا وہ شریفوں کے گھر آنے کا وقت نہیں تھا۔''

''آپ کی مصروفیات ہی ایسی ہیں۔ آپ دروازہ کھٹکھٹا لیتے۔''

''میری تو خیر مصروفیات ایسی ہیں لیکن آپ تو دن بھر کے کام کاج سے تھک کر سو گئی ہوں گی۔ میں اگر کھٹکھٹاتا تو یقیناً آپ کی نیند میں خلل ڈالتا، بچے بھی جاگ جاتے، محلے والے الگ پریشان ہوتے کہ اتنی رات گئے کون دروازہ پیٹ رہا ہے۔ چند گھنٹوں کی تو بات تھی میں باہر ہی سو گیا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''آپ کو نہ پڑے مجھے تو فرق پڑتا ہے۔ میں آئندہ دروازہ بند نہیں کیا کروں گی۔ آپ جس وقت آئیں گے دروازہ کھلا ہوا ملے گا۔ آس پڑوس بہت اچھا ہے چوری چکاری کا کوئی ڈر نہیں ہے۔''

اس کے بعد وہ جب بھی آتا، دروازہ کھلا ہوتا تو چپکے سے جا کر سو جاتا۔ اگر اتفاق سے بند ہوتا تو باہر سیڑھیوں پر ہی سو جاتا یا دوبارہ نگینہ بیکری پہنچ جاتا جہاں بے فکروں کے قہقہے اسے جاگنے میں مدد دیتے۔

☆......☆

پنچایت نام کا اخبار پنچایتی نظام کا ترجمان تھا۔ اس نظام کے تحت ایک خصوصی قانون کے ذریعے پنجاب بھر کے دیہات میں پنچایتیں قائم کی گئی تھیں۔ ارکان کو پنچ کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد ہر پنچایت کے ارکان اپنے میں سے ایک صدر کو چن لیتے تھے جسے سرپنچ کہا جاتا تھا۔ پنچایتوں کو از روئے قانون عدالتی اور انتظامی اختیارات حاصل تھے۔

ہفت روزہ ''پنچایت'' کے فرائض یہ تھے۔ پنچایتوں کی تعمیری سرگرمیوں کا عکاس بنے۔ سرپنچوں کو قانون کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرتا رہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں دیہاتی عوام کی رہنمائی کرے۔

باری علیگ نے اس پرچے کو معلوماتی بنانے کے لیے پنچایتوں سے ہٹ کر بھی خبریں اور مضامین شائع کرنے شروع کیے۔ ان میں جنگ عظیم دوم کے حالات و واقعات، کاشت کاروں کے لیے معلوماتی مضامین، باغبانی کے متعلق مشورے، سائنسی معلومات پر مبنی فیچر شامل تھے۔

اس کا کالم ''گردوپیش'' اس کی پہچان بن گیا تھا جس اخبار میں جاتا تھا اپنا کالم ''گردوپیش'' ساتھ لے کر جاتا تھا۔ پنچایت میں بھی اس نے یہ کالم شائع کرنا شروع کر دیا۔ اس کالم کے تحت ہفتہ بھر کی خبروں کا خلاصہ پیش کیا جاتا تھا۔

پنچایت میں آنے کے بعد قدرے فراغت ملی اور سرکاری اخبار ہونے کی وجہ سے وقت پر تنخواہ ملنے لگی تو وہ ایک مرتبہ پھر تصنیف و تالیف کے شغل میں مشغول رہنے لگا۔ سگریٹ تھی کہ ہاتھ سے چھوٹی نہیں تھی۔ شراب نوشی بھی

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کثرت سے کرنے لگا تھا۔ راتوں کو جاگنا تو اس کی زندگی بھر کا معمول تھا۔ یہ چیزیں آہستہ آہستہ اس کی صحت پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ لاابالی ایسا تھا کہ نہ خود پروا کرتا تھا نہ ڈاکٹروں کو زحمت دیتا تھا۔

پنچایت کی ملازمت کے دوران اس نے کئی کتابوں پر کام کیا کئی تراجم کیے۔ کچھ کتابیں شائع ہوئیں کچھ مسودے میز کی دراز میں بند ہو گئے۔ اس کے مرنے کے بعد شائع ہوئے۔

☆......☆

وہ یہ سوچ کر ہفت روزہ پنچایت میں آگیا تھا کہ وقت پر تنخواہ ملے گی لیکن یہ نہیں سوچا کہ یہ پرچہ اس کے ذہنی مزاج کے خلاف ہے۔ وہ سیاسی ادیب تھا اور پنچایت میں سیاست شجرِ ممنوعہ تھی۔ اس کے باوجود وہ یہاں جما رہا۔ کئی سال گزار دیے۔ اس کی صحت بھی اب اجازت نہیں دے رہی تھی کہ ستاروں پر کمندیں ڈالتا رہے لیکن جب پنچایت کے وہ ڈائریکٹر تبدیل ہو گئے جو اسے پسند کرتے تھے اس تبدیلی کے بعد اس کا وہاں رہنا دوبھر ہو گیا۔ اس نے استعفیٰ دے دیا اور سکھوں کے اخبار ''اجیت'' میں چلا گیا۔

سیاسی حالات نہایت تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ قراردادِ پاکستان پیش کی جا چکی تھی۔ نفرتیں اور تعصب بڑھتا جا رہا تھا۔ انگریز حکومت حالات میں تبدیلی کے لیے طرح طرح کی تبدیلیاں لا رہی تھی۔

پاکستان کے قیام سے تقریباً دو سال پہلے حکومت پنجاب کے ہوم سیکریٹری نے ایک نیا محکمہ تعلقاتِ عامہ کے نام سے بنانے اور انفارمیشن بیورو کو اس میں مدغم کر کے جملہ اخبارات و رسائل کی جگہ ایک باتصویر ہفت روزہ ''ہمارا پنجاب'' کے نام سے جاری کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس تجویز کی بڑے پیمانے پر مخالفت ہوئی لیکن اس پر عمل ہو کر رہا۔ ''ہمارا پنجاب'' جاری ہو گیا اور پنچایت کو حکماً بند کر کے ہمارا پنجاب میں ضم کر دیا گیا۔

اس ہفت روزہ کے لیے چیف ایڈیٹر کی ضرورت تھی۔ ایڈیٹر مولانا تاجور نجیب آبادی اور اسسٹنٹ ایڈیٹر عبدالسلام خورشید تھے۔ ایک دن ڈائریکٹر تعلقات عامہ اسماعیل پرویز نے عبدالسلام خورشید کو اپنے آفس میں طلب کیا۔

''خورشید صاحب آپ کو معلوم ہے اس وقت چیف ایڈیٹر لالہ اجیت رائے نیر ہیں۔''

''مجھ سے زیادہ کس کو معلوم ہوگا۔'' خورشید صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں ان کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں لیکن لکھنے لکھانے کا زیادہ تجربہ نہیں۔ میں اس عہدے پر کسی منجھے ہوئے صحافی کو لانا چاہتا ہوں۔ اس معاملے میں آپ میری مدد فرمائیں اور کوئی کام کا آدمی مجھے دیں۔''

''میری نظر میں تو لاہور بھر میں ایک باری علیگ ہی ہیں۔ ''پنچایت'' کے چیف ایڈیٹر تھے۔ آج کل ''اجیت'' میں ہیں درجن بھر کتابوں کے مصنف ہیں۔ ''احسان'' میں بھی رہ چکے ہیں برما اور رنگون تک ہو کر آچکے ہیں۔ بس یوں کہیے کہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے ہیں۔ انگریزی، اردو، پشتو، برمی، فرانسیسی زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ بہترین مترجم ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ نوجوان آدمی ہیں۔''

''میں ان کی اتنی خوبیوں سے تو واقف نہیں تھا البتہ نام ضرور سن رکھا ہے بلکہ ''کمپنی کی حکومت'' کے ذریعے میرا ان سے بھرپور تعارف ہے۔ آپ انہیں کسی روز میرے پاس لائیں۔ انٹرویو کی غرض سے میں ان سے گفتگو کے بعد ہی کوئی فیصلہ کروں گا۔''

''اگر وہ آج مجھے مل گئے تو کل ہی میں انہیں آپ کے پاس بھیج دوں گا۔''

''ان سے یہ نہ کہیے گا کہ آپ کا انٹرویو ہوگا۔ ایسے لوگ ذرا ٹیڑھے دماغ کے ہوتے ہیں، کہیں برا ہی نہ مان جائیں کہ اب اتنے کام کرنے کے بعد انٹرویو بھی ہوگا۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ میں انہیں انٹرویو کی تو ہوا بھی نہیں لگنے دوں گا۔''

باری کو ڈھونڈنا کون سا مشکل تھا۔ ''اجیت'' کے دفتر میں مل سکتا تھا یا نگینہ بیکری میں۔ وہ نگینہ بیکری میں مل گیا۔ عبدالسلام خورشید نے مطلب پر آنے سے پہلے باری کو ادھر ادھر کی باتوں میں لگایا۔

''باری صاحب، کہیے ''اجیت'' میں کیسی گزر رہی ہے۔''

''گزر نہیں رہی ہے گزار رہا ہوں۔ میں نے تو اب دوسروں کو برا کہنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ میرا ذہن کسی سے ملتا ہی نہیں۔ ظاہر ہے سب تو بُرے نہیں ہو سکتے۔ مجھ میں ہی کوئی خامی ہے کہ کہیں ٹکتا ہی نہیں۔ حالات تم دیکھ رہے ہو۔ اجیت چھوڑ کر جاؤں تو جاؤں کہاں۔ بس پڑا ہوا ہوں۔ ڈیڑھ سو روپے دے کر مالکان سمجھتے ہیں باری کو خرید لیا ہے۔ تصنیف و تالیف کے دامن میں بھی پناہ لے کر دیکھ لی۔ پبلشرز بھی میری تنگدستی کا مذاق ہی اڑاتے رہے ہیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''میں نے آپ کے لیے ''ہمارا پنجاب'' میں بات کی ہے۔ سرکاری اخبار ہے تنخواہ وقت پر ملا کرے گی۔ ڈائریکٹر تعلقات عامہ اسماعیل پرویز ہیں ادیبوں کے قدر دان ہیں۔ مجھے یقین ہے ان سے آپ کی نبھ جائے گی۔''

''مولانا تاجور جیسے لوگ وہاں موجود ہیں۔ مجھے کون پوچھے گا۔ وہاں بھی مجھے کون ٹکنے دے گا۔''

''آپ کا تقرر بطور چیف ایڈیٹر ہوگا۔ آپ سے جواب دہی کرنے والا کون ہوگا۔ تنخواہ بھی ''اجیت'' سے دوگنی تین گنی ہوگی۔ میری بات رکھ لیجیے اور کل کسی وقت اسماعیل پرویز صاحب سے مل کر دیکھ لیجیے۔ میں نے آپ کی بہت تعریف کر دی ہے۔ آپ کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔''

باری سوچ میں پڑ گیا اور پھر وعدہ کر لیا کہ وہ ڈائریکٹر صاحب سے مل لے گا۔

باری نے دوسرے روز اسماعیل پرویز سے ملاقات کی۔ گفتگو کرنے کا وہ بادشاہ تھا۔ اس کی لچھے دار باتیں اچھے اچھوں کو متاثر کر دیا کرتی تھیں۔ باری نے انہیں متاثر کر لیا۔

وہ ان کے دفتر سے باہر نکلا تو اس کا سیاہ رنگ عنابی ہو رہا تھا۔ اسے چار سو روپے ماہانہ پر چیف ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا تھا جب کہ ''اجیت'' میں اسے ڈیڑھ سو روپے مل رہے تھے۔ وہاں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا یہاں چیف ایڈیٹر بن گیا۔

اس نے کیلاش ہوٹل کی چھت پر بنے ہوئے ''بار'' میں ہم مشرب دوستوں کو مدعو کیا۔ نئی ملازمت کا جشن منایا اور دوسرے دن ''ہمارا پنجاب'' میں دفتر سنبھال لیا۔

یہ 1946ء کا زمانہ تھا۔ قیام پاکستان کی گھڑیاں قریب آ رہی تھیں۔

باری نے ادارت سنبھالتے ہی پرچے کو سنوارنے کا کام شروع کر دیا۔ اس نے اس اخبار میں دلچسپی کے اتنے سامان جمع کر دیے کہ سرکاری اخبار ہونے کے باوجود اس کی اشاعت بیس ہزار تک پہنچ گئی۔

اس نے اسی فارغ البالی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند تصنیفات پر کام شروع کر دیا۔ دراصل وہ خالص ادبی نوعیت کا کوئی کام کرنا چاہتا تھا لیکن تلاش معاش نے اس کو یہ فرصت کبھی دی ہی نہیں۔ کہیں جم کر کام کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ زیادہ تنخواہ کی آرزو میں ایک اخبار سے دوسرے اخبار کے چکر کاٹتا رہا۔ ہمارا پنجاب میں آنے کے بعد اسے کچھ خوش حالی نصیب ہوئی تو اس نے مختلف مسودوں پر کام

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ستمبر 2016ء کے شمارے کی
ستم گر کہانیاں، پر تجسس داستانیں

اولین صفحات پر **کاشف زبیر** کی یادگار تحریر۔ **فتنہ**

طاہر جاوید مغل کے قلم سے سلگتے، لہو کو گرماتے...... **انگارے**

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے **آوارہ گرد** کی شہ زوریاں اور آوارہ گردیاں

اس کے علاوہ

تنویر ریاض، سلیم انور، جمال دستی،
منظر امام اور عکس فاطمہ کی دل ربا، چلبلی اور دلچسپ
کہانیاں، کھٹی میٹھی محفل، تبصرے، حکایتیں، لطیفے، اور بہت کچھ

سرورق کی رنگ
شبنم شفیق
اور **مختار آزاد** کے رنگ

اپنے ہاکر سے آج ہی اپنی کاپی محفوظ کرا لیں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | PAKSOCIETY

www.paksociety.com

شروع کرادیا۔
اس نے ایک کتاب ''معاشیات کا مطالعہ'' کے نام سے لکھنی شروع کی۔ جس وقت وہ یہ کتاب لکھ رہا تھا اس وقت معاشیات کے بارے میں اردو میں بہت کم لٹریچر دستیاب تھا۔ باری نے نہایت عرق ریزی سے اس کتاب کو مرتب کیا اور اس کی اہمیت کو واضح کیا۔

''کچھ مدت پہلے یار لوگوں نے زندگی، روشنی اور صفائی کے مطالعے کو شہریت کی اساس قرار دیا تھا لیکن آج شہری بننے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کسی نہ کسی حد تک معاشیات سے بھی واقف ہو۔ معاشیات کے مطالعہ کی اہمیت بڑھتی چلی جارہی ہے کیونکہ یہ رسم عام ہورہی ہے کہ ماحول کی ہر چیز کو خواہ وہ بظاہر معیشت سے کوسوں دور ہو جائیں زاویہ نگاہ ہی سے دیکھا جائے گا۔''

خوش قسمتی سے یہی کتاب اس کی زندگی ہی میں شائع ہوگئی۔

وہ اسلامی تاریخ وتہذیب پر ایک مستند اور جامع کتاب لکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے وہ برسوں سے مطالعہ کررہا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ کئی جلدوں میں وہ ہر دور کی عالمی تاریخ و تہذیب کا جامع تنقیدی جائزہ نہیں کرے گا یہ کام طویل بھی تھا اور تحقیق طلب بھی۔ فرصت کم تھی اور کام زیادہ۔ جب بھی موقع ملتا وہ اس موضوع پر کچھ نہ کچھ صفحات لکھ کر محفوظ کرلیتا۔ یہ منصوبہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ موت نے اس کے ہاتھ سے قلم چھین لیا۔ اس کی موت کے بعد ادھورا مسودہ شائع ہوا۔

کتاب میں جو ابواب مقرر کیے گئے ہیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ یہ کام مکمل کرلیتے تو ایک نیا باری دریافت ہوتا جو اشتراکی نہیں اسلامی ادیب ہوتا۔ جوروس کے گن نہ گارہا ہوتا بلکہ یہ کہتا نظر آتا کہ اسلام نے صرف عربوں کی ہی نہیں نوع انسانی کی کایا پلٹ کررکھ دی۔

وہ بہت پہلے اشتراکیت کی چھاپ سے آزادی حاصل کرچکا تھا۔ یہ کتاب اگر مکمل ہوجاتی تو یہ داغ ہمیشہ کے لیے دھل جاتا۔

☆......☆

سیاسی اعتبار سے 1946ء کا سال نہایت ہنگامہ پرور تھا۔ یہی وہ سال تھا جب باری ''ہمارا پنجاب'' کا چیف ایڈیٹر مقرر ہوا۔

پنجاب میں مسلم لیگ نے کامیابی حاصل کی لیکن مسلم لیگ کی بجائے کولیشن کی وزارت بن گئی۔ پھر برطانیہ کی طرف سے وزارتی مشن تصفیہ کی نئی اسکیم لے کر آیا جو تین وزیروں پر مشتمل تھا۔

اس مشن نے مختلف سیاسی جماعتوں سے گفت وشنید کی اور تجویز پیش کی۔

ہندوستان کے صوبوں اور ریاستوں کی ایک یونین قائم کی جائے جس کے سپرد دفاع، امور خارجہ اور خزانہ ہوں۔ صوبوں کو کامل اندرونی خود مختاری دی جائے۔

اس تجویز میں چونکہ مطالبہ پاکستان کی تکمیل نہ ہوتی تھی اس لیے مسلمانوں نے مسترد کردیا۔ مسلم لیگ نے راست اقدام کا عزم کرلیا۔

مسلم لیگیوں نے خطابات ترک کرنے شروع کردیے۔

راست اقدام کا نام سنتے ہی ہندوؤں کے کان کھڑے ہوگئے اور انہوں نے مسلمانوں سے لڑنے کا عزم کرلیا۔ پہلے کلکتہ میں فساد ہوا اور پھر کئی دوسرے علاقے فسادات کی آگ میں جلنے لگے۔ ہزاروں جانوں کا نقصان ہوا اور حالات اس مقام پر پہنچ گئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا یکساں زندگی بسر کرنا غیر ممکن ہوگیا اور پاکستان کا قیام شرط حیات قرار پایا۔

کابینہ مشن مایوس ہوکر واپس چلا گیا اور ہندوستان میں ایک عبوری وزارت قائم کردی گئی جس میں کانگریس اور لیگ کو نمائندگی دی گئی۔

باری ابھی دفتر جانے کی تیاری کرہی رہا تھا کہ ریڈیو پر اس نے وزیراعظم برطانیہ کی طرف سے یہ اعلان سنا کہ حکومت برطانیہ عنقریب اختیارات حکومت ہندوستانیوں کی طرف منتقل کرنے والی ہے۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''خدا خیر کرے۔''

دفتر جانے سے پہلے اس نے نگینہ بیکری کا ایک پھیرا لگانا ضروری سمجھا۔ وہاں بھی اس اعلان پر تبادلہ خیال ہورہا تھا۔ کچھ لوگ خوش تھے پچھ کو یہ تشویش ہورہی تھی کہ یہ اعلان ہندوؤں کو بہ آسانی ہضم نہیں ہوگا۔

باری کی سیاسی بصیرت جو کچھ دیکھ رہی تھی وہی ہوا۔ لاہور اور دوسرے مقامات پر ہندوؤں اور سکھوں کے متحدہ جلسے ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے فرقہ وارکشیدگی انتہا کو پہنچ گئی۔ صوبے بھر میں فسادات شروع ہوگئے۔ راولپنڈی شہر اور مضافات میں ہولناک خونریزی ہوئی۔ دوسرے مقامات میں سے امرتسر میں ہندوؤں اور سکھوں نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

www.paksociety.com

قیامت مچادی۔

ایک دن شہر کی بری حالت تھی۔ عبدالسلام خورشید باری کو لینے آئے اور گشتم پشتم دفتر (ہمارا پنجاب) تو پہنچ گئے لیکن واپسی خطرے سے خالی نہیں تھی۔ باری کو نہ جانے کیا سوجھی کہ کافی ہاؤس جانے کی ضد کرنے لگا۔ عبدالسلام خورشید نے لاکھ سمجھایا کہ اس وقت گھر کے سوا کہیں اور جانا دانش مندی نہیں لیکن جب وہ ایک مرتبہ ضد پر آجائے تو کسی کے سمجھائے نہ مانتا تھا۔ وہ ایسے موقعوں پر ڈر جاتا تھا لیکن اس وقت دوسروں کی بزدلی پر ہنس رہا تھا۔

مال روڈ سنسان پڑا تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ راہ گیر بھی کوئی نظر نہ آتا تھا۔ کچھ دور آگے گئے تھے کہ ایک شخص گنڈیریاں بیچ رہا تھا۔ باری نے آگے بڑھ کر گنڈیریاں خرید لیں اور ایک قدرے نیچی دیوار پر دونوں بیٹھ کر گنڈیریاں کھانے لگے۔

''میں نے کہا تھا نا کہ خدا خیر کرے، دیکھ رہے ہو برطانوی وزیراعظم کا اعلان ہندوؤں کو ہضم نہ ہوگا۔ وہ سمجھ رہے ہیں اس طرح چھرے گھونپنے سے پاکستان بننے سے رک جائے گا۔''

''مولانا، لیکچر دینے کا یہ کون سا وقت ہے۔''

ابھی وہ کوئی جواب دینے نہ پایا تھا کہ ایک ہندو ڈرا سہما اس طرف سے گزرا۔ باری نے اسے بلایا تو وہ یہ سمجھا اور ٹھیک سمجھا کہ یہ لوگ اسے مار ڈالیں گے۔ وہ بھاگنے لگا۔

''پکڑلو جانے نہ پائے۔'' باری نے کہا اور بھاگ کر اسے پکڑ لیا وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

''مجھے مت مارو، مجھے مت مارو۔''

''ابے تجھے مار کون رہا ہے۔ ہمارے ساتھ بیٹھ کر گنڈیریاں کھا۔''

اس وقت تو جو بھی اس سے کہا جاتا وہ کرنے کو تیار ہو جاتا وہ گنڈیریاں کھانے لگا۔

''دیکھ بیٹا اسے کہتے ہیں ہندو مسلم اتحاد۔ مگر یہ بات سب کی سمجھ میں کہاں آتی ہے۔''

''آپ بڑے مہان ہیں۔''

''ہم تو مہان ہیں مگر جلدی سے یہاں سے نکل جا۔ کیا خبر کوئی مسلمان ہاتھ میں چھرا لیے اس طرف نکل آئے۔''

وہ اس وقت تک ان فسادات کو بھی غیر حقیقی سمجھ رہا تھا۔ اسے یہ دکھ ضرور تھا کہ اچانک ہندوؤں مسلمانوں کو کیا ہوگیا لیکن یہ بھی یقین تھا کہ جلد ہی دونوں قوموں کو عقل آجائے گی۔ یہ خوش فہمی اسے اب بھی تھی کہ جو ہندو بھاگ گئے ہیں واپس آجائیں گے۔

اس کی یہ خوش فہمی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ دفتر تک جانا بھی مشکل ہوگیا۔

اگست کے پہلے دو ہفتے قیامت کے تھے۔ فسادات اور آتش زنی کا دور دورہ تھا۔ امرتسر، لاہور دونوں شہروں میں امن و قانون ختم ہو چکا تھا۔ لاہور سے ہندو آبادی بھاگ رہی تھی۔ یہاں تک کہ شاہ عالمی دروازے کے اندرونی حصے کو آگ لگی اور ہندوؤں کے حوصلے بالکل ہی ٹوٹ گئے۔ امرتسر کے مسلمان بھی جب ہندوؤں کی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکے تو انہوں نے بھی لاہور کا رخ کیا۔

اس جیسا آوارہ مزاج بھی گھر میں دبکا بیٹھا تھا۔

جب فسادات کی آگ فرو ہوگئی تو وہ باہر نکلا۔ شہر کی صورت بالکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ ریلوے روڈ پر تمام اجنبی صورتیں نظر آرہی تھیں۔ سڑکوں پر ہزاروں لوگ مختلف چیزوں کے خوانچے لگائے بیٹھے تھے یہ سب مہاجرین تھے جن کا سب کچھ برباد ہوگیا تھا۔

وہ اپنے آنسو اپنے دل میں اتارتا ہوا نگینہ بیکری تک پہنچ گیا۔ یہاں بھی اداسی پہرہ دے رہی تھی۔ چند احباب بیٹھے تھے وہ بھی کسی بجھی ہوئی چنگاری کی طرح بیٹھ گیا لیکن جلد ہی چہکنے لگا۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں کون سا نظام ہو گا؟ بحث شروع ہوگئی۔

''ہمارا پنجاب'' بند ہو گیا تھا کیونکہ مغربی اور مشرقی پنجاب کی دونوں حکومتوں نے اسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ ایک مرتبہ پھر بے کاری کے دن کاٹنے لگا۔ اب اس کا ٹھکانا کافی ہاؤس تھا۔ اس کا پہلا نام انڈیا کافی ہاؤس تھا۔ قیام پاکستان کے بعد صرف کافی ہاؤس رہ گیا۔

اس بے کاری کے دور میں اس کی سگریٹ نوشی بہت بڑھ گئی۔ وہ اپنے ادھورے مسودوں کو جلد از جلد مکمل کر لینا چاہتا تھا۔ رات رات بھر جاگ کر تصنیف و تالیف میں مصروف رہنے لگا۔ اس نے دو کتابیں ''معاشیات کا مطالعہ'' اور ''تاریخ کا مطالعہ'' مرتب کر کے پبلشر کے حوالے کر دیں لیکن فسادات کی آگ نے سب کو جھلسا دیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی ابھی شروع ہی نہیں ہوئی۔ پبلشر نے بھی چند روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے اور یہ وعدہ کیا کہ ابھی تو حالات سازگار نہیں ہیں جب یہ کتاب شائع ہوگی باقی حساب اس وقت کر دیا جائے گا۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

مفلسی کا عفریت برہنہ ہو کر ناچ رہا تھا۔ وہ پریشان تھا کہ اب کیا ہوگا۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں ان کی تعلیم کا کیا ہوگا۔ دو وقت کی روٹی کہاں سے ملے گی۔ سوچتے سوچتے تھک جاتا تو کافی ہاؤس چلا جاتا لیکن کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔ وہ اب پہلے جیسا باری نہیں رہا تھا۔ اس کی شوخیاں فسادات کی آگ میں جل گئی تھیں۔

آپا دھاپی کے اس دور میں کوئی کسی کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ بھی تنہا کھڑا تھا۔

کئی روز ہوگئے تھے۔ اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ کافی ہاؤس میں بھی دکھائی نہیں دیا تھا جب کہ دن میں دو مرتبہ وہ یہاں ضرور آتا تھا۔ دوستوں نے چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ اس نے برطانوی ڈپٹی کمشنر لاہور کے دفتر میں بطور پریس آفیسر ملازمت کرلی ہے۔

کافی ہاؤس میں دھماکا ہوگیا۔ احباب اس طرح چونک پڑے جیسے باری بم بناتے ہوئے پکڑا گیا۔ چونکنے کی تو بات ہی تھی۔ وہ انگریز کا سخت دشمن تھا۔ ”کمپنی کی حکومت“ جیسی کتاب لکھ کر وہ اپنی نفرت کا اظہار کرچکا تھا۔ اس کے لکھے ہوئے سینکڑوں اداریے انگریز دشمنی کے گواہ تھے۔ وہ زندگی بھر انگریزوں سے جنگ کرتا رہا اور اس کے رخصت ہوتے ہی اس کی ملازمت میں آگیا۔

وہ کس کرب سے گزر کر اس ملازمت تک پہنچا ہے یہ کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے بچوں کی خاطر اپنے نظریات کو قتل کردیا ہے یہ کوئی نہیں جان رہا تھا۔ وہ تو بس یہ دیکھ رہے تھے کہ اس نے اپنے نظریات سے غداری کی ہے۔ اسے انگریزی ملازمت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ خود اس کا حال یہ تھا کہ جب اسے پہلی تنخواہ ملی تو وہ نوٹوں کو بستر پر بچھا کر لیٹ گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ اتنے سارے نوٹ دیکھے تھے لیکن دوستوں کی طرح خود اسے بھی سکون نہیں تھا۔ اس کا ضمیر اسے زخمی کرتا رہتا تھا کہ اس نے دولت کے لیے اپنے نظریات کو فروخت کردیا۔ اسے خود سے شرم آنے لگی۔ اس نے دوستوں سے ملنا جلنا کم کردیا اور پھر بالکل ہی ختم کردیا۔ نگینہ ہوٹل ویران ہوگیا۔ کبھی کبھی کافی ہاؤس جانکلتا۔ یہاں بھی ”بڑے لوگ“ ہونے کے طعنے ملتے۔

بڑی مشکل سے اچھے دن آئے تھے لیکن اسے راس نہیں آئے۔ اس کی بے اعتدالیوں نے اسے دل کے مرض میں مبتلا کردیا۔ علاج کی طرف کیا توجہ ہوتی احتیاط تک کی زحمت نہ کی۔

”باری صاحب چائے یا کافی نہ پیا کیجیے دل پر مضر اثر ڈالتی ہے۔“ ایک دوست نے مشورہ دیا۔

”ہماری زندگی میں سامان تفریح ہی کیا ہے اگر ایک پیالی چائے اور سگریٹ سے بھی محروم ہوجائیں تو پھر سمجھ لیں زندہ درگور ہوگئے۔“ باری نے کہا اور مزے سے سگریٹ کے کش لینے لگے۔

اس بے احتیاطی اور بیماری کا نتیجہ یہ نکلا کہ کمزوری بڑھنے لگی۔ قدم اٹھتے نہیں تھے اٹھائے جارہے تھے دوستوں سے کترانے لگا کہ کسی پر بیماری ظاہر نہ ہوجائے۔

سرراہ کوئی مل بھی جاتا تو جان چھڑا کر آگے بڑھ جاتا۔ انگریز کی ملازمت کے بعد ایک عجیب قسم کی شرمندگی تھی جو اس پر طاری رہنے لگی تھی۔

اس دن وہ تانگے پر سوار دفتر جارہا تھا کہ منٹو سے ملاقات ہوگئی یا تو یہ حال تھا کہ منٹو سے ملے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا یا اب کئی دن بعد مل رہے تھے اور وہ بھی سرراہ۔

”باری صاحب آپ نے تو مجھ سے ملنا ہی چھوڑ دیا۔“

”بس یونہی ذرا فرصت......“

”آپ نے انگریز کی نوکری کیا کی۔ اپنا سارا کیریکٹر ہی تباہ کرلیا۔“

”ارے نہیں کیریکٹر کی حفاظت میں ہم تو روٹی ہی سے چلے گئے تھے۔ اب روٹی تو کمارہے ہیں۔“

”خیر چھوڑیے ان باتوں کو یہ بتائیے مزاج کیسے ہیں۔ طبیعت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔“

”سب سے چھپا رہا ہوں اب تم سے کیا چھپانا۔ کافی عرصے سے دل کے عارضے میں مبتلا ہوں۔ علاج چل رہا ہے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔“

یہ منٹو سے اس کی آخری ملاقات تھی۔ دو دن بعد 9 دسمبر 1949ء کی صبح باری کی طبیعت انتہائی خراب ہوگئی۔ اسے میو اسپتال لاہور میں داخل کرادیا گیا جہاں 11 دسمبر کو دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ خالق حقیقی سے جاملا۔

12 دسمبر 1949ء کی صبح اسے لائل پور (فیصل آباد) کے غلام محمد آباد قبرستان میں والد اور والدہ کے پہلو میں دفن کردیا گیا۔

ماخذات

وہ جو باری علیگ تھا یارو، پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر
سرگزشت، عبدالمجید سالک
چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر طیب منیر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

مسیحائے دوراں

زویا اعجاز

اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنی قوم کو سازشوں میں گھرے اور ظلم کی چکّی میں پستے ہوئے دیکھا۔ آنے والی نسل کو تباہی کے دہانے پر کھڑے پایا۔ تب اس نے خود قوم کے مستقبل کو سنوارنے کے لیے میدان میں آنے کا سوچا اور تعلیم کے ذریعے صحت مند معاشرے کی تشکیل کا بیڑا اٹھایا، گو کہ کچھ اپنوں نے بھی راہ کو پُرخار بنایا، دیواریں کھڑی کیں لیکن وہ رکی نہیں، آگے ہی آگے بڑھتی رہی۔ اس نے عورت ہو کر بھی ایسے کارنامے انجام دیے کہ عالمی پیمانے پر دھوم مچ گئی۔

ایک باہمت دوشیزہ کے جہدِ مسلسل کی داستان

رات کی تاریکی کسی ساحر کی مانند ہر سو اپنا فسوں پھیلا چکی تھی۔ آسمان پر چاند تنہا مسافر کی طرح مشرقی سمت میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔ مدھم ٹمٹماتے تاروں کی لو میں بھی ایک نامحسوس اداسی رچی تھی۔ بیت اللحم کے نزدیک اس خیمہ بستی میں موت کا سا سکوت طاری تھا۔ اِکا دُکا خیموں سے کہیں کہیں جھلکتی روشنی ہی صرف زندگی کی واحد علامت نظر آرہی تھی۔ ایسے ہی ایک خیمے میں دو بوڑھے نفوس یاس و حسرت کی المناک تصویر بنے بیٹھے تھے۔ خیمہ میں بوجھل خاموشی طاری

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

تھی جسے کچھ دیر بعد اس سرخ و سفید چہرے والے بوڑھے کی مدھم آواز نے توڑا۔

''کیا اس کی حالت کچھ سنبھلی؟''

''جی ہاں! لیکن وہ اب بھی اپنے اسی فیصلے پر قائم ہے...... کہتی ہے اپنی پڑھائی نہیں چھوڑے گی۔'' بوڑھی عورت نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''مجھے اس کی تعلیم پر تو کوئی اعتراض ہے اور نہ کبھی ہو گا۔ مگر بس ڈرتا ہوں کہ لڑکی ذات ہے۔ کہیں اس کا نازک وجود وحشت کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔'' بوڑھے کی آواز تھرا گئی۔

''اللہ رحم کرے! کیوں اس کی رحمت سے نا اُمید ہوتے ہو؟''

''نا اُمید نہیں ہوں۔ لیکن اپنی قوم پر نازل شدہ اس آزمائش کو مستقبل قریب میں ایک عفریت کا روپ دھارتے دیکھ رہا ہوں۔ خدا ہم پر واقعی رحم فرمائے۔'' بوڑھے کی زمانہ ساز آنکھوں میں اندیشے جھلک رہے تھے۔

والدین کی فکر و رنج سے بے نیاز وہ خیمے سے باہر ایک پتھر پر گھٹنوں پہ سر رکھے بیٹھی تھی اس کی نظریں افق کی جانب اٹھی ہوئی تھیں جیسے وہ کچھ دیکھ رہی ہو، کوئی ایسا خواب جو اس کی زندگی بدل دے۔ اس کا ننھا سا دل بار بار بھر آرہا تھا اور آنکھیں ڈبڈبانے لگتی تھیں۔ اس کی ایک ہم جماعت آج اسرائیلی بربریت کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ دو دن قبل وہ اسکول سے واپس آتے ہوئے غائب ہوئی تھی اور آج اس کی کٹی پھٹی لاش سڑک کے کنارے ملی تھی۔ اس کا بے جان جسم خود پر گزری قیامت و درندگی کا احوال بخوبی سنا رہا تھا۔ یہ سانحہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ ''الدھشیہ کیمپ'' کی اس بستی میں اسرائیلی تشدد کے باعث کئی ننھی کلیاں اور پھول مسلے گئے تھے۔ انیسویں صدی کی دہائی میں اسرائیلی شرپسندی بے قابو تھی اور فلسطینی عوام آئے روز ان کی درندگی کا نشانہ بنتے۔

شعور کی پہلی کرن نے جب اس کے دماغ کو خیرہ کیا تو قرب و جوار میں اپنے ہم وطنوں کی تشدد زدہ لاشوں اور کرب و عذاب کا ایک لامتناہی سلسلہ پھیلے دیکھ کر وہ بھی قبل از وقت بالغ ہو گئی تھی۔ اس کی حساسیت و نرم دلی اس صورتِ حال پر رنجیدہ رہتی۔ اس کا دل پہروں اداس رہتا۔ بیت اللحم کی تاریخی حیثیت شاید پھر خود کو دہرا رہی تھی۔ مسیحی عقائد کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کی جائے پیدائش میں حنان نامی اس لڑکی نے بھی مستقبل میں ایک مسیحا ہی کا کردار ادا کرنا تھا۔ حنان اسم با مسمی تھی۔ رحم و محبت اور دردمندی سے گندھی۔

☆......☆

حنان کا بچپن الدھشیہ کیمپ کے ٹیڑھے میڑھے رستوں میں گزرا تھا۔ آگہی کا عذاب کسی عفریت کی طرح اس کا بچپن نگل گیا تھا۔ مہاجر کیمپ میں پروردہ بچوں کی زندگیاں اپنے دیگر ہم عصروں سے یکسر مختلف ہوا کرتی ہیں۔ مہاجر بچے زندگی سے خوشیاں کشید کرنے کے عمل سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ ان کے کھیل اور دیگر سرگرمیاں بھی اپنے ماحول ہی کے زیر اثر ہوتی ہیں۔ اپنی استطاعت سے کہیں زیادہ آگہی اور شعور کا بوجھ اٹھائے وہ اپنا ذاتی تشخص اور مقصدِ حیات کھو دیتے ہیں اور فلسطینی عوام تو جبری مہاجر تھے ان کا دکھ نا قابلِ بیان ہے لیکن حنان تشدد اور جبر و استحصال کے اس دور میں ثابت قدمی اور مفاہمت کے قالب میں ڈھل گئی۔ حصولِ علم کا شوق دھیرے دھیرے جنون میں ڈھلنے لگا تھا جس کی تسکین کے لیے بیرونی رکاوٹوں کے علاوہ والدین کی بیجد فکر کا سامنا بھی رہتا تھا۔ کیمپ کے حالات ان کے خدشات بد سے بدتر بنانے لگتے تو وہ بے اختیار اپنی بیٹی سے کہہ اٹھتے۔ ''کیوں اتنے خطرات مول لیتی ہو جانِ پدر! تمھیں نقصان پہنچنے کا خیال ہی روح فرسا ہے۔''

''علم ایک فرض ہے یا ابی! اور فرض کی ادائیگی میں رکاوٹوں کی پروا کیونکر کی جائے۔ اگر موت آ بھی گئی تو میرے لیے شہادت ہو گی۔ کیا آپ نہ چاہیں گے۔ آپ کی بیٹی کا نام شہداء کی فہرست میں شامل ہو؟''

حنان کے خیالات جان کر اس کے والدین بیک وقت فخر و مسرت میں مبتلا ہو جاتے۔ اس کی اس ذہنی مضبوطی میں وکالت الغوث الدولیہ (UNRWA ایلمنٹری اسکول برائے طالبات) کے تعلیمی ماحول اور اساتذہ کا عمل دخل تھا۔ شہر کے مغربی کنارے پر واقع اس اسکول میں تعلیم حاصل کرنا اس کے لیے کوہِ ہمالیہ سر کرنے کے مترادف تھا لیکن ایک الوہی طاقت اسے ہمہ وقت تقویت بہم پہنچاتی تھی۔ اسکول پہنچ کر وہ بیرونی دنیا کی پریشانیاں بھول جاتی تھی۔ وہ ایک ذہین طالبہ تھی اور اپنے ذہن میں اُمڈتے سوالوں کو انتہائی ادب سے اپنے اساتذہ کے سامنے پیش کر دیا کرتی۔

''آخر کیوں ہماری قوم اس آزمائش میں مبتلا ہے؟ کیا اس کا کوئی حل موجود نہیں؟''

''عزیزی حنان! ہم نے اپنی میراث سے منہ موڑ لیا ہے جس کے باعث اغیار ہم پر مسلط کر دیے گئے ہیں۔ جس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

دن ہم نے اپنی گمشدہ میراث پالی ہمارا حال ماضی سے کہیں زیادہ درخشاں ہوگا۔'' اس کے اساتذہ تحمل سے جواب دیتے۔

''اور وہ میراث کیا ہے؟'' وہ خوابناک لہجے میں استفسار کرتی۔

''علم، باہمی اتفاق اور بے غرضی۔ جب ہم انھیں ایک بار پھر اپنی زندگیوں کا حصہ بنالیں گے تو اس پستی و ذلت سے نجات پالیں گے۔ لیکن یاد رکھنا! علم سے کبھی منہ نہ موڑنا۔ ورنہ ذلت در ذلت مسلط کر دی جائے گی۔'' اس کے اساتذہ کا غمناک لہجہ حنان کے ارادوں کو از سر نو مہمیز کرتا۔

حنان کے زرخیز ذہن کو جلا بخشنے میں اس کے اسکول کی لائبریری نے بھی کلیدی کردار ادا کیا جہاں موجود سینکڑوں کتابوں نے اسے ایک نئے جہان سے متعارف کروایا۔ وہ من الحیث القوم اپنی کوتاہیوں سے آگاہ ہونے لگی۔ وکالت الغوث الدولیہ کے منفرد تعلیمی نظام اور بے غرض اساتذہ نے اس کی مخفی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی۔ یہ ادارہ ہم عصر اسکولوں کے برعکس طلبہ میں اخلاقی اقدار اور مثبت اندازِ فکر کی افزائش کے لیے نسبتاً زیادہ تگ و دو کرتا تھا۔ طالبات کے لیے ضلعی سطح پر ہم نصابی سرگرمیوں کے کئی ایک مقابلے منعقد کروائے جاتے تھے اور اس ضمن میں انھیں دوسرے شہروں میں بھی بھیجا جاتا تھا تاکہ وہ ذہنی طور پر مضبوط تر، خود اعتماد اور مصائب و مشکلات کا جوانمردی سے مقابلہ کرنا سیکھیں۔ اس ادارے میں حنان کی صورت میں مستقبل کے ایک عظیم مسیحا کی انتہائی احسن تربیت ہو رہی تھی۔

☆......☆

شام کا سرمئی طائر بیت المقدس کے گلی کوچوں میں اپنے پر پھیلانے لگا۔ دن بھر اپنی تابناکی سے ارضی دنیا کو منور کرنے کے بعد تھکا ماندا خورشید مغربی کونے میں منہ چھپا رہا تھا کیمپ کے باہر اپنے مخصوص پتھر پر بیٹھی حنان اداس نظروں سے آسمان پر اپنے آشیانوں کی جانب بے فکری سے پرواز کرتے پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ دن سے اس کی طبیعت پر ایک اضمحلال سا طاری رہنے لگا تھا۔ انبیاء کی سرزمین کے گلی کوچوں میں وحشت و بربریت کا بازار گرم تھا۔ موت سرعام رقص کر رہی تھی۔ اس کے ہم وطن بقاء کی ایک کٹھن جنگ میں مشغول تھے۔ فلک پر سورج کے تھال میں جھلکتی سرخی اسے اپنے ہم وطنوں کا لہو معلوم ہوتی تھی۔ وہ لہو جو انتہائی ارزاں تھا۔ دل درد سے بوجھل ہو چلا تھا۔

اسّی کی دہائی کے اختتام پر عرب کی اس جری و غیور قوم کی آزمائشیں مزید بڑھنے لگیں۔ شہر کے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر اسرائیلی غاصبانہ قبضے کے خلاف اس کی جانباز قوم پوری قوت و شدت سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسرائیلی انتظامیہ کے خلاف بغاوت کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ اسرائیلی اداروں اور مصنوعات کا بائیکاٹ، ہڑتالیں، احتجاج، ٹیکسز کی عدم ادائیگی، اسرائیلی لائسنسز پر ذرائع آمدورفت چلانے سے انکار، وال چاکنگ، کچی مورچہ بندیاں اپنے عروج پر تھیں۔ اسرائیل کی بہیمانہ جوابی کارروائیوں میں اٹھارہ سال سے کم عمر افراد کو خصوصی طور پر نشانہ بنا کر نسلِ نو کا خاتمہ کیا جاتے لگا۔ فسادات کی آگ اس بری طرح بھڑکی کہ تعلیمی ادارے بند کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ کچھ اسکول زیرِ زمین عمارتوں میں منتقل کر دیے گئے لیکن کالج اور یونیورسٹیز میں تعلیمی عمل جاری نہ رہ سکا۔ حنان اس وقت دہری کشمکش کا شکار تھی۔ وطن پر ٹوٹنے والی اس قیامت نے اس کی روح چھلنی کر دی تھی تو دوسری جانب اسکول کی پڑھائی مکمل ہونے کے بعد وہ اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے سے بھی محروم ہو گئی تھی اور یہی محرومی اس کی روح و قلب کے لیے ایک آزار بن گئی تھی۔ تعلیم اس کا جنون تھی اور کتابیں اوڑھنا بچھونا۔ جن کے بناء اس کا وجود ادھورا تھا۔

سورج اپنا رخِ روشن مکمل طور پر اوجھل کر چکا تھا لیکن حنان کے وجود میں ایک نیا عزم کروٹ لینے لگا۔

''میں کبھی شکست تسلیم نہیں کروں گی اور اعلیٰ تعلیم کا خواب ضرور شرمندہ تعبیر کروں گی۔ میری قوم کی حالت ضرور بدلے گی۔ یہ اندھیرے سدا ہم پر مسلط نہیں رہیں گے۔ اس رات کے بعد ایک نیا سویرا ضرور طلوع ہوگا۔ میں علم حاصل کر کے ان اندھیروں کو مٹانے میں مقدور بنوں گی۔'' اس نے ایک عزم سے خود کلامی کی۔

☆......☆

مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں اسرائیلی دراندازی بیسویں صدی کے آخری عشرے کے آغاز تک بھی تھم نہ پائی۔ ہزاروں گھر اپنے مکینوں سے محروم ہو کر محض کھنڈر بن گئے۔ فلسطینی نوجوانوں کی نسل کشی عروج پر تھی۔ عورتوں کی عصمت دری اور بے حرمتی ایک معمول بننے لگا۔ حنان کے والدین اپنی جبلی محبت کے زیرِ اثر اس کے فرض سے سبکدوش ہونے کے شدید متمنی تھے۔ عہدِ رفتہ نے حنان کے جذبۂ تعلیم میں کئی گنا تڑپ پیدا کر دی تھی۔ اس کا یہ جنون بلاشبہ شرعی و دینی تقاضوں کے عین متقاضی تھا جس کی تکمیل کا اسے کامل یقین تھا۔ شریکِ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

حیات کے لیے اس کے ذہن میں کوئی خیالی بت نہ تھا۔ وہ جس مضطرب قوم کی دختر تھی وہاں ایسے خیالی بت تراشنے کے لیے وقت تھا نہ مہلت۔ وہاں تو بس زندگی کا ہر ایک پل قوم کا مقروض تھا۔

قدرت نے اپنے خودکار منصفانہ نظام کے تحت اس کے لیے ایک بہترین شخص کا انتخاب کر رکھا تھا جس کا ساتھ اسے اپنے گم گشتہ خوابوں کی تکمیل کے ساتھ فلسطینی نسل نو کے لیے دست مسیحائی عطا کرنے والا تھا۔ اپنی قسمت کی اس مہربانی سے بےخبر وہ "عمرالحروب" سے ازدواجی رشتے میں بندھ گئی۔

عمرالحروب ایک جیالا حریت پسند اور اسرائیلی فوج کے تشدد کے سامنے دس سال تک ڈٹا رہنے والا غازی۔

☆......☆

وہ بیروت یونیورسٹی سے کیمیا کے مضمون میں گریجویٹ تھا۔ جذبہ حریت وملی دردمندی سے سرشاری اس کی میراث تھی۔ وہ اسرائیلی فوج کا معتوب تھا۔ مئی 1980ء میں اس نے الخلیل میں مجاہدین کی جانب سے ابراہیمی مسجد کے نزدیک کیے جانے والے گوریلا آپریشن میں حصہ لیا تھا۔ اسرائیلی تو آبادکاروں پر حریت پسندوں کے ایک گروہ نے پوری شدت سے حملہ کیا۔ اسرائیلی میڈیا نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ان کے مطابق اس حملے میں استعمال ہونے والے بم عمر کے ترسیل کردہ کیمیکلز سے بنے تھے۔ حملے کے بعد عمر نے اپنے ساتھیوں کو ایک محفوظ مقام پر منتقل کر دیا تھا۔ اسرائیلیوں کی نظروں میں یہ ایک سنگین جرم تھا۔ اس واقعہ میں چھ اسرائیلی فوجی ہلاک اور درجنوں زخمی ہوئے تھے۔ یہ آپریشن فلسطینی جانبازوں کا بڑی ترین حملہ تھا جس نے اسرائیلی صفوں میں کھلبلی مچا دی تھی۔ اسرائیلی محکمہ خفیہ پوری طرح متحرک ہو گیا تھا۔ کئی ماہ کی تگ ودو کے بعد بالآخر ان مجاہدین کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان میں عمر کا نام سرفہرست تھا۔ اس کی زندگی کے دس سنہری سال قید وبند کی صعوبتوں میں گذرے۔ گویا عمر کا دل بھی فلسطینیوں پر روا ظلم واستبداد سے باغی تھا۔ وہ بھی اسرائیلیوں کے قبضے سے اپنے وطن کو آزاد کرانے کا خواہاں تھا۔

☆......☆

شادی کے بعد حنان پر زندگی کا ایک نیا پہلو آشکار ہوا۔ شوہر کی محبت واعانت کا تیقن اس کے وجود کو ہلکا پھلکا کر گیا۔ درحقیقت وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے خوابوں کی تکمیل کے لیے مقسوم تھے۔ عمر کو اس کے تعلیمی جنون پر چنداں اعتراض نہ تھا۔

"یہ حالات سدا ایک جیسے تو رہیں گے نہیں۔ بہتری کی راہ نکلتے ہی تم اپنا تعلیمی سلسلہ ضرور بحال کرنا۔ میں ہر طرح سے تمہارے ساتھ ہوں۔" شوہر کی زبان سے ادا ہونے والے یہ الفاظ حنان کے لیے مژدہ جاں فزا تھے۔

"انشاء اللہ۔ وہ دن بہت جلد آئے گا۔ جب میں اپنی کھوئی ہوئی دولت پھر سے پالوں گی۔ کارخانۂ قدرت میں کوئی بھی کام حکمت سے خالی نہیں۔ اس تاخیر میں بھی میرے لیے ضرور کوئی بہتری پنہاں ہے۔" وہ آنسوؤں سے لبریز لیکن چٹانی لہجے میں بولی۔

وقت تیزی سے گزرا اور پروردگار دو عالم نے انھیں پانچ بچوں کی انمول نعمت سے مستفید کیا۔ اپنی اولاد کے لیے وہ بالکل روایتی ماں تھی۔ شفیق، مہربان اور ایک ڈھال۔ تاہم اس لاڈ پیار کے باوجود ان کے تعلیمی کیریئر سے غافل نہ تھی۔ اب تو اس کے خوابوں کا دائرہ وسیع تر ہو گیا تھا۔ اسے اپنی اور اولاد کی تعلیم کو کسی بھی صورت مکمل کرنا تھا۔

اکیسویں صدی کا آغاز اس کے لیے خاصا خوش کن ثابت ہوا۔ برسوں سے طاری انتظار کا جمود ٹوٹا اور جس روز اس کے سب سے چھوٹے بیٹے نے اپنی تعلیمی کمان سنبھالی حنان الحروب بھی "القدس یونیورسٹی" کی معلمہ بن گئی۔ آنکھوں میں شکرانے کے آنسو لیے کتابیں ہاتھ میں تھامیں تو اسے اپنی روح کا ادھوراپن فضاء میں تحلیل ہوتا محسوس ہوا۔ اس کے خواب کی تکمیل کا سفر شروع ہو گیا لیکن خواب اپنا خراج وتاوان بھی تو ضرور وصولتے ہیں۔

القدس یونیورسٹی کا حصہ بننے کے کچھ عرصہ بعد اس کے خاندان پر ایک بلائے ناگہانی نازل ہوگئی۔ عمر اپنی بچیوں کو اسکول سے لینے گیا تو کہاں واقف تھا کہ واپسی کا سفر اس کے خاندان کے لیے مصائب کا ایک در وا کر دے گا۔ بیت اللحم کے نزدیک ایک چیک پوسٹ پر کچھ فوجی اہلکاروں نے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی عمر کا کندھا بری طرح گھائل ہو گیا۔ بچیاں سراسیمگی اور خوف سے دیوانہ وار چیخیں تو فوجیوں کے قہقہے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اس واقعہ کے ڈانڈے عمر کے ماضی سے ملتے تھے یا یہ محض ان فوجیوں کی "دل لگی" تھی وجہ تا حال مخفی ہے۔ بچیاں اس حادثے میں بظاہر محفوظ تھیں لیکن گذرتے وقت کا ہر پل اس بھیانک حادثے کے اثرات عیاں کر کے حنان کی مشکلات میں اضافہ کرنے لگا۔ زخمی شوہر کی تیمارداری، اولاد کی مخدوش ذہنی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

حالت کے ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھنا کسی بھی عام انسان کے بس کا روگ نہیں لیکن اس نے ہمت ہارنا تو سیکھا ہی نہ تھا۔ اس کے خواب ہی اس کی سب سے بڑی طاقت تھے۔ اس نے ایک نئے ولولے سے اس خارزار کو گلزار میں بدلنے کے لیے اپنی کوششوں کا آغاز کر دیا۔

حنان کے لیے بچوں کی معصوم نفسیات میں افزائش پانے والی پیچیدہ تر الجھنوں سے نمٹنا بے حد دشوار امر تھا۔ وہ رفتہ رفتہ اپنے ساتھیوں اور قرب و جوار کے ماحول سے بالکل کٹ کر رہ گئے۔ انسانیت پر عدم اعتماد اور لاشعور میں جاگزیں خوف انھیں اسکول کے تصور ہی سے ہراساں کرنے لگا۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس کے بچے اسکول جانے سے انکاری ہو گئے۔

''ہمیں گھر پر ہی رہنا ہے، ہمیں نہیں جانا اسکول اب۔ وہ پھر سے گولیاں برسائیں گے۔ اسکول میں بھی آجائیں گے۔'' ان کا ہسٹریائی انداز اسے بے اختیار رلا دیتا۔

بچوں کو اسکول کے اساتذہ کی جانب سے بھی کسی قسم کی کوئی نفسیاتی اعانت حاصل نہ تھی۔ ایک جانب بچوں کی اس ذہنی کیفیت کا کرب تھا تو دوسری جانب ملکی تعلیمی اداروں کا حال اسے بے کل کرتا تھا۔ گلی کوچوں میں دندناتے اسرائیلی فوجی، گولہ باری اور تشدد نے سوچ و خیالات کی لطافت نگل لی تھی۔ بچوں کو نارمل زندگی کی طرف واپس لانے کے اس کٹھن چیلنج میں اسے عمر کا بھرپور تعاون حاصل تھا۔ وہ اس کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا۔

''یہ مشکلات عارضی ہیں حنان۔ تم ان پر بہت جلد قابو پالوگی۔''

''میں بچوں کے سراسیمہ چہروں اور وحشت زدہ آنکھوں میں دیکھتی ہوں تو دل لہولہو ہونے لگتا ہے۔ زندگی کی اس دوڑ میں وہ تعلیم کے ہتھیار کے بغیر بقاء کی جنگ کیسے جیت سکیں گے؟'' وہ سوچتی تو اس کی زخمی مامتا بلکنے لگتی۔

''تمھاری مدد اور ہمت سے۔ تم اپنی نرمی اور محبت سے انھیں اس صدمے سے باہر نکال سکتی ہو۔ اس کائنات میں ماتا کے مرہم سے بڑھ کر کوئی اکسیر نسخہ نہیں۔ مجھے یقین ہے ہمارے بچے تمھارا خواب ضرور پورا کریں گے۔'' عمر اس کا حوصلہ بڑھاتا۔

وہ وقت حنان کے لیے کٹھن ضرور تھا لیکن منزل کی لگن اس کے ارادے ناتواں نہ ہونے دیتی تھی۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے گھر میں مختلف کھیلوں اور تخلیقی سرگرمیوں کی مدد سے ایک خوشگوار ماحول استوار کر لیا تھا۔ رات کو سونے سے قبل وہ بچوں کو اپنی آغوش محبت میں سمیٹ کر کہانیاں سناتی لیکن یہ کہانیاں دیومالائی کرداروں، کوہ قاف کے نادیدہ شہزادوں کی شہزادیوں کی خاطر کی جانے والی فرضی جنگیں ہرگز نہ ہوتی تھیں۔ وہ انھیں اپنی میراث کے قصے سناتی تھی۔ اس کے جگر گوشے جب حیرت و مرعوبیت سے اپنے اسلاف کے کارنامے سنتے تو وہ بڑی مہارت سے موضوع کا رخ ان کی فتوحات و کامرانیوں کی جانب موڑ دیتی۔

''یہ سب کیسے ممکن ہوا تھا بھلا؟'' وہ تجسس سے استفسار کرتے۔

''اپنے رب کا حکم مان کر۔ اور ہمارے رب کا ہمارے لیے سب سے پہلا حکم جانتے ہو کیا تھا؟ اقراء...... یہی ہماری معراج ہے اور یہی وہ وسیلہ ہے جس کے توسط سے ہم اپنی مشکلات کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔''

''لیکن اگر کوئی فوجی اسکول جاتے ہوئے گولیاں چلا دے تو......'' اس کی بیٹی سہمی ہوئی آواز میں ٹوکتی۔

''تو کیا...... جب ہم علم حاصل کرنے جاتے ہیں تو فرشتے ہمارے پیروں تلے اپنے پر بچھاتے ہیں اور ہمارے لیے دعائے خیر کرتے ہیں۔ تو پھر بھلا ہمیں کوئی انسان کیسے نقصان پہنچا سکتا ہے؟'' وہ شفیق لہجے میں کہتی۔ ''موت تو ہر صورت آنی ہے لیکن اگر علم کے رستے میں آجائے تو شہادت ہوگی۔ اور آپ کو معلوم ہے ناں شہید کا رتبہ کس قدر بلند ہے؟''

''جی! ہماری معلمہ نے اسکول میں ہمیں بتایا تھا۔'' بچے ننھے جوش سے بولتے۔

حنان کی انتھک محنت رنگ لے آئی اور بچوں کی شدید صدماتی کیفیت زائل ہو گئی۔ اس دوران القدس یونیورسٹی سے ان کا ناتہ بھی ٹوٹ نہ پایا تھا۔ اور پانچ سال میں ہی سہی لیکن حنان الحروب نے آخر کار اپنی منزل کا ایک بڑا ڈگر یجویٹ ہونے کی صورت میں پار کر لیا۔ اس کے عزم نے غاصبین کے ارادوں کو پاش پاش کر دیا۔ اپنی زندگی کے اس مشکل ترین مرحلے سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اسے اپنی ہم وطن ماؤں کی بے بسی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔

''اگر میں اپنی اولاد کو اس کشمکش سے چھٹکارا دلانے میں خدانخواستہ ناکام رہتی تو انھیں ہمیشہ کے لیے کھو دیتی۔ لیکن اب بھی مجھ پہ بہت قرض باقی ہے، میرے وطن کے بھی بچے میرے بچے ہیں۔ میں انھیں اندھیروں کا راہی بنتے نہیں دیکھ سکتی۔ اگر میری یہ مہارت ان کے کام نہ آسکی تو میری روح

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

سدا ملول رہے گی۔'' اس نے ایک روز عمر سے کہا۔

''میں ہمیشہ کی طرح تمھارے ساتھ ہوں۔ یہ ایک جہاد ہے اور اس میں پروردگار بھی تمھارا حامی و ناصر ہوگا۔'' وہ محبت پاش نظروں سے اپنی نصف بہتر کو دیکھتے ہوئے بولا۔

حنان کے اس فیصلے کے نتیجے میں تاریخ ایک نیا باب رقم کرنے کے لیے تیار تھی۔

☆......☆

2007ء میں حنان نے بطور معلمہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا تو اسے صحیح معنوں میں فلسطینی تعلیمی اداروں کے نظام کی اندرونی دگرگوں حالت کا اندازہ ہوا۔ وہاں کے چنیدہ تعلیمی ادارے اور کمرائے جماعت انتہائی گنجان آباد اور کہنہ سالی کا شکار تھے۔ ڈربے نما کمروں میں 35 سے متجاوز طلبہ کو بٹھایا جاتا۔ عمارتوں کا مخدوش ڈھانچا بھی بذاتِ خود کسی خطرے سے کم نہیں تھا۔ دیہاتوں اور مہاجر کیمپوں میں رہائش پذیر بچوں کے لیے تعلیم مشکل ترین ہدف تھی۔ ہزاروں بچوں کو روزانہ اسکول جانے کے لیے کسی نہ کسی چیک پوسٹ سے گذرنا پڑتا۔ مقبوضہ علاقوں کی ناکہ بندی، خار دار باڑیں اور رکاوٹیں ہمہ وقت ایک تناؤ بھرا ماحول قائم رکھتیں۔ شہر کے مغربی کنارے کے ٹیڑھے میڑھے راستے اور فوجی باڑیں پانی، خوراک اور طبی سہولیات جیسی بنیادی ضروریات کی فراہمی میں بے طرح حائل تھیں۔ جو بچے بالواسطہ طور پر چیک پوسٹس، قتل و غارت اور تشدد سے محفوظ رہتے وہ سماجی روابط کی ویب سائٹس اور ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے مناظر سے شدید متاثر ہوتے جس سے ان کی سوچ اور رویہ میں منفی رجحانات کا اضافہ ہونے لگا۔ طلبہ کی اکثریت ان مشکلات سے نمٹنے میں ناکام رہتی اور وہ حصولِ علم کی بجائے محنت کشی کی راہیں اپنا لیتے۔ حنان کے لیے یہ صورتِ حال ایک لمحۂ فکریہ تھی۔ اس نے بچپن میں اپنے وجود میں ایک حنان کو ہمیشہ سسکتے اور بلکتے ہوئے پایا تھا۔ اس کا بچپن تو حوادث و تشدد کی بھینٹ چڑھ گیا تھا اور کسی زنجیر کی طرح یہ کڑی آج بھی ملت کے نونہالوں کو پابند سلاسل کیے ہوئے تھی۔ وہ ہر فلسطینی بچے کو اس کا بچپن لوٹانے کا ایک نیا خواب آنکھوں میں سجائے ایک نئی لگن اور نیک نیتی سے اس مشن میں جت گئی۔ اس نے چھ تا دس سال کی عمر کے بچوں کو تعلیم دینے کا آغاز کیا۔

حنان الحروب نے اپنی تدریس کے لیے ''تعلیم بذریعہ کھیل'' جیسے منفرد طریقے کا انتخاب کیا۔ انتظامیہ اور ساتھی اساتذہ نے بڑی حیرت سے اس عجوبہ روزگار کو دیکھا اور اسے ہرزہ سرائی و کاٹ دار جملوں کی زد میں لے لیا۔

''ہم ایسی عیاشیوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ آپ طلبہ کے ساتھ ساتھ اپنا اور ہمارا قیمتی وقت بھی برباد کر رہی ہیں۔'' آئے دن کم و بیش ایسے کئی فقرات اس کی ساعتیں لہولہان کرتے۔

''معلم ایک رہنما ہوتا ہے۔ ہمارے بچے جس بیرونی و اندرونی خوف و ہراس کا شکار ہیں ہمیں اس مرحلے پر ان کی رہنمائی کرنی چاہیے۔ کمرائے جماعت میں بھی ڈرا سہما ماحول پا کر وہ مزید ذہنی تباہی کا شکار ہوں گے۔ وقت بدل چکا ہے۔ اب معلم کے درشت و کرخت تاثرات انھیں تحریک نہیں دے سکتے۔ آج ہم جس المیہ کا شکار ہیں اس کے پیش نظر ہم معلمین کو مزید حلاوت و شفقت اختیار کرنی ہوگی۔ ورنہ ہمارے گلشن کا ہر پھول بے موت مرجائے گا اور اس مرگ برگ کا ذمہ دار کوئی اور نہیں ہم خود ہوں گے۔ ہم اپنے برتاؤ اور محبت سے ہی انہیں بخوشی اسکول آنے پر رضامند کر سکتے ہیں۔'' وہ ہر مخالف حملے کو اپنے آہنی استقلال سے ناکام بنا دیتی۔

☆......☆

سرکاری اسکول کی محدود تنخواہ (2,500 مثقال) اور وسائل کی عدم دستیابی کے باوجود حنان نے زورِ بازو پر اکتفا کیا اور روزمرہ استعمال ہونے والی گھریلو اشیاء اور مواد سے کھلونے اور مختلف تدریسی آلات تیار کر کے احسن انداز میں ان کا استعمال شروع کیا۔ کپڑے کی بنی کٹھ پتلیاں، لکڑی کی میخیں، کھلونا گاڑیاں اور ایسے بے تحاشا سامان سے اس کے گھر کا ایک کونہ بھرا رہتا تھا۔ اساتذہ کے روایتی رعب و دبدبے کے برعکس وہ مصنوعی رنگ برنگے بالوں اور مسخروں کا خاصہ جزو سرخ موٹی سی ناک اپنی ناک پر جمائے بچوں کے ساتھ گھل مل جاتی۔ ان کے معصوم ذہنوں پر رائج خوف اس کے انواع و اقسام کے کھیلوں سے زائل ہونے لگا۔ ان کی لطیف نفسیات کے مطابق وہ انھیں کھیل ہی کھیل میں عدم تشدد کی تربیت دینے لگی۔ اسکول میں انھیں وہ خوشی اور روحانی سکون میسر آنے لگا جو گھروں میں بھی ناپید تھی۔ مختلف قسم کے کھیل اور روایتی عربی طائفہ نظمیں، گانے اور دف کا استعمال ان کی شخصیت پر جادوئی اثر کرتے۔ کمرائے جماعت کا ماحول خوشگوار ہوتے ہی خوف اور منفی رجحانات کو بھاگتے ہی بنی۔

اس کا زرخیز تخلیقی ذہن بچوں کے لیے نت نئے کھیل ایجاد کرتا رہا۔ ہر کھیل کے الگ اصول و ضوابط مقرر کیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

جاتے۔ شرکاء کے لیے اجتماعی و انفرادی طور پر ایک کردار مخصوص کردیا جاتا جس سے ان کا ذاتی تشخص توانا ہونے لگا اور وہ اپنی مثبت توانائی سے معاشرے کے مثبت شہری ثابت ہونے لگے۔ حنان نے اپنے نظریہ کے ذریعے طلبہ میں لاثانی مہارتیں اور خوبیاں پروان چڑھائیں۔ گروہی کھیلوں کے ذریعے ان میں معاشرتی مطابقت کی صلاحیتیں پیدا ہوئیں تو انفرادی سطح پر بھی ان میں صبر، برداشت اور اولوالعزمی جیسی صفات نمو پانے لگیں۔ طلبہ کے تعلیمی نتائج ابتدائی طور پر بہت شاندار نہیں ہوتے تھے لیکن وہ مستقل مزاجی سے ان کی نفسیاتی گرہوں کو غیر محسوس انداز میں کھول کر ان کے سارے دکھ اپنی آغوش محبت میں سمیٹ لیتی۔ شفیق لہجہ اور شیریں اندازِ تخاطب بچوں کی گھائل روح کے لیے مرہم کا سا اثر کرتے۔ وہ صرف معلّمہ ہی نہیں ان کی ماں بھی تھی۔ اس کا طلبہ اور اسکول کے ساتھ رشتہ محض پیشہ وارانہ نہیں بلکہ خاندان اور افرادِ خانہ کے باہمی محبت و خلوص جیسا تھا۔ وہ سراپا محبت تھی...... کیونکہ وہ حنان تھی۔

☆......☆

''میرا بیٹا بہت منفی اور تشدد ذہنیت کا حامل ہوگیا ہے یا اختی! اس کے تعلیمی نتائج بدترین تنزلی کا شکار ہیں، اس کی معاشرتی زندگی میں صرف ایک ہی ہم جولی ہے، اس کی تنہائی۔ یہی معمول رہا تو وہ اپنی شناخت ہی نہ کھو بیٹھے۔ ڈرتی ہوں کہ اپنی تنہائی کے مدار میں نہ بھٹک جائے۔'' حنان کے سامنے بیٹھی وہ عورت بلک بلک کر رونے لگی۔ وہ اس کے ایک نئے شاگرد کرم کی والدہ تھیں۔ کرم کی ذہنی استعداد خاطر خواہ نہ تھی۔ وہ کئی نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھا۔ معاشرتی مطابقت میں ناکام رہنے کے باعث وہ اپنے ہم جماعت ساتھیوں سے بھی بری طرح الجھتا۔ کھیلوں میں عدم شرکت اور جارح مزاجی بڑھتی جارہی تھی۔ اور ایسے ہی بچے حنان کی محبت، شفقت اور توجہ کا خصوصی مرکز ہوتے تھے۔ اس وقت بھی اسے ان خاتون میں برسوں قبل اپنے بچوں کی بہتری کے لیے بلکتی حنان کی جھلک نظر آرہی تھی۔

''آپ ہمت نہ ہاریں اختی! آپ کے تعاون کے بغیر میں بھی کچھ نہ کر پاؤں گی۔ آپ اسے محبت و اعتماد بخشیں۔ محبت تو فاتح عالم ہے۔'' وہ بڑے مؤثر انداز میں اسے اپنا لائحہ عمل سمجھانے لگی۔

اور پھر حنان کی خصوصی توجہ اور محنت نے کرم کی کایا ہی پلٹ دی۔ وہ اپنی جماعت کا مقبول ترین بچہ بن گیا مگر اُسے

مور (Moors)

شمالی افریقا کے بربر قبائل۔ اہلِ روم انہیں ماؤری کہتے تھے۔ ہسپانوی زبان میں یہ لفظ مور بنا اور انگریزی میں مور۔ بعد ازاں وہ تمام مسلمان جو اسپین میں بس گئے تھے، مور کہلانے لگے۔ انہوں نے طارق کی سرکردگی میں اسپین فتح کیا اور سات سال کے عرصے میں کوہ پرینیز اور جنوبی فرانس بھی ان کے زیرِ نگیں آگیا، تا آنکہ چارلس مارٹل نے 732ء میں انہیں پلوائٹرز کے مقام پر شکست دے کر پیچھے دھکیل دیا۔ یہ لوگ ریاضی، سائنس اور فلسفے میں اس زمانے کے یورپ کے استاد تھے۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو آج یورپ سائنس اور دوسرے علوم میں اتنی ترقی نہ کرسکتا۔ فنِ زراعت، باغبانی اور انجینئری میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انہوں نے نہریں بنا کر اپنے باغوں کو سیراب کیا۔ انہی کے ذریعے فنِ کاغذ سازی اور دوسرے فنون یورپ میں پہنچے۔ پندرہویں صدی تک ہسپانیہ میں ان کا عمل دخل رہا اور تقریباً ساڑھے سات سو سال تک انہوں نے یہاں حکومت کی۔

سرتامس مور (Sir Thomas More)

(1478ء۔1535ء)

انگریز ادیب اور سیاست دان۔ لندن میں پیدا ہوا۔ آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ 1504ء میں پارلیمنٹ کا رکن بنا۔ شاہ ہنری ہشتم اس پر بہت مہربان تھا۔ اس کے ایماء پر 1518ء میں پریوی کونسل کا رکن مقرر ہوا۔ 1523ء میں دارالعلوم کا اسپیکر بنا۔ 1521ء میں سر کا خطاب ملا اور 1529ء میں لارڈ چانسلر بنایا گیا لیکن 1532ء میں اسے بادشاہ کے حکم سے جیل میں ڈال دیا گیا۔ بعد میں پھانسی دے دی گئی۔ اس کی تصانیف میں Utopia (جنتِ خیالی) بہت مشہور ہے جو اس نے لاطینی زبان میں لکھی تھی۔ اس میں اس نے ایک ایسی ریاست کا تصور پیش کیا جو ہر قسم کے جنگجو اور حریص انسانوں سے پاک ہو اس میں کوئی بھی چیز نجی یا ذاتی نہیں ہوتی۔ تمام امور میں لوگ برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

مرسلہ: منظر علی منظر۔ دینہ جہلم

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

جماعت میں کھیل اور تعلیم کے بیک وقت مواقع نے اس کی زندگی کو نئی جہت عطا کی۔ باہمی گفت و شنید اور اعتماد نے اس کی شخصیت میں واضح نکھار پیدا کیا۔ کرم کی والدہ تادم تحریر ایک ہی بات دہراتی ہیں۔ ''حنان الحروب کی کرشماتی شخصیت اور مسیحائی نے مجھے میرا بیٹا لوٹا دیا۔ پروردگار اس پہ اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔''

☆......☆

حنان متوازن چال چلتی ہوئی اسکول کے دفتر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ گذرتے ماہ و سال میں اس کے طریقۂ تدریس پر اعتراضات اٹھانے والے اور ناقدین اس کے مداح بنتے گئے اور اس کی کاوشوں کے سودمند اثرات کی بدولت طلبہ میں بھی تشدد کے رجحانات کم ہونے لگتے اور یہ نظریہ دیگر اسکولوں میں بھی لاگو کیا جانے لگا۔

وہ دفتر میں داخل ہوئی تو سربراہ ادارہ نے خیر مقدمی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ہمارے ادارے کی انتہائی خوش قسمتی ہے کہ ہمیں آپ جیسی ذہین اور بے لوث معلّمہ کی خدمات حاصل ہیں۔ آپ کے طریقۂ تدریس کے نتائج انتہائی سودمند ثابت ہو رہے ہیں۔ لیکن اب آپ کو کچھ مزید ذمہ داریاں تفویض کی جا رہی ہیں۔''

''کیسی ذمہ داریاں؟'' حنان نے پُراعتماد انداز میں دریافت کیا۔

''فلسطینی تعلیمی نظامت کے اعلیٰ افسران نے اساتذہ کی تکنیکی تربیت کے لیے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ آپ کو اپنا ہنر، اپنی سوچ اور اپنا جذبہ دیگر فلسطینی معلمین تک بھی منتقل کرنا ہے۔''

''مجھے بسر و چشم منظور ہے۔ میرا یہ ہنر، تعلیم بھی کچھ میری سرزمین کی مقروض ہے۔ مجھے اپنی نسل تو کی ذہنی و اخلاقی مضبوطی کے لیے آگ و خون کے دریا بھی عبور کرنے پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔'' اس کا جذبہ روز اوّل جیسا توانا تھا اور وہ اپنی اس نئی ذمہ داری کی نزاکت سے بخوبی واقف تھی۔ تدریسی میدان میں محض چند سال کے بعد ہی یہ کامیابی و پذیرائی اس کے جذبۂ جنون، لگن اور خلوص نیت کا انعام تھا مگر وہ خود بھی ناواقف تھی کہ قدرت نے اس کے لیے ایک منفرد اوج مقسوم ٹھہرایا ہے۔ جس کی جانب سفر کے آغاز کا وہ پہلا قدم تھا۔

☆......☆

حنان الحروب کے تربیتی اجلاس کی کمان سنبھالتے ہی انبیاء کی سرزمین فلسطین میں ایک انقلابی تعلیمی نظریہ کی بازگشت گونج اٹھی۔ اسے درحقیقت چراغ در چراغ جلانے کا ایک زریں موقع میسر آیا تھا جس کے ضیاع کی وہ متحمل نہ ہو سکتی تھی۔

''فلسطینی عوام پر جبر و تشدد مسلط کر دیا گیا ہے لیکن ہمارے بچے بھی دیگر اقوام عالم کے اطفال کی طرح پُرامن فضاء میں پروان چڑھنے کے جبلی حقدار ہیں۔ ہم امن کے خواہاں ہیں۔ ہمارا مذہب امن و آشتی کا داعی ہے۔ اس نازک وقت میں آپ بھی کی ذات ہماری قوم کے لیے ایک مسیحا کا درجہ رکھتی ہے۔'' حنان نے گھمبیر لہجے میں اپنے سامنے بیٹھے اساتذہ سے کہا۔ ''ہمارا پیشہ انتہائی مقدس ہے۔ اس کے مقاصد نیک ہیں۔ ہمیں اپنے بچوں کو ایک ہی ہتھیار کا استعمال سکھانا چاہیے۔ سلیمی ہتھیار، جو کبھی کند نہیں ہوتا۔ اسی کے طفیل ہم اپنی وہ گمشدہ میراث حاصل کر سکتے ہیں جسے ہماری لاعلمی و جہالت نے ہم سے جدا کر دیا ہے۔ ہمیں ان کی ذات میں تشدد نہیں جذبۂ جہاد اجاگر کرنا ہے جہاد اور تشدد کا فرق واضح کرنا ہے۔ ورنہ غلامی کی ان زنجیروں سے ہم کبھی نجات حاصل نہیں کر سکتے۔''

''لیکن کھیل کود ہی کیوں؟ آخر ہم بھی تو روایتی طریقوں سے تعلیم حاصل کی تھی تو پھر اب اس نئی نسل کے لیے یہ نئے طریقے کیوں؟'' ایک ادھیڑ عمر معلّمہ نے سوال اٹھایا۔

''آپ کے سوال میں ہی آپ کا جواب پوشیدہ ہے یا اختی!'' وہ تحمل سے گویا ہوئی۔ ''آپ گھر میں کھانا کیسے بناتی ہیں؟ یقیناً چولہے اور گیس کے استعمال سے۔ آپ نے ان روایتی طریقوں کو کیوں نہ اپنایا جس سے ہم اپنے بچپن میں آشنا تھے۔ لکڑیوں پر کھانا بنانا۔ پیدل چل کر میلوں دور سے پانی لانا...... وقت نے بہت کچھ بدل دیا ہے۔ ہمارے نونہالوں کو بھی اسی تبدیلی کا سامنا ہے۔ بچپن بے حد معصوم ہوتا ہے۔ اس کی معصومیت اردگرد کے ماحول سے گہنا جائے تو ان کی نفسیات میں ناقابلِ اصلاح کجی پیدا ہو جائے گی۔ میں وہ کربناک وقت کبھی فراموش نہیں کر سکتی جب میرے جگر گوشے پڑھائی اور اسکول کے تصور سے ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتے تھے۔ جس بچپن کی بے ریائی پر تشدد کی پرچھائیاں پڑ جائیں وہ آئندہ زندگی میں اسی عمل کا ردعمل دیتے رہتے ہیں۔ ہم نے اپنے بچوں کو انسانیت و محبت کا درس دینا ہے۔ انھیں درندگی و وحشت سے بچانا ہے۔ انھیں اپنے ان اسلاف جیسا بنانا ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

جن کی دھاک آج بھی غاصبوں کے دلوں میں بیٹھی ہے اور اگر ہم ایسا نہ کر سکے تو تاریخ میں مزید رسوا ہو جائیں گے۔''

اس کی آواز وہاں بیٹھے بیسیوں معلمین کے ذہنوں میں فکر و سوچ کے نئے دریچے وا کر رہی تھی۔

لا تشدد (No to Violence) کے اس نو زائیدہ نظریہ کے ساتھ فلسطین میں ایک نئے عہد کا آغاز ہو چلا تھا۔

☆☆☆

پیشہ وارانہ کامیابیوں سے قطع نظر حنان کی ذاتی زندگی بھی کئی ایک خوشیوں سے لبریز تھی۔ ایسی خوشیاں جن کی چاہ ہر ماں اور بیوی اپنے آشیانے کے لیے کرتی ہے۔ اس کی دو جڑواں بیٹیاں اب وکیل، تیسری بیٹی محاسب اور ایک بیٹا شیف بن چکا تھا جبکہ سب سے چھوٹے نے ماہر فن تعمیر کی تربیت کے حصول کی راہ اپنائی۔ بحیثیت معلمہ بھی کامیابیاں اس کی بے دام کنیز تھیں۔ اس نے اپنے طریقہ تدریس و نظریات پر مبنی ایک کتاب We Play and Learn بھی تصنیف کی۔ لیکن مسرت و کیف کے یہ تمام تر لمحات اس کے دل پہ چھائی اداسی کا کہر مٹا نہیں پا رہے تھے۔

اکیسویں صدی کا دوسرا عشرہ اپنا نصف پڑاؤ طے کر رہا تھا جب فلسطین کے خلاف اسرائیلی جارحیت میں ہولناک اضافہ ہو گیا۔ پانچ ماہ میں عوام کا خون بے دریغ بہایا گیا۔ حریت پسندوں کی جوابی کارروائی میں 128 اسرائیلی اور دو امریکی جہنم واصل ہوئے۔ اسرائیلی فوج نے ایک اجتماعی دھرنے کی پاداش میں 184 فلسطینیوں کو فائرنگ سے چھلنی کر دیا۔ ان کا موقف تھا کہ ان میں 124 افراد حملہ آور تھے۔ حکام نے انتہائی بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس صورت حال کا ملبا فلسطینی رہنماؤں اور سماجی رابطوں کی ویب سائٹس پر ڈال دیا۔ اپنی قوم پر جاری اس جبر و تشدد کی لہر نے اسے کوئی بھی خوشی مکمل طور پر محسوس ہونے ہی نہ دی تھی۔ اسرائیلی حکام کی جانب سے مقامی تعلیمی اداروں پر تشدد اور لاقانونیت سکھانے کے بلا جواز الزام نے حنان کی ریاضت گویا پل بھر میں بے مول کر دی۔

''پروردگار! میری قوم کو اس جدو جہد میں سرخروئی نصیب فرمانا۔ میرے وطن کو خوشیاں اور سکون عطا فرما۔'' اس کے دل کی گہرائیوں سے یہی صدائیں بلند ہوتیں۔ وہ گھڑی بھی شاید قبولیت کی سند تھی۔ عرش پر ان مظلوموں کی مدد کے لیے ایک فیصلہ ہو چکا تھا۔ مقدر ایک نئی کروٹ لینے کو تیار تھا۔ فلسطین پر خوشیوں اور فخر کے ساون کی گھٹائیں گھر آنے لگیں۔

☆......☆

وہ مارچ 2016ء کا ایک پُر بہار دن تھا۔ بہار تو یوں بھی ازل سے خوشیوں اور تبدیلی کا استعارہ قرار پائی ہے۔ عمر الحروب اور اس کے قابل بچے ٹی وی اسکرین پر بے تابی سے نظریں جمائے بیٹھے تھے جہاں ان کی میسجاروایتی کڑھائی شدہ قومی لباس اور اسکارف میں ملبوس دبئی کی ایک تقریب میں موجود تھی۔ ہزاروں نظریں اس وقت شہر کے مغربی کنارے کے وسط میں نصب بڑی سی اسکرین پر گڑی تھیں جہاں The Global Teacher's Prize کی تقریب جاری تھی۔ چند بارسوخ عالمی اہلِ درد افراد نے دنیا کے ہر کونے سے قابل ترین اساتذہ کی خدمات کو سراہنے کے لیے یہ تنظیم بنائی تھی جس کی دوسری سالانہ تقریب میں مشرق وسطی سے حنان الحروب کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس کی دونوں جڑواں بیٹیوں نے قدرے نروس انداز میں اپنے والد کی جانب دیکھا تو اس کی نظروں میں اپنی شریک حیات کے لیے جھلکتے اٹوٹ اعتماد کی غیر مرئی شعاعوں نے انھیں ایک پل میں پُرسکون کر دیا۔ مسیحی مذہبی پیشوا پاپ فرانسز نے براہ راست ویڈیو لنک کے ذریعے رام اللہ کی رہائشی ''سمیحہ خلیل ہائی اسکول'' کی 43 سالہ معلمہ حنان الحروب کی فتح کا اعلان کیا۔ فضاء ساکت ہو گئی دھڑکنیں تھم سی گئیں اور اگلے ہی پل فلسطین نعرۂ تکبیر کے فلک بوس نعروں سے گونج اٹھا۔ پاپ فرانسز کے تہنیتی الفاظ حنان کی برسوں سے جاری اس جدو جہد کو دنیا کے ہر کونے میں معتبر کر گئے۔ نصف صدی سے دانستہ خاموش عالمی برادری نے ان کی مظلومیت اور استقامت کے آگے گھٹنے ٹیک کر ان کی جدو جہد تسلیم کر لی تھی۔ ایک نازک پیکر نے اپنی دکھی قوم کی صدا عالمی ایوانوں کی بلند و بالا دیواروں کے پار پہنچا کر مٹی کا قرض چکا دیا تھا۔

اس تاریخی فتح کے بعد وہ ایک ملین امریکی ڈالرز کی انعامی رقم کی مستحق قرار پائی جو دس سال تک اسے متوازی اقساط کی صورت میں ملتی۔ اس کے خوابوں کی تعبیر اب اس کے ہاتھ میں تھی۔ فلسطینی تعلیمی نظام کے لیے یہ خطیر رقم کسی من و سلویٰ سے کم نہ ہوتی۔ وہ بھی خوش تھے۔ بہت خوش۔ مگر قسمت کے ترکش میں ابھی چند تیر باقی تھے جن کا وار ایک نیا گھاؤ دینے کے لیے بے تاب تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

☆☆

''یہ سب کب تک چلے گا ابی! انھیں مناسب جواب دیئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔'' حنان کے بیٹے نے شدت ضبط سے عمر کو مخاطب کیا۔

''جانِ پدر! کچھ لوگ سفید کو سیاہ ثابت کرنے کی جو کوششیں کررہے ہیں انہیں کرنے دو۔ جیت ہمیشہ سچائی ہی کی ہوتی ہے۔ بس اک ذرا صبر درکار ہوتا ہے۔''

''تو آپ ان کی الزام تراشیوں اور ہرزہ سرائیوں کا کوئی جواب نہیں دیں گے۔'' بیٹی نے قدرے حیرانی سے استفسار کیا۔

''نہیں! ہم میں سے کوئی بھی کسی بھی قسم کا بیان نہیں دے گا اس صورتِ حال پہ۔ بس یہی حتمی فیصلہ ہے۔'' حنان نے بھی شوہر کی تائید کی۔

بہار اپنے اختتام پر تھی۔ الحروب خاندان اسرائیلی ذرائع ابلاغ کی تندوتیز گولہ باری کی ایک نئی لہر کی لپیٹ میں تھا۔ حکام ہمیشہ ہی سے فلسطین پر لاقانونیت اور دہشت گردی کے الزامات لگاتے آئے تھے لیکن حنان کی اس فتح نے انہیں ایسا زخم دیا تھا کہ وہ بلبلاتے ہوئے ذاتی اور اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے۔ اور اس بار ان کا نشانہ عمر الحروب تھا۔ اسرائیلی اخبارات نے اس کے ماضی کے متعلق زہریلی موشگافیاں شروع کردیں۔ ہر جانب بس ایک ہی صدا تھی۔

''بہترین عالمی معلمہ کا شوہر دہشت گرد ہے۔ جس نے ماضی میں چھ بے گناہ، معصوم اور نہتے افراد کو بینا کوچ سے واپسی پر جاں بحق کردیا۔ ایک دہشت گرد کی اہلیہ کیونکر عدم تشدد کی تربیت دے سکتی ہے؟''

اخبارات اور انٹرنیٹ پر ان افراد کی تصاویر و پروفائلز شائع کر کے خود ساختہ مظلومیت کی ردا اوڑھ لی گئی۔ ایسوسی ایٹڈ پریس اور حکام سے کچھ اور نہ بنا تو گلوبل ٹیچر پرائز کے اصل روحِ رواں Varkey Foundation کو ان کی اس ''سنگین غلطی'' کی بار بار نشاندہی کی جو انھوں نے تشدد سکھانے والوں کے ہاتھ مزید مضبوط بنا رہی تھی۔

''ہم مکمل ذمہ داری، تحقیق اور شفاف منصفانہ بنیادوں پر اساتذہ اور پھر فاتح کا اعلان کرتے ہیں۔ ہم معلمین کو ان کی ذاتی کاوشوں کے لیے منتخب ٹھہراتے ہیں۔ ہمیں ان کے عزیز و اقارب کے کسی قول و فعل سے کوئی سروکار ہے اور نہ ہو گا۔''

فاؤنڈیشن کے بانی نے ان ہمدردانہ اطلاعات اور دباؤ کا فلک بوس قلعہ ایک ہی جھٹکے میں مسمار کردیا۔ عمر الحروب نے ان بیانات کے جواب میں کسی قسم کا کوئی ردعمل نہ دیا لیکن عرش پہ براجمان وہ حاکم الحاکمین اپنے ان عزیز بندوں کو کیسے اکیلا چھوڑ دیتا؟ کئی عرب ممالک نے عمر کی حمایت میں اس کی ذات کے کچھ اسرار بے نقاب کر کے اس داستان کو ایک نیا موڑ دے دیا۔ قطری اخبار ''العربی الجدید'' نے اس کی حریت پسندی کو خراجِ تحسین پیش کیا تو فلسطینی قیدیوں کی ایک انجمن کے ناظم ''قدورة فارس'' نے انکشاف کیا کہ عمر الحروب نے 1993ء میں Oslo Accords میں شمولیت کے بعد حکومت کے ساتھ بطور ڈپٹی کیبنٹ منسٹر عرب اسرائیل کی باہمی مفاہمت اور دوطرفہ امن پالیسی کے لیے اپنی خدمات وقف رکھیں۔ وہ فلسطینی وزیراعظم محمود عباس کے مقربین میں بھی شامل تھا۔

وہ مظلوم قوم کا فرد تھا۔ اور مظلوم دہشت گرد نہیں ہوتے۔ عالمی برادری نے بھی ان کی آبلہ پا مسافت کے بعد یہ نکتہ تسلیم کر ہی لیا۔

☆......☆

''ظلم کبھی فاتح نہیں ہو سکتا۔ مسلمان جھکنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے۔ اس رات کی صبح بہت روشن ہو گی۔ وہ وقت دیکھنے کے لیے شاید ہم زندہ نہ ہوں۔ لیکن آپ سب دیکھو گے کہ آزادی کی صبح کتنی دلفریب ہوتی ہے۔'' عمر الحروب اپنے بچوں سے مخاطب تھا۔ ''مجھے کبھی بھی کسی بھی لمحہ حنان کی جیت پر شبہ نہیں تھا۔ اس کی یہ فتح ہماری قوم کی فتح ہے۔ اس کی جلائی ہوئی شمعیں فلسطین میں لرزیدہ غلامی کے سائے ضرور مٹائیں گی۔''

ایک لمحاتی سکوت کے بعد اس نے ٹیلیویژن پر ایوارڈ تقریب کی ریکارڈنگ دیکھتے ہوئے وہاں جری عرب جوانوں کو قومی پرچم لہراتے دیکھا جو بڑے جوش و جذبے سے باآواز بلند ایک ہی جملہ دہرا رہے تھے۔

''اے ارضِ فلسطین!

ہمارے خون کا ہر قطرہ اور جسم و جاں کا اک اک ریشہ بھی تجھ پر قربان۔''

اس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ نم آواز میں گویا ہوا۔ ''یہ نعرہ مستانہ چند الفاظ کا مجموعہ نہیں ہے۔ ایک پیغام ہے کہ فلسطین ایک آزاد خطہ ہے کیونکہ غلام قوموں کے پرچم یوں بلند تر اور جذبے توانا نہیں ہوتے......''

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

آسمان چپ رہا

سلمیٰ اعوان

عراق جو کبھی عروس البلد کہلاتا تھا۔ علم و فن کا مرکز تھا مگر جب سازشیں شروع ہوئیں تو وہ مقتل بن گیا۔ کھنڈر میں تبدیل ہو گیا۔ خون میں لتھڑے اور بارود کی بُو میں بسے عراق سے ایک ایسی روداد جو آنکھیں پُرنم کردے گی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

ایک قابلِ فخر دوشیزہ کے بھیانک انجام کی روداد

بغداد جل رہا ہے جدی۔ اس کے گلی کوچوں میں امریکی ٹینک توپیں ہلکائے کتوں کی طرح بھاگی پھرتی ہیں۔ پل پل اڑتے ہیلی کاپٹر گردوغبار کے طوفان اڑاتے اس کے چہرے کو دھواں دھواں کیے دے رہے ہیں۔ اعظمیہ کے خستہ حال گھر اپنے مکینوں کے ساتھ زمین بوس ہو گئے ہیں۔ بے گور و کفن لاشیں سڑکوں پر پڑی ہیں۔ المامون کے چھوٹے چھوٹے گھروں کے معصوم بچوں نے کہیں اپنی کھڑکیوں اپنی بالکونیوں سے جھانکا تو گولیوں نے انہیں بھون

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

دیا۔ پانی نہیں ہے۔ جدّی آپ کا اور میرا بغداد کربلا بن گیا ہے۔

یہ انیس سالہ عبیر تھی۔ اپنے نام کی معنوی عکاس۔ آنکھیں جیسے دکھ کے گہرے جذبات سے لدی پھندی مگر لہجے میں اندرونی کرب کا وہ رچاؤ جہاں شدت ایک عجیب اور بے نیاز سے احساس کی نمائندہ ہو جاتی ہے۔

اس کے پیچھے کھڑی پینتیس چھتیس سالہ دلکش خاتون نے اسکارف سر سے اتارتے ہوئے چھ فٹ 2 انچ کی کرمان کے کھجور کے درخت جیسی قامت والے سرخ و سفید بوڑھے کو جس کی گھنی مونچھوں میں اس کا بالائی ہونٹ چھپ سا گیا تھا دیکھا اور قدرے غصے، قدرے ملال اور قدرے سرزنش کھلے لہجے میں بولی تھی۔

وہ کیل کی طرح گڑی بیٹھی تھی کہ بغداد سے نہیں جانا۔ جیسے یہ اگر نکلی تو فصیل شہر گر جائے گی اور بغداد ڈھے جائے گا۔

ایک حالات کی نزاکت اوپر سے اس کا پاگل پن۔ المنصور آرتھوپیڈک اسپتال جانے اور وہاں کام کرنے کی رٹ۔ باپ کی جان سولی پر چڑھی ہوئی تھی۔ یہ ان کی ہر بات ہر خدشے کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہی تھی۔ اسٹڈی سرکل میں پڑھنے والی عورتوں پر سیخ پا تھی کہ انہیں ایسے وقت میں گھر سے نکلنا چاہیے۔ ہمیشہ باپ کی بات سننے اور ماننے والی اب آپ کی حکم عدولی پر بھی تلی ہوئی تھی۔

”جدّی میں نے تو گھر سے قدم بھی نہیں نکالا اور بغداد پھر بھی ڈھے گیا۔“

بوڑھے عراقی کی آنکھوں میں نمی تیری۔ اس نے دو قدم آگے بڑھ کر پوتی کو بانہوں کے دائروں میں سمیٹ لیا۔ اس کے اسکارف سے ڈھپنے سر پر ہونٹ رکھتے ہوئے وہ بولا تھا۔

”اپنی اولاد کے بچوں میں سے کسی کو تو مجھ پر جانا ہی تھا نا۔“

پھر وہ سب وہیں ایک دوسرے کے پاس بیٹھ گئے یوں جیسے کسی میت کی رخصتی سے فارغ ہوئے ہوں۔ حویلی کے زمانوں کے پرانے خدام بھی دلگیر سے اس مشترکہ دکھ میں شرکت کے لیے پاس آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک نے قہوے کی ٹرے تپائی پر رکھی۔ قہوہ پیتے ہوئے اس نے اپنے دادا کو سنایا تھا۔

”عراقی بڑے ہی بدقسمت ہیں۔ انہیں ترکوں نے منہ نہ لگایا۔ بس اپنے حلوے مانڈے سے تعلق رکھا۔ ان کے خزانوں میں ٹیکس جمع ہوتا رہا، رہے عراقی وہ جائیں جہنم میں۔ ہماری سادگی اور جاہلیت سے برطانیہ نے موجیں ماریں۔ انہوں نے اپنا الّو سیدھا کیا اور ہمیں بھاڑ میں جھونکا۔ عرب قوم پرستی بھی نری فراڈ نکلی۔ صدام کے کمیونسٹوں نے بڑے سبز باغ دکھائے۔ غریب اور ماٹھے لوگ ان کے خوش کن نعروں کی طرف بھاگے اور منہ کے بل گرے۔ موصل، کرکوک اور بصرہ خون میں نہایا تو جانے کہ یہ سب تو بس رولا گولا ہی ہے۔ جمہوریت کے لیے کتنے پاپڑ بیلے۔ تو کہیں بس جھلک ہی نصیب ہوئی پھر یہ احمق آمر ہڈیوں جوڑوں میں بیٹھ گیا۔“

بڑی دردناک بڑی شکست خوردہ سی ہنسی ان کے لبوں پر آئی۔ دس سال کی اقتصادی پابندیاں۔ عراقی قوم کے خوشحال، مضبوط سماجی ڈھانچے پر کاری ضرب۔ مغرب کی دل لگی اور تماشے۔

”عراق کا سب سے بڑا دشمن تو اس کا تیل ہے ابھی نکالا ہی گیا ہے کہ وہ پھر آ گئے۔ فریڈم آف عراق کا جھنڈا لہراتے۔ تیل نکالنے اور غریب کو مارنے میں جو کسر باقی رہ گئی تھی اسے پوری کرنے۔“ وہ اپنی رو میں بولتی گئی۔

اس کی چھوٹی بہن نبا، اپنی ماں ولدہ کے ساتھ اندر چلی گئی تھی۔ بس وہ وہاں بیٹھی رہی۔ اس تنہائی، سناٹے اور سکون میں ڈوبے ماحول میں جہاں بہر حال اس قیامت کا گزر نہیں تھا جو بغداد، بصرہ، ناصریہ، کربلا اور نجف میں برپا تھی۔

اس نے ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر جال سا بنایا اور اپنے سر کی بیک کو اس پر ٹکاتے ہوئے فضا کو دیکھا۔

☆......☆

کچھ آنکھوں کے سامنے ابھرا تھا۔ تین سال پہلے کا ایک منظر، اور جگہ بھی یہی تھی۔ ایسے ہی دن تھے اور یہ بھی کیسا اتفاق تھا کہ وقت بھی کم و بیش یہی تھا۔ وہ منظروں کے حسن میں پوری طرح ڈوبی ہوئی تھی۔

شام کے حسن میں سلونا پن تھا۔ سورج دور نظر آتے ٹیلوں سے ابھی خاصا اوپر تھا اور دجلہ کے بہاؤ میں بہت دھیما پن تھا۔

عبیر بیٹھی تھی اب کھڑی ہو گئی کہ سفید براق مرغابیوں کی ایک ڈار اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے دھیرے دھیرے ایک ترتیب سے دجلے کے پانیوں پر اتر رہی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

"اف۔" اس نے بچوں جیسی معصوم کلکاری بھری۔ کیسا حسین منظر۔ اس کی آنکھوں میں منظر سے متعلق خوبصورتی ایک شعلے کی سی لپک والے احساس کے ساتھ باہر آئی تھی۔ چند لمحوں تک وہ اس سے محظوظ ہوتی رہی۔

رخ موڑا تو سامنے تاحد نظر پھیلے گندم اور جو کے کھیتوں کا پھیلاؤ تھا۔ ہریالی اور سنہرے پن کے گھلے ملے رنگوں کے عکس دلفریب تھے۔ اس کے دادا کو سال کے بارہ مہینوں میں سب سے اچھے یہی مارچ اور اوائل اپریل کے دن لگتے تھے۔ دادا کا ایسا سمجھنا سو فیصد درست تھا کہ مئی جون میں تو دھرتی آگ اگلنے لگ جاتی تھی۔ عبیر نے درختوں کے جھنڈوں کو دیکھا اور ذرا دور کھجور کے باغ پر بھی نظر ڈالی جن پر پھل ابھی چنے منے سے تھے۔

"ہزاروں بار کے دیکھے ہوئے ان منظروں میں ہر دفعہ ہی کچھ نئی تازگی کچھ نیا حسن محسوس ہوتا ہے۔" اس نے خود سے کہا تھا۔ "شاید نظروں کے زاویوں میں تبدیلی آتی رہتی ہے یا درمیان میں تھوڑا سا وقت گزر جانے پر جب اعادہ ہوتا ہے تو انوکھی سی سرشاری کا احساس جاگتا ہے۔"

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہاں آگئی تھی جہاں گنجے سر والا ایک بوڑھا خاکی رنگی ٹوپ میں ملبوس آنکھوں پر چشمہ لگائے حقہ پیتے ہوئے کچھ پڑھ رہا تھا۔

عبیر دادا کے قریب آئی۔ حقے کی لمبی نال جو زمین پر بکھر گئی تھی سمیٹ کر تپائی پر رکھی اور دادا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "جدی اتنی تمباکو پینا ٹھیک نہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ آپ کے منہ سے پائپ نہیں چھوٹتا۔"

وہ ہنسا۔ "اب تم ان پاس بھرے دنوں میں اسے بھی مجھ سے چھین لینا چاہتی ہو۔ چلو نبیذ پر تمہاری پابندی میں نے مان لی ہے۔" عینک کے موٹے شیشوں سے دادا نے پوتی کو دیکھا تھا۔

سیاہ اور گلابی پھولوں والے لونگ اسکرٹ، کندھوں پر جھولتے گھنے سیاہ بالوں میں عبیر کا چہرہ جیسے چاند کی طرح دمکتا تھا۔ وہ میڈیکل کی ذہین ترین طلبہ السریۃ الثانیہ میں جب بھی آتی۔ دادا سے لمبی لمبی نشستوں کے دوران بحث مباحثوں میں ضرور الجھتی۔

"عبیر کسی کو قہوے کے لیے کہنا تھا۔" ابھی تو ایک لفظ بھی اس کے ہونٹوں سے نہیں نکلا تھا۔ جب اس مصطفیٰ البرزانی نے دبیز شیشوں کے پیچھے سے جھانکتی نگاہوں میں شریر سی مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر ان الفاظ کی مٹھاس تھی۔

"جدی یہ اتنا قہوہ پینا آپ کے لیے مضر ہے۔ نہیں کہنا۔ ہرگز نہیں کہنا۔"

عبیر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کیسی ہنسی تھی۔ جیسے ساری فضا نغمہ بار ہوگئی ہو۔ بوڑھے نے اس کی پشت کو محبت پاش نظروں سے دیکھا تھا جس پر بکھرے ہوئے گھنے سیاہ بال اس کے چلنے کے ساتھ ہلکورے کھاتے تھے۔

انہیں نوکر کے ہاتھ قہوہ بھجوا کر اور اپنی ماں سے رات کے کھانے پر کیا ملے گا جیسے سوال پوچھتی "کچھ نہیں...... فلافل کا ڈنر ہوگا۔"

"کیوں؟" وہ بحث کرتی۔

"سکینہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" جیسے جواب سنتی تھوڑی سی جز بز ہوتی پھر باہر آ جاتی تھی۔ اندر تو اس کا دل ہی نہیں لگتا تھا۔

جب وہ اپنے جدی کے باغیچے میں آئی ان کے پاس کچھ لوگ تھے۔ پل بھر کے لیے وہ ساکت کھڑی ہوئی۔ خود سے پوچھا؟ اور سوال بھی کیا۔ جانے کون ہیں؟ آگے جانا مناسب ہوگا یا نہیں۔ بالعموم اپنے دادا کے دوستوں سے وہ بے تکلف تھی۔

اسے رکے دیکھ کر جدی کی آواز، ان کے لہجے کی شگفتگی، اس میں جھلکتی سرشاری جیسے اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ "رک کیوں گئی ہو؟ آگے آؤ۔ دیکھو تو سہی آج کون آیا ہے؟"

مہمانوں کی پشت اس کی طرف تھی۔ دو چہرے اور چار آنکھیں۔ ایک بوڑھا دوسرا جوان۔ اپنی اپنی عمروں کے حساب سے دونوں دلکش۔ نظروں میں شوق و اشتیاق کی موجیں لیے کھڑے ہوگئے تھے۔ بوڑھے نے آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔

"پہچانو تو بھلا میں کون ہوں؟"

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "میں تو پہچان گئی ہوں۔ امتحان تو آپ کا ہے۔ بتائیے ذرا میں کون ہوں؟"

مخاطب کا اونچا زوردار قہقہہ اس خاموش فضا میں گونجا۔

"تو اگر پہچان جاؤں کچھ انعام وانعام بھی ہوگا۔" پھر مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے قامت کو ذرا سی خمیدہ کرتے ہوئے بولے۔ "بھئی آپ ہماری بہت پیاری عبیر ہیں۔"

احمد بارزنجی کی آواز میں جو چہکار تھی۔ وہ تو بن بولے ہی بتائے دے رہی تھی۔ ان کے پرانے اور نئے البموں کے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پلندوں میں شاید ہی کوئی تصویر ان کے بغیر ہو۔

سرما کی راتوں میں فائل میں سنبھالے گئے پرانے اور نئے خطوط کو پڑھنا، نئی تصاویر میں انہیں دیکھنا، وہ بھلا اجنبی کب تھے؟ احمد بارزنجی، سلمانیہ کا سنی کرد جو اس کے شیعہ دادا کا یار غار، جمہوریت کی جدوجہد میں اس کا پل پل کا ساتھی، کٹر سوشلسٹ، خوبصورت اور انقلابی شاعر، بعث پارٹی کے عتاب سے جانے بچ کیسے گیا؟ مرنے میں کسر تو کوئی باقی نہ تھی، جیل سے بھاگ گیا تھا انگلینڈ۔

لڑکا اس کا پوتا تھا جو پہلی بیوی سے تھا۔ ڈاکٹر تھا۔ بغداد میں ہی بڑھا پلا اور پڑھا۔ کوئی سات سال سے امریکا میں مقیم تھا۔ پہلے اسپشلائزیشن کے سلسلے میں۔ اب Voices in the Wilderness اور دیگر کئی تنظیموں میں شامل ہو کر عراق پر عائد پابندیوں کے خلاف تحریکیں چلا رہا تھا۔ فنڈ اکٹھے کرتا، ادویات کی ممکن فراہمی یقینی بناتا اور غیر ملکیوں کو اسپتالوں کے دورے کرواتا تھا۔ ابھی وہ بصرہ سے آرہا تھا۔ اس نے بصرہ کے اسپتالوں کی خوفناک حالت زار بیان کی تھی، بچوں کی خطرناک بیماریوں جن میں سرفہرست کینسر، لیکیومیا، ڈائریا، ہیپاٹائٹس اور اعضاء کے ٹیڑھے پن کی خوفناک منظر کشی کی تھی۔

پھر ایک عجیب سی بات ہوئی۔ عبیر کھڑی تھی سنتی رہی تھی پھر ڈاکٹر مسعود بارزنجی کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ بیٹھی اور بولی۔

''آپ چار سالوں سے مسلسل عراق میں آجا رہے ہیں۔ اف میرے خدایا۔ آپ پہلے کیوں نہیں میرے جدی سے ملنے آئے۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ کام کرتی۔ بہت ہی ایسی جگہوں پر آپ کو لے کر جاتی جہاں کے لوگوں اور بچوں کو اس تعاون کی شدید ضرورت ہے۔''

ملا احمد بارزنجی نے عبیر کو دیکھا تھا۔ کس انہماک سے وہ ڈاکٹر مسعود کی طرف متوجہ تھی۔ بیتابی، بشتابی، دکھ بھرے جذبات کا چہرے پر پھیلاؤ، کتنے رنگ تھے وہاں۔ قدرے دھیمے لہجے میں وہ دوست سے مخاطب ہوئے۔ ''مصطفیٰ، ہدی سے تمہارے بے پایاں عشق کا عبیر کی صورت یہ انعام بہت خوبصورت ہے۔''

''بہت جذباتی، منہ پھٹ، بے باک اور عراق کی محبت میں لتھڑی ہوئی ہے یہ۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔''

میں نے کئی بار ہاتھ جوڑے اور ساتھ میں ڈپٹا بھی۔ مگر زنجی اس میں ایک سچی انقلابی روح ہے میں کیا کروں؟

ابھی باتوں کا یہ سلسلہ جاری تھا جب وہاں دو عورتیں ایک بچے کے ساتھ آئیں۔

وہ یہیں اس چھوٹے سے باغیچے میں ہی آگئیں۔ کوئی فرلانگ پرے سریتہ الثانیہ کے گاؤں کی تھیں۔ بچہ بیمار تھا۔ شفا خانے میں دوائی کے نام پر سر درد کی گولی بھی نہ تھی۔ حالت زیادہ خراب ہونے کی وجہ سے وہ یہاں آئی تھیں کہ اس گھر کا سربراہ اپنے وسیع تعلقات اور مالی وسائل سے کبھی اردن، کبھی شام اور کبھی انگلینڈ سے دوائیں منگوا کر رکھتا تھا۔ شفا خانے کو بھی فراہم کرتا اور گھر میں بھی ہوتیں۔

عبیر اور ڈاکٹر فوراً متوجہ ہوگئے۔

نمونیے کا شدید اٹیک تھا۔ سانس لینے میں شدید دشواری تھی۔ چھاتی کھڑکھڑ کرتی تھی۔ آکسیجن کی اشد ضرورت تھی مگر اسپتال میں آکسیجن چھوڑ دوائی تک نہیں تھی۔

گھر میں دوائیاں موجود تھیں۔ انہی میں سے مناسب کا انتخاب ہوا اور دی گئیں۔ دونوں عورتوں نے شکریہ ادا کیا۔ بچہ کندھے سے لگایا اور رخصت چاہی۔

مصطفےٰ البرزانی نے ملازم کو بلایا اور انہیں پار چھوڑ آنے کا کہا۔

ان کا یہ گھر گاؤں سے کوئی نصف میل پر دجلہ کے بائیں کنارے پر تھا۔ بغداد موصل روڈ پر چڑھنے کے لیے زمینی راستہ تھا مگر دجلہ کے پار گاؤں جانے کے لیے انہیں کشتی استعمال کرنا پڑتی تھی۔

ایسے پریشان حال لوگوں کے جانے کے بعد عبیر ہمیشہ افسردگی اور دل شکستگی کی دبیز تہہ میں ڈوب جاتی تھی۔ ہمیشہ ایسا ہوتا جب وہ بیماروں کو دوائیاں نہ ملنے کے باعث مرتے دیکھتی تو پہروں کڑھتی۔

آج یقیناً یہاں ڈاکٹر مسعود بارزنجی کی موجودگی تھی جس نے بچے کو انتہائی توجہ سے دیکھا اور فوری بہترین طبی امداد دی جو اس کے میڈیکل کٹ میں موجود تھیں۔ خاتون کے گھر کا پتا عبیر نے سمجھا تھا اور رات کو وہاں چکر لگانے اور بچے کو دیکھنے کا پروگرام فائنل کیا تھا۔

''کوئی معجزہ ہی بچے کو بچا سکتا تھا اور میرا خیال ہے ڈاکٹر مسعود کی صورت میں قدرت یہ معجزہ یہاں بھیج چکی ہے۔'' اس نے ان کے جانے کے بعد احمد بارزنجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

اس نے دور سورج کو دیکھا تھا۔ سورج کی تیزی شوخی

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اور جولانی سب کہیں غائب تھیں۔ زوال کی کمزوری غالب تھی۔

اور جب سورج غروب ہو رہا تھا وہ سب کھڑے ہوئے۔ گھر کے اندر جاتے ہوئے عبیر کے لبوں پر اس باغی شاعر نزار قبانی کی نظم ابھری تھی جو بے اختیار اس کے لبوں سے پھسل کر فضا میں پھیل گئی تھی اور جسے دونوں بوڑھوں کے ساتھ ساتھ اس نوجوان نے بھی سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتے چلتے سنا تھا۔ اور سراہا تھا۔

ہمیں جوش و جذبے سے بھرپور ایک نسل کی ضرورت ہے

جو آسمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے
جو تاریخ کو ہلا دے
ہمیں ایک ایسی نسل کی ضرورت ہے
جو غلطیاں کوتاہیاں در گزر نہ کرے
جو گھٹنوں کے بل نہ جھکے
ہمیں ضرورت ہے جنات کی ایک نسل کی

پھر وہ سب اس پندرہ فٹ بلند دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اس وسیع و عریض گھر کی بلند و بالا فصیلیں مصطفےٰ البرزانی کے باپ کے زمانے میں مٹی کی تھیں۔ اس کے زمانے تک ایسی ہی رہیں۔ بیٹوں کے دور میں پختہ پتھروں کی بن گئیں۔ ڈیوڑھی سے آگے ایک طرف نیلے گرینائٹ کا حوض تھا۔ بیچ میں وسیع لان جس کے چہار جانب درخت تھے۔ آگے برآمدے اور برآمدوں کی پشت پر کمروں کی قطاریں تھیں۔

اس وقت لوڈ شیڈنگ تھی۔ برآمدوں میں جلتی مشعلیں ماحول کو درجہ خوابناک سا بنا رہی تھیں۔

وہ سب مصطفےٰ البرزانی کے کمرے میں آ گئے تھے۔ کمرے کا نصف حصہ چبوترہ نما اسٹیج جیسی صورت لیے ترکی کے شہر ازمیر کے خاص قالینوں سے سجا تھا۔ دیواروں پر پرانے زمانے کی بندوقیں لٹکی تھیں۔ عبیر دادا کی ہدایت پر رات کے کھانے کا کہنے چلی گئی۔

رات کا کھانا پُرتکلف تھا۔ گھر کے سب افراد بیٹھے۔ ملقوبہ کی ڈش بہت پسند کی گئی۔

عبیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”مصطفےٰ جدی آپ کی وجہ سے ہمیں یہ شاندار سا کھانا ملا۔ وگرنہ تو بتو نے فلافل پر ٹرخانا تھا آج۔“

قہوے کا دور چلا اور ساتھ پرانی یادوں کا بھی۔ وہ خط جو احمد بارزنجی نے اپنے اس جگری یار کو ان دنوں لکھے جب وہ سب عراق کو جمہوریہ بنانے کی جدوجہد میں تن من دھن سے سرگرم عمل تھے۔

عبیر نے ہنستے ہوئے فائل میں سے ایک خط نکالا اور احمد بارزنجی کے ہاتھوں میں دے دیا۔ وقت نے ماضی میں چھلانگ ماری۔ 1958ء کے رگوں میں لہو ابالنے والے دن یاد آئے تو مسکراہٹ نہ صرف ہونٹوں پر ابھری بلکہ چہرہ بھی اس میں نہا گیا۔

”مصطفےٰ البرزانی اب جتنے بھی امکانات سامنے ہیں خدا گواہ ہے ان میں سے کسی ایک پر بھی میرا دل نہیں ٹکتا۔ مجھے بتاؤ تو سہی آخر تم السریہ ثانیہ رہے ہو؟ بغداد کا ہر چڑھتا دن جس اضطراب، بے کلی، آس، امید، مایوسی اور گھٹن کا پل پل شکار ہو رہا ہے وہ کب تم سے پوشیدہ ہے؟ پھر کیا تمہارے پاؤں تلے کوئی میگنٹ بار آ گئی ہے جس نے تمہیں چپکا لیا ہے۔“

نیا مہمان گھر میں آنے والا ہے۔ بیوی کا گوڈا تھامے بیٹھے ہو کہ اب بچہ جنوا کر ہی اٹھو گے۔ کہنے کو ابھی خیر النساء سے تمہیں ذرا الفت نہیں۔ ہوتی تو جانے کیا کرتے۔ ایک خیال تمہارے لالچی باپ کی طرف بھی جاتا ہے۔ جو شاید ان دنوں سوچوں کی گھمن گھیریوں میں بھی ہو کہ موقع و مفاد پرست اس قبائلی سردار نے برطانوی لارڈز کی مٹھی چاپیوں اور خوشامدیوں سے جو زمین سمیٹی ہوئی ہے اب آزادی عراق کے کسی انقلاب کے ہاتھوں چھن نہ جائے۔ ایسے میں اکلوتے بیٹے کی حیثیت سے اس کی دلجوئی کرنا تمہارے لیے بہت اہم تو ہے نا۔

بصرہ سے محمد الرکابی آیا ہے بہت ساری خبروں کے ساتھ۔ بعث پارٹی میں افلاق شاذلی کا حبّ ناصر گروپ ان دنوں ناصر کی محبت میں کچھ زیادہ جذباتی ہو رہا ہے۔ کل ”ہراس الاستقلال“ پر چھاپہ پڑا۔ حریہ میں بشار کے گھر سب اکٹھے تھے۔ پندرہ کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔

رات المغرب اسٹریٹ کے اپنے اسی کیفے میں محمد الرکابی کے اعزاز میں کھانا تھا۔ محمد العبیدی کی نئی نظم نے بڑا سماں باندھا۔

”اب از راہ مہربانی اسے خط تو ہرگز نہ سمجھنا بس تار جاننا۔ بھاگتے بھاگتے چلے آؤ۔“

دونوں بوڑھوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں کے گوشے نم تھے۔ خط اب مسعود بارزنجی کے ہاتھوں میں آ گیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

تھا۔

اس خط نے بھی بہت لطف دیا جو مصطفیٰ البرزانی کے پھوپی زاد ابراہیم علاوی کا تھا۔ بڑا بغض رکھتا تھا احمد بارزنجی سے۔ ہمیشہ ہی اسے اکساتا رہتا تھا۔

ارے وہ سنی کرد ہے۔ سمجھو اسے۔ یہ کرد تو نرے فصلی بٹیرے ہیں۔ عراق سے کب مخلص ہیں؟ کردستان بنانا چاہتے ہیں۔ امریکا، برطانیہ کے ایجنٹ اور ان کے پٹھو۔ ہمہ وقت مار دھاڑ پر مائل۔ ترکوں نے انہیں خوب رگیدا ہے پر یہ کمبخت پھر بھی باز نہیں آتے۔ اپنی ٹانگ وکھری رکھنے کے شوق میں گھائل ہوئے جاتے ہیں۔

بہت سی یادیں چھم چھم کرتی دماغ کے گوشوں سے باہر نکل آئی تھیں۔

خلیفہ اسٹریٹ کے قہوہ خانوں میں بیٹھ کر دھواں دھار بولتے۔ الجواہری کی شاعری سنتے۔ کبھی مظفر النواب کو پڑھتے۔ شاہ فیصل بن غازی اور ساتھ نورالسید اور جعفر عسکری کے بخیے ادھیڑتے۔ حکومت کے چھاپے مارنے پر مار دھاڑ کرتے ہوئے بھاگتے۔ کبھی دمشق کبھی قاہرہ میں چھپتے پھرتے۔

جمال عبدالناصر کے نعرے لگاتے لگاتے انقلاب آگیا۔ گلی کوچوں میں نوری السعید کی لاش کے ٹکڑے بکھر گئے۔ عراق جمہوریہ بنا۔ پر کہاں استقامت تھی اس ملک کے مقدر میں؟ عبدالکریم قاسم کا زمانہ۔ بغاوتوں، سازشوں، کیمونسٹوں کے وار۔ بعث پارٹی کی چالاکیاں، عرب قوم پرستوں کے مفادات، بیچارے لوگ ان کو ترستے خون میں نہاتے رہے۔ عبدالسلام عارف، ڈاکٹر عبدالرحمٰن البزاز پھر جون 1966 کو بغداد کی گلیوں میں ٹینک توپوں کا گشت۔

بعث پارٹی نے کیمونسٹ سوچ پر توپیں چڑھائیں تو احمد بارزنجی جیسے لوگ عقوبت خانوں میں پھینک دیئے گئے۔ سو جتنوں سے باہر نکلا تو ملک بدر ہونے میں عافیت جانی۔ پہلے اٹلی پھر انگلینڈ۔ باہر کے ملکوں سے آئے ہوئے اس کے وقتاً فوقتاً ڈھیر سارے خطوط فائل میں کس درجہ سلیقے سے ترتیب وار لگے ہوئے تھے۔

تازہ لائے گئے قہوے کی چسکی بھرتے ہوئے وہ بولی تھی۔ ''آخر جدی آپ جب جدوجہد آزادی کے دنوں کی یادیں مجھے سناتے ہیں تو بتایئے اس لڑکی کا قصہ کیوں گول کر جاتے ہیں جو آپ کی جدوجہد کے ہر دن کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی انداز میں سامنے آتی ہے۔''

مصطفیٰ البرزانی نے رسان سے کہا۔ ''میری بچی میری عبیر، عراق کو جمہوریہ بنانے کی جدوجہد میں کوئی ایک لڑکی تھوڑی تھی، بہت ساری تھیں۔''

دونوں مسکرائے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

احمد بارزنجی نے ستائش بھری نگاہیں عبیر کے رخ روشن سے اٹھا کر دوست کے چہرے پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ ''یقیناً بہت کچھ یاد آیا ہوگا۔''

''بہت کچھ بھولتا کب ہے؟ رگ جان کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔''

ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ جو ماضی کی دلکشی اور شکستگی دونوں کو سنبھالے ہوئی تھی۔

بلوری شیشے میں سونے جیسے رنگ میں گھلے قہوے کے گھونٹ نے لبوں کو کیا چھوا کہ پل نہیں لگا تھا اور وہ وہاں پہنچ گیا تھا جہاں پہنچنے کی اسے ہمیشہ بڑی خواہش رہتی تھی۔ چھوٹے سے کپ کے افقی کنارے سے اپنے سامنے کی دیوار کے منظر کو اس نے یوں گہری نظروں سے دیکھا تھا کہ سین تو جیسے وہاں پینٹ ہوا پڑا تھا۔

اس شام بھی ان سب کا ٹولا المغرب اسٹریٹ کے ایک کیفے میں موجود تھا۔ نجب باشا کے علاقے میں دجلہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں المغرب اسٹریٹ پر اس قہوہ خانے کا مالک خود پکا کیمونسٹ اور انقلابی تھا۔

اس شام بھی اس نے قہوے کے گلاس کو ابھی منہ لگایا ہی تھا جب قہوے خانے کا دروازہ دھڑ سے کھلا۔ جیسے ہوا کا ایک لطیف، خوشگوار جھونکا رگ وپے میں لطیف سی سرشاری دوڑاتا اندر آئے۔ بس ایسے ہی وہ داخل ہوئی تھی۔ پاؤں تک پھولدار قرمزی رنگ کا لانگ اسکرٹ، گلے میں خوبصورت موٹے پتھروں کا ہار۔ سیاہ پھولوں والا اسکارف سر پر اوڑھے تھی۔ تعاقب میں ایسے ہی حلیے والی ایک اور لڑکی تھی۔

چہرہ تو ایسا تھا جیسے بہار کے اولین دنوں میں کھلنے والا کوئی پھول ہو۔ قہوہ جس کی چسکی بھرنے جا رہا تھا وہ تو ہاتھوں میں ہی جھولتا رہ گیا تھا۔ پٹر پٹر اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہاں موجود کچھ سینئر لڑکے کھڑے ہو کر اس کی پذیرائی کے لیے آگے بڑھے تھے۔ اس نے ابوالہیثم سے پوچھا تھا اور پتا چلا تھا کہ دونوں لڑکیاں بڈی اور ام زینب ترکمانی ہیں۔ سلیمانیہ سے پانچ سات کلومیٹر پر Sarchinar گاؤں سے تعلق ہے۔ حال ہی میں انگلینڈ سے آئی ہیں۔ عرصہ دس سال سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اپنے چچا کے پاس وہاں مقیم تھیں۔

اس نے بیٹھنے کے ساتھ ہی لڑکوں پر جو لعن طعن اور پھٹکار برسائی وہ شپٹا سا گیا۔ ''ذرا پولیس کا چھاپہ پڑا اور تم لوگ بھاگ گئے۔ کمبختو کچھ اپنا دم خم دکھاؤ گے یا یونہی عورتوں کی طرح بھاگتے پھرو گے۔ نوری السید ہماری بوٹیاں تک برطانیہ کو کھلا دے گا۔ بغداد پیکٹ دیکھ لیا ہے نا۔ پس تو بہتر نہیں کہ جان کسی Cause کے لیے جائے۔''

لڑکے سر نہوڑے بیٹھے اسے سنتے رہے تھے۔ اگلے دن کے احتجاجی جلوس کی تفصیل اس نے بتائی۔ اور جیسے آئی تھی ویسے ہی اٹھ کر چلی گئی اور احمد مصطفےٰ البرزانی کو محسوس ہوا تھا جیسے شام کے سارے چراغ گل ہو گئے ہیں۔

ان دنوں بغداد کے گلی کوچوں میں حشر ہوا پڑا تھا۔ اعظمیہ اور کرخ کے قدیمی محلے جن کے گلی کوچوں میں مرد کیا عورتیں اور چھوٹے بچے بھی مکے لہراتے تھے۔ ''سامراجیو عراق چھوڑ دو۔ روٹی مفت۔ مہنگائی ختم۔''

ہجوم کسی طرح کنٹرول میں نہیں آتا تھا۔ مامون پل کے آر پار لوگوں کا ہجوم تھا۔ انتظامیہ نہیں چاہتی تھی کہ لوگ ایک دوسرے سے ملیں اور یوں ہجوم جلوس کی صورت اختیار کر لے۔ بکتر بند گاڑیوں اور مشین گنوں کے منہ کھل گئے تھے۔ نوجوان لڑکے کٹ کٹ کر دجلہ میں گرنے لگے۔ ہدیٰ نے پرچم بہن کو پکڑایا۔ آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ چودہ پندرہ سالہ منتہا نے پرچم پکڑا اور چلی۔ ہدیٰ چلی۔ مصطفےٰ البرزانی نے احمد بارزنجی کا ہاتھ تھاما بھاگے اور دونوں بہنوں کو بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ اور لڑکے بھی دائیں بائیں چلنے لگے۔

ہدیٰ تو جیسے اس کی روح میں اتر گئی تھی۔ یہ تو ممکن ہی نہ رہا کہ وہ کوئی میٹنگ کوئی جلسہ جلوس مس کرتا جس میں ہدیٰ شامل ہوتی۔ ہدیٰ کی بہن اور وہ بچ گئے پر ہدیٰ خون میں نہا گئی۔

☆......☆

سالوں بعد آنے والے اس مہمان کو تین دن کے قیام پر ہزاروں منتوں سے روکا گیا۔ عبیر اور ڈاکٹر مسعود نے گاؤں کے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے درمیان وقت کا زیادہ حصہ گزارا۔ راتوں کو ایران عراق اور خلیجی جنگ جیسے موضوع زیر بحث آئے۔ عبیر کا انداز بہت جذباتی ہوتا۔

یہ امریکا یہ یو این او، یہ سلامتی کونسل کتنے بڑے فراڈ، کتنے بڑے cheaters ہیں۔ موجودہ حکومت کو مارنا چاہتے ہیں۔ بھئی مار دو اسے۔ خلیجی جنگ کا مجرم ہے۔ بات نہیں سکتا ہے۔ پر غریب عوام کو کس بات کی سزا؟ کمال ہے۔ وہ اتنی سی تھی کہ حکمراں کی باتوں کو بھی نہیں اور حکمراں ایسا جیالا اور بہادر کہ وہ امریکا اور اس کے اتحادیوں کے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھاتا۔ مانا کہ کویت عراق کا حصہ ہے۔ یہ سب بدمعاشیاں برطانیہ کی تھیں کہ جس نے کویت کے ٹکڑے کو علیحدہ کر کے اسے صبا خاندان کو دان کرتے ہوئے وہاں کے شیخوں کی دولت سے اپنے بینک کالے کر لیے۔

ہاں البتہ بڑوں کی باتوں میں تاسف اور دکھ کے ساتھ ساتھ وہ ایک نئی تصویر بھی دیکھتی۔ ایرانی انقلاب سے خائف امریکا، عراق کی بڑھتی فوجی طاقت سے خائف اسرائیل نے دونوں کو لڑایا۔ عراق کو اسلحے کی فراہمی امریکا نے کی۔ سیاست کے عیارانہ انداز۔

رہا کویت تو وہ ہمیشہ سے عراق کا حصہ تھا۔ چلو یہ احمق صدام ذرا موقع محل دیکھ لیتا۔ اگر حملہ کر دیا تھا تو وہاں انتخابات کروا دیتا۔ کویتی تو صبا خاندان سے ناکوں ناک آئے ہوئے تھے۔ مگر کرواتا کیسے؟ اپنے لوگوں کو تو نکیل ڈالی ہوئی تھی۔ زبانوں پر تالے لگوا رکھے تھے۔

اب رہی یہ عراقی قوم پر پابندیاں تو یہ بھی ان کی پلاننگ کا ایک حصہ ہے۔ احمد بارزنجی بیرونِ ملک ہونے کی وجہ سے حالات کی باریکیوں سے زیادہ آگاہ اور امریکا کی ریشہ دوانیوں کے ہتھکنڈوں سے زیادہ واقف تھے۔ عبیر حیران تھی جب وہ کہتے تھے کہ امریکی دراصل حکومت کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس حکومت کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آتا۔ کردوں کو جس انداز میں رگڑا دیا گیا۔ ان کے گاؤں زہریلی گیس سے جس انداز میں ختم ہوئے اس کے ذکر سے ہڈیوں میں خون جمتا ہے۔ جنوب کے شیعہ قبائل کا جو حال ہوا۔ وہ بھی ظلم کی بدترین شکل تھا۔

اور جب انہوں نے یہ کہا۔ ''اب ایٹمی اور کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری اور ان کے پھیلاؤ کا شور وغوغا سب فضول اور اوچھی باتیں ہیں۔ اپنی انہی باتوں کے گھوڑے پر چڑھ کر ایک دن وہ یہاں آ جائے گا۔''

اس نے سہم کر یہ سنا۔ اور گھائل سی آواز میں بولی۔ ''مصطفےٰ جدی امریکا بغداد پر قابض ہو جائے گا۔''

''خدا نہ کرے مگر حالات جس رخ پر جا رہے ہیں وہ حوصلہ افزا نہیں۔''

اور وقت رخصت مسعود کے تین چار وعدے تھے۔ بغداد ان کے گھر آنے، اس کے ساتھ متاثرہ خاندانوں سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | f PAKSOCIETY

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

www.paksociety.com

ملنے۔ ان کے بچوں کے چیک اپ اور علاج کے سلسلے میں مدد دیتا۔

وقت رخصت احمد بارزنجی نے اس کا ماتھا چوما اور کہا تھا۔ ''کاش عبیر جیسی میری کوئی پوتی یا نواسی ہوتی۔''

اور اس نے پل نہیں لگایا تھا بولنے میں۔ ''ایسا کیوں کہا آپ نے؟ آپ تو ہمیشہ مجھے اپنے جدی ہی لگے ہیں کہ آپ کے بارے میں سنتی تھی اور اپنے متعلق آپ کا لکھا ہوا پڑھتی تھی۔ اب میں آپ سے یہ بھی شکایت نہیں کر سکتی کہ آپ اتنے طویل عرصے بعد کیوں آئے کہ وجہ میرے سامنے ہے۔''

☆......☆

پھر بہت سارے دن کیا بہت سارے مہینے گزر گئے۔

اور اس سہ پہر جب وہ قطیبہ اسٹریٹ کے اسٹڈی سرکل کی ملازم رعنا کے ہمسائے میں بصرہ سے آنے والی فیملی کی بچی جب والمنصور اسپتال دکھانے لائی تھی اور Pediatric وارڈ کے برآمدے میں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس نے مسعود بارزنجی کو دیکھا تھا۔

اس کی آنکھیں مسعود کو دیکھ کر ٹمٹمائیں نہیں بس ذرا بجھی سی مانوسیت کی روشنی جھلملائی تھی وہاں۔ مسعود رک گیا۔ شوق سے اسے دیکھا۔ معذرت کی کہ اسے واپس جانا پڑا تھا۔ ابھی کل شام ہی وہ عراق پہنچا ہے۔

''خود سے چند قدم پیچھے کھڑی عورت کے ساتھ کھڑی نو دس سالہ بچی کے بارے میں اس نے مسعود کو بتایا کہ بچی کے پیٹ پر ٹیومر ہے چھ ماہ پہلے ایسے ہی ٹیومر کا بصرہ میں آپریشن ہوا تھا۔ اب پھر یہ پیدا ہو گیا ہے۔ ڈاکٹروں نے بس دو تین ماہ بچی کے مزید زندہ رہنے کا کہا ہے۔''

مسعود جھکا۔ بچی کے پیٹ سے فراک اٹھا کر دیکھا۔ اور پھر قریب کھڑی افسردہ سی عبیر کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''Lymphatic Cancer ہے یہ۔ بصرہ کے گردونواح کی بہترین زراعتی زمین اتحادیوں کے میدان جنگ تھے۔ یورینیم شیلوں کی بھرمار نے زمین کو زہر آلود کر دیا ہے۔ اب غریب لوگوں کو اس زمین میں اگے ٹماٹر آلو پیاز بھی کھانے تھے اور پھر ان کا شکار بھی ہونا تھا۔''

وارڈ ٹیڑھی میڑھی ٹانگوں، پھولے پیٹوں، مدقوق چہروں، بجھی آنکھوں اور ٹیڑھے میڑھے ہاتھوں والے بچوں سے بھرے پڑے تھے۔ ڈاکٹر بیچارے کیا کریں۔ نہ دوا نہ دارو۔ نہ بجلی نہ بس۔ نہ دودھ نہ خوراک۔ مر رہے ہیں کہ ظالم حکمرانوں اور امریکا و برطانیہ نے مرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

مسعود نے دیکھا تھا اس کی چمکتی آنکھوں سے دو آنسو اس کے سیاہ کارڈیگن پر گرے تھے۔

☆ جھیل Baikal اپنے کشیدی نظام کے حوالے سے بھی منفرد مقام کی حامل ہے جس کے باعث یہ دنیا کی صاف و شفاف جھیل ہے۔ اس جھیل میں بعض نایاب ترین حیاتیاتی اقسام بھی پائی جاتی ہیں جو دنیا کی اور کسی جھیل میں نہیں پائی جاتی جیسا کہ میٹھے پانی کی سیل (Fresh Water Seal) ہے۔ گرم چشموں کے ذریعے جھیل کو تازہ پانی Living water مہیا ہوتا ہے جو آکسیجن سے لبریز پانی کو جھیل میں پمپ کرتے ہیں جس کی وجہ سے اس جھیل کی گہرائی میں بھی زندگی پائی جاتی ہے اس کے برعکس تمام گہری جھیلوں کی گہرائی مردہ ہوتی ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ کوئی عام جھیل نہیں۔

.....☆.....☆.....

☆ سطح سمندر سے 12 ہزار 5 سو فٹ بلندی پر Peru کی جھیل Titicaca دنیا کی بلند ترین جھیل ہے جس میں کسی بڑے بحری جہاز کی مدد سے گھوما جاتا ہے۔

☆ سطح سمندر سے ایک ہزار 3 سو 16 فٹ نچائی پر دنیا کی سب سے نیچی جھیل بحیرہ مردار ہے جو اردن اور اسرائیل کے درمیان ہے۔

☆ دنیا میں رقبے کے حوالے سے بڑی 25 جھیلوں میں سے 10 شمالی امریکا میں ہیں ان میں سے 9 کینیڈا میں ہیں (جو کہ دنیا میں کسی بھی ملک میں سب سے زیادہ بڑی جھیلوں کی تعداد ہے) جب کہ 7 ایشیا میں (جن میں دو بڑی ترین ہیں) یورپ میں کوئی نہیں۔ دو جنوبی امریکا اور ایک آسٹریلیا میں واقع ہے۔

☆ امریکا میں موجود چھ بڑی جھیلیں آئس ایج کی پیداوار ہیں پانچ جھیلیں ایسی جگہوں پر ہیں جہاں آئس ایج میں گلیشیئر ہوتے تھے۔

مرسلہ: راحت علی۔ کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

''اچھا خدا حافظ۔'' وہ آگے بڑھنے لگی۔
تبھی مسعود نے کہا۔ ''عبیر میں رات کا کھانا آپ لوگوں کے ساتھ کھاؤں گا۔''
رات بہت ٹھنڈی تھی۔ خالد بن ولید روڈ کا یہ گھر اندر باہر سے تاریخی اسٹائل کا انداز لیے ہوئے تھا۔ چند کمروں کی سجاوٹ اگر خالصتاً مغربی انداز کی تھی تو وہیں عراقیوں کی مخصوص روایت کا حامل ایک کمرا بھی تھا۔ طعام کا بندوبست وہیں تھا۔ اور بہت گھریلو محبت بھرا ماحول تھا جہاں خاتون خانہ کے ساتھ ساتھ دونوں لڑکیاں بھی خوش دلی و خوش طبعی سے باتوں اور سروس میں مگن تھیں۔ کھانوں کی بھرمار نہیں تھی۔ چاندی کی سینی میں ملفوبہ آیا تھا۔ گھر کے سب افراد بمعہ گھر کی خادمہ کے بیٹھے اور کھانا کھایا گیا۔
قہوہ پیتے ہوئے عبیر کی والدہ نے کہا۔ ''ہم اپنی اس بیٹی کا کیا کریں جس کی ہر سانس کے اتار چڑھاؤ میں عراق کی محبت ہے۔ حکومت کے کاموں پر اعتراض ہے۔ بعث پارٹی کی پالیسیوں پر تنقید ہے۔ کس مشکل سے سمجھاتے ہیں کہ عقل کو مروا دیں گے یہ حکمران تمہیں بھی اور ہمیں بھی لیکن یہ سنتی ہی نہیں۔''
مسعود نے دفعتاً نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ دیوار کے ساتھ پشت جوڑے قہوہ کا بلوری کپ ہاتھوں میں تھامے بے نیازی سے بیٹھی اسے چھوٹے چھوٹے گھونٹوں سے پی رہی تھی۔ کمرے میں کینڈل لائٹ بکھری ہوئی تھی۔
والدہ نے تنقید کا پھر وار کیا۔
''اب ہماری کیا مجال کہ لوڈشیڈنگ میں ہم سی پی یو یا ایمرجنسی لائٹ جلائیں۔ سچ تو یہ ہے مسعود کہ اسے یہ ہمارا قدرے ڈھنگ سے رہنا بھی بہت کھلتا ہے۔''
مسعود ہنسا تھا۔ ایک بار پھر اسے دیکھا تھا۔
الف لیلہ کی سرزمین پر نزار قبانی کی باغیانہ شاعری جیسا ایک کردار۔
اور رات کو انہوں نے اسے جانے ہی نہ دیا۔ روک لیا۔
عراقی نیشنل آرکیسٹرا رباط ہال میں پروگرام پیش کر رہا تھا۔ مسعود اس میں مدعو تھا۔ اس نے فون کیا۔
''عبیرا اگر تھوڑے سے وقت کے لیے آجاؤ۔''
جواباً وہ بولی تھی۔ ''مسعود لعنت بھیجو وہاں جانے پر۔ چلو میں تمہیں وہ میوزیم دکھا کر لاؤں جہاں عماریہ شیلٹر میں پناہ گزین بوڑھے بچے اور غریب عورتیں امریکیوں کی تباہ کن بمباری کے ہاتھوں شہید ہوئیں۔''
وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''کچھ رحم کرو۔ زندہ رہنے دو مجھے۔ میں ابھی کرامہ اسپتال سے آرہا ہوں۔'' وہ زبردستی گھسیٹ کر اسے آرکیسٹرا دکھانے لے گیا۔ رباط ہال لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ نشستیں اگلی رو میں تھیں۔
کنڈکٹر Podium پر چڑھا ہوا تھا۔ عبیر نے عراق کے اس مایہ ناز کنڈکٹر محمد امین عزت کو گہری نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کا بایاں بازو متحرک نہ تھا اور اس ہاتھ کی انگلیاں باہم جڑی ہوئی تھیں۔ ''ارے یہ کیا۔'' مضطرب سی آنکھوں سے اس نے مسعود کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہونے والے المیے سے تو وہ آگاہ ہی نہ تھی۔ پاور سپلائی کی فراہمی باقاعدہ نہ ہونے کی وجہ سے عام عراقیوں کی طرح ملک کا یہ مایہ ناز فنکار بھی کیروسین آئل استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ کہیں کھانا پکاتے ہوئے چولہا پھٹ گیا تھا، امین عزت کی بیوی جل کر مر گئی اور اسے بچاتے ہوئے اس کا بازو بھی جل گیا اور انگلیاں جڑ گئیں۔
''اف میرے خدا۔'' وہ دکھ اور اضطراب کے گہرے سمندر میں گر پڑی۔ ایک ہوک سی اس کے اندر سے اٹھی۔
تبھی ایک عجیب سی بات ہوئی۔
آرکیسٹرا شہرہ آفاق موسیقار چائیکوسکی کی مشہور صنفی NutCracker Suite کی ریہرسل کر رہا تھا۔ مگر بہت بے آہنگی سی نظر آئی تھی پھر جیسے سب کچھ رک گیا۔ تاسف اور دکھ بھرے لہجے میں محمد امین عزت کی آواز بلند ہوئی تھی۔
''Clarinets میں سے ریڈز غائب ہیں، وائلن میں سے تاریں۔ میوزیکل سکورز سخت ہو گئے ہیں۔ پرانے وقتوں کے جھلی نما کاغذ کی طرح۔ کاغذ کا حصول ان کے لیے مشکل بن گیا ہے۔ اس قدیم اور شاندار آرکیسٹرا کے صرف دو لوگ یہاں رہ گئے ہیں۔ باقی کے ساری دنیا میں جہاں جہاں ان کے سینگ سمائے، چلے گئے ہیں۔ میں انہیں الزام نہیں دیتا۔ آخر کو پیٹ اور ضروریاتِ زندگی کے کتنے مطالبات ہیں۔''
عبیر کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے مسعود سے کہا کہ آخر ہم لوگ اتنے بزدل کیوں ہیں؟ بولتے کیوں نہیں؟ میں اسٹیج پر جاتی ہوں۔
وہ بے تاب تھی۔ کھول رہی تھی۔ مسعود اگر اس کے ہاتھ نہ تھامے بیٹھا ہوتا اسے اسٹیج پر چڑھ جاتا تھا۔
شو ہوا۔ جو کچھ فنکار کر سکتے تھے وہ انہوں نے کیا مگر

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

جیسے مزہ نہ آئے۔ جیسے سارا لطف کرکرا ہو جائے۔ وہ والی بات تھی۔

ہم بھی کیا کریں۔ ہم انہیں باہر سے نہیں منگوا سکتے ہیں۔ پابندی عائد کردی گئی ہے۔ اپنے طور پر جو کچھ ہو سکتا ہے اس سے کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک دن جب یونہی مسعود نے کہا۔ ''عبیر بہت مدت گزری بغداد کے کوچہ و بازاروں میں نہیں پھرا۔ جی چاہتا ہے کسی دن چکر لگاؤں۔ پرانی یادیں تازہ کروں۔''

''کمال ہے۔'' وہ ہنسی تھی۔ ''پہلے کیوں نہیں کہا۔ چلو ابھی چلتے ہیں۔''

''آج نہیں۔ کسی اور دن پر رکھو۔ آج تو کہیں پارک، کسی باغ، کسی کھلی جگہ پر جانے کا موڈ ہے۔''

''ارے ہاں مسعود تم عراق کے مایہ ناز آرٹسٹ محمد غنی سے ملے ہو یا نہیں۔ اس کے اسٹوڈیو کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ امریکیوں کی 1991 کی بمباری میں۔ اور جانتے ہو دنیا بھر میں مانے گئے اس فنکار نے کیا کہا۔ عراقی اپنے ملک پر بے حد نازاں قوم ہے۔ میں تو کبھی عراق چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہیں رہوں گا یہیں مروں گا۔''

اس ایک ہفتہ میں دونوں نے ایران، عراق جنگ کے نامعلوم سپاہیوں کی یاد میں بنائی جانے والی یادگاروں کو دیکھا۔ خلیجی جنگ کی تباہ کاریوں اور اس کے نتیجے میں لگنے والی پابندیوں پر عبیر ہیر پھیر کر بحث کرنے سے باز نہ آتی کہ یہ جنگیں کیوں ہوئیں آخر۔ مسلمان نے مسلمان کا گلا کاٹا۔ اور دنیا کے مفاد پرستوں کو خوش ہونے کا موقع دیا۔

شہدا برج پر دونوں کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے کی تصاویر بنائیں۔ عراق کو جمہوریہ بنانے کی ہر جدوجہد اسی پل پر آکر ختم ہوتی تھی۔ عبیر نے اپنے دادا کی بہت پیاری سی ہدیٰ کو یاد کیا اور دعا کی۔

اگلا ڈیڑھ دن دونوں نے کرخ کے راؤنڈ سٹی میں اس گھر کو ڈھونڈنے میں ضائع کیا جہاں کبھی مسعود اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔

عبیر قدیم بغداد کے ان تنگ و تاریک گلیوں اور ان میں بکھرے بازاروں سے خود بھی ناآشنا تھی۔ حیرت سے دیکھتی تھی۔

''دیکھو ہمیں اپنی ملکی ثقافت کو جو ان گلی کوچوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ دیکھنے کی کتنی ضرورت ہے۔ عبیر میرا گھر گلی کی نکڑ پر تھا۔ بیٹھک کا دروازہ متوازی گلی میں کھلتا تھا۔ بالمقابل جو گھر تھا وہاں نبیذ بنتی تھی۔ اس گھر کے ساتھ کھجور کے درختوں کا جوڑا تھا اور جانتی ہو وہ درخت کتنے پرانے اور کتنے تاریخی تھے۔''

اور عبیر نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ''تم کتنے عرصے سے آرہے ہو عراق اور تم نے کبھی اپنے بچپن کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔''

''کی، عبیر کی۔ بہت بار کی۔ مگر الجھے ہوئے دھاگوں کے گچھے جیسے اس گورکھ دھندے میں کچھ نہیں ملا۔ تمہیں لایا تھا کہ شاید کچھ مدد ہو جائے۔''

''چلو ایک بات تو ہے کہ تمہارے طفیل میں نے بھی یہ سب دیکھا۔ ایک آدھ بار میں یہاں کسی فیملی کے بچوں کو دیکھنے آئی تھی، مگر بھول بھلیوں میں نہیں پڑی کہ جو لوگ ساتھ تھے وہ راستوں سے شناسا سا تھے۔ یہاں کی کچی پکی گلیاں سڑکیں، تنگ بازار اور ان میں بکھرا قدامت کا حسن میں نے تب نہیں دیکھا تھا۔''

اس کا لہجہ معمول کا سا ہی تھا۔ بس دکھ کی گھلاوٹ ضرور محسوس ہو رہی تھی جب وہ بات کرتا تھا۔

''عراق کو جہنم میں دھکیل دیا ہے ان ظالموں نے۔ نو فلائی زون کی کسر باقی تھی۔ اردن تک پہنچنے کے لیے چوبیس گھنٹے کا سفر۔ اتنے لمبے سفر کے تصور سے مجھے ہول آرہا ہے۔''

عبیر نے یہ سنا مگر سر اٹھا کر اسے نہیں دیکھا۔ اسے جانا تھا وہ چلا گیا۔

دو تین دفعہ عبیر نے نہ چاہتے ہوئے بھی موبائل چیک کیا۔ کوئی پیغام، کوئی بات۔ کچھ نہیں تھا وہاں۔ پر چند دنوں بعد ایک چھوٹا سا خط اسے ملا تھا۔

مواقع بہت ملے تھے۔ پر دل کی بات کہنے میں کیا چیز مانع تھی۔ نہیں جانتا۔ یادگار شہدا پر جھیل کے پاس میں نے کہنا چاہا تھا۔ جب تم نے میرے ساتھ ساتھ ٹہلتے ہوئے نظار قبانی کو گنگنانا شروع کیا تھا۔

ہمارے صحراؤں کا تیل
آگ اور شعلوں کا خنجر بن سکتا ہے
ہم اپنے آباء کے دامن پر داغ ہیں
ہمارا تیل فاحشاؤں کے قدموں میں پڑا ہے

میں نے کہنا چاہا تھا۔ عبیر دھیرے دھیرے یہاں اونچی آواز میں بغاوت کی کوئی بات خواہ سامراجیوں کے خلاف ہو یا حکمرانوں کے۔ گولی کی طرح چل جائے گی۔ کوئی نہیں جانتا۔ شاعر نے کیسے دھکے کھائے تھے۔

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

مگر میں کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے اچھا ہی نہیں لگا تمہیں ٹوکنا۔

گو عبیر، عراق کا حسن ہے۔ بغداد کی خوبصورتی ہے۔ مگر میرے لیے اس کی رعنائی اس کا گداز دل ہے۔ جس میں بسنا میری دلی تمنا ہے۔ میں کرد بھی ہوں اور سنی بھی۔ کرد نا قابل اعتبار ہیں۔ کسی تھالی کے ڈھکن نہیں کسی سینی کا پیندا نہیں۔ ایرانی، عراقی، ترکی اور عرب تہذیبوں کے ساتھ ساتھ اپنے مقامی رنگ میں بھی رنگے، اپنی شناخت، اپنی نسل کے لیے تڑپتے۔

کیا کریں بیچارے۔ تین ملکوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ کبھی ترکوں سے جوتے کھاتے اور کھلاتے ہیں، کبھی ایرانیوں سے پھڈے کرتے ہیں، کبھی عراقیوں کے خلاف بغاوت علم بلند کرتے، کبھی برطانیہ اور کبھی امریکیوں کے آلہ کار بنتے ہیں۔

اور عبیر نے خط بند کرتے ہوئے بس اتنا کہا۔

''اب میں شیعہ ہوں۔ عرب ہوں تو بھلا اس سے کیا؟''

پروفیسر ڈاکٹر احمد حلاوی کی میڈیسن کلاس میں جب پروفیسر اپنی عادت کے مطابق موضوع سے پھسل کر دور جدید کی دریافت شدہ بیماری شیزو فرینیا میں الجھا۔ تو عبیر جو بظاہر منہ اٹھائے لیکچر سننے میں متوجہ ہونے کا بھرپور تاثر دیتی تھی مگر الجھے ذہن سے خود سے کہے چلی جاتی تھی۔ ''ہائے مجھے تو۔ شیزو فرینیا ہی ہو جائے۔ اس منحوس مارے وطن کی محبت کے مالیخولیے نے میرا دن رات کا چین حرام کر دیا ہے۔ جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے اس کے وجود پر گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔''

دفعتاً اس کے ساتھ ابھی باہر سے آکر بیٹھنے والے جلال شیلابی نے اپنے موبائل کی اسکرین اس کے سامنے کر دی۔ اس نے سر جھکا کر پڑھا۔ ''ارے۔'' نا قابلِ بیان حیرت سے آنکھیں جیسے لبالب بھر گئی تھیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے جلال شیلابی کو گھورا۔

بس لمحوں کی دیر تھی۔ ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے پھر چوتھے حتیٰ کہ آدھی کلاس خبر کی زد میں تھی پھر جیسے خبر کے غبارے کے ابھراؤ زدہ پیٹ کو کسی نے نوکیلی پن سے چھو دیا اور وہ پھٹ گیا۔ کلاس میں طوفان آ گیا تھا۔

نائن الیون کا حادثہ زیرِ بحث تھا۔ رنگ رنگ کے تبصرے اور باتیں گردش میں تھیں۔ امریکا کے محفوظ گھر کی فصیل میں کسی نے ہتھوڑا مارنے کی جرأت کی۔ بڑی بات۔ بڑی بات۔

سارا بغداد اور قصاں تھا۔ لوگوں کے تپتے جذبات پر جیسے ٹھنڈے ٹھار پانی کے چند چھینٹے پڑ گئے ہوں جیسے پیاسے ہونٹوں کو یخ انگلی نے چھو لیا ہو۔

مسعود ان دنوں نیو یارک میں تھا۔ رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا اس سے۔ کوئی چار پانچ دنوں بعد اس کی میل آئی۔

''نیو یارک تو جیسے کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا ہے۔ ایک نیا ڈراما۔ اب دیکھنا اس کی آڑ میں اس ریاست کی چالاکیاں۔ کرتی کیا ہے یہ؟ با اثر یہودیوں نے تو ابھی کہنا شروع کر دیا ہے۔ عراق پر حملہ ناگزیر ہے۔ افغانستان کا مکھو پہلے ٹھونپا جائے یا عراق کا۔''

آنے والے مہینوں میں مسعود کے بھیجے گئے غیر ملکی اخبار نویسوں کے تجزیئے ان کی رپورٹیں وہ پڑھتی اور کڑھ کر خود سے کہتی۔ عراق کے کیمیائی اور ایٹمی ہتھیاروں کے ذخیروں سے کسی اور کو کوئی خطرہ لاحق ہو نہ ہو مگر اس اسرائیل کو پچیس لگ گئے ہیں اور امریکا کو تو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ایک اسرائیل محفوظ ہو، دوسرے تیل کے ذخائر قبضے میں رہیں، باقی سب خیریت ہے۔

2002ء کے آخری دنوں میں مسعود عراق آیا۔ وہ سو رہی تھی جب موبائل کی بیپ سے جاگی۔ نیند میں ہی اس نے ہیلو کہا تھا۔ پر مسعود کا جان کر وہ چھلانگ مار کر بستر سے اٹھی۔

''کب آئے؟ اور بتایا کیوں نہیں؟ کہاں پر ہو؟'' ایک ہی سانس میں ڈھیر سارے سوالات۔

وہ اربیل سے بول رہا تھا۔ ''کل شام کو پہنچوں گا۔''

پیچھے سے کسی نے قرمانجی (کردوں کی زبان) میں کہا۔ ''چار دن تو رہو۔ بھاگنے بھی لگ گئے ہو۔''

عبیر کے پوچھنے پر مسعود نے بتایا۔ ''میری اماں ہیں۔ پانچ دن ہو گئے ہیں گوڈے منڈ بیٹھا ہوں مگر وہ رجی نہیں۔ دراصل ڈیموکریٹک پارٹی آف کردستان نے دعوت دی تھی۔ عمان کی بجائے استنبول کا راستہ چنا ہے۔''

مہمان کے استقبال میں تکلف ہرگز نہیں تھا۔ ہاں البتہ ایک پُر جوش دلی اہتمام ضرور تھا۔ عبیر نے لگن سے مسکوف مچھلی کی عراقی ڈش بنائی۔ عراقی قبہ بنایا۔ مسعود بہت سے تحائف لایا تھا۔

عبیر بالعموم سادہ مزاج لڑکی تھی مگر پھر بھی اسے یہ بے

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

حد اچھا لگا۔

Cool Water کو اپنے ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے اس نے اتنا کہا۔ ”مسعود میں نہیں کہوں گی کہ تم یہ سب کیوں لائے۔ مجھے اچھا لگا ہے۔“

اور جب وہ دونوں قہوہ پیتے اور باتیں کرتے تھے۔ مسعود نے دکھ سے بوجھل لمبی سانس کھینچ کر کہا تھا۔ ”مجھے تو عراق کی بربادیوں کے چرچے جیسے آسمانوں تک میں سنائی دیتے ہیں۔“

عبیر نے دکھ اور یاس میں لپٹی ایک لمبی آہ نکالی۔ ”بہت کم ظرف دشمن ہے۔“

”دشمن ہمیشہ کم ظرف ہوتا ہے۔“

اور پھر مسعود نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ وہ اچھل سی پڑی۔

کہا تو صرف اتنا ہی تھا کہ عبیر یہ ممکن ہے تم اپنے بھائی مشعل کے پاس انگلینڈ چلی جاؤ۔

”ارے مر کر بھی نہ جاؤں اس پوڈل کے دیس میں۔ مجھے تو ویسے ہی اس دم ہلاتے کتے سے نفرت ہے۔“

”چلو اگر یہ پسند نہیں تو شادی کر کے میرے ساتھ چلی چلو۔“

”مسعود کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ مشعل کے پاس چلی جاؤں۔ شادی کر لوں اور تمہارے ساتھ چلی جاؤں۔ کیوں مشعل کے پاس جاؤں اور رہی شادی تو وہ میں نے ضرور تم سے کرنی ہے لیکن میڈیکل پورا کرنے پر۔“ عبیر نے اس کی آنکھوں میں بکھرے چہرے پر پھیلے بہت سے جذبات پڑھے۔ انہیں سمجھی اور بولی۔ ”عراق کی لاکھوں بیٹیاں ہیں مسعود۔ میں اکیلی نہیں۔ اور ہاں میں اپنا وطن چھوڑ کر کبھی کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”چلو چھوڑو ان سب کو۔ آؤ تمہیں میں زوارہ پارک دکھا کر لاؤں۔ صدام کے چند خوبصورت کاموں میں سے ایک یہ بھی ہے۔“

مارچ کے پہلے ہفتے انٹرنیٹ پر ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے اگر مسعود کے لہجے میں اضطراب سا تھا تو وہیں وہ بھی اضطراب کی سولی پر چڑھی ہوئی تھی۔

”ابھی چند دن پہلے میں نیویارک ٹائمز کے مضامین دیکھ رہی تھی۔ امریکا کے پاس عراق کے لیے تحدید کا راستہ تو موجود ہے عراق نے کبھی بھی کوئی کام خواہ ایران عراق جنگ ہو یا کویت پر حملہ پیشگی اجازت یا مرضی کے نہیں کیا۔ اسی لیے اسرائیل پر چڑھ دوڑنے کا کوئی منطقی جواز نہیں۔ ساری باتیں فضول ہیں۔ یہ بڑے لوگوں کے سیاسی ہتھکنڈے ہیں کہ عراق

کیفی اعظمی

(1920-2002) بھارت کے نامور اردو شاعر، وہ اتر پردیش کے ایک چھوٹے سے قصبے اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ والدین نے اختر حسین رضوی نام رکھا۔ مشہور دینی مدرسے سلطان المدارس میں داخلہ لیا۔ جہاں انہوں نے طالب علم یونین بنائی اور مدرسے میں ہڑتال کرادی۔ جو ڈیڑھ سال تک جاری رہی۔ 1943ء میں ممبئی آگئے اور ایک اردو اخبار میں کام کرنے لگے، تاہم اسی سال وہ فلموں کے لیے گانے اور سکرین پلے لکھنے لگے اور ہزاروں کی تعداد میں گانے لکھے۔ پہلی غزل 11 سال کی عمر میں لکھی تھی، جس کا پہلا مصرع تھا۔

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے

بعد میں اس غزل کو بیگم اختر کی سوز و گداز سے بھرپور آواز نے لافانی بنادیا۔ انہوں نے فلم ہیر رانجھا کا گیت ”یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں“ لکھ کر فلمی دنیا میں تہلکہ مچادیا۔ انہوں نے کاغذ کے پھول، حقیقت، ہیر رانجھا، آخری خط اور شعلہ اور شبنم جیسی فلموں کے نغمے لکھے۔ ان کی تصانیف میں یہ کتب شامل ہیں۔ (۱) جھنکار (۲) آخری شب (۳) آوارہ تو دے (۴) ابلیس کی مجلس شوریٰ۔ بھارتی حکومت نے ان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے کئی اعلیٰ ایوارڈ دیے۔

مرسلہ: ثواب علی، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ایٹمی اور کیمیائی ہتھیار بنا رہا ہے اور دنیا کو شدید خطرہ ہے۔ ساری بکواس جنگ کا طبل بجانے کی ہے۔ وجہ تو وہی پرانی تیل اور مشرقی وسطی پر گرفت کی ہے۔ پر مصیبت تو یہ بھی ہے کہ اپنے غدار بھی یہی سوچتے ہیں کہ سامراجی عراقیوں کے حق میں بہتر ہوں گے۔ میرے تو اپنے ماموؤں کی یہی سوچ ہے۔ کسی اور کا رونا کیا روؤں۔ کبھی کبھی مسعود میں سوچتی ہوں کہ اس عراق اور خاص طور پر بغداد کے مقدر میں تباہیاں کیوں لکھ دی گئی ہیں۔"

اور پھر تباہی کوکتی ہوئی آ گئی تھی۔ ماضی کے ہلاکو خان نے اس وقت کی عراقی فوج اور حکومت کے لوگوں کو خریدا اور بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجائی۔ آج کے ہلاکو خان نے بھی حاصل کر لیے ہیں۔

بغداد ڈھے گیا۔ اور عبیر کو آگ و بارود سے محفوظ رکھنے کے لیے گاڑی میں بٹھا دیا گیا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھی۔ گردوپیش کو دیکھا۔ کلیجہ تو جیسے پھٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ امنڈتے آنسوؤں کی یلغار نے حملہ کیا۔ اس نے بھی انہیں روکا نہیں۔ بہنے دیا۔ رخساروں پر لڑیوں کی صورت ان کا بہاؤ۔ وقفے وقفے سے کسی چھوٹی سی سسکی کی صورت میں اندرونی درد کا اظہار۔ ولدہ نے یہ سب دیکھا تھا۔ اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے اس نے خود سے کہا تھا۔ آخر ہمارے پاس اپنے وطن کی بربادی پر نذرانہ پیش کرنے کے لیے اس کے علاوہ ہے ہی کیا۔

بغداد موصل روڈ پر چڑھنے سے پہلے ڈرائیور نے گاڑی شہر کی اندرونی چھوٹی چھوٹی سڑکوں سے گزاری تھی۔ بغداد کا مضافات ترقی پذیر شہروں جیسا ہی تھا۔ بے ترتیب اور بکھرا ہوا سا۔ مگر اس بے ترتیبی پر جنگ کا فضلہ جو رنگ جما رہا تھا وہ وحشت ناک تھا۔

سریۃ الثانیہ تک چھ پوسٹیں بھگتانی پڑیں جو سب کی سب امریکی سپاہیوں کے قبضے میں تھیں۔

حفاظتی انتظامات۔ ریت کی بوریوں کی دیواریں جنہیں لوہے کی تاروں کے حصار میں قید کیا گیا تھا۔

پہلی چیک پوسٹ پر گاڑی روک لی گئی۔ امریکی فوج کی جی آئی بٹالین کے چھ جوانوں نے گاڑی کو اپنے حصار میں لے لیا۔ سواریوں کو اترنے اور تلاشی دینے کو کہا گیا۔

کیسا المیہ۔ ہمارا وطن، اور ہم تلاشی دیں انہیں جو غاصب ہیں۔ جارح ہیں۔ بندوقوں اور گولیوں کے سروں پر تیرتے یہاں آئے ہیں۔ رحم پروردگار رحم۔

اس کے بڑے ماموں نے اسپیشل اجازت نامہ بغداد زون کے چیف ایڈمنسٹریٹو کے ذاتی دستخطوں سے دیا تھا کہ زیادہ پوچھ پڑتال نہ کی جائے مگر پھر بھی یہ سلسلہ جاری تھا۔

عراقی پھولوں سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ اس نے سوچا کہیں کہیں ایسی ہی کسی دیوار پر پھیلے پھولوں کی بیل بچھی نظر آتی تھی۔

تیسری چیک پوسٹ پر عبیر کا نام لکھتے ہوئے پوچھا گیا۔ اس کا مطلب؟

عبیر نے تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اس سے مطلب؟" مگر ولدہ نے بیٹی کو ڈپٹا اور ان سے مخاطب ہوئی۔ "یہ عربی زبان کا لفظ ہے زعفران کی خوشبو اور کیسر کا رنگ مل جائے تو اسے عبیر کہتے ہیں۔"

قدرے عمر رسیدہ کالا امریکی ہنسا اور بولا۔ "تمہاری بیٹی اپنے نام کا عکس ہے۔"

یہ چھٹی چیک پوسٹ تھی۔ کیموفلاج یونیفارم میں آہنی ٹوپیوں کی پیشانیوں پر جڑی اسپاٹ لائٹوں سے سروں کو ڈھانپے چار ایک جیسی قدوقامت والے لڑکے گاڑی کے گرد کھڑے ہوگئے تھے۔

ڈکی چیک ہوئی۔ ولدہ عبیر اور نباء کو نکال باہر کھڑا کیا۔ عبیر نے سیاہ عبایا پہن رکھی تھی۔ ہڈ میں صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ جھیل جیسی آنکھیں جو حزن یاس کے پانیوں سے بھری ہوئی تھیں۔

ایک نے رعونت سے کہا۔ "چہرہ دکھاؤ۔ نقاب نیچے کرو۔"

"کیوں کردوں۔" اس نے ترشی سے کہا۔

ولدہ نے ہاتھ دبایا اور نوجوان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"لڑکیاں پردہ کرتی ہیں ہماری سوسائٹی میں۔"

"دراصل ہمیں احکامات کی پیروی کرنا ہوتی ہے۔ تلاشی کا حکم ہے۔"

اس نے ایک جھٹکے سے چہرہ ننگا کرتے ہوئے مغلظات کا طوفان اٹھا دیا۔ چاروں گم صم اسے دیکھتے اور اس کی گالیاں سنتے رہے تھے۔ ایسا چاند چہرہ کہ جس نے انہیں محوحیرت ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

کارروائی ضرور ہوئی مگر نرم انداز میں۔ گاڑی کا نمبر نوٹ ہوا۔ جہاں سے آئے تھے اور جہاں جانا تھا درج ہوا۔

"کاش میرے پاس ہینڈ گرینڈ ہوتے تو میں ان کے چیتھڑے اڑا دیتی۔" اس نے دوبارہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کہا۔

مصطفٰی البرزانی کی نگاہیں کب سے عبیر پر جمی تھیں۔اس کی شکستگی اور دل گرفتگی پر انہوں نے پھاہا رکھنا چاہا تھا۔

''عبیر ہم اُمید کر سکتے ہیں کہ شاید عراق کے ساتھ جاپان والی پالیسی اپنائی جائے۔اگر ایسا ہوا تو یہ عراق کے لیے بہت اچھا ہوگا۔''

وہ چند لمحوں تک اپنے دادا کو دیکھتی رہی۔پھر بولی۔

''جدی ایسا نہیں ہوگا۔کسی خوش فہمی میں مت رہیے۔''

دونوں کے درمیان اب طویل خاموشی تھی۔

☆......☆

اس نے ٹی وی آن کیا۔منظر نے اسے ٹھٹھرا کر کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔صدام کا نیا عالی شان محل گورے کالے امریکی فوجیوں کے بوٹوں تلے روندا جا رہا تھا۔پہلے مرکزی گیٹ سے اندر کمروں کی آرائش و زیبائش فرنیچر، زینوں کی ریلنگ تک شاہانہ کروفر کے پٹارے کھلے پڑے تھے۔

''اف!'' پل بھر کے لیے اس نے آنکھیں بند کیں۔کھولیں اور کہا۔

''کاش تم نے یہ سب غریبوں پر خرچ کیا ہوتا۔''

اس نے ٹی وی بند کر دیا۔کھڑکی سے باہر دیکھا۔آسمان ابر آلود تھا۔ہواؤں میں تیزی تھی۔درختوں کا جھلار شور مچاتا تھا۔

اس نے تپائی پر پانی کا خالی گلاس رکھا تھا۔جدی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔انہیں سوپ پلا کر کمبل سے ڈھانپ کر وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کمرے میں آئی تھی۔

اس کے سرہانے سعدی یوسف کی منتخب نظموں کی کتاب پڑی تھی۔اس نے صفحے کھولے یونہی پھولا پھرولی کرتی رہی۔

پھر نظار قبانی کی نظم یاد آگئی۔

صبح خبریں سننا بہت مشکل ہے
دشمن نے ہماری سرحد نہیں پھلانگی
وہ تو چیونٹی کی طرح ہماری کمزوری کے راستے آیا ہے۔

قاسم الرحیم البرزانی کی آمد آج کل متوقع تھی۔کاش کوئی اچھی خبر ہو۔اپنے آپ سے کہتی ہوئی وہ لیٹ گئی تھی۔دماغ میں کسی انگریزی شاعر کا ایک Stanza شور مچانے لگا۔جس میں لوگوں کی جگہ اس نے عراق کو جوڑ لیا تھا۔

When will Thou Save Iraq

Oh, God of mercy! When?

اگلی لائنوں کو چھوڑ کر کتنی دیر تک وہ When When کی گردان کرتی رہی۔آنکھوں کے کویوں سے بہتے آنسوؤں کو پونچھتی رہی۔پھر ایسے ہی کچھو مچھو سی نیم دراز ہو گئی۔جانے کب آنکھ لگی تھی۔

☆......☆

اس شام آسمان ابر آلود سا تھا۔مغرب سے ذرا پہلے ہلکی سی بونداباندی بھی ہوئی۔آخری چیک پوسٹ کے چاروں نوجوان اپنے خیمے میں سیریا کی شہد کی آمیزش سے تیار کردہ خاص شراب رساطون جو آج ہی کسی عراقی نے ان کی فرمائش پر انہیں لا کر دی تھی جسے پیتے ہوئے انہوں نے ''نبیذ'' کے بارے میں رائے دی یہ تو نہایت فضول ہے۔ایسے ہی اس کا گڈا باندھ رکھا ہے۔

نشے میں مخمور ہوئے تو اپنی اپنی محبوباؤں اور اپنے بیوی بچے کی یاد میں آہیں بھرتے ہوئے عراقیوں کو گالیاں نکالنی شروع کیں کہ ان جاہل اجڈ گنواروں کو ڈکٹیٹر سے نجات دلانے اور ان کے اسلامی فاشزم کو جمہوریت کا مزہ چکھانے کے لیے انہیں اپنے خوبصورت وطن اور آسائشوں سے بھری زندگی کو چھوڑ کر ان کالے پانیوں میں آنا پڑا۔

بس ایسے ہی لمحوں میں وہ بھونرا سی آنکھوں اور زعفران کی خوشبو والی عبیر انہیں یاد آئی تھی۔فلک شگاف سا نعرہ لگایا۔رجسٹر کھول کر پتا نکالا۔جیپ میں بیٹھے اور چل پڑے۔

سامنے شاندار سی حویلی تھی۔بلند و بالا چوبی دروازہ بند تھا۔دستک پر ملازم نے چوبی کھڑکی کھول دی کہ بغداد سے قاسم الرحیم البرزانی کی آمد متوقع تھی۔

پہلا نشانہ ادھیڑ عمر ملازم تھا۔چیتے جیسے پھرتی سے انہوں نے سب کمروں کو اپنے حصار میں لیا۔

مصطفٰی البرزانی کو پل نہیں لگایا۔بیڈ پر غنودگی میں ہی سلا دیا۔

دفعتاً وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔کمرا اس کی ماں اور بہن کی چیخوں سے بھرا ہوا تھا۔چند لمحوں کے لیے اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے یا بغداد کی گلیوں بازاروں میں ناچتا تھرکتا منظر اس کے گھر آگیا ہے۔

کمرے میں چار فوجی رائفلیں تانے کھڑے تھے۔اس کی ماں گھبرائی ہوئی خوفزدہ اونچے اونچے انگریزی میں کہتی تھی کہ وہ کیوں ان کے گھر آئے ہیں؟ ان کا یہاں کیا کام؟

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

www.paksociety.com

ابھی تو بمشکل اس کی آنکھوں نے اس منظر کی حقیقت کو قبول کیا ہی تھا کہ اس سے بھی کہیں ظالمانہ، سفاکانہ اگلا منظر سامنے آگیا۔ دو ہاتھوں نے آگے بڑھ کر دونوں کونشانے پر رکھا اور پل بھر میں وہاں خون کے فوارے تھے۔ چیخیں تھیں۔ دھڑام سے گرتے وجود تھے۔ وہ تو کسی کو سنبھالنے آگے بھی نہ بڑھ سکی تھی۔

اب قیامت کبریٰ برپا ہوئی تھی۔ زعفران کی خوشبو اڑی اور کیسر کا رنگ بے رنگ ہوا۔ پر سامرہ کا آسمان ویسے ہی کھڑا تھا۔ ٹوٹ کر نہیں گرا۔

وہ جو تین تھے مستی میں تھے اور چوتھا جو اس بہتی گنگا میں ہاتھ نہیں دھو سکا تھا۔ اول فول بکے جا رہا تھا۔ آخر اس لینڈن کو ایسی دلیری دکھانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

جانتا ہوں اس سورمے کو۔ ذرا سا کھٹکا ہوا اور یہ سب سے پہلے بنکر میں کودتا ہے۔ عورت دل آویز بھی تھی اور بھری بھری تھی۔ لڑکی بھی چھوٹی نہ تھی۔ گلاب کا پھول نہ سہی پر موسم بہار کی بند کلی تو تھی۔

لینڈن نے خباثت بھری آنکھوں سے اسے دیکھا اور کہا۔ ”رونا کس بات کا؟ مری ہے وہ۔ اس ہے تو کیا ہوا؟ جاؤ جت جاؤ۔“

اس نے نفرت سے اس کی طرف تھوکا اور غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ کردی۔

جسم کی بھوک مٹی تو پیٹ کی بھوک چمکی۔ وہ کچن میں گئے۔ فریج میں سینکی ہوئی مرغیاں باہر نکالیں اور آگ پر بھوننے لگے۔

وہ تینوں کچن میں بیٹھے روسٹ ٹانگیں کھا رہے تھے۔ صحن میں زعفران کی خوشبو میں بسا اور دودھ میں ٹپکے کیسر کے قطرے میں گھلے رنگ جیسا وجود مٹی کے تیل اور آگ کے شعلوں میں جل رہا تھا۔ ہواؤں کی چنگھاڑ اور وحشت حویلی کے در و دیواروں سے ٹکراتی، بین کرتی اور اونچے اونچے کرلاتی تھی۔ اور چوتھا وزنی بوٹوں کے ساتھ صحن میں چکر کاٹتا انہیں گالیاں نکالتا اور موبائل پر سارے منظروں کو محفوظ کرتا پھر رہا تھا۔

ان میں سے ایک نے بوٹی کے بڑے سے ٹکڑے کو دانتوں سے نوچتے کھسوٹتے کہا۔ ”مجھے جوفیالزر پر ترس آ رہا ہے۔ بیچارہ پیاسا رہ گیا نا۔“

اس نے سنا اور چنگھاڑا۔ پر اس کی چنگھاڑ ان کے لیے مطلقاً تشویش انگیز نہ تھی۔

”پور فیلو“ انہوں نے اٹھتے ہوئے ہاتھ جھاڑے اور باہر صحن میں آئے۔

قدرے سرخ آگ کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔ اور وہاں بہت خوفناک منظر تھا کہ جیسے کسی مصور نے سیاہ اور قدرے سرخ گرینائٹ سے ایک مجسمہ تراش کر وہاں لٹا دیا ہو۔ وہ تینوں اس کے گرد کھڑے تھوڑی دیر دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے ہوائی فائر کیے اور رقص کرتے ہوئے ملٹری ٹریننگ کیمپوں میں گایا جانے والا بڑا پاپولر گیت گایا۔

This is my Riffle
This is my Gun
This is far Killing
This is far fun

فتح کے پھریرے لہراتے وہ ٹھکانے پہنچے۔ جب ان کے خراٹے گونجنے لگے۔ تب وہ جوفیالزر گاڑی میں بیٹھا اور بغداد کے لیے روانہ ہوا۔ گرین زون صدام کا محل امریکی ہیڈ کوارٹر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جگہ جگہ کھڑی رکاوٹوں سے گزرتا، تعارف اور شناخت کرواتا انچارج بریگیڈیئر کے پاس پہنچا۔

اس وقت وہاں موجود کرنل رینک کا عراقی فوجی افسر تھا۔ اسے روکنے کی ہلکی پھلکی سی کوشش ضرور ہوئی۔

وہ جنرل کے لیے ضروری پیغام کا کہتے ہوئے آگے بڑھ سکتا تھا مگر وہ رکا تھا اور اس نے اس کیس کا سارا کچا چٹھا اسے سنا دیا اور تصویریں بھی دکھا دیں۔ کرنل ابراہیم سعد خلیلی دم بخود تھا۔ عراق کی ممتاز اور سرکردہ فیملی۔ وحشت اور ننگی بربریت کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

اب امریکن فوجی افسر ہر صورت اس گینگ ریپ اور قتل کی لرزہ خیز واردات کو غیر موثر بنانے پر تلے تھے۔ احمد شلابی کی طفیلی حکومت کا ٹولہ مجرموں کے کورٹ مارشل پر مصر تھا۔ گرینڈ جیوری نے کیمپ لبرٹی میں کیس کی سماعت میں کہا کہ آخری فیصلہ امریکی جنرل کرے گا کہ کورٹ مارشل ہونا چاہیے یا نہیں۔

صفائی کے وکیلوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کیس مضبوط کر دیا تھا کہ بیچارے ملزمان دہشت گردی کی مریضانہ حالت میں تھے۔ ان کی بٹالین کے سترہ ساتھی عراقی مزاحمت کاروں کے خودکش حملوں میں مارے گئے تھے۔ وہ تو نارمل اخلاق باختہ جنسی مجرموں کی فہرست میں ہی نہیں آتے ہیں۔

اب قاسم الرحیم البرزانی مسعود بارزنجی، مشعل البرزانی اور عبیر کے ماموؤں کے پاس اپنی ساری توانائیاں مزاحمت کاروں کی جھولی میں جھونکنے کے سوا کیا چارہ کار تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

آخری حصہ

تاریخ عالم

منظر امام

یہ عالم رنگ و بو لفظِ کُن سے خلق ہوا، سائنسدانوں نے کہا یہ تو بگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرئہ ارض کے وجود میں آتے ہی زندگی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے ہی اس کرۂ ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس میں ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

خوش ذوق قارئین کے لیے ایک دلچسپ تحریر

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

گزشتہ ماہ آپ نے پڑھا کہ چودھری رحمت علی نے لفظ پاکستان کی تشہیر شروع کردی تھی۔ قیام پاکستان کا وقت نزدیک آنے لگا۔ یہ وقت کس کس گام پر رکا، کون کون سے اہم واقعات رونما ہوئے اس بارے میں چند مختصر مختصر اشاریہ ملاحظہ کریں۔

24 جولائی 1935ء کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ ہوگیا۔

سانحہ مسجد شہید گنج۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

یہ 1936ء کے آغاز کا واقعہ ہے کہ لاہور میں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان شدید کشیدگی پیدا ہوگئی۔
لاہور میں دہلی گیٹ کے باہر لنڈا بازار کے نزدیک تقریباً سو سالہ قدیمی مسجد پر سکھوں نے قبضہ کرنے کی غرض سے اس کے قریب ہی گوردوارہ تعمیر کرنا شروع کر دیا تھا۔
ہنگامے پھوٹ پڑے، حکومت نے کرفیو لگا دیا۔ کرفیو کے باوجود مسلمانوں کا احتجاج جاری رہا۔ مولانا ظفر علی خان، میاں فیروز الدین، سید حبیب، ملک لال دین اور بہت سے مسلمانوں کو گرفتار کرلیا گیا۔
17 جنوری 1937ء کو بنگال اسمبلی کے لیے انتخابات ہوئے۔ 21 جنوری 1937ء کو پنجاب میں انتخابات کا مرحلہ طے پا گیا۔
اپریل 1937ء میں پنجاب یونیسٹ پارٹی نے اپنی حکومت قائم کرلی۔
3 نومبر 1937ء کو قائداعظم نے بمبئی میں ایک جلسہ کیا۔
26 تا 29 دسمبر 1938ء کو صوبہ بہار کے شہر پٹنہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا۔ مسلمانوں کا جوش اور جذبہ دیکھنے کے قابل تھا۔
اس اجلاس میں دو بڑی باتیں ہوئیں۔ مشہور نظم پڑھی گئی۔ ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'' اور دوسری بات یہ ہوئی کہ اس جلسے میں محمد علی جناح کو قائداعظم کا لقب دیا گیا۔
یکم ستمبر 1939ء کو دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوگیا۔
کانگریس وزارتوں کے خاتمے کے بعد 20 دسمبر 1939ء کو قائداعظم نے اعلان کیا کہ 22 دسمبر کو یومِ نجات وتشکر منایا جائے گا۔
آل انڈیا مسلم لیگ کا ستائیسواں اجلاس لاہور میں ہوا۔
1940ء کو پولیس نے خاکساروں پر گولیاں چلا دیں۔ جس سے بہت سے خاکسار شہید ہوگئے۔
22 مارچ 1940ء کو ایک اہم اجلاس ہوا۔ اس میں قائداعظم کی تقریر ایک تاریخی تقریر تھی۔ بیگم محمد علی جوہر نے قرارداد لاہور کو قراردادِ پاکستان کا نام دیا۔ خوب ہنگامے ہوئے لیکن یہ نام مشہور ہوگیا۔
کانگریس کی پھر سے سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوگئی۔

یکم جولائی 1940ء کو سبھاش چندر بوس گرفتار ہوئے۔ 3 جولائی کو گاندھی گرفتار ہوئے۔ 31 اکتوبر کو پنڈت نہرو کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔
یکم مارچ 1941ء کو لاہور میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک اجلاس میں بات کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا۔ ''پاکستان بن چکا ہے۔''
23 مارچ 1941ء کو مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ''یومِ پاکستان'' منایا گیا۔
آل انڈیا مسلم لیگ کا اٹھائیسواں اجلاس مدراس میں 12 تا 15 اپریل 1941ء کو منعقد ہوا۔ قائداعظم اپنی کمزوری اور بیماری کے باوجود اس میں شریک ہوئے۔
فروری 1942ء کو بنگال مسلم لیگ کی صوبائی کانفرنس کا انعقاد سراج گنج میں کیا گیا۔ قائداعظم بھی شریک ہوئے۔
23 مارچ 1942ء کو ہندوستان بھر میں دوسرا یومِ پاکستان منایا گیا۔ (دوسری جنگِ عظیم جاری تھی اور برطانیہ کی پوزیشن کمزور ہوتی جا رہی تھی)۔
1942ء میں گاندھی نے ہندوستان چھوڑ دو تحریک کا آغاز کیا جس سے ہنگامے پھوٹ پڑے۔
12 ستمبر 1942ء میں قائداعظم نے دہلی میں ایک زبردست پریس کانفرنس کی جس میں برطانیہ کے علاوہ دوسرے ملکوں کے صحافی بھی موجود تھے۔
13 جون 1943ء کو قائداعظم نے سندھ کا دورہ کیا۔ پھر قاضی محمد عیسیٰ کی دعوت پر 25 جون 1943ء کو بلوچستان کا دورہ کیا۔
11 جولائی 1943ء کو خان آف قلات کی دعوت پر قلات تشریف لے گئے۔
26 جولائی 1943ء کو خاکسار تحریک کے ایک رکن رفیق صابر نے قائداعظم پر چاقو سے حملہ کیا۔ تاہم اس پر قابو پا لیا گیا۔ قائداعظم کے چہرے اور گردن پر زخم آئے۔ قائداعظم کی زندگی بچ جانے پر 13 اگست 1943ء کو مسلمانوں نے یوم تشکر منایا۔
آل انڈیا مسلم لیگ کا اکتیسواں اجلاس 24 تا 26 دسمبر 1943ء کو کراچی میں ہوا جس کی صدارت قائداعظم نے کی۔
مدراس سے تعلق رکھنے والے راج گوپال اچاریہ کی کوشش تھی کہ پاکستان کے مسئلے پر مسلم لیگ اور کانگریس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

درمیان مذاکرات ہونے چاہئیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے 18 اپریل 1944ء کو ایک فارمولا پیش کیا۔ اس فارمولے کو قائداعظم نے ایک موہوم اور پُرفریب فارمولے کا نام دیا۔

9 ستمبر 1944ء کو قائداعظم اور گاندھی کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ گاندھی نے ہندوستان کی تقسیم کو ناقابلِ عمل قرار دیا۔ اس طرح یہ مذاکرات ناکام ہوگئے۔

17 فروری 1945ء کو برطانیہ کے لارڈ ڈیول نے مجلس قانون ساز سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ جغرافیہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ ہندوستان ایک قدرتی وحدت ہے۔'' اس پر قائداعظم نے جواب دیا کہ لارڈ ڈیول کانگریس کے سمندر میں مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔

25 جون تا 14 جولائی شملہ کانفرنس منعقد ہوئی۔

1945ء میں برطانیہ میں لیبر پارٹی برسرِ اقتدار آئی۔

5 تا 12 مئی 1946ء کو دوسری شملہ کانفرنس ہوئی۔ اس میں مسلم لیگ کی طرف سے قائداعظم محمد علی جناح، خان بہادر لیاقت علی خاں، نواب محمد اسماعیل خان اور سردار عبدالرب نشتر شریک تھے۔

16 اگست 1946ء کو مسلمانوں نے ڈائریکٹ ایکشن ڈے منایا۔ اس روز بنگال اور پنجاب کی حکومتوں نے عام تعطیل کا اعلان کیا۔ جلسوں کا انعقاد ہوا۔ سہروردی نے اس موقع پر اعلان کیا کہ اگر کانگریس وزارتیں بنائے گی تو بنگال کی آزادی کا اعلان کردیا جائے گا۔

کلکتہ میں مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ تو ہندو غنڈوں نے مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگانی شروع کردی۔ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ بوڑھوں کو قتل کیا گیا۔ فسادات کا دائرہ پورے بنگال میں پھیل گیا۔

فوج بلائی گئی تب جا کر حالات قابو میں آئے۔ بنگال کے علاوہ یوپی اور پنجاب میں بھی فسادات شروع ہوگئے۔

26 اکتوبر 1946ء کو ایک عبوری حکومت بنائی گئی۔ جس میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں شامل تھیں۔ پڑھنے والوں کی دلچسپی اور معلومات کے لیے اس کے وزراء کی تفصیل درج ذیل ہے۔

1۔ نوابزادہ لیاقت علی خان۔ خزانہ (مسلم لیگ)

2۔ آئی آئی چندریگر۔ تجارت (مسلم لیگ)

3۔ سردار عبدالرب نشتر۔ مواصلات (مسلم لیگ)

4۔ راجا غضنفر علی۔ صحت (مسلم لیگ)

5۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ امورِ خارجہ (کانگریس)

6۔ راجندر پرشاد۔ خوراک وزراعت (کانگریس)

7۔ جگ جیون رام۔ لیبر (کانگریس)

8۔ سردار بلدیو سنگھ۔ دفاع (کانگریس)

9۔ سی ایچ بھابھا۔ صنعت و رسد، قدرتی وسائل (کانگریس)

10۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ امورِ داخلہ، اطلاعات ونشریات (کانگریس)

11۔ راج گوپال اچاریہ۔ تعلیم آرٹ (کانگریس)

12۔ جوگندر ناتھ منڈل۔ امور قانون سازی (مسلم لیگ)

یہ تھی پوری حکومت۔

فروری 1947ء میں نوابزادہ خان لیاقت علی خان نے ایک ایسا بجٹ پیش کیا جس کو پورے ملک میں سراہا گیا۔

22 مارچ 1947ء کو لارڈ ڈیول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وائسرائے ہند کے عہدے کا چارج سنبھالا۔

3 جون 1947ء کو آل انڈیا ریڈیو پر تقسیم ہند کا باقاعدہ طور پر اعلان کردیا گیا۔ 3 جون 1947ء ہی کو قائداعظم نے آل انڈیا ریڈیو سے خطاب کیا تھا۔

6-7 جولائی 1947ء کو آسام کی ریاست سلہٹ میں ریفرنڈم ہوا تو وہاں کے لوگوں نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

19 جون 1947ء کو قانونِ آزادی ہند کے تحت نظام حیدرآباد نے اپنی مملکت کا مکمل آزادی اور خودمختاری کا اعلان کردیا۔

19 جون 1947ء کو مسلم کانفرنس نے ایک قرارداد کے ذریعے ریاست جموں وکشمیر کو پاکستان کے ساتھ الحاق کا رسمی اعلان کردیا۔

(قیام پاکستان کے بعد مہاراجا کشمیر نے ریاست جموں وکشمیر کے عوام کی خواہشات کے برعکس 27 اکتوبر 1947ء کو کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کردیا جس کو آج تک قبول نہیں کیا گیا ہے)۔

بہرحال ان تمام مراحل اور نشیب وفراز سے گزرنے کے بعد تقسیم ہند کا فارمولا طے پا گیا اور اس کے باقاعدہ اعلان کے لیے 15 اگست 1947ء رات 12 بجے کا

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

وقت مقرر کیا گیا۔
لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی یہ خواہش تھی کہ وہ پاکستان اور ہندوستان کا مشترکہ گورنر جنرل بن جائے مگر قائداعظم محمد علی جناح نے 3 جولائی 1947ء کو واضح طور پر یہ بتا دیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا جب کہ بھارت نے قبول کر لیا۔
ماؤنٹ بیٹن کی ہمدردیاں ہندوستان کے ساتھ ہو گئیں اور اس نے تقسیم کا اعلان کرتے ہوئے وہ علاقے بھی ہندوستان میں شامل کر دیے جو پاکستان کو ملنے والے تھے۔
بہرحال 14 اگست 1947ء کو پاکستان کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا لیکن اس اعلان سے پہلے 3 اگست کو 1947ء کو گورنر جنرل کے عہدے کے لیے قائداعظم کی تقرری کی گئی۔
10 اگست 1947ء کو کراچی میں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس سندھ اسمبلی کی عمارت میں ہوا۔ اس کی صدارت جوگندر ناتھ منڈل نے کی تھی۔ اجلاس سے قبل مولانا شبیر احمد عثمانی نے قرآن حکیم کی تلاوت کی۔
11 اگست 1947ء کو قائداعظم نے خطبہ دیا۔
11 اگست ہی کو آئین ساز اسمبلی نے پرچم پاکستان کی منظوری دی۔ اس موقع پر وزیراعظم پاکستان نواب زادہ لیاقت علی خان نے تقریر کی تھی۔
پاکستان کے اس قومی پرچم کو کراچی میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے اور ڈھاکا میں ظفر احمد عثمانی نے لہرایا۔
14 اگست 1947ء کو پاکستان کے قیام کا باقاعدہ اعلان ہوا۔ اس اجلاس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بھی شرکت کی۔ تاکہ انتقال اقتدار کی کارروائی باقاعدہ عمل میں لائی جائے۔
15 اگست 1947ء کو حلف وفاداری کا انعقاد کیا گیا۔ قائداعظم سے لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب عبدالرشید نے اور قائداعظم نے پہلی کابینہ سے حلف لیا۔
دسمبر 1947ء میں ظفر اللہ خان کو وزیر خارجہ بنا دیا گیا۔
قیام پاکستان کے وقت بے شمار مسائل تھے۔ بے شمار دشواریاں تھیں۔ وسائل کم تھے مسائل بہت زیادہ تھے۔
ہزاروں مسلمان مردوں عورتوں کو انتہائی بے دردی سے کاٹ کر پھینک دیا گیا۔
اس کی تفصیل بہت دلخراش اور بہت بھیانک ہے۔ ہمارے اس جائزے کا یہ موضوع نہیں ہے۔ ورنہ تاریخ کے اس بہت برے چہرے، بہت بڑی خونریزی پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں جنرل محمد موسیٰ خان کی کتاب ''جوان ٹو جنرل'' دیکھی جا سکتی ہے۔
مہاجرین کی آبادکاری کے لیے قائداعظم ریلیف فنڈ قائم کیا گیا۔
جولائی 1948ء میں کشمیر کے مسئلے پر پاکستان کی بھارت سے پہلی جنگ ہوئی جس میں پاکستان کا سب سے بڑا اعزاز نشانِ حیدر کیپٹن راجا محمد سرور شہید نے حاصل کیا تھا۔
6 جولائی 1948ء کو اقوام متحدہ کا کمیشن بٹھایا گیا۔
27 جولائی 1949ء کو جنگ بندی لائن کا تعین کر دیا گیا۔
11 ستمبر 1948ء کو قائداعظم کا انتقال ہو گیا۔
13 ستمبر 1948ء کو بھارت نے حیدرآباد دکن پر قبضہ کر لیا۔
(30 ستمبر 1947ء کو پاکستان کو اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل ہو گئی تھی)
یکم نومبر 1949ء کو پاکستان میں تمام ہندوستانی کرنسی کا لین دین ممنوع ہو گیا۔
قائداعظم کی رحلت کے بعد خواجہ ناظم الدین پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل ہوئے۔ نواب زادہ لیاقت علی خان بدستور وزیراعظم رہے۔
28 ستمبر 1950ء کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے اپنی ذیلی کمیٹیوں کی سفارشات کی روشنی میں ایک عبوری رپورٹ پیش کی۔
1951ء۔ 21 تا 24 جنوری کراچی میں مولانا سید سلیمان ندوی کی زیر صدارت پاکستان کے آئین کی اسلامی شکل دینے کی غرض سے ایک اجلاس ہوا۔
(اپریل 1950ء کے آغاز پر وزیراعظم لیاقت علی خان بھارت کے دورے پر گئے۔ بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو سے مذاکرات ہوئے۔ ایک معاہدہ سامنے آیا جس کو لیاقت نہرو پیکٹ کہا جاتا ہے۔)
9 مارچ 1951ء کو پاکستان کی بری فوج کے چیف آف جنرل اسٹاف میجر جنرل محمد اکبر خان کی رہائش گاہ پر 2 فروری 1951ء کو جو اجلاس ہوا تھا اس کے بارے میں ایک بیان جاری ہوا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

یہ پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اسے پنڈی سازش کیس کہا جاتا ہے۔ اس میں حکومت کا تختہ الٹنے کی بات کی گئی تھی۔ اس اجلاس میں شامل چند اہم لوگ یہ تھے۔

میجر جنرل اکبر خان، بریگیڈیئر ایم اے وحید خان، لیفٹیننٹ خضر حیات، فیض احمد فیض (مشہور شاعر) اور پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر سجاد ظہیر جنرل سیکریٹری پاکستان کمیونسٹ پارٹی وغیرہ۔

17 مئی 1951ء کو میجر جنرل اکبر خان، بیگم نسیم اکبر خان، سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض گرفتار ہو کر لاہور سینٹرل جیل پہنچا دیے گئے۔

1949ء میں لیاقت علی خان کو روس کا دورہ کرنے کی دعوت ملی۔ جو قبول تو کرلی لیکن دورہ نہ کیا۔

3 مئی 1950ء کو امریکا کے دورے پر روانہ ہو گئے۔

17 جولائی 1951ء کو آپ نے اپنا آہنی مکا دکھایا تھا جو ایک علامت بن گیا ہے۔

16 اکتوبر 1951ء کو راولپنڈی میں لیاقت علی خان کو شہید کر دیا گیا۔

17 اکتوبر 1951ء کو خواجہ ناظم الدین نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھال لیا۔

خواجہ ناظم الدین کی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں تحریکِ ختم نبوت اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ ملک کے بہت سے شہروں میں قادیانیوں کے خلاف پُرتشدد مظاہرے شروع ہو گئے۔

19 اپریل 1953ء کو خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا گیا۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

محمد علی بوگرہ (17 اپریل 1953ء تا اگست 1955ء)۔

محمد علی بوگرہ امریکا میں پاکستان کے سفیر کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے۔ ملک غلام محمد گورنر جنرل نے ان کو مشورے کے لیے پاکستان طلب کیا تھا۔ جب یہ پہنچے تو ان کو وزیراعظم کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔

مشرقی پاکستان میں صوبائی انتخابات ہوئے۔ یہ انتخابات مارچ 1954ء میں ہوئے تھے۔ انتخابات ختم بھی نہیں ہوئے تھے کہ لسانی فسادات پھوٹ پڑے۔ اردو بولنے والوں کی املاک کو بنگالیوں نے لوٹنا جلانا شروع کر دیا۔ ان فسادات کی شدت تین اہم اداروں میں زیادہ تھی۔

ایک تو آدم جی جوٹ مل، دوسرے کھلنا کے ایک ماچس بنانے کے کارخانے میں اور تیسرا کھلنا ہی کے کاغذ بنانے کے ایک کارخانے میں۔ جہاں 13 ہلاک اور 40 زخمی ہو گئے۔ کاغذ سازی کے واحد پاکستانی ماہر مسٹر خورشید جو اس کارخانے کے آپریٹنگ مینیجر تھے وہ بھی ہلاک کر دیے گئے۔

13 اگست 1954ء کو ابوالاثر حفیظ جالندھری ہی کی آواز میں پاکستان کا قومی ترانہ پہلی بار ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا۔

14 اگست 1954ء کو حکومتِ پاکستان نے اس ترانے کے حقوق حفیظ جالندھری سے خرید لیے۔ اس کی دھن عبدالکریم چھاگلہ نے بنائی تھی۔

1954ء میں پاکستان نے سیٹو میں شمولیت اختیار کی۔

22 نومبر 1954ء کو محمد علی بوگرہ نے پاکستان میں ون یونٹ قائم کرنے کا اعلان کر دیا (یہ ذہن میں رکھیں کہ ہر کسی کے دورِ حکومت میں واقعات تو بہت سے ہوئے ہوں گے لیکن انتہائی خاص خاص واقعات کی نشاندہی کی جا رہی ہے)۔

6 اگست 1955ء کو گورنر جنرل پاکستان ملک غلام محمد اپنی بیماری کے سبب دو ماہ کی رخصت پر چلے گئے ان کی جگہ پر میجر جنرل اسکندر مرزا نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا۔

صورتِ حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے محمد علی بوگرہ نے وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔

چودھری محمد علی (11 اگست 1955ء تا 12 ستمبر 1956ء)۔ چودھری محمد علی پاکستان کے چوتھے وزیراعظم تھے۔

1956ء میں پاکستان کا پہلا آئین پیش کیا گیا لیکن زیادہ عرصے تک نافذ نہیں رہ سکا اور چودھری محمد علی نے استعفیٰ دے دیا تھا۔

حسین شہید سہروردی (12 ستمبر 1956ء تا 18 اکتوبر 1957ء)۔

پاکستان کے پانچویں وزیراعظم حسین شہید سہروردی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کا تعلق عوامی لیگ سے تھا۔
اس دور کے ایک اہم واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔
لاہور کے میاں افتخار الدین نے نومبر 1956ء میں چھ سیاسی جماعتوں کے قائدین کو اکٹھا کیا اور ایک سیاسی جماعت ''نیشنل عوامی پارٹی'' کے لیے راہ ہموار کی۔ ان قائدین کے نام یہ ہیں۔
1۔ آزاد پاکستان پارٹی کے میاں افتخار الدین اور میاں محمد علی قصوری۔
2۔ سندھ عوامی محاذ کے جی ایم سید اور عبدالمجید سندھی۔
3۔ خدائی خدمت گار کے سربراہ خان عبدالغفار خان۔
4۔ سندھ پارٹی کمیٹی کے حیدر بخش جتوئی۔
5۔ میر غوث بخش بزنجو اور شہزادہ عبدالکریم آف قلات۔
6۔ ورے پشتون آف بلوچستان کے خان عبدالصمد خان اچکزئی اور ہاشم خان غلوئی۔
1957ء میں حسین شہید سہروردی نے ملک کی بگڑتی ہوئی سیاسی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے استعفیٰ دے دیا۔
ابراہیم اسماعیل چندریگر (18 اکتوبر 1957ء تا 11 دسمبر 1957ء)
آئی آئی چندریگر کا دورِ حکومت اگرچہ بہت مختصر ہے مگر کچھ ایسے کام بھی ہوئے جو تاریخ پاکستان کا حصہ ہیں۔ جیسے پورے ملک میں جداگانہ طریقۂ انتخاب۔
ملک فیروز خان نون (16 دسمبر 1957ء تا 7 اکتوبر 1958ء)۔
ملک فیروز خان نون کے دور کا ایک اہم واقعہ یہ تھا کہ 9 مئی 1958ء کو ری پبلکن پارٹی کے بانی اور مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ خان عبدالجبار خان عرف ڈاکٹر خان صاحب کو ان کی رہائش گاہ پر عطا محمد نام کے ایک آدمی نے قتل کر دیا۔ اس کا تعلق خاکسار تحریک سے تھا۔ اس کے بیان کے مطابق یہ کام علامہ عنایت اللہ مشرقی نے کروایا تھا جو خاکسار تحریک کے بانی تھے۔
8 ستمبر 1958ء کو گوادر، پاکستان کو منتقل کیا گیا۔
7 اکتوبر 1958ء کو اسکندر مرزا نے آئین کو منسوخ اور مارشل لاء کا نفاذ کر دیا۔ فوج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہو گئے۔
27 اکتوبر 1958ء سے 25 مارچ 1969ء (فیلڈ مارشل محمد ایوب خان)۔
صدر پاکستان اسکندر مرزا نے محمد ایوب خان کو ملک کا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ ان کی کابینہ میں مندرجہ ذیل افراد تھے۔
1۔ لیفٹیننٹ جنرل محمد اعظم خان۔ (وزیر بحالیات)
2۔ لیفٹیننٹ جنرل کے ایم شیخ۔ (وزیر داخلہ)
3۔ لیفٹیننٹ جنرل ڈبلیو اے برقی۔ (وزیر صحت سماجی بہبود)
4۔ ذوالفقار علی بھٹو۔ (وزیر تجارت)
5۔ حفیظ الرحمٰن۔ (وزیر خوراک وزراعت)
6۔ منظور قادر۔ (وزیر برائے امور خارجہ)
7۔ محمد شعیب۔ (وزیر خزانہ)
8۔ ایف ایم خان۔ (وزیر مواصلات)
9۔ مولوی محمد ابراہیم۔ (وزیر قانون)
10۔ ابو قاسم خان۔ (وزیر صنعت، تعمیرات، آب پاشی اور بجلی)
11۔ حبیب الرحمٰن۔ (وزیر تعلیم، اطلاعات و نشریات)
اسکندر مرزا اور ایوب خان کا ساتھ چند ہی دنوں تک رہا۔ 27 اکتوبر 1958ء کو اسکندر مرزا سے کہا گیا کہ وہ مستعفی ہو جائیں۔
اسکندر مرزا مستعفی ہو کر لندن چلے گئے۔ 13 نومبر 1969ء کو لندن میں ان کا انتقال ہو گیا۔
جون 1959ء میں نتھیا گلی میں گورنروں اور دیگر اعلیٰ حکام کی کانفرنس ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ کراچی سے دارالحکومت منتقل کر دیا جائے (اسلام آباد)۔
جنوری 1965ء میں بھارت نے رن کچھ میں پاکستان رینجر کی چوکی پر حملہ کر دیا لیکن اسے شکست ہوئی۔ پھر بھارتی وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ بھارت اب اپنی مرضی کا محاذ کھولے گا۔
5 اور 6 ستمبر 1965ء کو بھارت نے اپنی مرضی کا محاذ کھولتے ہوئے لاہور پر حملہ کر دیا۔
6 ستمبر 1965ء کو ایوب خان نے ریڈیو پر ایک تاریخی تقریر کی۔
22 ستمبر 1965ء کو اقوامِ متحدہ میں ذوالفقار علی بھٹو نے جو تقریر کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔
10 جنوری 1966ء کو اعلانِ تاشقند جاری ہوا۔
اسی دوران شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے چھ نکات پیش کیے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

18 جون 1966ء کو ذوالفقار علی بھٹو، صدر ایوب خان سے اختلاف کے باعث حکومت سے الگ ہو گئے۔

16 دسمبر 1966ء کو پاکستان پیپلز پارٹی وجود میں آئی۔

25 مارچ 1969ء کو صدر محمد ایوب خان نے صدارت کے منصب سے استعفیٰ دیتے ہوئے اقتدار جنرل آغا محمد یحییٰ خان کے سپرد کر دیا۔

جنرل محمد یحییٰ خان۔ (25 مارچ 1969ء تا 20 دسمبر 1971ء)

1970ء میں تحریک استقلال کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کی بنیاد ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان نے رکھی تھی۔

15 نومبر 1971ء کو متحدہ محاذ کے قیام کا اعلان ہوا۔

23 مارچ 1971ء کو بنگلہ دیش کا پرچم لہرایا گیا۔

22 نومبر 1971ء کو بھارت نے بغیر کسی اعلان جنگ کے مشرقی پاکستان پر تین طرف سے حملہ کر دیا۔

3 دسمبر 1971ء کو بھارت نے مغربی پاکستان پر حملہ کیا۔

16 دسمبر 1971ء کو ڈھاکا کے ریس کورس گراؤنڈ میں جنرل نیازی نے ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کر دیے۔

20 دسمبر 1971ء کو یحییٰ خان نے استعفیٰ دے کر اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کے سپرد کر دیا۔

ذوالفقار علی بھٹو (20 دسمبر 1971ء تا 5 جولائی 1977ء)

4 نومبر 1974ء میں حمود الرحمان کمیشن نے اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کی۔

3 جولائی 1972ء کو شملہ معاہدہ ہوا۔

ستمبر 1973ء سے پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی شروع ہوئی۔

14 اگست 1973ء کو نیا آئین نافذ کر دیا گیا۔

یکم جولائی 1973ء کو ملک میں شناختی کارڈز کی اسکیم کا آغاز ہوا۔

31 دسمبر 1973ء کو پاکستان اسٹیل مل کی بنیاد رکھی گئی۔

22 فروری تا 24 فروری 1974ء کو لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد ہوئی۔

22 مئی 1974ء کو قادیانیوں نے نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلباء پر حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں پورے ملک میں قادیانیوں کے خلاف ہنگامے شروع ہو گئے۔

یوشی رو موری

جاپانی سیاست دان اور وزیر اعظم۔ انہوں نے 6 اپریل 2000ء کو وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا، اس وقت انہیں ایوان کے 500 ووٹوں میں سے 335 ووٹ ملے تھے۔ 4 جولائی 2000ء کو پارلیمنٹ نے انہیں دوبارہ وزیر اعظم منتخب کر لیا حالانکہ ان کے سامنے مضبوط حزبِ اختلاف بھی موجود تھی۔ ان کی جماعت لبرل ڈیموکریٹک پارٹی کی مقبولیت میں اس وقت اضافہ ہوا جب ٹوکیو کے معروف روزنامہ یومیوری شمبون نے عوام سے ڈیموکریٹک پارٹی کی کارکردگی کے بارے میں رائے طلب کی۔ وہ اپریل 2001ء تک وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہے۔

مرسلہ: نوشابہ فتح محمد۔ ایبٹ آباد

7 ستمبر 1974ء کو قادیانیوں کے خلاف قرارداد کو قانونی حیثیت دے دی گئی۔

4 اور 5 جولائی 1977ء کی درمیانی شب کو چیف آف آرمی اسٹاف جنرل محمد ضیاء الحق نے مارشل لاء نافذ کر کے ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق (5 جولائی 1977ء تا 17 اگست 1988ء)

4 اپریل 1979ء کو راولپنڈی جیل میں صبح کے وقت ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔

16 ستمبر 1978ء کو صدر پاکستان فضل الٰہی چودھری نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

23 مارچ 1985ء تا 29 مئی 1988ء۔ محمد خان جونیجو وزیر اعظم رہے۔

10 اپریل 1988ء کو سانحہ اوجڑی کیمپ ہوا۔

ضیاء الحق نے جونیجو حکومت کو برطرف کر دیا۔ 9 جون 1988ء کو ایک نگراں حکومت قائم کی گئی جس میں محمد نواز شریف پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔

17 اگست 1988ء کو جنرل ضیاء الحق کے طیارے کو حادثہ ہوا۔ جس میں ضیاء الحق سمیت تمام افراد جاں بحق ہو گئے۔

صدر غلام اسحاق خان (17 اگست 1988ء تا یکم دسمبر 1988ء)

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

2 دسمبر 1988ء تا 6 اگست 1990ء۔ وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو۔ بے نظیر بھٹو عالمِ اسلام کی پہلی خاتون وزیراعظم بنیں۔

صدر مملکت غلام اسحاق خان نے 6 اگست 1990ء کو اسمبلیاں توڑ دیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے ایک سال آٹھ ماہ اور تین دن حکومت کی۔

(نگران وزیراعظم غلام مصطفیٰ جتوئی۔ 6 اگست 1990ء تا 6 نومبر 1990ء)

(وزیراعظم میاں محمد نواز شریف۔ 6 نومبر 1990ء تا 17 جولائی 1993ء)

ان کے دورِ حکومت کی خاص خاص باتیں۔

موٹر وے، ٹرانسپورٹ اسکیم۔ سندھ میں فوجی آپریشن۔ ایم کیو ایم کے خلاف کارروائی۔

18 اپریل 1993ء کو صدرِ مملکت غلام اسحاق خان نے میاں نواز شریف کی حکومت برطرف کردی اور قومی اسمبلی توڑ دی۔

نگراں وزیراعظم سردار بلخ شیر مزاری (18 اپریل 1993ء تا 25 مئی 1993ء)۔

26 مئی 1993ء کو سپریم کورٹ نے نواز شریف کی حکومت بحال کرنے کا حکم دے دیا۔

18 جولائی 1993ء کو صدر غلام اسحاق خان نے استعفیٰ دے دیا اور جناب وسیم سجاد کو قائم مقام صدر بنا دیا گیا۔ جب کہ معین قریشی کو نگراں وزیراعظم بنادیا گیا۔

نگراں وزیراعظم معین قریشی (18 جولائی 1993ء تا 19 اکتوبر 1993ء)۔

وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو (19 اکتوبر 1993ء تا 5 نومبر 1996ء) دوسری مرتبہ وزیراعظم منتخب ہوئیں۔

25 جنوری 1994ء کو ملک میں پہلا خواتین پولیس اسٹیشن قائم کیا گیا۔

20 ستمبر 1996ء کو مرتضیٰ بھٹو کو مار دیا گیا۔

25 اپریل 1996ء کو عمران خان نے تحریکِ انصاف کے قیام کا اعلان کیا۔

5 نومبر 1996ء کو صدرِ پاکستان فاروق احمد خان لغاری نے بے نظیر حکومت کو برطرف کردیا۔

نگراں وزیراعظم ملک معراج خالد (5 نومبر 1996ء تا 17 فروری 1997ء)۔

وزیراعظم میاں نواز شریف 17 فروری 1997ء تا 12 اکتوبر 1999ء۔ دوسری مرتبہ وزیراعظم منتخب ہوئے۔

28 مئی 1998ء کو پاکستان نے ایٹمی دھماکا کیا۔

12 اکتوبر 1999ء کو فوج نے میاں نواز شریف کی حکومت ختم کردی اور جنرل پرویز مشرف برسرِ اقتدار آگئے۔ وہ چیف ایگزیکٹو تھے۔ صدر رفیق تارڑ تھے۔

پرویز مشرف دور کے خاص واقعات۔

پہلی بین الاقوامی دفاعی نمائش۔

باغِ قائداعظم۔

جینیٹک ریسرچ میں کارنامہ۔

پہلی موبائل فون سروس کا آغاز۔

پاک عرب آئل ریفائنری کا افتتاح۔

گوادر پورٹ کی تعمیر کا افتتاح۔

پہلا ایئر شو۔

وزیراعظم میر ظفر اللہ خان جمالی۔ 21 نومبر 2002ء تا 28 جون 2004ء۔

14 دسمبر 2003ء کو پرویز مشرف پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔

میر ظفر اللہ جمالی کے بعد چودھری شجاعت حسین وزیراعظم رہے۔ 30 جون 2004ء تا 25 اگست 2004ء۔

وزیراعظم شوکت عزیز۔ 28 اگست 2004ء تا مارچ 2008ء تک۔

20 مارچ 2007ء کو پرویز مشرف نے گوادر بندرگاہ کا افتتاح کیا۔

26 اگست 2006ء میں اکبر بگٹی کا قتل ہوا۔

9 جولائی 2007ء کو لال مسجد کا واقعہ ہوا۔

نگراں وزیراعظم میاں محمد سومرو۔ (16 نومبر 2007ء تا 24 مارچ 2008ء)۔

26 نومبر 2007ء کو میاں نواز شریف سات سالہ جلاوطنی کے بعد وطن واپس آئے۔

یہاں تاریخ عالم کا یہ سلسلہ ختم کررہا ہوں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں پوری طرح کامیاب ہوا ہوں۔ کیونکہ یہ دنیا بہت وسیع ہے واقعات لاکھوں ہیں اور میرا مطالعہ بہت محدود ہے۔

اس کے باوجود میں نے اپنی سی کوشش تو کی ہے۔ سرگزشت کے خوش ذوق قارئین کے لیے۔ اُمید ہے اسے پذیرائی ملے گی۔

ختم شد

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

چھٹا حصہ

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

وہ سات سمندر پار جاکر ایک نئی زندگی بنانے کا خواب دیکھا کرتا تھا۔ اسی خواب کو تعبیر دینے کی خاطر وہ ارضِ وطن سے نکل پڑا۔ یورپ پہنچا، اجنبی نگر، انجانے لوگ، الگ انداز کا معاشرہ اور نت نئے مصائب کا سامنا۔ گویا یہ سفر نامہ نہیں تجربے کا نچوڑ ہے۔ دلچسپ کہانی ہے۔ ہدایت نامہ ہے، ان کے لیے جو یورپ میں رہائش کے خواہش مند ہیں۔

عالمی پیمانے پر مشہور فوٹو گرافر کے تجربوں کا نچوڑ، ایک الگ انداز کی سفر کہانی

وکلاء میرے انکار پر مایوس ہو گئے تھے۔ ان کے چہرے اندرونی جذبات کے غماز تھے۔ اگر یہ امریکا نہ ہوتا، پاکستان ہوتا تو جو کیفیت ان کے چہرے پر نظر آرہی تھی اس کا ردعمل میرے گال پر نقش ہو جاتا یا پھر ان کی زبان کھل جاتی اور وہ مجھے جی بھر کے سناتے لیکن یہاں قانون کی اہمیت پر خصوصی توجہ ہے۔ اس لیے وہ کچھ بول نہ سکے اور میں نے ان کے چنگل سے خود کو بچا لینے پر غور کیا پھر انکار کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ان کا غصہ اپنی جگہ مگر میں کسی معذور کی طرح نہیں رہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

سکتا تھا۔ وہ سمجھاتے رہے اور میں نے نہ سمجھنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ میں جب ان کے دفتر سے باہر آرہا تھا تو کوئی بھی مجھے دروازے تک چھوڑنے نہ آیا تھا اور سب مجھے غصے اور بے بسی سے گھور رہے تھے کیونکہ ایک بنا بنایا کیس ان کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔

سیفٹی شوز بھی اسی لیے تھے کہ اگر کوئی چیز پاؤں پر گر جاتی تو فیکٹری کی انشورنس کمپنی ایک بڑے ہرجانے کی ذمہ دار ہوتی۔ کیونکہ ہر کوئی میری طرح وکلا کی مدد کو ٹھکراتا نہیں اور کمپنی پر فوراً مقدمہ ٹھونک دیتا ہے۔ فیکٹری والوں کو بھی انشورنس پالیسی لیتے وقت اس بات کا پابند کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ورکر کی حفاظت کے تمام انتظامات کریں گے اور یہ انشورنس کمپنی گاہے بگاہے فیکٹری کا اچانک دورہ بھی کرتی ہے۔ یہ بات اس وقت مجھے معلوم نہ تھی جب ہم آج مال میں سیفٹی شوز خرید رہے تھے۔

ایک اور ضمنی بات بھی درمیان میں یاد آگئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ میں یہ شوز مسلسل ہر جگہ استعمال کرتا رہا تھا۔ پھر کسی طرح اس پر کوئی کٹ لگ گیا جیسے کسی نے چھری سے ہلکا سا کاٹ دیا ہو۔ آٹھ دس ماہ بعد میں بچوں کے ساتھ مال میں گھوم رہا تھا تو میری بیوی سمیعہ بولی۔ ”اب نیا جوتا خرید لیں کیونکہ یہ بہت پرانا لگ رہا ہے اور تھوڑا سا کٹا ہوا بھی ہے۔“ یہ سن کر پہلے میں نے اپنے جوتوں کو ذرا ناقدری سے دیکھا اور پھر اسی دکان میں گھس گیا جہاں سے یہ جوتا خریدا تھا۔ میں نے ایسے ہی ان سے کہہ دیا۔ ”آپ سے جو شوز خریدے تھے۔ ان میں سے ایک خراب ہو گیا ہے۔“

انہوں نے مجھے بٹھا لیا۔ پھر میرے جوتے اتروائے۔ اس پر اپنی کمپنی کی مہر دیکھی۔ رسید مانگی تو میں نے کہا۔ ”وہ تو میں نے پھینک دی تھی۔“

انہوں نے اصرار نہ کیا۔ پھر سیل مین کچھ دیر مینیجر سے باتیں کرتا رہا اور ڈبے سے اسی سائز کا وہی برانڈ نیا جوتا لایا اور میرے پاؤں میں پہنا دیا اور معذرت کی کہ ہمارے جوتوں نے آپ کو مایوس کیا۔ میں نے قیمت ادا کرنا چاہی تو وہ شرمندہ ہو گئے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ آپ کے لیے فری ہیں۔ میں اپنے پرانے جوتے وہیں چھوڑ کر ٹھاٹ سے باہر نکل آیا۔

میں نے جوتوں کا ماجرا جب سنایا تو سمیعہ مجھ سے بھی زیادہ حیران تھی کہ کسٹمر سروس کا یہ معیار بھی ہو سکتا ہے؟

خیر آج کے دن ... یہ جوتے لے کر ہم اس لیے بھی خوش تھے کہ یہ کینیڈا میں ہماری پہلی باقاعدہ شاپنگ تھی۔

ہم خوش وخرم گھر پہنچے تو مفتی نے یہ کہہ کر ایک دھماکا کر دیا۔ ”کیا تم دونوں پردیسیوں کو معلوم ہے کہ کل پہلا روزہ ہے؟“ ہم ششدر رہ گئے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کل پہلا روزہ ہے اور ہمیں معلوم ہی نہیں؟ ایسا ماہ رمضان تو میری زندگی میں کبھی نہیں آیا۔ میں دھڑام سے کرسی پر گر گیا۔ شہباز کا رنگ ایک بار پھر پیلا پڑا، کچھ لرزا اور پھر اس کی آنکھوں کے کونے بھیگ گئے۔ میری اپنی یہی حالت تھی۔ میں تو روزوں سے کئی دن پہلے اس کی تیاری شروع کر دیتا تھا۔ پوری فضا عقیدت کی لہروں سے منور ہو جاتی تھی۔ مسجدیں دمک اٹھتی تھیں۔ دل نور سے ٹمٹمانے لگتے تھے۔ گلی میں چہل پہل بڑھ جاتی تھی۔ ہر ایک اپنی سائیکل یا بائیک پر سامان لادے، ٹمٹماتا ہوا گزرتا۔ شام سے پہلے محلے دار ایک جگہ جمع ہو کر چاند دیکھنے کا اہتمام کرتے۔ اگر چاند دیکھ لیا جاتا تو ایک شور بلند ہوتا اور وہ پھر پھیلتا ہوا سارے گھروں میں جا پہنچتا۔ جامع مسجد سے گولے فائر ہوتے ہی پورا شہر ماہ صیام کے تقدس میں ڈوب جاتا۔ مسجدوں کی روشنیاں جل اٹھتیں اور نمازی جوق در جوق مسجد کی جانب بڑھتے نظر آتے۔ مبارک بادیں دی اور وصول کی جاتیں۔ تراویح کی محفلیں بندھ جاتیں۔ سحری سے پہلے تنہا پڑی گلیوں میں آوازیں بلند ہوتیں۔ ”اٹھو دین دارو۔ وقت ہو گور دا۔ لقمہ کھاؤ نور دا۔ کم (کام) کرو حضور دا۔“ پھر پورا دن سورج کے ساتھ ساتھ چلتا۔ باورچی خانے مہک اٹھتے۔ دستر خوان سجائے جاتے۔ نئے کھانے اور لوازمات تیار ہوتے۔ سب مل کر ایک جگہ بیٹھ کر افطار کرتے اور پھر مسجد کے میناروں سے اذانیں گونجتیں۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔

مگر یہاں تو مہیب خاموشی اور اداس تنہائی ہمیں گھیرے تھی۔ نہ میں نے کسی کو ماہ رمضان کی مبارک باد دی اور نہ کسی نے مجھے۔ میں نے لیونگ روم کے پردوں کو ذرا ہٹا کر باہر دیکھا تو آسمان ہمیشہ کی طرح سیاہ بادلوں سے ڈھکا تھا۔ ٹھنڈ کی وجہ سے کوئی باہر نظر نہ آیا۔ چند بلبوں کی دودھیا روشنی پھیل رہی تھی اور سناٹا تھا۔ نہ میں نے نماز پڑھی اور نہ کوئی تراویح ہوئی۔ میں منہ لپیٹ کر لیٹ گیا۔ شدت غم سے نیند کوسوں دور تھی۔ اسی حالت میں پڑا رہا کہ سحری کے وقت مفتی کی گھڑی کا الارم بول پڑا۔ رات کے بنے ابلے چاولوں پر دال ڈال کر ہر ایک نے خاموشی سے اپنی اپنی سحری کی اور پھر نماز ادا کی اور پھر خاموشی سے جا سوئے۔

نیند نہیں آرہی تھی اور جب جلد اٹھ بیٹھے۔ ایک تو مفتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کی پیکنگ ختم نہ ہوتی تھی۔ اس نے دو چار دن بعد پاکستان جانا تھا۔ سامان پیک کرنے کے بعد پھر وہ اسے اندازے سے تولتا کہ کہیں بھاری نہ ہو جائے۔ اگر بیگ کا وزن بڑھ جاتا ہے تو ایئر لائن والے اضافی چارج کرتے ہیں۔ یہاں مجھے احساس ہوا کہ میں نے قندیل کے لیے بہت سا سامان مفتی کو پکڑوا دیا ہے۔ اس نے میری ذہنی حالت کی بدولت کوئی تردد نہیں کیا۔ میں اب اندر سے شرمندہ ہو رہا تھا۔ جب کوئی اسے اپنی چیزیں پاکستان لے جانے کے لیے منت سماجت کرتا اور مفتی ان سے کہتا کہ پہلے ہی میرے پاس بہت سامان ہے تو شرمندگی مزید بڑھ جاتی۔

مجھے اس کا اندازہ بعد میں ہوا کہ جب ہم سمندر پار کے پاکستانی کچھ دن کے لیے وطن جاتے ہیں اور دوسرے لوگ اپنے تحائف لے آکر آپ کے دروازے پر دستک دے رہے ہوتے ہیں تو کس طرح اپنی مجبوری بیان کر کے ان کو خالی لوٹاتے ہیں۔

اس دن کی شرمندگی کے احساس نے مجھے اس طرح گھیرا کہ میں نے پھر کسی کو اپنا سامان نہ دیا اور نہ مجھے کوئی اپنے تحائف ساتھ لے جانے کے لیے دیتا تھا۔ ایک بار ایک دوست نے پورا سوٹ کیس مجھے تھما دیا۔ میں تا دیر اس سوٹ کیس کو غصے سے دیکھتا رہا۔ وہ اپنی جگہ مجبور ہوتے ہیں اور سفر کرنے والے اپنی جگہ۔

اتنے میں شہباز اپنے پسینا بھرے زرد چہرے سمیت اٹھ کر باہر لیونگ روم میں آگیا اور ڈور وال سے ٹیک لگائے خلاؤں میں کچھ گھورتا رہا۔ اتنے میں فون بجا تو میں نے اٹھا لیا۔ میں اکثر فون نہیں اٹھاتا تھا کیونکہ اگر آگے کوئی انگلش میں بات کرتا ہو تو میرے پلے ان کا لہجہ بالکل نہیں پڑتا تھا مگر میں نے اس دن بے خیالی میں اٹھایا تو آگے کوئی نک تھا (Nick) اور شہباز کا پوچھ رہا تھا۔ شہباز نے نک کا نام سنا تو ایک دم میں ہوشیار ہو گیا۔ امید اور خوشی کی کیفیات اس کے چہرے پر نمایاں تھیں۔ مفتی بھی اپنی پیکنگ چھوڑ کر میری طرح ہمہ تن گوش ہو گیا۔

شہباز نے میرے ہاتھوں سے فون جھپٹا اور دونوں ہاتھوں سے ریسیور کو تھاما، قدرے جھکا اور اپنے لہجے کو انتہائی درجے کی خوشگواری میں رکھ کر بڑے ادب سے بات کی۔

''نک میں آجاؤں گا۔ نک فکر نہ کرو۔ میں وقت کا بہت پابند ہوں۔ نک موسم آج اچھا جا رہا ہے۔ نک اور کیسے ہو؟'' ہم حیران تھے کہ یہ نک کہاں سے آگیا اور یہ شہباز کیوں بچھا جا رہا ہے۔

فون بند ہوا تو زرد چہرے پر اب سرخی تھی اور پسینا بھی خشک ہو چکا تھا۔ شہباز خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ کوئی انجانی سی مسکراہٹ چہرے پر پھیلی تھی اور وہ نئی نویلی دلہنوں کی مانند بری طرح سے شرما رہا تھا۔ میں ڈر گیا کہ اللہ خیر کرے، کہیں یہ بھٹک تو نہیں گیا جس کا امکان نہایت ہی کم تھا۔ ہم نے پوچھا کہ نک کون ہے تو زیادہ شرماتا گیا اور مسکراہٹ چھپتے نہ چھپتی تھی۔ ہم نے جب سختی سے کریدا تو پھر معلوم ہوا کہ شہباز نے کل کسی جاب کے لیے فون پر انٹرویو دیا تھا۔ نک کمپنی کا سی او تھا۔ وہ اس کو آج جاب کے لیے بلا رہا تھا۔ شہباز نے بتایا۔ ''مارکیٹنگ کی کوئی پوسٹ ہے اور مجھے ایک انٹرویو کے بعد انہوں نے منتخب کر لیا ہے اور دو گھنٹوں میں مجھے پہنچنا ہے۔'' یہ کہتا ہوا وہ واش روم میں گھس گیا۔

میں نے اور مفتی نے ایک دوسرے سے کہا کہ یہ بہت خوش قسمت رہا کہ آتے ہی ایک کمپنی میں مارکیٹنگ کی جاب مل گئی اور وہ بھی سی او نے خود فون کیا۔

شہباز تیار ہو کر نکلا تو ہم دنگ رہ گئے۔ مکمل سوٹ اور ٹائی لگا کر کوئی باقاعدہ مارکیٹنگ آفیسر لگ رہا تھا۔ وہ سیدھا کچن میں جا کر چائے بنانے لگا تو مفتی بولا۔ ''کیا روزہ بھی توڑ دو گے۔''

یہ سن کر اسے یاد آیا کہ آج تو پہلا روزہ ہے۔ تھوڑا سا ہنسا، پھر لہرایا اور باہر نکل گیا۔

افطاری سے کچھ دیر پہلے آیا تو افسردگی، فاقہ کشی اور پسینا اس کے زرد چہرے پر تھا۔ تھکے انداز میں ڈولتا ہوا آیا اور آتے ہی کارپٹ پر گر گیا۔ ہم دونوں خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ کچھ ساعت بعد وہ بولا۔ ''سب سیاپا ہے۔ سارے فراڈی ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ گورے بڑے کھرے ہوتے ہیں مگر یہ تو ہم سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔''

پھر اس نے اپنی داستان سنائی تو ہم سب دنگ رہ گئے۔ خلاصہ یوں ہے۔

شہباز نے میکرو اسکل سینٹر سے کسی مارکیٹنگ کی جاب کا اشتہار انٹرنیٹ پر دیکھا اور وہیں سے انہیں فون کیا۔ نک سے بات ہوئی اور اس نے اس کا نمبر لے لیا۔ آج صبح اسے مسی ساگا کے ایک مشہور مال اسکوائر ون میں بلوایا تھا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے بھی دو گھنٹے لگ گئے۔ وہاں کوئی دفتر نہ تھا بلکہ مال کی راہداری کے بیچ میں ایک کاؤنٹر لگا تھا۔ ایک لڑکی آتے جاتے کو ایک پمفلٹ پکڑاتی اور کہتی کہ آپ کو ہماری کمپنی کا کریڈٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایڈ فری لنکس

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

www.paksociety.com

کارڈ چاہیے؟ اور لینے والا دوبارہ وہی پمفلٹ اس کے ہاتھ میں واپس دیتا اور آگے بڑھ جاتا۔ شہباز سے بھی یہی کہا گیا کہ چلو شروع ہو جاؤ۔ شہباز نے پوچھا۔ ''تنخواہ کتنی ہوگی؟'' تو بتایا گیا کہ کوئی تنخواہ نہیں ہے مگر جب ایک کارڈ بیچو گے تو تین ڈالر ملیں گے۔ شام تک شہباز کارڈ کیا، تین پمفلٹ بھی نہ بانٹ سکا تھا۔ لڑکی سے تو لوگ وہ پمفلٹ لے لیتے تھے مگر اس کی سنتے بھی نہ تھے۔ جس کی بھی جانب یہ لپکتا تو وہ اسے حقارت سے دیکھتے۔ یہ بھاگ دوڑ کرتا رہا مگر نتیجہ لاحاصل رہا۔ ایک کارڈ بھی بیچ لیتا تو تین ڈالر تو مل جاتے مگر یہ تو آٹھ ڈالر بسوں کے کرائے میں اڑا آیا تھا آخر کار یہ چند گھنٹوں بعد وہی پمفلٹ ڈسٹ بن میں پھینک کر آ گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''وہ لڑکی کہاں گئی؟''

جواب میں اس نے کارپٹ پر لیٹے لیٹے جو کہا۔ وہ میں لکھ نہیں سکتا صرف مفتی یہ کہتا رہ گیا۔ ''روزے میں تو حیا کرو۔''

کل جب مفتی نے ماہ رمضان کے شروع ہونے کا اعلان کیا تھا تو مجھے اپنی ذہنی حالت کی بدتری کی وجہ سے خیال نہ رہا تھا کہ پوچھوں... اسے کیسے معلوم ہوا کہ کل پہلا روزہ ہے؟ کسی مسجد نے اطلاع دی تھی یا کسی ریڈیو نے خبر دی یا ٹی وی پر پٹی چل رہی تھی۔ آج شہباز جب منہ بسورے کراہ رہا تھا تو میں نے مفتی سے یہ پوچھ لیا۔ وہ کہنے لگا۔ ''ہر سال پہلے سے ہی کیلنڈر میں دے دیتے ہیں کہ روزے کب شروع ہوں گے اور عید کب ہوگی۔''

شہباز اپنے تکیے پر بڑبڑایا تھا جو ہم سب نے صاف سنا ''مفتی کی ہر بات پر کوئی نہ کوئی سیاپا ہوتا ہے۔ مولوی جب تک خود اعلان نہ کریں تو کوئی روزہ رکھ سکتا ہے؟''

مفتی بولا۔ ''پھر تم نے کیوں رکھا ہے؟''

بات تو مفتی کی بھی ٹھیک تھی مگر شہباز اپنا ذہنی دباؤ کم کرنے کے لیے مفتی کو چھیڑنے سے باز نہ آیا۔

''میں نے تو اس لیے رکھ لیا کہ تو مولوی تو نہیں پر لیٹ نائٹ شو دیکھنے والا مفتی ضرور ہے اسی لیے تیرے کہنے پر رکھ لیا۔'' یہ سن کر مفتی منہ پھیر کر بند ٹی وی کو رغبت سے تکنے لگا تھا۔

جو کچھ مفتی نے بتایا وہ غلط بھی نہ تھا۔ ناسا پورے سال کے کیلنڈر ایک سال پہلے دے دیتا ہے کہ کس دن چاند کی پوزیشن کس مقام پر کیا ہوگی اور یہ معلومات بہت حد تک صحیح بھی ہوتی ہیں۔ اسی لیے یہاں ہر مسلمان کو معلوم ہوتا ہے کہ اس سال ماہ رمضان کب شروع ہوگا اور عید کس دن ہوگی۔ جیسے ان دنوں میں فوٹوگرافی کرتا ہوں تو میرے فون میں ایک پروگرام ہے۔ جس سے مجھے سورج کے طلوع اور زوال، چاند کی ہر پوزیشن، ستاروں اور ملکی وے کی ہر لمحے حرکت کا معلوم ہوتا رہتا ہے۔ چاند اس وقت افق کے اوپر ہے یا نیچے اور ایک سال پہلے یا ایک سال بعد کسی خاص دن کے خاص لمحے میں کہاں تھا یا ہوگا۔ یہ سب معلوم ہو جاتا ہے۔

مجھے اس مقام پر ایک روایت یاد آ رہی ہے جو یہاں بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک بار کوئی موذن فجر کی اذان دینے مسجد میں آیا۔ لاؤڈ اسپیکر کو کھولا اور جیسے ہی اذان شروع کرنے لگا ایک آدمی باہر سے آیا اور اسپیکر بند کر دیا۔ موذن نے پوچھا کہ بھائی کیا ماجرا ہے تو وہ آدمی بولا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ فجر کا وقت ہو گیا ہے۔ موذن بولا کہ کلینڈر لگا ہوا ہے اور ہم اسے دیکھ کر اذان دیتے ہیں۔ وہ آدمی بولا کہ کیا شریعت میں کوئی کلینڈر ہے؟ موذن بہت پریشان ہوا اور مولوی صاحب کو حجرے میں بلا لایا کہ کوئی پاگل ہے جو اذان نہیں دینے دیتا۔ مولوی صاحب آئے اور وہی سوالات و جوابات دہرائے گئے۔ وہ آدمی کہہ رہا تھا کہ شریعت میں فجر جب ہوتی ہے جب رات کی سیاہی افق پر دن کے نور سے ملتی ہے تو فجر ہوتی ہے اور آپ کو چھت پر جا کر یہ دیکھنا چاہیے اور جب وقت ہو جائے تو اذان دینی چاہیے۔ مولوی صاحب نے سمجھاتے ہوئے کہا کہ ایک تو سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ سورج کے طلوع ہونے کا وقت معلوم ہو جاتا ہے اور پھر اگر ہر ایک اپنے اپنے اندازے کے مطابق اذان دے گا تو فتنہ پھیلے گا اور جب سائنس نے کیلنڈر بنا دیے ہیں اور وہ ہیں بھی درست تو کون چھت پر چڑھے۔ کیوں نہ اس کی مدد سے اس سہولت کا فائدہ اٹھایا جائے؟ پھر مولوی صاحب نے اس آدمی سے پوچھا کہ اب بات سمجھ میں آ گئی ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ''مگر ایک خلش باقی ہے۔''

مولوی صاحب گویا ہوئے کہ وہ کیا ہے۔ اس آدمی نے پتے کی بات کی۔ اذان کے لیے آپ فتنہ خلق سے بچنے کے لیے کیلنڈر کا استعمال کرتے ہیں تو چاند دیکھنے کے لیے آپ چھتوں پر کیوں چڑھ جاتے ہیں اور اس سے تو بڑا فتنہ پیدا ہو رہا ہے۔ اس پر آپ سائنس کی مدد کیوں نہیں لیتے۔''

یہ مسئلہ مغرب نے حل کر دیا مگر ہم ابھی بھی وہیں پھنسے ہیں۔ ہر عید پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے اور ہر شہر اپنا چاند ڈھونڈتا ہے۔ ایک بار میں نے موسم کی پیش گوئی دیکھی تو کہا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

گیا تھا کہ چار دن بعد تین بجے سہ پہر برف باری شروع ہو گی۔ میں جاب سے نکلا اور گاڑی پر گھر جا رہا تھا۔ ہائی وے پر تھا کہ ٹھیک تین بجے برف کا پہلا گالا میری گاڑی کی ونڈ اسکرین پر پڑا تو میں حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

شہباز کسی طور مفتی کی منطق سے مطمئن نہ تھا اور میں بھی گومگو کی حالت میں تھا۔ مفتی دلائل کے ڈھیر لگا رہا تھا اور شہباز ان کو ٹھوکروں پر اڑاتا جا رہا تھا پھر کچھ دیر میں تند و تیز بحث نے لڑائی کی صورت اختیار کرنا شروع کی۔ کفر کے فتوے لگنا شروع ہوئے تو مجھے مداخلت کرنا پڑی سب خاموش ہوئے تو کشیدگی سی فضا میں جم گئی۔

افطاری کا وقت ہو رہا تھا اور کچن کا چولہا سرد تھا۔ سب ایک دوسرے سے خفا الگ الگ بیٹھے تھے۔ مفتی میٹرس پر لیٹا چھت کو تک رہا تھا اور شہباز دور لیٹا کمپیوٹر ٹیبل کے پائے ناخنوں سے کھرچ رہا تھا۔ میں نے افطار کا بگل بجایا تو سب نے بھاگ کر انڈے آلو تیار کیے اور روٹیاں وہی خمیری موجود تھیں۔ کشیدگی نرم پڑ کر ملاہٹ میں تبدیل ہوئی۔ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے لگے۔ پھر ایک دسترخوان لگا اور ہم نے کھجور اور کیلوں سے افطاری کی۔ تینوں خاموش اور اپنے آپ میں تنہا بیٹھے تھے، ہر ایک کسی گہری سوچوں میں گم۔ لگتا تھا کہ وہ میری طرح اپنی پچھلی افطاریوں کو یاد کر رہے تھے۔ جہاں ایک اہتمام سے سب دسترخوان کے گرد ایک محفوظ اور مطمئن گھیرے میں بیٹھے افطار کرتے ہوں گے۔ آج یہاں صرف گہری اداس خاموشی تھی، بڑی کھڑکی پر سرد ہواؤں کے تھپیڑے پڑ رہے تھے جو سیدھا میرے دل پر ضرب لگا رہے تھے۔ شہباز کے دل سے اٹھتی آہیں، اس کے منہ سے گہری سانسوں کی صورت باہر نکل رہی تھیں اور مفتی نے اپنا افطار ختم کر کے واش روم میں وضو کیا تھا اور لیونگ روم میں ایک مہیب سا سکوت طاری ہو گیا۔

میں اب سنجیدگی سے اس بات پر غور کر رہا تھا کہ ہمیں اپنے کھانے پینے کا انتظام ٹھیک سے رکھنا ہو گا۔ پچھلے کئی دنوں سے ہم کم خوراکی کی وجہ سے اپنا ذہنی توازن کھوتے جا رہے تھے۔ جب اللہ کی ہر نعمت ارزاں نرخوں پر دستیاب تھی تو ہم کیوں اس کے نہ شکرے بن رہے تھے۔ مفتی پاکستان جانے والا تھا اور لامحالہ اس کے جانے کے بعد یہ نظام میرے ہاتھ میں آتا اور میں نے بھی سوچ رکھا تھا کہ ایک بار کچن کا یہ نظام میرے ہاتھ آ گیا تو دوبارہ مفتی کے پاس نہیں جانے دوں گا۔ مفتی کو صفائی کا خبط تھا اور وہ کم سے کم خوراک بنانے کا عادی ہو گیا تھا کہ کہیں کچن خراب نہ ہو جائے، وہ یوں ہی چمکتا دمکتا رہے، بھلے ہم بھوکوں مر جائیں۔

شہباز اپنا لاہوری بھائی تھا اور کھانا کھانے میں وہ بہت ندیدہ تھا، دبے لفظوں میں کئی بار کہہ چکا تھا۔ ”یہ مفتی کے کچن کا نظام بھی نرا سیاپا ہے۔ کوئی ڈھنگ کی چیز نہیں بنانے دیتا کہ ایک تو خرچ زیادہ ہو گا اور دوسرا مصالحوں کی خوشبو باہر جائے گی جو گوروں کو بہت ناپسند ہے۔ ندیم بھائی۔ تم ہی کچھ کرو! یہ تمہاری سنتا ہے۔“

میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ کوئی ترکیب نکالتے ہیں جس سے مفتی بھی خفا نہ ہو۔

اگلا دن ہم نے سحری کرنے کے بعد سوتے گزارا۔ سو کر اٹھے تو پھر اونگھنے لگے۔ اپنے طور پر میں تو برسرروزگار ہو چکا تھا اور کل صبح جاب کا پہلا دن تھا۔ سوچتے، اونگھتے، کراہتے اور سوتے پورا دن گزر گیا۔ اسی دوران میں نے پاکستان سے لائی ہوئی نئی پینٹ کو اہتمام سے استری کیا۔ شرٹ کی کریزیں درست کیں۔ شوز تو ویسے بھی نئے تھے۔ معلوم تھا کہ افطاری کل جاب پر ہی ہو گی، اس لیے اپنے لیے انڈوں کے دو سینڈوچ تیار کیے۔ شہباز یہ سب خالی خالی نظروں سے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا۔ میں نے کپڑے ہینگر پر الماری میں لٹکائے۔ اپنا دفتری بیگ تیار کیا اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد دال بنائی اور شہباز سے کہا کہ وہ گلاٹی سے کچھ فروٹ لے آئے مگر اس نے باہر سردی میں جانے سے انکار کر دیا۔ میں نے کہا۔ ”تو پھر کھانا نہیں ملے گا۔“

وہ بولا۔ ”پہلے کون سا من و سلوئی اتر رہا ہے میں نہیں جاتا۔“

مجھے معلوم تھا کہ وہ میری جاب کی وجہ سے فرسٹریشن کا شکار ہے، اس لیے میں خاموش رہا۔

صبح سحری کے بعد میں بہت پرجوش تھا۔ بڑے اہتمام سے تیار ہوا۔ رگڑ کر شیو بنائی۔ مفتی کا پرفیوم لگایا۔ نئے کپڑے پہنے۔ باہر ابھی اندھیرا تھا۔ میں جاب کے پہلے دن لیٹ ہونا نہیں چاہتا تھا اس لیے سرمستی میں اپنی لیدر کی جیکٹ پہنے باہر نکل آیا۔ باہر دیکھا تو سیزن کی پہلی برف گر رہی تھی۔ فضا دھواں دھواں تھی اور ہر جانب برف کے پر تیر رہے تھے جو آہستہ آہستہ زمین کو ڈھانپتے جاتے تھے۔ ایک شاندار منظر میرے سامنے تخلیق ہو رہا تھا۔ کچھ لوگ اپنے آپ کو گرم لباس میں لپیٹے بس اسٹینڈ کے کیبن میں پناہ کے لیے تیز تیز چلے جا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ہمراہ وہاں کھڑا آسمان کو اور پھر

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

آس پاس دیکھ رہا تھا۔ علاقے کو دھند اور برف کے گالوں سے بھرتا ہوا دیکھنے لگا۔ بس آئی اور بھاگم بھاگ دوسرے کے ساتھ میں بھی اس میں سوار ہو گیا۔

فیکٹری پہنچا تو ابھی اندھیرا تھا اور مزدور اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں کسی دفتری بابو کے روپ میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ میں کہاں سے اندر داخل ہوں۔ آسمان تاریک تھا اور برف مجھ پر پڑ رہی تھی۔ زیادہ تر مزدور سکھ اور ہسپانوی تھے۔ کسی سے پوچھا تو اس نے مجھے بھی اسی لائن میں لگا دیا جس میں کھڑے سب اندر کہیں گم ہو رہے تھے۔ میں پہلے تو پریشان ہوا کہ ان مزدوروں میں، میں کیا کر رہا ہوں؟ پھر سوچا کہ اندر تو چلیں۔ پھر کسی سے پوچھ کر اپنے دفتر میں جا بیٹھوں گا۔ سب خاموش سایوں کی طرح پچھلے چھوٹے سے دروازے سے اندر جا رہے تھے۔

میں اندر پہنچا تو دیکھا کہ ایک بہت بڑا ہال ہے، جس میں آرا ٹائپ کی مشینیں لگی تھیں اور لکڑی کے بڑے بڑے تختے زمین پر رکھے تھے۔ مجھے وہ معینگ شخص جس نے مجھے نوکری پر رکھا تھا وہیں چھجے دار ٹوپی پہنے ہر ایک کو تنقیدی نظروں سے دیکھتا نظر آ گیا۔ میں چلتا ہوا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ''میں نے کہاں بیٹھنا ہے؟''

اس نے کسی کو اشارہ کیا اور کوئی میرے پاس آیا۔ میری جیکٹ اتروا کر کسی کھونٹی پر لٹکوائی، میرا بیگ کہیں آس پاس رکھا اور مجھے ایک آرا مشین کے پاس حیران و پریشان کھڑا کر کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔ میں ابھی سنبھلنے نہ پایا تھا کہ ایک اور ہسپانوی مشین کی دوسری جانب کھڑا ہو گیا اور دستانے چڑھانے لگا۔ مجھے بھی ساتھ رکھے دستانوں کی جانب اشارہ کر کے کہا کہ انہیں چڑھا لو۔ میں نے حکم بجا لایا۔ اس نے ایک بٹن دبایا اور آرا جیسے میرے دل پر چل پڑا۔ سب مشینیں ایک ساتھ چلیں تو لوگوں کی آوازیں ان میں دب گئیں۔ پھر میں نے سامنے والے کی ہدایت پر ایک طرف سے تختہ اٹھایا اور مشین پر رکھ کر آگے دھکیل دیا۔ اس کے دو ٹکڑے ہوئے اور آگے والے نے ان کو اٹھا کر زمین پر رکھ دیا۔ یہ عمل شروع ہوا اور ایک عذاب مجھ پر نازل ہوتا گیا۔ میں لکڑی کے بھاری تختے اٹھا کر آرا مشین پر لگی تیزی سے گھومتی آری کے آگے رکھتا اور وہ دو ٹکڑوں میں بٹ کر آگے والے کے ہاتھوں میں پہنچ جاتے۔ ایک گھنٹا گزرا تھا کہ میری کمر زمین سے تختے اٹھا اٹھا کر دوہری ہو گئی۔ وہی میرا نوکری رساں مجھ پر نظریں رکھے میری کارکردگی جانچ رہا تھا۔ اس کا کام سب مشینوں کے ارد گرد ٹہلنا تھا۔ وہ ہماری مشین کی جانب آیا اور کوئی بٹن دبایا تو اس آرا مشین کی رفتار بڑھ گئی۔ پہلے ایک منٹ میں سات تختے نکلتے تھے تو اب دس نکلنے لگے اور ہمارے کام میں تیزی آتی گئی۔ میں نے حساب لگایا تو ایک گھنٹے میں چار سو روپے کما چکا تھا مگر جھک کر بھاری تختہ اٹھانا اور اسے مشین کے سپرد کر کے دوبارہ جھکنا اور پھر اسے مشین پر رکھنا یہ عذاب مسلسل تھا۔ میرے نئے نکور کپڑے برادے سے بھر رہے تھے۔ چہرے اور بالوں میں بھی برادہ اٹکا ہوا تھا۔ یہ عمل معلوم نہیں کتنے گھنٹے جاری رہتا کہ لنچ بریک کا ٹائم ہو گیا۔

میں سمجھا کہ کسی کینٹین میں کرسی پر بیٹھ کر یا کسی صوفے پر لیٹ کر اپنی کمر سیدھی کروں گا مگر سب محنت کش اپنے ٹفن لیے انہی بدبخت تختوں پر بیٹھ گئے۔ بیشتر سکھ تھے اور اپنی سبزیاں نکالے اسے اپنے منہ میں ٹھونس رہے تھے۔ میرا روزہ تھا اور میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ ایک بولا۔ ''تم کیوں نہیں کھاتے؟''

میں نے کہا۔ ''میرا روزہ ہے۔''

دوسرا بولا۔ ''مسلم ہو کیا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو کہنے لگا۔ ''نئے لگ رہے ہو۔ کیا تھک گئے ہو؟''

میں خاموش رہا تو کسی اور کی آواز آئی۔ ''کچھ دن میں عادی ہو جائے گا۔ جب ہم بھی پہلے دن آئے تھے تو ایسے ہی تھے۔'' پھر سب کا قہقہہ فضا میں گونجا اور مجھے اپنا دل اس آرے سے گزرتا محسوس ہوا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں بھی انہی کی طرح ساری زندگی اسی آرا مشین میں یہی کرتے گزار دوں گا؟ یہ سوچتے ہی مجھے ایک جھرجھری سی آ گئی لیکن یہ طمانیت تھی کہ ایک دن میں مجھے اچھے خاصے پیسے مل جائیں گے۔

پھر وہی مشین چلی اور میں دوبارہ سے کٹنے لگا۔ سارا کام جسمانی تھا اور سوچنے کو دماغ مکمل فارغ تھا جو یہ سوچتا تھا کہ وہ کیا وقت تھا جب افسروں کی طرح یونیورسٹی میں پڑھانے جاتا تھا۔ اس کام کا کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ کل طارق نے نیویارک سے فون کر کے میری منتیں کی تھیں کہ مہینے کا خرچ میں بھیج دیا کروں گا۔ تم کو صرف بیٹھ کر لائسنس کے امتحان کی تیاری کرنا ہے۔ پر میں خودداری میں کوئی احسان نہ لینا چاہتا تھا اور آج اس پنجرے میں آ پھنسا تھا۔ اب میرا ذہن ماؤف ہو چکا تھا اور میں ایک میکانکی انداز سے اپنا کام کر رہا تھا۔ وقت کی رفتار رک گئی تھی اور مشین تیزی سے چل رہی تھی۔

افطاری کا وقت قریب آ رہا تھا اور میں متواتر جھک

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

جھک کر سیدھا ہو رہا تھا اور بار بار گھڑی کی سمت دیکھ رہا تھا جو مدتوں سے رکی ہوئی تھی۔ اللہ اللہ کر کے افطاری کا وقت ہوا تو میں نے سامنے والے سے کہا کہ کچھ دیر کے لیے مشین بند کر دے تاکہ میں روزہ افطار کرسکوں۔

وہ بولا۔ ”کیا مجھے نوکری سے نکلوانا ہے۔ مشین سپروائزر ہی بند کرسکتا ہے۔“

میں نے منت کی تو اس نے کہا کہ بھاگ کر پانی پی لو۔

میں بھاگ کر ایک نل کی طرف آ گیا، دو گھونٹ پانی کے پیے اور اسی رفتار سے بھاگتا ہوا آیا اور پھر جت گیا۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ مشین رک چکی ہے، چھٹی ہو گئی ہے اور میں تختہ اٹھا رہا تھا۔ سامنے والے نے مجھے روکا اور میں نے دھندلی نظروں سے دیکھا کہ وہ مجھے گھور رہا ہے۔ جیکٹ چڑھائی، دفتری بیگ اٹھا کر باہر آیا تو ہر چیز پر برف پڑی تھی اور ایک سفید سی چادر نے سب کچھ ڈھانپ لیا تھا۔ رات کی سیاہی پھیل کر پورے ماحول کو خوفناک بنا رہی تھی۔ میرے دماغ میں ابھی تک آرا مشین کی گونج اٹھتی تھی اور میں دہل سا جاتا تھا۔ میں لڑکھڑاتا، بھاری قدم اٹھاتا آہستہ آہستہ بس اسٹاپ پر آیا اور وہاں پڑے بینچ پر بیٹھ گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ سرد ہوا برف کو اڑا کر شور کر رہی تھی۔ میں نے بیگ سے انڈوں کا سینڈوچ نکالا اور نم آنکھوں سے چبانے لگا۔ سردی کی شدت سے چہار جانب ویرانی تھی، برف فضا میں اڑ رہی تھی اور میں 72 ڈالر کما چکا تھا۔

گھر پہنچا تو ٹھنڈ سے کپکپا رہا تھا۔ مفتی اور شہباز گرم لیونگ روم میں کارپٹ پر پڑے قہقہے لگا رہے تھے۔ میں داخل ہوا تو دونوں مجھے دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ مفتی بولا۔ ”یہ تیری حالت کیا ہو رہی ہے؟“ میں برادے سے لپٹا کھڑا تھا۔ میرا رنگ سفید پڑ چکا تھا اور اب مجھے ایک قدم اٹھانے کی بھی ہمت نہ تھی۔

شہباز نے مجھ سے میرا بیگ لیا اور آرام سے مجھے بٹھا دیا۔ میرے لیے پانی لایا جو میں غٹاغٹ چڑھا گیا۔ پھر میری آج کی کہانی سنی تو دونوں خاموش ہو گئے۔ شہباز نے پہلے مجھے کھانا کھلایا اور پھر چائے پلائی تو میری حالت سنبھلی۔ دونوں نے ایک ساتھ فیصلہ سنایا کہ میں کل سے نہیں جاؤں گا۔

مفتی کہنے لگا۔ ”بھاڑ میں گئی ایسی جاب۔ تم بھوکے نہیں مرو گے۔ بس یہ فیصلہ ہے کہ تم نہیں جاؤ گے کل سے۔“

میں نے کہا کہ محنت میں کیا عار ہے۔ میں جاؤں گا اور مجھ سے فارغ نہیں بیٹھا جاتا ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا مگر ان لوگوں نے کچھ ٹھان لیا تھا اور پھر مجھے زبردستی سلا دیا۔ باہر سے دونوں کی باتیں سرگوشیوں کی صورت اندر آتی رہیں اور پھر میں نیند کی وادی میں چلا گیا۔ سحری کے وقت اٹھا اور خاموشی سے سحری کی، نماز ادا کی اور کپڑے تبدیل کر کے دوبارہ کام پر جانے کے لیے تیار... ہو کر باہر آیا تو وہ دونوں میرے منتظر تھے۔ مفتی غصے میں تھا اور شہباز نے میرا بازو سختی سے پکڑا اور کہا کہ ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے۔

ان کے تیور دیکھ کر میں خاموش ہو رہا اور پھر پرسکون ہوتا چلا گیا کہ اب مجھے اس عذاب میں نہیں جانا تھا۔ مجھے میرے دوستوں نے روکا تھا۔ میں نے تشکر بھری نظروں سے انہیں دیکھا اور مطمئن ہو کر دوبارہ کپڑے تبدیل کیے اور سونے چلا گیا۔ جب تک میں سونے کے لیے لیٹ نہ گیا۔ انہوں نے مجھے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا تھا۔

آج مفتی کی پاکستان کے لیے فلائٹ تھی۔ سو کر اٹھے تو اس کا سامان پھر سے جانچا گیا۔ ایک بھاگ دوڑ اپارٹمنٹ میں جاری تھی۔ جیسے ہم سب پاکستان جا رہے ہوں۔ مفتی کا اپنا سامان کم اور دوسروں کا زیادہ تھا۔ سمندر پار سے وطن کے سفر کا دن ایک عجیب سی کسک رکھتا ہے۔ جلد سے جلد یہاں سے نکلنے کی جستجو اور نظر میں وطن کی مٹی اور وہاں ایئرپورٹ پر اپنوں کے دمکتے چہرے...... ایک ایک سے گلے ملنا اور سب کا آپ کو ہاتھوں ہاتھ لینا لیکن اب وہ کسک دونوں جانب سے مدھم پڑ گئی ہے۔ جب سے انٹرنیٹ، اسکائپ اور فیس بک آ گئے ہیں۔ اب شادی پاکستان میں ہو رہی ہوتی ہے اور ہم یہاں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ پہلی بار میں پاکستان گیا تو انٹرنیٹ ابھی نیا نیا آیا تھا اور یہ رابطے کم تھے۔ میں ایک ایک کو چھو کر دیکھ رہا تھا۔ بچے بڑے لگ رہے تھے اور بڑے بہت بڑے۔

مفتی کا سامان پیک ہو گیا تو شہباز کا رنگ زرد پڑ گیا اور چہرہ پسینے پسینے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مغموم ہے یا بھوکا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ افسردہ ہے۔

مفتی نے کال کر کے ٹیکسی منگوا لی۔ شہباز نے ائرپورٹ جانے سے انکار کر دیا۔ میں ٹیکسی میں سامان رکھنے باہر آیا۔ آسمان دھواں دھواں تھا کہر کی دبیز تہہ چھائی ہوئی تھی اور بار بار سردی سے دانت بج رہے تھے۔ پاکستان میں کسی نے کہا تھا کہ کینیڈا میں صبح سویرے سڑک پر نکلو تو دانت جل ترنگ بجانے لگتے ہیں۔ واقعی مجھے اس وقت ایسا ہی لگ رہا تھا کہ میرے منہ میں جل ترنگ بج رہا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

www.paksociety.com

دانت مسلسل بج رہے تھے۔ کیونکہ یہ دسمبر کا مہینا تھا۔ تو رنتو دسمبر میں سردی نہ ہوتو کب ہوگا؟

ٹیکسی کی ڈکی میں سامان رکھا اور جلدی سے اندر بیٹھ کر دروازے بند کر لیے۔ ہیٹر کی وجہ سے اندر کی فضا نسبتاً گرم تھی۔ ہم نے راحت بھری سانس لی اور ائرپورٹ کو چل دیے۔ ڈرائیور پاکستانی تھا۔ عمر لگ بھگ پچپن سال ہوگی۔ نام کاظمی تھا۔ دیار غیر میں اپنی طرف کا کوئی مل جائے تو گویا عید ہو جاتی۔ کاظمی سے ملتے ہی میں اپنی عادت سے مجبور ہو گیا اور اس سے بھی سوال کرنے لگا۔

اس نے بتایا وہ تیس سال سے یہاں تھا۔ اس کے لہجے میں ایک پچھتاوا اور افسردگی تھی۔ آنکھوں میں کوئی اداسی سی آ ٹھہری تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''کب سے آپ کینیڈا میں ہیں؟''

''تیس سال سے۔'' جواب ملا۔

میں نے مرعوب آنکھوں سے مفتی کو دیکھا۔

مگر مفتی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کاظمی خود ہی بتانے لگا۔ ''میں 1969ء میں یہاں آیا تھا۔ پہلے میں ایک سوئس کمپنی میں جاب کرتا تھا اچھی جاب تھی۔ معقول تنخواہ تھی زندگی بہترین گزر رہی تھی کہ جس کو ایک امریکن نے خرید لیا اور کینیڈا کا آفس بند کر دیا نتیجتاً میں بھی بے روزگار ہو گیا۔'' پھر ایک آہ بھرتے ہوئے بولا ''اگر دو سال اور جاب چل جاتی تو ماہانہ چودہ سو ڈالر تاحیات پنشن ملتی۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے پھر پوچھا۔ ''یہ سب وقت کیسے گزرا؟''

اس نے بتایا۔ ''پوری جوانی کینیڈا کو دے دی۔ تین بچیاں ہیں۔ ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔ دوسری امریکا میں ایم بی اے کر رہی ہے اور تیسری بی ایس سی آنرز کر رہی ہے۔ تینوں خوش ہیں۔''

''اور آپ؟'' میں اس کا حال پوچھنا چاہتا تھا۔

میری جانب مخاطب ہو کر بولا ''میری کیا پوچھتے ہیں۔ بس اس بات کو گرہ میں باندھ لیں کہ اگر پاکستان میں باعزت نوکری ہے تو یہاں صرف پانچ سال گزاریں۔ اپنا اور فیملی کا پاسپورٹ لے کر واپس چلے جائیں۔ ورنہ ایک پچھتاوہ ہی پیچھے رہ جائے گا۔'' اس نے ٹن پیک سے کوک کا گھونٹ بھرا۔ ''تیس سال پہلے لائٹ ہاؤس کراچی میں بیٹھ کر چائے کا ایک کپ پی کر دل مطمئن ہو جاتا تھا۔ سال میں ایک دو پینٹس اسی لائٹ ہاؤس کے علاقے سے لا کر موج میں آ جاتے تھے۔ کسی ریڑھی والے سے بریانی کھا کر آسمان کی جانب دیکھ کر شکر گزار ہوتے تھے اور یہاں پچھلے کئی سال سے برگر اور کوک پر چل رہا ہوں۔ دن رات کام کرنے کے بعد اپنا خرچ پورا کرتا ہوں۔ اپنا ملک اپنا ہوتا ہے۔ روکھی سوکھی کھا کر بھی دل مطمئن رہتا ہے۔ یہ ہمارا ملک نہیں ہے۔ یہاں سو سال گزار کر بھی ہم غیر ملکی ہی کہلائیں اور ہماری ثقافت، ہمارے ادب و آداب بھی ہم سے چھن جائیں گے۔ ہم نہ گھر کے رہیں گے نہ گھاٹ کے۔'' اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ کچھ توقف کے بعد وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے پاس وقت ہے۔ جوان ہو۔ کچھ کما کر واپس چلے جاؤ۔ یہاں کینیڈا کو پڑھے لکھے مزدوروں کی ضرورت ہے۔ لوگ اچھی خاصی نوکریاں چھوڑ کر آتے ہیں اور پھر یہاں کے جال میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔ یہاں مزدوری کرتے ہیں اور پاکستان میں رشتہ دار سمجھتے ہیں کہ ہم یہاں بہت خوشحال ہیں اور شرم و پردہ داری کی وجہ سے انہیں بتا بھی نہیں سکتے کہ ہم پر کیا قہر ٹوٹ رہا ہے۔ میری اولاد اب تک فرماں بردار ہے مگر یہاں کی آب و ہوا کا کوئی بھروسا نہیں۔ کل کو کہہ سکتے ہیں کہ you old man۔ تم کون ہوتے ہو ہمارے معاملات میں دخل دینے والے؟''

یہ باتیں کرتے کرتے وہ ایئرپورٹ میں داخل ہو چکا تھا۔ ہم دونوں اس کی باتوں سے دل گرفتہ تھے۔ ہم خاموشی سے نیچے اترے۔ کرایہ دیا اس نے نوٹ لے کر جیب میں رکھا اور چلا گیا مگر پیچھے اندیشوں اور خدشوں کے سانپ ہمارے حوالے کر گیا۔ ہم ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہے تھے۔ کاظمی ہمیں جھنجھوڑ گیا تھا۔

ائرپورٹ پر تمام مسافر پاکستانی تھے۔ چند لوگ ایک لڑکے کو چھوڑنے آئے تھے۔ لڑکے سے ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگا کہ چند ماہ پہلے آیا تھا اور اب مکمل طور پر واپس جا رہا ہوں۔ اپنوں میں رہ کر دو وقت کی روٹی یہاں کی اونچی عمارتوں اور صاف شفاف سڑکوں سے بہت بہتر ہے اس لیے میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔

کاظمی کے وار کے بعد اس کا وار بھی مجھے کاٹ گیا۔ مفتی کو الوداع کہہ کر میں واپس اپارٹمنٹ میں آیا اور منہ لپیٹ کر پڑا رہا۔ دل بری طرح ریزہ ریزہ۔ تمام خواب بکھرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ دل و دماغ میں رسہ کشی شروع ہو گئی تھی۔ دماغ کہہ رہا تھا کہ جب آ گیا ہوں، اتنی بڑی رقم داؤ پر لگا دی ہے تو کچھ بن کر دکھا جاؤں لیکن دل کا تقاضا تھا کہ سب ''موہ مایا'' ہے سب دھوکا ہے۔ یہ ملک نہیں سنہرا جال ہے جو مجھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

پھانس رہا ہے اس لیے میں بھی مفتی کے ساتھ اسی جہاز میں بیٹھ کر واپس چلا جاؤں۔

کئی دن تک میرے اندر جنگ کی سی کیفیت رہی لیکن دھیرے دھیرے حالات کی نزاکت نے مجھے احساس دلا دیا کہ میں غلط رخ پر سوچ رہا ہوں جن لوگوں نے مجھے آس اور اُمید سے یہاں آنے سے نہیں روکا تاکہ ان کی اُمید پر کھرا اتروں۔ میری تربیت اتنی کچی نہیں ہے کہ میں یہاں کی بھول بھلیوں میں اتنی آسانی سے کھو جاؤں۔ یہاں کا ماحول میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ اس خیال نے تقویت دی اور میں نے ذہن پر چھائی گرد کو جھٹک دیا۔ یہاں سیٹ ہونے کے لیے پھر سے ہاتھ پیر مارنے لگا۔

میں اپنے تئیں سمجھتا تھا کہ ڈیرہ اسمٰعیل خان سے میں پہلا شخص ہوں جس نے کینیڈا کی امیگریشن لی ہے۔ میں کچھ دن پہلے خاکوانی صاحب کے گھر گیا تھا تو انہوں نے بتایا کہ ڈیرہ کے عارف صاحب بھی بچوں سمیت امیگریشن لے کر آئے ہوئے ہیں۔ میں نے عارف کا نام سنا تھا مگر ملاقات نہ تھی۔ وہ شروع سے جاپان میں رہا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ ایک چھوٹے سے شہر سے کسی نے کینیڈا کی امیگریشن لی ہو اور میں بے خبر رہوں۔ پھر مجھے خاکوانی صاحب نے بتایا تھا کہ وہ لوگ ماسکو سے یہاں پہنچے ہیں تب جا کر میرے دل کو تسلی ہوئی۔

آج مجھے عارف نے گھر پر افطاری کے لیے مدعو کیا تھا۔ وہ بھی خاکوانی صاحب کے آس پاس سکاربرو میں رہتا تھا۔ اس کی فیملی میں تین بیٹیاں تھیں۔ اس کی بیوی کنول میری بہن کی کلاس فیلو بھی تھیں اور غائبانہ جان پہچان بھی نکل آئی تھی اور باقی میں نے خود بنا ڈالی تھی۔ حالانکہ ان کے گھر تک کا رستہ ڈیڑھ گھنٹے سے زائد کا تھا مگر گھر کا بنا کھانا جیسے مجھے صدیوں سے نصیب نہ ہوا تھا اور اسی لیے میں اب ائرپورٹ کے باہر 58 نمبر بس کا انتظار کر رہا تھا جو مجھے لارنس ویسٹ کے سب وے لے جائے۔ اس سے میں ساؤتھ کی ٹرین پکڑ کر Spidina اور پھر وہاں سے مشرقی سمت کو کینیڈی جا سکتا تھا۔

دو دن پہلے جو برف باری شروع ہوئی تھی۔ وہ وقفے وقفے سے ہوتی رہتی تھی۔ کبھی ہوا کی موج میں آئے برف کے گالے زمین کے اوپر فضا میں تیرنے لگتے اور پھر آہستہ آہستہ زمین پر گرتے چلے جا رہے تھے۔ دیکھنے میں ایک سہانا منظر تھا۔

دھواں دھواں فضا، منہ سے بھاپ اڑاتے ہاتھوں میں کافی کے کپ پکڑے ہوئے آتے جاتے بھاگتے لوگ۔ برق رفتاری سے گزرتی گاڑیاں اور ایک بھی ہارن کا شور نہ ہو تو دل اس ماحول میں کھوسا جاتا ہے۔ آنے جانے کے لیے تین تین رویا سڑکیں اور ان کے کناروں پر بلند ہوتی عمارتیں جن کو میں تصویروں میں بھی دیکھ کر اپنے خیالوں میں بہہ جاتا تھا۔ اب میرے سامنے کھڑی، میرا مذاق اڑا رہی تھیں۔ ایک گھنٹا بعد بس آئی اور میں اپنے نقشے کی مدد لیتے ہوئے اپنے روٹ کے مطابق عارف کے فلیٹ کے نیچے دو گھنٹے بعد کھڑا تھا۔ وہ دو دکانوں کے اوپر بنا تنہا فلیٹ تھا۔ دکانوں کے بیچ سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔

گھنٹی بجائی تو کنول بھابی نیچے آئیں۔ بچے گھر پر تھے اور وہ مہمانوں کے لیے گھر کی صفائی کر رہی تھیں۔ میں وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ عارف ابھی جاب سے واپس نہیں آیا تھا۔ میں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گیا۔ جس کی کھڑکیاں باہر سڑک پر کھلتی تھیں۔ جہاں سرد آسمان تلے کاریں بھاگ رہی تھیں۔ پہلے انہوں نے سب گھر والوں کا حال احوال پوچھا اور پھر کام میں جت گئیں۔ بچے چھوٹے تھے اور آپس میں لڑ رہے تھے۔ یہ شور مجھے بھلا لگ رہا تھا۔ معلوم نہیں کب سے یہ شور میں نے نہیں سنا تھا مگر ان کی ماں یہ شور وغوغا سن کر اپنا سر پیٹتی ہوئی کہنے لگی۔ ”کاش ان کو کچھ دیر کے لیے یہاں سے کوئی لے جائے۔“

میں نے کہا۔ ”بھابی! آپ تو خوش نصیب ہیں کہ بچوں کا شور تو سن رہی ہیں۔ مجھے دیکھو، ان آوازوں کو ترس رہا ہوں۔“

کام کرنے کے بعد وہ میری جانب متوجہ ہوئیں۔ میں ٹیکسی ڈرائیور کاظمی کی باتوں کا ڈسا، بچوں سے دور ایک بیروزگار تھا۔ کنول بھابی کو جب یہ کہا کہ کینیڈا رہنے کی جگہ نہیں، بچوں کے لیے تو یہ زہر قاتل ہے تو انہوں نے غصے سے میری بات اچک لی۔ کہنے لگیں کہ ایک تو اس ملک نے آپ کو آنے دیا ہے اور آپ اس میں کیڑے نکال رہے ہیں۔ اتنے میں کوئی اور صاحب بھی اپنی فیملی کے ساتھ آگئے۔ وہ پاکستان میں اسٹیل مل کے مینیجر تھے اور پچھلے پانچ ماہ سے جاب کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ میں سوچنے لگا کہ ہر جگہ مجھے واپس جانے کی بات نہیں کرنی چاہیے۔ کنول بھابی اور عارف ماسکو سے آئے تھے اور اس سے پہلے جاپان میں رہتے تھے۔ وہ کبھی بھی پاکستان میں مستقل نہ رہے تھے۔ ہماری سوچوں میں ایک بڑا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

فرق تھا کیونکہ میں اپنی مرضی سے کینیڈا آیا تھا۔ کسی نے مجھے ملک بدر نہ کیا تھا۔ مجھے اب مثبت انداز میں آگے بڑھنا چاہیے تھا۔ یہ میں نے بعد میں جانا کہ شروع میں ہر کوئی اس ذہنی کیفیت سے گزرتا ہے جس سے میں گزر رہا تھا۔ ایک ایسا شخص جو ایک دن میں اپنے سالوں کے معمولات سے نکال دیا گیا ہو، بچوں سے دور اور روزگار کے لیے پریشان ہو تو وہ کس طرح ایک نارمل رویہ اختیار کر سکتا ہے۔ بعد میں جب کوئی کینیڈا آتا اور مجھ سے ملاقات ہوتی تو میں اس کی ہر ممکن مدد کرتا، جو چیزیں میں نے ایک سال کے تجربات سے سیکھیں تھیں وہ میں انہیں ایک ہفتے میں سکھا دیتا تھا یا سکھانے کی کوشش کرتا۔ ان کو تسلی دیتا اور رہنمائی کرتا۔ مجھے کئی سال ہو گئے ہیں یہاں رہتے ہوئے۔ ایک بات طے شدہ ہے کہ یہاں کسی کو آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ صرف انہیں صحیح گائیڈ کر کے اپنے راستے پر لگا دیں تو وہ خود ہی چند مہینوں میں چلنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر ملیں ضرورت پڑنے پر گلے لگا لیں اور بس۔ یہی چیز اس کو اٹھا دے گی۔ کیونکہ یہاں آنے والے میچور ہوتے ہیں۔

عارف بھی آ گیا۔ وہ پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھا مگر وہ بھی کوئی چھوٹی سی جاب کر رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ ”تم تو فارماسسٹ ہو اور اگر لائسنس لے لو تو زندگی تبدیل ہو جائے گی۔“

میں نے کہا۔ ”اس کے امتحانات بہت مشکل ہیں اور لائسنس لینا آسان نہیں۔“

وہ مجھے سمجھانے لگا تھا کہ یہ ناممکن تو نہیں۔ کئی لوگوں نے لیے بھی ہیں۔

بات اس کی جائز تھی۔ دراصل آتے ہی مفتی نے میرے کان میں یہ ڈالنا شروع کر دیا تھا کہ فارماسسٹ کے لائسنس کو تو بھول ہی جاؤ کیونکہ اس کے مراحل اتنے سخت ہیں کہ آپ صرف اپنا وقت ضائع کرتے رہو گے اور میں نے بھی مفتی کی بات کو پلے سے باندھ لیا تھا۔ مفتی خود فارماسسٹ تھا اور لائسنس کے پہلے امتحان میں فیل ہو کر مجھے یہ سب سمجھایا کرتا تھا۔

کھانا بہت اچھا تھا اور مجھے اب یہ فکر تھی کہ پھر دو گھنٹے کا بسوں اور ٹرین کا سفر کرنا ہے۔ عارف نے میری مشکل بھانپ لی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی اپنی گاڑی میں مجھے گھر چھوڑنے آئے اور ساتھ میں بہت سا کھانا بھی دے دیا۔ میں پہلی بار کسی کار میں شہر کے بیچوں بیچ چلتی ہائی وے 401 پر جا رہا تھا۔ ٹورنٹو کی روشنیاں کار میں بیٹھے ہوں تو بہت خوبصورت منظر پیش کرتی ہیں اور یہ آپ کو بس یا ٹرین سے ایسے نہیں دکھتی ہیں۔ سواری کے لیے کار ہو تو منظر بھی بدل جاتا ہے۔

یہ ہائی وے ایک سائیڈ پر ملا کر کہیں کہیں سات لائنوں کی تھی۔ دونوں جانب روشنیوں میں ڈوبیں سر بہ فلک عمارتیں تھیں۔ لگتا تھا کہ روشنیوں کا سیلاب امڈ آیا ہو۔ میں ان نظاروں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ جو سفر مجھے دو گھنٹے میں کرنا تھا، گاڑی پر آدھے گھنٹے میں تمام ہوا۔ میں عارف کی مہربانی پر اس کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔

شہباز زرد چہرے سمیت خفا سا کارپٹ پر پڑا تھا۔ وہ صبح سے اکیلا اپارٹمنٹ میں بند تھا۔ معلوم نہیں کہ اس نے افطاری کس چیز سے کی تھی۔ مجھے دیکھ کر چہرہ پھیر لیا مگر جب اتنا سارا کھانا دیکھا تو کھلکھلا اٹھا۔

ہم چائے پی ہی رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ شہباز بولا۔ ”پھر تیرا کوئی سیاپا ہو گا۔“ دروازہ کھولا تو مائیکل تھا۔ مائیکل دراز قد سیاہ فام تھا جو ہماری بلڈنگ کا سیکیورٹی گارڈ تھا۔ اس نے وردی پہنی ہوئی تھی۔ سلیٹی رنگ کی پینٹ پر نیلا کوٹ اور سفید شرٹ۔ رات کو اس کی جاب ہوتی تھی۔ سیکیورٹی گارڈ کی جاب سخت نہیں ہوتی ہے۔ یہاں کون سے ڈاکے پڑتے ہیں کہ سیکیورٹی گارڈ کو ہر وقت مستعد رہنا پڑے۔ بلڈنگ کا انشورنس پریمیم کم رکھنے کے لیے بلڈنگ کے مالک سیکیورٹی گارڈ رکھ لیتے ہیں۔ اس کا کام یہی ہوتا ہے کہ ہر ایک دو گھنٹے بعد اِدھر اُدھر چکر لگا لے اور پھر آفس میں جا کر بیٹھ جائے۔ مائیکل اکثر ہمارے پاس آ جاتا تھا اور ہم اکٹھے چائے پیتے تھے۔ شہباز، مفتی کی غیر موجودگی میں اس کے میٹرس پر چوڑا ہو کر پڑا تھا۔ مائیکل کو دیکھتے ہی بولا۔ ”چائے میں نہیں بناؤں گا، روز آ جاتا ہے۔ یہ سیاپا، تم خود ہی بھگتو۔“ اسی دوران مائیکل میز کے ساتھ لگی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

میں نے مائیکل سے پوچھا۔ ”آج بھی چائے پینی ہے؟“

اس کے منہ سے غوں غوں کی آواز نکلی۔ جس کا مطلب ہاں میں ہی ہوتا تھا۔ شہباز زور زور سے ہنسا۔ ”تمہارا بس چلے تو ہر آتے جاتے کو پکڑ کر یہاں لا بٹھاؤ اور اس کا انٹرویو کرنے لگو۔“

میں نے اسے چپ کرایا۔ وہ چائے بنا کر لایا اور سب پینے لگے۔ شہباز کہنے لگا کہ اس مفت خورے کو بالٹی میں چائے پلانی چاہیے، اتنا موٹا اور لمبا تڑنگا ہے کہ پیالی اس کے ہاتھ میں

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

جچتی نہیں۔ مائیکل نے شہباز کو ہنستے دیکھ کر کہا۔ ''یہ آج اتنا خوش کیوں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ کہہ رہا ہے کہ مائیکل کتنا خوش نصیب ہے کہ اتنی اچھی جاب کر رہا ہے۔ اتنا سا کام ہے اور پیسے بھی اچھے لیتا ہے۔''

مائیکل کچھ الجھا سا لگ رہا تھا کہ نہیں بات کچھ اور ہے۔ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بے فکر ہو کر چائے پینے لگا۔

چائے کی چسکی لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''آپ کے ملک میں سیکیورٹی گارڈ ہوتے ہیں؟''

میں نے کہا کہ یہ وہاں ہوتے ہیں جہاں جرائم ہوں۔ ہماری پولیس اتنی قابل ہوتی ہے کہ کوئی ایک جرم بھی نہیں ہوتا۔

شہباز نے لقمہ لگایا۔ ''وہ بھی تمہاری طرح بے کار ہی بیٹھی رہتی ہے۔''

مائیکل کو یہ بات ذرا پسند نہیں آئی تھی۔ مگر شہباز رکا نہیں بولتا رہا کہ وہاں پہلے تو کوئی جرم کرنے کی ہمت نہیں کرتا اور اگر غلطی سے بھی جرم سرزد ہو جائے تو پولیس اسے پکڑ کر عدالت میں لے جانے کی زحمت نہیں کرتی، بلکہ وہیں گولی مار دیتی ہے۔

اس بات سے وہ باقاعدہ پریشان سا ہو گیا۔ ''پر عدالت کیوں نہیں لے جاتے؟''

شہباز بولا۔ ''اس لیے کہ جج بھی تمہاری طرح بیکار بیٹھے رہتے ہیں۔''

اس کے چہرے کا رنگ تو وہی رہا مگر آنکھوں میں حیرت اتر آئی تھی۔ پھر پوچھنے لگا۔ ''پولیس کی تنخواہ تو اچھی ہوتی ہو گی؟''

شہباز وہیں میٹرس سے بولا۔ ''وہاں پولیس تنخواہ نہیں لیتی بلکہ اپنا بھی کماتی ہے اور اپنے افسروں کا گھر بھی چلاتی ہے۔''

مائیکل کہنے لگا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟''

شہباز نے کہا کہ لوگ خود پیسے اکٹھے کر کے ان کا خرچ اٹھاتے ہیں۔

مجھے لگا کہ اب مائیکل اپنے آپ کو باقاعدہ ہونق سمجھ رہا ہے اور اپنے طور سے کوئی سوال کرنے سے گریز کر رہا ہے۔ شہباز کچھ اور بتانے لگا تو مائیکل اٹھ کھڑا ہوا اور یہ کہتا ہوا باہر کا دروازہ کھول کر نکل گیا۔ ''مجھے راؤنڈ لگانا ہے۔''

ہم رات کو جلدی سو گئے۔ سحری میں آملیٹ بنا کر اللہ کا شکر ادا کیا، نماز پڑھی اور پھر سو گئے۔ صبح اٹھے تو برف باری تھم گئی تھی لیکن درجہ حرارت بڑھا تو بارش شروع ہو گئی اور زمین پر بچھی برف بھی پگھل پگھل کر بہنے لگی۔ ہم اپارٹمنٹ میں نکمے بیٹھے تھے۔ اب تک اتنی جگہوں پر Resume ڈال چکے تھے کہ یاد بھی نہیں تھا۔ اتنے میں مطیع اللہ کا فون آ گیا۔ فون شہباز نے اٹھایا اور بولا۔ ''کسی لڑکی کا فون ہے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا کہ کون ہو سکتی ہے اور جب ہیلو کہا تو آگے مطیع اللہ تھا۔ ''میں آج آ رہا ہوں۔'' وہ بولا۔

مطیع اللہ کا تعارف میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ مجھ سے چار ماہ پہلے کینیڈا آیا تھا اور ویکن ہٹ سیکیورٹی ایجنسی میں گارڈ کی جاب کر رہا تھا۔ ہم دونوں پاکستان میں اکثر اکٹھے بیٹھ کر کینیڈا کے سہانے سپنے دیکھا کرتے تھے۔ سوات کا چھوٹا سا اور کمزور جسامت کا یہ پٹھان ہمیشہ بات کرتے ہوئے مذکر اور مونث کا فرق نہیں رکھتا تھا اور آواز لڑکیوں جیسی باریک تھی۔

وہ آیا اور زور سے سلام کرتا ہوا گلے لگ گیا۔ ''اچھا ہوا تم بھی پہنچ گئے۔ ہم نے جو فخ کرتا تھا کر لیا اور باقی تم کرو۔'' یہ کہتا ہوا وہ شہباز سے ملا اور میٹرس کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

بال کندھوں تک بوجھ کر لٹک رہے تھے۔ چہرہ تھکا ہوا اور کندھے جھکے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔ ''مطیع اللہ بھائی! کیا تم تھک گئے ہو؟'' میری بات کی تہہ تک پہنچ کر بولا۔ ''نہیں، سردی بہت ہے۔ اس لیے ذرا تھکا ہوا ہوں۔'' پھر وہ شہباز کو دیکھ کر بولا۔ ''یہ بھی ادھر رہتی ہے۔''

شہباز کہاں چپ رہنے والا تھا۔ ''میں ادھر رہتا ہوں خان بھائی۔ آپ کو کچھ دیر بعد معلوم ہو جائے گا کہ رہتی نہیں، رہتا ہوں۔''

مطیع اللہ نے سیکیورٹی گارڈ کی یونیفارم پہنی ہوئی تھی اور ایک لمبی جیکٹ کے اندر چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ میں بولا۔ ''یار! تم سوات کے رہنے والے ہو۔ تم کو تو اتنی سردی نہیں لگنی چاہیے۔''

وہ بولا۔ ''یہ کافر سردی ہے اس لیے تنگ کرتی ہے۔ وہ تو مسلمان سردی ہوتی ہے۔''

اب گفتگو میں شہباز کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ سادہ سا پٹھان بھائی ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ مطیع اللہ بہت ہی عقلمند اور کایاں شخص ہے۔ وہ خود پر معصومیت کا خول چڑھائے رکھتا ہے۔ بے ضرر ہے مگر احمق نہیں۔ میں نے پوچھا۔ ''پہلی کب بلواؤ گے؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

حسبِ توقع یہی جواب دیا۔ ”اس کافر ملک میں کون شریف انسان اپنے بچوں کو رکھے گا؟“

شہباز بولا کہ جب شریف انسان یہاں رہ سکتے ہیں تو اس شریف کے بچے کیوں نہیں رہ سکتے؟

وہ بولا۔ ”ہم تو مرد ہے مگر زنانیوں کے لیے ملک ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”نواز شریف کے بچے تو سنا ہے لندن میں کاروبار کرتے ہیں۔“

مطیع اللہ کسی بات پر پکڑائی نہیں دے رہا تھا اور ہر دفعہ مچھلی کی طرح ہاتھ سے پھسل جاتا تھا۔

میں نے کہا۔ ”یہ بال کیوں بڑھائے ہوئے ہیں؟“

وہ جواب میں منمنایا۔ ”پاکستان میں بیس روپے میں بال کٹواتا تھا اور یہاں بارہ ڈالر لیتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ بال کاٹنے کا سامان لے کر یہی کام شروع کردوں۔ اچھے پیسے بن جائیں گے۔“ پھر شہباز کو دیکھ کر بولا۔ ”جاب نہ ملے تو یہی نائیوں والا کام شروع کردو اللہ کی قسم بہت پیسے بنتے ہیں۔“

شہباز کارپٹ پر پڑا تلملا کر رہ گیا۔

میں نے پوچھا۔ ”مطیع اللہ بھائی! پاکستان یاد آتا ہے؟“ تو جواب دیا۔ ”اس کافر ملک نے بچے تک بھلا دیے مگر سوات نہیں بھولتا، پاکستان ذہن میں پھنسا کھڑا ہے۔“ شہباز چوٹ کرنے کے چکر میں بولا۔ ”سوات میں کوئی معشوق ہے جو یاد آتا ہے۔“ اس نے باریک سا قہقہہ لگا کر کہا۔ ”ہم پٹھان لوگ ہے۔ معشوق رکھتا ہے مگر کبھی کسی زنانی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔“ پھر خود ہی ہنس پڑا۔

شہباز کہنے لگا۔ ”یار! یہ بھی نرا سیاپا لگتا ہے کسی طرح بھی ہاتھ ڈالنے نہیں دے رہا۔“

کچھ دیر اسی قسم کی گپ شپ چلتی رہی۔ وقتی طور پر ہم اپنی پریشانیاں بھول گئے اور فراخدلانہ قہقہے لگاتے رہے۔ پھر وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ مجھے گھر پہنچنا ہے اور پھر رات کی سیکیورٹی کی جاب بھی ہے۔ جاتے جاتے اپنی کمپنی کا ایڈرس سمجھایا اور بولا ریسپشن پر مشال ہوگی۔ اس کو میرا حوالہ دینا اور امید ہے جاب ہو جائے گی۔ شہباز بولا۔ ”وکین ہٹ بڑی کمپنی ہے۔ کیا اس کا نام لینے پر ہمیں جاب مل جائے گی؟“ پھر وہ زور سے ہنسنے لگا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہ حوالہ ہی ہمارا راستہ کھولنے والا ہے۔

ابھی افطار میں بہت وقت تھا۔ ہم بے بسوں کی طرح لاغر ہو کر کارپٹ پر اونگھ رہے تھے۔ میں نے مفتی کے پاکستان جانے کے بعد کچن کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ پاکستان سے کھانا بنانے کی کتاب ساتھ لایا تھا۔ مارٹن گرو کی سڑک شمال سے جنوب چلتی ہے۔ ہم اپنے اپارٹمنٹ سے شمال کی سمت چلتے ہیں تو پہلی سڑک جو مارٹن گرو کو کراس کرتی ہے وہ ویسٹ وے ہے۔ اسی کونے پر گلائی سپر اسٹور کے علاوہ اور بہت سی شاپس ہیں جو سب ایک لائن میں بنی ہوئی ہیں اور آگے بہت بڑا پارکنگ لاٹ ہے۔ اردگرد رہائشی عمارتیں ہیں اور سڑک پار کرکے ایک سولہ منزلہ عمارت Redgrave-20 کے نام پر ہے۔ اس کے سامنے ایک بڑا پارک ہے جو ان دنوں برف سے ڈھکا ہوتا ہے۔ ویسٹ وے کے بعد جو سڑک مارٹن گرو کو کراس کرتی ہے وہ ڈکسن ہے جس پر مغربی سمت میں تین سے چار میل جائیں تو ٹورنٹو کا پیرسن ایئرپورٹ ہے۔

اس کے بعد ریکس ڈیل Rexdale اس کو کراس کرتی ہے جہاں مشرقی سمت میں IMO مسجد ہے، جہاں ہم جمعہ کی نماز پڑھنے جاتے ہیں۔ پھر اور شمال میں جائیں تو البین (Albion) آتی ہے جس کے مشرقی سمت میں دو میل جائیں تو ایک پورا دیسی بازار ہے۔ یہاں سکھوں، مسلمانوں اور دوسرے تارکینِ وطن نے دکانیں کھول رکھی ہیں۔ یہاں ایک پاکستانی ڈاکٹر کا کلینک بھی ہے اور ادھر ہی ایک افغانی کی حلال گوشت کی دکان ہے۔ نام اس کا المیزان ہے اور علاقے میں اس وقت یہی ایک دکان تھی جہاں حلال گوشت ملتا تھا۔ میں اس سے مفتی کی روایت توڑ کر گوشت، قیمہ، چکن لے آیا تھا اور آج قیمہ بنا کر لینا ہی تھا کہ فون بج اٹھا۔

شہباز نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں گھنٹی سنتے ہی بولا۔ ”یہ کیا سیاپا ہے؟“ پھر مجھ سے بولا کہ تم اٹھالو!

میں نے بھی اٹھنے سے انکار کردیا۔ فون بجتا رہا لیکن جب شہباز کو دیکھا کہ وہ اٹھنے والا نہیں ہے تو خود اٹھ کر فون اٹھا لیا اور ہیلو کہا تو دوسری جانب کوئی اردو میں بولا۔ ”سر ندیم سے بات ہوسکتی ہے؟“

میں حیران ہوا کہ کون ہے جو مجھ جیسے بے وطن کو یہاں سر بولتا ہے۔ میرے استفسار پر جواب آیا۔ ”سر جی! میں شاہد بات کررہا ہوں۔“ پھر اس نے اپنے بارے میں بتایا تو مجھے یاد آیا کہ پاکستان میں میری فلائٹ سے ایک دن پہلے، میرے ایک کزن کے ہمراہ واپڈا کا عجز و انکساری میں ڈوبا ایک ایکسین آیا تھا۔ اس کو ٹورنٹو ائرپورٹ سے اس کی بیوی کے رشتے دار نے نیویارک سے آکر وصول کرنا تھا اور وہیں سے اسے اپنے ساتھ نیویارک لے جانا تھا جہاں ایک شاندار کاروبار اس کا منتظر تھا اور میں نے نجانے کس خیال میں مفتی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کے گھر کا نمبر اسے دے دیا تھا۔ اب معاملہ الٹا پڑ چکا تھا۔ شاہد صاحب ائرپورٹ پر کھڑے تھے اور وہ اس کے رشتہ دار فیض صاحب اب بے فیض ہوکر انہیں لینے نہیں آئے تھے۔ شاہد صاحب ان کے پاس میرا نمبر تھا اور اب مجھ سے گھگھیا کر کہہ رہے تھے۔ ''سر جی! میں اب کہاں جاؤں؟''

میں مخمصے میں پھنس گیا۔ یہ مفتی کی جگہ تھی اور اس کی اجازت کے بغیر میں کسی کو رکھتا تو اس کے زیر عتاب آتا لیکن مفتی بیس دن کے لیے پاکستان میں گیا ہوا تھا اور شاہد کو ایسے بے یار و مددگار چھوڑا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی پریشانی بھی معقول اور جائز تھی۔ شہباز بھی اٹھ بیٹھا تھا اور وہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ ان صاحب کو بے یار و مددگار اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ میں نے اسے اپارٹمنٹ کا ایڈریس لکھوایا اور کہا کہ ٹیکسی پکڑ کر ادھر آجائے۔ میں نے سوچا کہ مفتی کے آنے سے پہلے اللہ کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا۔

فون بند کیا اور ہم انتظار میں بیٹھ گئے۔ اسی دوران میں نے شہباز کو اس کی ساری کہانی سنا دی۔ شہباز بولا۔ ''اس کے ساتھ تو بڑا سیاپا ہوگیا ہے۔''

میں بھی سوچ رہا تھا کہ یہ تو اچھا ہوا کہ میں نے اپنا فون نمبر اس کو دے دیا تھا ورنہ بے چارہ کہاں دھکے کھاتا مگر مجھے اس کے رشتہ دار فیض پر شدید غصہ آرہا تھا۔ اللہ جانے کیا معاملہ تھا کہ وہ نہ پہنچ سکا تھا۔

شہباز نے کھڑکی کے پردے ہٹائے باہر ٹیکسی کو دیکھا۔ شاہد کچھ دیر میں آپہنچا۔ ہم نے باہر جا کر اس کا سامان اتارا۔ وہ خاصا خاموش اور پریشان تھا۔ پستہ قد، گھنی مونچھیں اور سر پر بال خال خال رہ گئے تھے، نیلے رنگ کی سفید دھاریوں والی ٹی شرٹ اور نیلی جینز کی پینٹ میں وہ لرز رہا تھا۔ برفانی قسم کی ہوا چل رہی تھی جو ہمیں کاٹ رہی تھی۔ یہ کینیڈا کا ایک اور شکار تھا جو یہاں کے برفانی پنجرے میں آپھنسا تھا۔ ہم اسے اور اس کے سامان کو احتیاط سے اندر لائے۔ اسے مفتی کے میٹرس سے ٹیک لگا کر بٹھایا اور پھر دونوں خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ کر اسے دیکھنے لگے اور وہ خلاؤں میں کہیں گھور رہا تھا۔

آج یہ سب لکھتے ہوئے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ اس وقت کتنے کرب اور مشکل میں ہوگا۔ کوئی شخص پاکستان سے ایک بنا بنایا خواب لے کر ہزاروں میل دور ٹورنٹو ائرپورٹ پر اترے اور چند لمحوں میں سارا خواب ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جائے۔ کس بے چارگی اور بے بسی کی کیفیت میں وہ ہوگا۔ اس کی نظر میں، ہم شاید رحمت کے فرشتے ہوں گے۔ وہ خالی خالی نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا اور نگاہوں میں مدد کی درخواست تھی جو لاچاری اور بے بسی اس کی آنکھوں میں تھی وہ کئی بار میری آنکھوں میں بھی آچکی تھی۔ میں اس نیس کو خوب جانتا تھا اور اس کے وار سے اچھی طرح آگاہ بھی تھا۔ میں نے دل میں یہ تہیہ کرلیا تھا کہ اللہ نے مجھے موقع دیا ہے اور جہاں تک ہوسکا میں اس کی مدد کروں گا۔

کچھ دیر خلاؤں میں گھورنے کے بعد شاہد منمنایا۔ ''سر جی! فیض صاحب ذرا لیٹ ہوگئے ہوں گے یا کوئی مجبوری ہو گی۔ اسی لیے نہیں آئے ہوں گے۔ ورنہ وہ تو بہت اچھے انسان ہیں۔'' اس کے بعد ہمارا شکریہ ادا کرنے بیٹھ گئے اور میں نے بڑی مشکل سے انہیں چپ کرایا۔ پھر جیب سے ایک کالنگ کارڈ نکالتے ہوئے بولا۔ ''سر جی! کیا میں نیویارک اپنی سالی کو فون کرسکتا ہوں؟''

شہباز نے فون اس کی جانب بڑھا دیا۔ شاہد کی اس عادت کا اندازہ ہمیں بعد میں ہوگیا تھا کہ وہ ہر ایک ملنے والے کو ''سر جی'' کے نام سے پکارتے تھے اور پھر شہباز نے ان کا نام ہی سر جی رکھ دیا اور آج تک ہر ایک ملنے والا انہیں سر جی کے نام سے بلاتا ہے اور وہ قطعاً اس کا برا نہیں مناتے۔

نیویارک فون کیا۔ کچھ دیر وہ جی جی کرکے باتیں کرتے رہے مگر مایوسی نگاہوں سے جھلک رہی تھی۔ فون بند کرنے کے بعد میری جانب دیکھ کر بولے۔ ''فیض صاحب تھے۔ انہیں کچھ کام پڑ گیا تھا اور اب وہ دو چار دن بعد آئیں گے لیکن آپ لوگ یقین کریں وہ بہت اچھے انسان ہیں۔''

غصے سے میرا بدن کانپنے لگا۔ اگر اسے کام پڑ گیا تھا تو اس نے پاکستان فون کرکے اس سیدھے سادے شخص کو بتایا کیوں نہیں؟ اس نے یہ احساس کیوں نہیں کیا کہ ایک مسافر وطن سے دور، کسی اجنبی مقام پر اسے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ غصہ فیض صاحب پر کم تھا اور شاہد پر زیادہ آرہا تھا کہ اس کو غصہ کیوں نہیں آرہا ہے۔ شاہد کے لہجے میں بات کرتے ہوئے وہی عجز و انکساری تھی۔ وہ ایسے شرمندہ بیٹھا تھا کہ اس نے کسی سے غلط بیانی کی ہے۔ شہباز بات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا اس لیے شاہد کو مخاطب کرکے بولا۔ ''سر جی! آپ کپڑے تبدیل کرلیں کیونکہ کچھ دیر میں افطار کا وقت ہونے والا ہے اور فی الحال اس فیض بے فیض کے سیاپے سے باہر نکلیں۔''

پھر شاہد کو میں نے باتھ روم کے نظام کے بارے میں وہ سب کچھ بتایا جو مفتی نے پہلے دن مجھے بتایا تھا۔ مفتی کے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

میٹرس پر اس کا بستر لگایا۔ اس نے جا کر شاور لیا اور پھر وہی جینز اور نیلی شرٹ پہن کر اپنے تئیں پھر سے تیار ہو کر آبیٹھا۔ شہباز کچھ کہنے والا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔ اس سے پاکستان فون کروایا جو انہوں نے دو الفاظ ہی میں بند کر دیا۔ ''میں پہنچ گیا ہوں۔ فیض صاحب دو چار دن میں آجائیں گے اور ٹھنڈ بہت ہے۔''

فون پر لہجہ ایسا تھا کہ اطلاع نہیں دے رہے بلکہ اپنا کوئی گناہ تسلیم کر رہے ہوں۔ شہباز نے کہا۔ ''کچھ اور بات کر لیتے۔ کچھ بھابی سے گپ شپ لڑا لیتے۔'' یہ سن کر شاہد صاحب (سرجی) شرم سے دوہرے ہو گئے اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ ان کا شرمانا تھم نہیں رہا تھا کہ میں نے انہیں اٹھایا اور کہا کہ یہ لباس تبدیل کر کے آجائیں اور پھر ان کا رسیوں سے لپٹا سوٹ کیس اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔ سوٹ کیس پر ان کا نام اور پاکستان کے علاوہ نیویارک کا بھی کوئی ایڈریس لکھا تھا کیونکہ اپنے تئیں جو نیویارک جانے کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ یہ سرجی سے ہماری ایک طرح سے پہلی ملاقات تھی اور پھر یہ ایسی دوستی میں بدلی کہ اب تک قائم ہے۔

وہ تبدیل کر کے باہر آئے اور پھر اسی جگہ، اسی پوزیشن میں گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر بیٹھ گئے اور پھر سے خلاؤں میں گھورنے لگے۔ ہم نے افطاری میں جو کچھ تھا وہ لگایا، بھنا قیمہ پلیٹوں میں ڈال کر رکھا اور وہ دستر خوان تک آنے کو تیار نہ ہوئے۔ منتیں کیں مگر لاحاصل اور وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کہہ رہے تھے کہ جہاز میں کھانا کھا لیا تھا جب چودہ گھنٹے پہلے انہوں نے سحری کی تھی۔ شہباز نے بار بار کہا تو کہنے لگے کہ آپ بسم اللہ کریں۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔ پھر میں نے ہلکا سے ڈانٹا تو کھنچے چلے آئے۔ میں اور شہباز اپنی اپنی نماز پڑھتے تھے مگر آج انہوں نے امامت کی۔ ایسی پراثر تلاوت کی کہ خود بھی رو پڑے اور پیچھے میری آنکھیں بھی چھلک اٹھیں۔ لگتا تھا کہ ان کے اندر کا درد پورے اپارٹمنٹ میں سرائیت کر گیا ہو۔

رات ہم سرجی (شاہد) کو سلا کر مزے سے سو گئے۔ سحری کے لیے اٹھا تو وہ پہلے ہی سے اٹھ کر بیٹھے تھے اور لیونگ روم کی ڈور وال کا پردہ کھسکائے کہیں باہر دیکھ رہے تھے۔ مجھے موجود پایا تو جھٹ سے کہا۔ ''مجھ سے چولہا آن نہیں ہو رہا تھا۔ ورنہ سحری تیار کر لیتا۔''

مجھے وہ بہت معصوم لگے۔ وہ اپنے آپ کو پناہ گزین سمجھ رہے تھے۔ میں ان کے سامنے جا بیٹھا اور کہا۔ ''شاہد صاحب! آپ مہمان ہیں اور کسی طرح ہم پر بوجھ نہیں۔ آپ رہنے دیں یہ سحری میں ہی تیار کر لوں گا۔''

ان کی آنکھوں میں پھر سے تشکر کا پانی اتر آیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ سوئے نہیں؟ کیا بھابی یاد آرہی ہیں؟'' اس پر دوبارہ سے شرما کر سمٹ گئے اور بات بدل کر کہنے لگے۔ ''یہ بف (برف) باری کب ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہ آپ پردہ ہٹا کر برف باری دیکھ رہے تھے؟'' جواباً کہنے لگے۔ ''نہیں، دیکھ رہا تھا کہ یہ کب شروع ہوگی۔'' پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ''پاکستان میں کسی نے بتایا تھا کہ بف (برف) اچانک گرتی ہے۔'' میں یہ سب سن کر سوچ میں پڑ گیا کہ کہیں جیٹ لاگ کا اثر زیادہ تو نہیں ہو گیا۔

اگلا دن سرجی کا SIN کارڈ اپلائی کرتے اور بینک اکاؤنٹ کھلوانے میں گزرا۔ ٹرانسپورٹ کا نقشہ لا کر انہیں سمجھایا۔ بسوں اور ٹرین کے بچھے جال کو سمجھانے کی کوشش کی اور پھر کہا کہ جب تک SIN کارڈ نہیں آتا، آپ فیض صاحب کا انتظار کریں اور آرام سے مزے اڑائیں۔ فیض کا نام سن کر ایک کرب کی لہر ان کے چہرے کو چھو کر گزر گئی اور بولے ''آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میری مدد کی لیکن میں آپ کے لیے کھانا بنا دیا کروں گا۔ میں حلیم بہت اچھی بناتا ہوں۔''

شہباز کہنے لگا دالیں بھی گھوٹ لیتے ہیں آپ؟

سرجی اپنا سر جھکا کر بولے۔ ''جی! ماشاءاللہ بہت تجربہ ہے۔''

میں اور شہباز اپنی ایشین اور مارکیٹنگ کی جاب کے تجربے سے خاصے بددل ہو گئے تھے۔ بس یوں سمجھ لیں کچھ ست پڑ گئے تھے اور کہیں اپنے Resume بھی نہیں بھیج رہے تھے۔ جب سے مطیع اللہ اپنی سیکیورٹی کمپنی کی بات کر کے گیا تھا۔ ہم نے یہاں بھی ایک اور کوشش کرنے کا سوچا۔ ایک صبح ہم دونوں بس اور ٹرین کے ایک گھنٹے کے سفر کے بعد سکاربرو کے کسی صاف ستھرے علاقے میں چند فلک بوس عمارتوں کے بیچ کھڑے ویکن ہٹ سیکیورٹی ایجنسی کا آفس ڈھونڈ رہے تھے۔ ایک بڑے چوراہے کے ہر کونے پر بہت سی عمارتیں سر اٹھائے سرد دھند میں لپٹی کھڑی تھیں۔ کافی تگ و دو کے بعد ہم ایک عمارت کے پاس پہنچے۔ جس کے گراؤنڈ فلور پر ویکن ہٹ لکھا ہوا دیکھا۔ شہباز نے کہا۔ ''تم فضول میں لے آئے ہو۔ تمہارا ابھی سیاپا ختم نہیں ہوتا۔ اتنی بڑی کمپنی میں وہ بھی سیکیورٹی گارڈ کی جاب اور وہ بھی مطیع اللہ کے ریفرنس

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پر؟''

ہم دونوں سردی سے کبڑے ہو رہے تھے۔ ہاتھوں میں گرم دستانے اور سر پر اونی ٹوپیاں پہنے ہم ایک کاؤنٹر کے پیچھے جوان سال گوری لڑکی کے سامنے بھکاریوں کی طرح کھڑے تھے۔

وہ لڑکی مشال تھی جس کا مطیع اللہ نے ذکر کیا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ مطیع اللہ نے کہا ہے کہ تم سے بات کروں کیونکہ ہم دونوں کو بھی سیکیورٹی گارڈ کی جاب کرنی ہے۔ وہ بھی دوسرے گوروں کی طرح خوش مزاج تھی۔ ہم دونوں نے ہاتھوں میں اپنے اپنے Resume پکڑ رکھے تھے اور ہماری دانست میں اس نے ہم سے یہی مانگنے تھے اور پھر ہم کو بعد میں فون کرنے کا کہہ کر ہم سے جان چھڑا لینی تھی۔

میں نے اپنا Resume آگے کیا تو وہ بولی۔ ''نہیں! مجھے اس کی ضرورت نہیں۔''

شہباز نے میرے کان میں پنجابی کی ایک وزن دار گالی دی اور بولا۔ ''یہ کم بخت تو Resume بھی نہیں لے رہی۔'' پھر مجھ سے بولا۔ ''کہتا تھا ناں اس زنانے خان کی باتوں میں مت آؤ۔ تم نے سیاپا ڈالا ہوا تھا کہ یہاں بھی ٹرائی کرتے ہیں۔''

مشال اسی دوران اندر سے دو دو فارم لے آئی۔ کہنے لگی کہ ایک پر آپ لوگ اپنے کوائف لکھیں اور دوسرا کوئی ٹیسٹ سا تھا، جس میں مختلف نوعیت کے سوالات تھے جو مجھے ابھی یاد نہیں آرہے ہیں۔ ہم دونوں نے آدھا گھنٹا لگا کر وہ ٹیسٹ دیا اور دونوں کو اس نے ادھر ہی پاس کر دیا اور کہا کہ اگلی سنیچر کو آٹھ گھنٹے کی کلاس ایک پولیس آفیسر لے گی اور اس کے بعد ایک اور ٹیسٹ ہوگا اگر وہ ٹیسٹ پاس ہو گیا تو آپ کا سیکیورٹی گارڈ کا لائسنس بنانے بھیج دیں گے اور جیسے ہی وہ بن کر آجائے گا تو آپ کی جاب شروع ہو جائے گی۔'' پھر وہ بولی۔ ''تنخواہ ساڑھے آٹھ ڈالر فی گھنٹا ہوگی۔''

ہم دونوں اپنی اس غیر متوقع کامیابی پر حیران پریشان کھڑے اس کی گفتگو سن رہے تھے۔ وہ ہماری اس حیرانگی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

ہم باہر نکلے تو شہباز کا چہرہ آج زرد نہ تھا بلکہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''تمہارا یہ پٹھان دوست بڑے کام کی چیز نکلا۔'' پھر نعرہ لگا کر بولا۔ ''مطیع اللہ زندہ باد۔ یہ تو مرد کا بچہ ہے۔'' ہم دونوں بے انتہا خوش تھے ٹورنٹو اپنا اپنا لگ رہا تھا۔ فضا میں کوئی مایوسی تیرتی نہ تھی۔ ہمارے کندھے جو پہلے ڈھلکے

موریا سلطنت

(322ق م۔185ق م)

ہند قدیم کی ایک سلطنت، اس کی بنیاد چندر گپت موریا نے 322ق م میں یونانی سلطنت کے تباہ ہونے پر ڈالی۔ موریا سلطنت شمال سے وسطی ہند تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ عہد حکومت تجارت خوش حالی اور دوسرے ممالک سے راہ و رسم کے لیے مشہور تھا۔ اس خاندان کا مشہور بادشاہ اشوک (232۔272ق م) ہوا۔ اشوک نے بدھ مت اختیار کیا اور اسے پھیلانے کے لیے کئی ممالک میں بھکشو بھیجے۔ بدھ مت کے بھکشوؤں کے لیے مندر تعمیر کروائے۔ عام لوگوں کو بدھ مت کے اصولوں سے آشنا کرنے کے لیے ساری سلطنت میں ستون اور لاٹیں بنوائیں، جن پر بدھ مت کے اصول کندہ کروائے گئے۔ یہ ستون تراشیدہ ہیں اور فن کا بہترین نمونہ۔ اشوک کے عہد کا شاہی آرٹ ستونوں اور لاٹوں پر مبنی ہے۔ اشوک کے دور کے تمام ستون اعلیٰ فن کاری کا ثبوت ہیں۔

مرسلہ: آفاق عظیم۔ جہلم

جھکے تھے اب پھر سے تن گئے تھے۔ ہماری چال میں خود اعتمادی عود کر آئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم خوشی سے چہک رہے تھے۔

اگلے سنیچر میں تین چار دن رہتے تھے اور اب ہم بے فکر تھے کیونکہ ہماری دانست میں جاب پکی ہو چکی تھی۔ ان دنوں میں ہمیں بس سحری اور افطاری کرنی تھی اور باقی وقت شاید سو کر گزارنا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک لمبی مشقت کے بعد چار چھٹیاں بمع تنخواہ کے ملی ہیں۔

مفتی گیا تو خان قیصر واپس آگیا۔ اس کی فیملی اگلے دن پاکستان سے آرہی تھی۔ وہ ان دنوں بہت پُر جوش تھا۔ مفتی سے اس کی کچھ اَن بن تھی اور اب اس کی غیر موجودگی میں یہیں رہتا تھا۔ اس نے سامنے والی بلڈنگ میں دو بیڈ کا اپارٹمنٹ کرائے پر لیا تھا۔ ان دنوں اسی کے لیے سرگرم رہتا تھا۔ یہاں Moving سیل لگتی ہے۔ اگر کوئی اپنا گھر تبدیل کرتا ہے تو وہ سامان اس کو دوسری جگہ منتقل کرنے میں بہت رقم خرچ ہوتی ہے اگر وہ سامان نئے گھر میں کہیں نہیں بجتا تو لوگ اس سامان کی موونگ سیل لگا لیتے ہیں۔ اخبار میں دو سطری خبر چھاپ کر فون کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔ مسلمان زیادہ تر مسلمانوں سے سامان خریدنا پسند کرتے ہیں کیونکہ انہیں وہم ہوتا ہے گوروں کے بستروں اور صوفوں پر کتے بھی آرام فرماتے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ہیں۔ یہ سامان اچھی حالت میں آدھی سے بھی کم قیمت پر مل جاتا ہے۔ موونگ کمپنی سارا سامان پیک کر کے آپ کے گھر لے آتی ہے اور پھر دوبارہ سے کھول کر جہاں جہاں آپ کہیں اسے لگا بھی دیتی ہے۔ میکسیکو کے رہنے والے یہ کام بخوبی سر انجام دیتے ہیں۔ خان قیصر کو بھی اس طرح اچھا بھلا سامان مناسب قیمت پر مل گیا تھا اور اب اس کے گھر میں سجا تھا۔

کافی دیر سے خان قیصر اور شہباز میں بحث جاری تھی۔ شہباز کہتا تھا کہ میں تمہاری بیوی کو بتاؤں گا کہ تم نے کسی سیاہ فام سے یہ سامان مفت میں لیا ہے اور خان اس کو کہتا تھا کہ اگر تو نے بتایا تو میں تمہیں اپنے اپارٹمنٹ سے نیچے پھینک دوں گا۔ سر جی انکساری کا نمونہ بنے دونوں کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ خان کو واقعی ڈر یہی تھا کہ شہباز بول دے گا۔ میں نے شہباز سے کہا۔ ”تمہیں آخر مسئلہ کیا ہے کہ جو تم یہ بتاؤ گے۔ بلکہ غلط ہی تو بتاؤ گے۔“

شہباز کی منطق عجیب تھی کہ ہم یہاں دانتوں کو ترسیں اور یہ گھر کے پراٹھے کھائے؟

آخر کار..... یہ فیصلہ ہوا کہ روزوں کے ہر ویک اینڈ پر خان ہمیں افطاری کرائے گا۔

خان اتنا گھبرا چکا تھا کہ فوراً ہی مان گیا۔ خان کے جانے کے بعد شہباز بولا۔ ”یہ اپنی بڈی سے ڈرتا بہت ہے۔ اب مزہ آئے گا۔“

سر جی سر جھکا کر بولے۔ ”ہر کوئی ڈرتا ہے۔“ پھر نظریں جھکا کر کچھ شرمندہ بھی ہوئے۔

سر جی اکثر اوقات ڈور وال کے پردوں کو ذرا سا کھسکا کر، اس میں اپنا چہرہ ڈالے باہر دیکھتے پائے جاتے تھے۔ شہباز ایک دن بولا۔ ”سر جی یہ کیا تانک جھانک کرتے رہتے ہیں؟“

”میں یوں ہی دل بہلاتا ہوں۔“ سر جی مسکین صورت بنا کر بولے۔

ان کے چہرے پر غور سے دیکھتے ہوئے شہباز بولا۔ ”محترم لڑکیاں نیکروں میں صرف گرمیوں ہی میں نظر آتی ہیں۔ سردیوں میں تو ساری ایک جیسی ہی لگتی ہیں۔ نیچے اوپر ڈھکی ہوئی۔“ شہباز کو وہم تھا کہ شاہد صاحب اپنی آنکھوں کی پیاس بجھانے کے لیے پردوں سے باہر دیکھتے ہیں۔

سر جی شہباز کی جانب دیکھتے ہوئے بولے ”نہیں! میں تو صرف یہ دیکھتا رہتا ہوں کہ بف (برف) باری کب ہوگی۔“

اب عقدہ یہ کھلا کہ انہوں نے آج تک برف باری نہیں دیکھی اور جیسے ہی برف باری دیکھتے فوراً پاکستان میں اپنی فیملی کو فون پر یہ خبر دینی تھی۔ وہ برف باری کو بف باری بولتے تھے۔ جب سے وہ آئے تھے تب سے ابھی تک برف نہیں پڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ یہاں کسی اور کام سے نہیں بلکہ برف باری دیکھنے آئے ہیں جبکہ یہاں سب سے زیادہ ناپسندیدہ موسم وہ ہوتا ہے جب برف پڑتی ہے۔ دفتروں، دکانوں اور بسوں میں یہ ذکر زیادہ رہتا ہے کہ برف کب پڑے گی اور کتنے دن یہ منحوس موسم چلے گا۔ انہیں برف پڑی ہوئی صرف کرسمس میں اچھی لگتی ہے۔ یہاں والوں کا سب سے پسندیدہ موسم وہ ہوتا ہے جب دن چمک دار ہو اور وہ گھر کے باہر کرسیوں پر بیٹھ کر شام گزار سکیں مگر سر جی کی ہر بات نرالی تھی۔

موسم انسان کی عادات، سوچوں اور طور طریقوں کو کس طرح بدل دیتا ہے، وہ میں نے یہاں آ کر دیکھا۔ پاکستان میں ہم برف دیکھنے مری کی جانب دوڑتے ہیں۔ چمکتا سورج جیسے ہمیں چڑاتا تھا۔ بادلوں سے ڈھکا آسمان ہمیں رومانوی بنا دیتا تھا اور ساون کے گیت گائے جاتے ہیں جب کہ چمکتا آسمان لوگوں کو پھیکا پھیکا لگتا ہے۔ جب بادل گھر آتے ہیں تو بیسن کی روٹیاں توؤں پر ہوتی ہیں۔ اچار اور لسی کے ساتھ ساون کا مزا دوبالا ہو جاتا ہے۔ آسمان صاف ہو تو کسی کی نظر بھی نہیں اٹھتی۔

یہاں اگر آسمان صاف ہو، دن روشن اور ہلکی سی حدت ہو تو ہر کوئی کسی نہ کسی بیچ کی جانب دوڑتا ہے یا یہ لوگ اپنے گھر کے باہر بنے ڈیک پر ایک میز کے گرد کرسیاں رکھے بیٹھے ہوتے ہیں۔ میز پر ایک گلدان میں پھول سجائے معلوم نہیں کیا باتیں کرتے رہتے ہیں مگر انتہائی خوش دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں کینیڈا ہو یا امریکا، ملنے جلنے میں موسم کا احوال بتانا یا پوچھنا ایک اہم کام ہوتا ہے اور اس کے بغیر ان کی بات نامکمل رہتی ہے۔ جب یہاں برفانی طوفان اٹھتے تھے تو ملتان کی گرمی ہمیں جنت کے موسم کی یاد دلاتی تھی۔ یہاں ہمارا جنت کا تصور ہی بدل گیا تھا۔

جنت کے ذکر پر یاد آیا کہ ایک بار حقیقی جنت میں جانے کا موقع مل رہا تھا۔ ہوا یہ کسی کام سے ایک فرم کے ورک شاپ میں جانا تھا۔ ورک شاپ شہر سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں نے ٹیکسی منگوائی تھی۔ اتفاق سے ٹیکسی ڈرائیور سردار جی تھے۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر خوش ہوئے۔ یہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ زیادہ تر سردار جی پاکستانیوں سے مل کر خوش ہوتے ہیں جب

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کہ انڈین سے واجبی رغبت رکھتے ہیں اور خود کو انڈین کی بجائے پنجابی کہتے ہیں اگر ہم لوگ صحیح طور پر خالصتان تحریک کا ساتھ دے دیتے تو آج ہماری سرحدیں بھی محفوظ ہوتیں۔ اس لیے کہ یہاں رہنے والے سردار ہم پاکستانیوں سے بہت خوش رہتے ہیں تو خالصتان کے سردار بھی خوش رہتے۔

خیر میں بتا رہا تھا کہ ڈرائیور ایک سردار تھا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے اس زور سے کہا۔ ''اے ہو۔'' کہ میں چونک گیا بلکہ کانپ گیا۔ اس نے مڑ کر بڑے تپاک سے کہا۔ ''آپ پاکستانی ہو جی!''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے زبردستی مجھ سے مصافحہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی پنجابی ہوں۔''

''بڑی خوشی ہوئی۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔

''ہور جی لاہور کے ہو۔'' اس نے ایکسی لیٹر پر دباؤ بڑھا کر پوچھا۔

''نہیں، میں ڈیرا کا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ہوہوہو۔'' شاید اس نے قہقہہ لگایا تھا۔ اس کی نظر ونڈ اسکرین پر تھی اور مخاطب مجھ سے تھا۔ ''ڈیرا اور لاہور میں دوری ہی کتنی ہے۔ یہ اتنی سی تو دوری ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اشارے سے بتایا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ یہاں ڈرائیونگ اسپیڈ زیادہ ہوتی ہے۔ ذرا سی گاڑی لہرائی کہ ٹکر ہوئی اور یہ ٹکر معمولی نہیں ہوتی۔ گاڑی چور چور ہو جاتی ہے۔ مجھے ابھی مرنا نہیں تھا مگر کیا کرتا سردار تو پھر سردار ہے۔ خوش ہوگا تو دل سے خوش ہوگا۔

''جی ہاں جی ہاں۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''ہم ایک بار پنجاب ضرور جائیں گے۔ چاہے کچھ ہو جائے۔'' اس نے کہا اور جوش میں ایکسی لیٹر پر مزید دباؤ بڑھا دیا۔ میرا خون مزید خشک ہوا۔ وہ اپنی ترنگ میں بولے جا رہا تھا۔ ''یہ گورے اپنی مٹی کی محبت کیا جانیں۔ ہمارے پنجاب میں تو صرف بہادر پیدا ہوتے ہیں۔''

میں اتنا بہادر نہیں تھا کہ اس کی اڑتی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ کر خود کو بہادر ثابت کرتا یا بلا معاوضہ جنت کا ٹکٹ حاصل کر لیتا۔ اسی لیے اس کی تیز رفتاری سے گھبرا گیا میں نے کہا۔

''سردار جی وہ اگر اس بلڈنگ کے سامنے روک دیجیے۔''

اس نے ٹیکسی روکی اور میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے بغیر کسی کام کے بلڈنگ میں داخل ہوا اور پھر باہر آکر دوسری ٹیکسی لی۔

کل جمعہ کا دن تھا اور ٹی وی پر بتا رہے تھے کہ ہلکی برف باری ہوگی۔ سرجی نے آج کا دن پردے میں منہ ڈالے گزارا تھا اور اب کل کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کیونکہ ان کی زندگی میں پہلی بار برف آسمان سے نازل ہونے والی تھی۔ سحری کے لیے اٹھے تو انھیں پردے میں سے جھانکتے ہوئے پایا۔ شہباز مجھ سے کہنے لگا۔ ''یار! یہ کیا ڈراما چل رہا ہے۔ اس کو واقعی برف باری کا شوق ہے یا ہمیں چڑاتا ہے؟''

''میں نے اسے کہا کہ یہ ڈراما بھی اگر ہے تو چند دن میں بے نقاب ہو جائے گا۔'' اور مجھے یقین تھا کہ یہ سرجی کی سادہ لوحی تھی۔ انہیں دیکھ کر مجھے اپنے فیری میڈو والے شاہ جی یاد آجاتے تھے۔ وہ بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسی طرح خوش ہوتے تھے۔

شاہد صاحب اب ہم سے پوچھ رہے تھے کہ سحری میں وہ ہمارے لیے کیا بنائیں؟ میں جب کہتا کہ ہم خود بنالیں گے تو ایک طرح سے پاؤں پڑنے پر تیار ہو جاتے۔ شہباز کہتا۔ ''سر جی۔ آپ مجھے کبھی۔۔۔۔ اپنی امی لگتے ہیں۔''

انہوں نے اسی روانی میں جواب دے دیا۔ ''امی سمجھ یا ابو۔ اب کھانا میں ہی بنایا کروں گا۔''

سحری کھا کر ہم دوبارہ گھوڑے بیچ کر سو گئے۔ آج ہمیں جمعہ کی نماز کے لیے جانا تھا۔ اٹھے تو دیکھا کہ سرجی ڈور ... وال کے پردے ہٹائے باہر برف کے گالوں کو آہستگی سے زمین پر گرتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور اللہ کی شان میں قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ باہر کا منظر واقعی شاندار تھا۔ زمین کو جیسے ایک سفید چادر نے ڈھانپ دیا ہو۔ درختوں کی ٹہنیاں برف کو تھامے خاموش کھڑی تھیں۔ ایک تھما تھما سا منظر تھا گویا خاموش زبان سے بتلا رہا تھا کہ اللہ کے کتنے رنگ ہیں جو اس زمین و آسمان میں بکھرے نظر آتے ہیں۔ میں خود بے خود ہو کر سرجی کے ساتھ بیٹھ گیا اور باہر کے حسن کو دیکھنے لگا۔ شہباز نے برا سا منہ بنایا اور سیاپا، سیاپا کرتا کسی کاہل ریچھ کی طرح کارپٹ پر ڈھیر ہو گیا۔

میں اور سرجی جمعہ نماز پڑھنے IMO مسجد کی جانب چلے اور شہباز اپنا تھیلا لٹکائے ماموں خورشید کی جانب چل دیا۔ میں نے کہا۔ ''یاد سے آج واپس آنا ہے کیونکہ کل ویکن ہٹ سیکیورٹی کمپنی میں نو بجے ٹریننگ ہے۔''

وہ سر ہلاتا اور ڈولتا ہوا چلا گیا۔ آج آسمان دھواں دھار تھا۔ وقفے وقفے سے برف پڑ رہی تھی۔ سرجی نے پاکستان فون کر کے برف باری کی خوش خبری پہنچا دی تھی اور ڈھیروں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

مبارک بادیں بھی وصول کر لی تھیں۔ ہم باہر نکلے تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ برف کے گالوں کو خوشی میں اُچھل اُچھل کر پکڑنے کی کوشش کرتے تھے، جیسے آسمان سے ڈالر ان پر اتر رہے ہوں۔ مگر دورانیہ طویل ثابت نہ ہوا۔ کچھ ہی دیر میں وہ سردی سے کمزور پڑ گئے اور ٹھٹھرنے لگے۔ یہ اچھلنا کودنا بھی تھم گیا۔

ہم بس میں سوار ہوئے تو سرجی بولے۔ ”ایک بات نوٹ کی ہے؟ یہاں کی بسیں کتنی آرام دہ اور گرم ہیں، حالانکہ باہر کتنی زیادہ سردی ہے۔“

وہ اپنے تئیں مجھے ایک اہم خبر دے رہے تھے۔ ان کی ایک طرح سے دوہری حالت ہوگئی تھی۔ ایک جانب زمین پر بچھی برف کی سفید چادر دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آتا تھا اور دوسری جانب وہ سردی سے کڑکتے تھے۔ کہنے لگے۔ ”ایسا کبھی ہوتا ہے کہ بف باری بھی ہو مگر اتنی زیادہ سردی نہ ہو؟“

میں نے جواب میں کہا۔ ”گرمیوں کی برف باری میں سردی نہیں ہوتی ہے۔“

میرے جواب پر کچھ دیر غور کرنے کے بعد بولے۔ ”سرجی! آپ مذاق بہت کرتے ہیں۔“

”میں نے کہا مذاق تو آپ مجھ سے کر رہے ہیں۔“

میرے جواب کے بعد وہ بس کی کھڑکی سے دوبارہ برف باری کے نظارے کرنے لگے......

مسجد میں ماتھا زمین پر ٹکا اور میں آسمانوں میں اڑنے لگا۔ روح میں ایک سرشاری پھیل گئی جیسے ہی میں اس رب عظیم کے آگے مغلوب ہوا۔ بندگی کا یہ ترانہ دل میں تب بجتا ہے جب آخرت کا یقین دل میں بیٹھ جاتا ہے۔ کل رات ہی کی بات ہے میں سویا ہوا تھا۔ خواب میں دیکھا کہ ایک باغ ہے۔ جس کی زمین پھولوں سے بھری ہے۔ لہلہاتے درختوں کے جھنڈ ہیں اور میں تنہا اس میں گھوم رہا ہوں۔ چلتے چلتے ایک پیڑ کے پاس آتا ہوں وہاں ایک بندہ چارپائی پر دھوتی باندھے بیٹھا ہے۔ چہرہ اس کا پُرسکون ہے نور سے تمتما رہا ہے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنے پاس بلایا۔ میں جا کر اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ فضا سے تازہ پھولوں کی پتیاں برسنے لگیں۔ اس وقت میں سکون اور طمانیت کے ان لمحات میں تھا جن کا میں اس دنیا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پھر آنکھ کھل گئی... دیکھا تو سحری کا وقت ہو رہا ہے۔ سحری کرتے ہوئے بھی میں تصور میں اسی ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ گو منظر میری آنکھوں سے دل میں اتر چکا تھا۔ جسم ابھی لمحات کی زد میں تھا اور دل منور سا لگ رہا تھا۔

میں پہلی بار کینیڈا کی سرزمین پر ایسا اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب مسجد میں آیا تو سجدے میں ایک لذت کا احساس ہوا ایسی لذت جو مجھے اڑائے پھر رہی تھی۔ زبان سے دعاؤں کے حرف نکلتے اور قبولیت کی صدا کانوں میں گونجنے لگی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ کچھ دعائیں قبول ہو کر آخرت کے لیے رکھ لی جاتی ہیں۔ میرے رب کو میرے دل کی پلیدگی کا معلوم تھا، اسی لیے اس نے بہت سی دعائیں میرے حشر کے میدان کے لیے بچا رکھی ہوں گی کیونکہ ان کی ضرورت وہاں بھی پڑے گی۔

نماز پڑھنے کے بعد ہم باہر نکلے تو سرجی پھر سے سردی میں تھر تھر کانپنے لگے۔ میں نے سوچا یہاں آیا ہوں تو کیوں نہ اس آرا مشین سے اپنے ایک دن کی محنت کی کمائی وصول کر لوں۔ ہم دونوں اسی سڑک پر ہلکی برف باری میں چلنے لگے جہاں وہ فیکٹری تھی۔ وہاں جا کر میں نے اپنے چیک کا معلوم کیا تو کاؤنٹر پر اسی لڑکی نے گھورتے ہوئے کہا کہ اگلے ہفتے تیار ہوگا اور ہم آپ کو میل کر دیں گے۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ سرجی کو میری آرا مشین کی کہانی کا پتا تھا وہ لڑکی کے جواب پر غصے میں لال ہونے کے بجائے پہلے پیلے ہوئے پھر تھر تھر کانپنے لگے۔ بولے۔ ”یہ ایسے نہیں مانے گی۔ میں بات کرتا ہوں۔“ اسی دوران وہ سرجی کا حیرت سے بغور جائزہ لے رہی تھی۔ میں نے ان کا بازو پکڑا اور کہا۔ ”زیادہ غصہ آپ پر بالکل نہیں جچ رہا ہے۔ اسی لیے تحمل کا مظاہرہ کریں۔“ اس پر وہ پھر سے مظلوم صورت بنا کر کھڑے ہوگئے اور پھر خاموشی سے باہر نکل آئے۔

اسٹاپ پر پہنچے۔ بس کے آنے میں دیر تھی اور ہم سڑک کنارے ایک بینچ پر ٹکائے اکٹھے سے بیٹھے بس کا انتظار کرنے لگے۔ برف کے ہلکے ہلکے گالے فضا میں تیر رہے تھے اور یخ بستہ ہوائیں ہمارے بدن میں گھستی چلی جا رہی تھیں۔ سرجی کا سردی سے ذرا دماغ جما تو وہ پھر سے اپنے سوال لے کر بیٹھ گئے بولے۔ ”کینیڈا میں اتنی سردی پڑتی ہے تو لوگ یہاں رہتے کیوں ہیں؟“

بلاشبہ میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا اس لیے خاموش بیٹھا رہا۔

جواب نہ ملا تو ایک اور سوال داغ دیا۔ ”سرجی! آپ نے دیکھا ہے کہ پاکستان میں بھی ٹریفک بائیں ہاتھ پر چلتی ہے اور یہاں بھی......“

میں خاموش نہ رہ سکا اور جھنجلا کر بولا۔ ”یہاں تو دائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

جانب چل رہی ہے۔''

تب وہ دوسری جانب اشارہ کر کے بولے۔ ''وہاں بائیں جانب بھی تو چل رہی ہے۔''

میرے جواب نے مجھے ہی پھنسا دیا اور وہ لگے بحث کرنے۔ میں نے ہتھیار ڈالے اور کہا کہ آپ صحیح فرماتے ہیں پھر مسجد کے اوپر تیرتے بادلوں کو دیکھنے لگا جس کے نیچے برف کے گالے تھے جو چھت پر گر رہے تھے۔ ہماری ٹوپیاں گرتی برف سے سفید ہو چکی تھیں اور ہمیں بس کا انتظار تھا۔

سر جی نے ایک اور سوال کیا۔ ''کتنی ہی کاریں یہاں سے گزر رہی ہیں۔ پھر بھی سردی اتنی زیادہ ہے؟''

اب مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ سر جی حواس کھو بیٹھے ہیں۔ میں نے گھوم کر ان کی جانب دیکھا تو ان کی مونچھیں برف سے سفید ہو رہی تھیں اور وہ سنجیدگی سے میرے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔ میں تشویش میں کچھ بولتا کہ بس آ پہنچی۔ بس میں بیٹھے تو اپنا سوال دہرا رہے تھے کہ کاروں کے علاوہ بسیں بھی چلتی ہیں۔ پھر بھی اتنی زیادہ ٹھنڈ ہے؟

میں شش و پنج میں تھا کہ سر جی واقعی اتنے معصوم ہیں یا مجھے بنا رہے ہیں۔ وہ وقت گزرے کئی سال بیت گئے ہیں اور سر جی سے میرے مراسم اب بھی قائم ہیں۔ میں آپ لوگوں کو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرے اندازوں سے زیادہ معصوم اور سادہ لوح ہیں۔ ان کا صبر، استقامت اور حوصلہ میرے لیے قابل قدر رہا۔ جتنے نشیب و فراز انہوں نے دیکھے، کسی اور کے حصے میں نہ آئے۔ بعد میں بچے بھی بلوا لیے تھے۔ پھر امریکا میں اپنے رشتہ دار فیض صاحب کے پاس بھی کام کیا اور بے فیض ہی لوٹے۔ یہاں ڈاؤن ٹاؤن میں اپنی گفٹ شاپ کھولی اور نقصان اٹھا کر سرخرو ہوئے۔ کئی سال سیکیورٹی کی جاب کرنے کے بعد آج کل ٹیکسی چلاتے ہیں، خوددار اتنے کہ کبھی کسی کا ایک دھیلے کا احسان نہ لیا۔ مالی تنگی کے باوجود مجھ پر کئی ایک احسان کر گئے۔ میری ہر پیش کش کو جوتے کی نوک پر رکھ دیا۔ سر جی میرے اس سفر کے ہم سفر رہے اور ان کے بارے میں آپ مزید پڑھیں گے ان کے بارے میں بہت کچھ جان لیں گے۔

خیر اس دن ہم بس سے اپنے اپارٹمنٹ کے سامنے اترے تو برف باری میں شدت آ چکی تھی۔ برف نے ہر چیز کو ڈھانپ دیا تھا۔ چیڑ کے درختوں پر ٹکی برف نے ایک سماں باندھ دیا تھا۔ سر جی پھر برف سے کھیلنے لگے۔ وہ کوئی سنو مین بنانے کے موڈ میں تھے کہ میں نے ان کا بازو پکڑا اور کھینچتا ہوا انہیں بلڈنگ کے اندر لے آیا۔

پردیس میں کوئی اکیلا رہ رہا ہو اور جب وہ اپنے گھر کا دروازہ کھولتا ہے تو نظر اس کی زمین پر ہوتی ہے۔ وہ اس اُمید پر دروازہ کھولتا ہے کہ آج کسی کا لکھا خط ڈاکیے نے دروازے کے نیچے سے اندر کھسکایا ہوگا۔ یہ میں ان دنوں کی بات کر رہا ہوں جب انٹرنٹ نیا نیا آ رہا تھا اور آدھی ملاقات کا انحصار خطوط... ہوتے تھے۔ فون کرنا ایک مہنگا مشغلہ تھا۔ سر جی (شاہد صاحب) کو کبھی کسی خط کا انتظار نہ رہا۔ وجہ مجھے معلوم نہ تھی اور نہ انہوں نے بتائی اور نہ میں نے کبھی پوچھا۔ مہینوں بعد مجھے وجہ معلوم ہوئی تو دکھ سے دل کٹ گیا تھا۔ وہ وجہ میں بیان نہیں کروں گا کیونکہ یہ میرے لیے غیر مناسب ہوگا۔

آج دروازہ کھولا تو بہت سے اشتہاری اخباروں کے کباڑ کے اندر شاہ جی کا پاکستان سے آیا ہوا خط ملا۔ خط پا کر میں خوشی اور حیرت سے بت بنا کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ خود تو ان پڑھ تھے اور یہ خط انہوں نے اپنی بیٹی سے لکھوایا تھا۔ میرے پڑھنے والے ''نانگا پربت کا عقاب'' کے کردار ''شاہ جی'' سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ میرے ہم سفر اور بہترین دوست بھی تھے۔ جو خط انہوں نے لکھا تھا وہ میں من و عن لکھ رہا ہوں۔

میرے پردیسی دوست ندیم بھائی۔

اسلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت کا طالب ہوں۔ اُمید ہے آپ کینیڈا میں بخیریت ہوں گے۔ میں بھی یہاں ڈیرہ میں خیریت سے ہوں۔ ہر جمعہ کے دن دریا پر جاتا ہوں اور آپ کو بہت یاد کرتا ہوں۔ دریا پر دھاولی کے بعد جب کھانا لگتا ہے تو آپ بہت یاد آتے ہیں کیونکہ ہم ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتے تھے۔ میں اپنے بچوں کو فیری میڈو کی تصویریں دکھاتا رہتا ہوں اور ہم سب بہت خوش ہوتے ہیں۔

عید کا سیزن شروع ہے۔ کپڑے کی سلائی کا بہت رش ہے اور دو نئے کاریگر بھی رکھ لیے ہیں۔

میں امید رکھتا ہوں کہ آپ جب بھی پاکستان آئیں گے تو ہم ایک بار پھر فیری میڈو چلیں گے۔ اس بار بگروٹ بھی جائیں گے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مجھے ضرور بتانا۔ اُمید ہے..... اپنی اسکول کی نوکری کر رہے ہوں گے۔ انگریزوں کو اسلام کا درس دینا نہ بھولنا۔ خط کا جواب ضرور دینا، انتظار رہے گا۔

اللہ آپ کو اپنی حفاظت میں رکھے۔

منجانب آپ کا دوست اسماعیل شاہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

میں اس مختصر خط کو کئی بار پڑھ چکا تھا۔ اس خط کے اندر کا پیار اور خلوص الفاظ سے جھلکتا تھا۔ میری آنکھیں نم تھیں۔ میں اپنے کمرے میں میٹرس پر لیٹا تھا۔ ایک دو بار سرجی نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور مجھے محو دیکھ کر چلے گئے تھے۔ میں تادیر پھر سے نانگا پربت کی وادیوں میں اپنے خیالات میں گھومتا رہا۔ میں خیالوں میں ہنزہ کے ہوٹل کی چھت پر درن پیک سے تاروں کو طلوع ہوتے دیکھتا رہا۔ التر گلیشئر سے اٹھتی ٹھنڈی ہوا میری پیٹھ کو سرد کرتی رہی۔ میں فیری میڈو کے جنگلوں میں اکیلا گھومتا رہا۔ نانگا پربت کے سامنے بیٹھ کر اس پر سے اٹھتے برفانی طوفان میرے دماغ کی اسکرین پر برسنے لگے۔ میں کھو سا گیا۔ اپنے وطن کی بھینی خوشبو میں ڈوب رہا تھا۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور سرجی کا سر اندر آیا۔ میری نظریں اٹھیں تو وہ خود بھی کمرے میں آگئے۔ چہرہ کسی خوشی سے تمتما رہا تھا۔ میں پہلے تو سمجھا کہ کہیں باہر سنو مین تو نہیں بنا آئے...... کیا اسی لیے چہرے پر مسکراہٹ سجی ہوئی ہے؟ مجھے دیکھتے ہوئے ذرا جھجک کر بولے۔ ”سرجی! آپ سو رہے ہیں۔“

میں نے ذرا ہنس کر کہا۔ ”تو آپ یہ سوال کر رہے ہیں یا اطلاع دے رہے ہیں......؟ مگر یہ خوشی کس بات کی سجی ہے آپ کے چہرے پر؟“

تھوڑا سا شرمائے اور نظریں جھکا کر بولے۔ ”وہ فیض صاحب کا ابھی فون آیا تھا، وہ ٹورنٹو آئے ہوئے ہیں اور ابھی آرہے ہیں۔ میں نے اپنا بیگ تیار کر لیا ہے اور ہم آج نیو یارک چلے جائیں گے۔“ وہ بہت سرشار لگ رہے تھے۔ خوشی ان کے چہرے پر عیاں تھی لیکن میں تھوڑا سا پریشان تھا کہ جو شخص اس کو یہاں بے یار و مددگار چھوڑ سکتا ہے وہ ان کو کس طرح اپنے ساتھ نیو یارک لے جائے گا؟ میں نے ان کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ کر پوچھا۔ ”کیا انہوں نے آپ سے کہا ہے کہ آپ ان کے ساتھ جا رہے ہیں؟“

وہ کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر مغموم لہجے میں بولے۔ ”اس نے اس بارے میں کہا تو کچھ نہیں ہے مگر لگتا یہی ہے کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔“

”میں نے سر پیٹ لیا اور ذرا زور دے کر کہا کہ اپنے بیگ کو اندر الماری میں رکھنا اور اگر وہ کہیں تو اسے نکال کر چل دینا مگر خود سے کچھ نہ کہنا۔“

یہ سن وہ کچھ کھو سے گئے اور پھر اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

ہم نے اسی دوران کچھ کھانے میں بنایا۔ پھل کاٹے، کھجوریں سجائیں اور مینگو جوس کا ڈبہ کھول کر جگ بھر لیا۔ وہ جلدی جلدی کام کر رہے تھے پھر کچھ کہنے کے لیے میرے پاس آ بیٹھے۔ میں نے پوچھا۔ ”اب کیا بات ہے؟“

شرما کر فرمانے لگے۔ ”آپ نے کبھی دودھ میں جلیبیاں ڈال کر کھائی ہیں؟“ پھر خود ہی جواب دینے لگے۔ ”میں نے کھائی ہیں اور اللہ کی قسم بہت اچھی ہوتی ہیں۔“

مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس وقت بے وطنی میں انہیں جلیبیاں کیوں یاد آرہی ہیں۔ میں نے کہا ”کھائی تو کبھی نہیں۔ پر اب کیوں یاد آرہی ہیں؟“

”کہنے لگے کہ اگر مہمانوں کے لیے دودھ میں جلیبیاں بنا لیں تو انہیں بہت مزہ آئے گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”جلیبیاں کیا آپ پاکستان سے لائے ہیں؟“

کہنے لگے۔ ”لایا تو نہیں، کیا یہاں بازار سے نہیں ملتیں ہیں؟“

میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”اوہ بھائی کون سا بازار؟ یہاں ہم کسی محلے میں رہتے ہیں کیا کہ باہر گلی کی نکڑ پر حلوائی کی دکان ہے۔“

وہ۔ ”اچھا“ کہہ کر اداس ہو کے بیٹھ گئے۔

دروازے پر بیل بجی تو وہ دو چھلانگوں میں ہی دروازے پر پہنچ گئے اور اسے کھول دیا پھر ایک کالے سے، لمبے اور موٹے شخص کے پیٹ سے گلے ملنے لگے۔

یہ فیض صاحب تھے۔ شکل سے شخصیت کا اندازہ ہو جاتا ہے مگر میں نے کوئی بری رائے قائم کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ان کے ہمراہ ایک باریش بندہ بھی تھا۔ ان دونوں کو عزت سے بٹھایا۔ فیض صاحب ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے کارپٹ پر اکڑ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔

سرسری نظروں سے اپارٹمنٹ دیکھ کر بولے۔ ”آپ کتنے لوگ یہاں رہتے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”تین۔“

وہ خود ہی رواں ہو گئے۔ ”جگہ کیا تنگ نہیں لگتی آپ کو؟ میرا گھر جو نیو جرسی میں ہے۔ وہ چار بیڈروم کا ہے۔ ڈبل اسٹوری ہے اور ایک انیکسی ہے۔“ پھر خود ہی مرعوب ہوتے گئے اور مجھے مخاطب کر کے بولے۔ ”آپ کوئی جاب کرتے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہیں؟''

میرے جواب دینے سے پہلے سرجی بول پڑے۔ ''انہیں ابھی ایک ماہ ہوئے ہیں آئے ہوئے۔ جاب تلاش کررہے ہیں۔''

''ہاں بھائی۔ یہ تو ہے۔ بڑی خواری اٹھانی پڑتی ہے یہاں ایڈجسٹ ہونے میں...... مجھے دیکھو، میں نے کیا کیا نہیں کیا۔ آتے ہی دوسرے دن سے مین ہٹن (نیویارک کے ڈاؤن ٹاؤن) میں فٹ پاتھ پر چھوٹی چھوٹی چیزیں بیچنے لگا تھا اور آج۔ میرے دو اسٹور ہیں۔ جن کا ہر ماہ ساٹھ ہزار ڈالر کرایہ دیتا ہوں۔''

ساٹھ ہزار کرایہ کا سن کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ سرجی کا حال بھی میری ہی طرح تھا۔ یہاں اگر دو ڈھائی ہزار ڈالر مہینے کی جاب مل جائے تو لوگ مبارک باد کے لیے فون کرتے ہیں اور یہ ساٹھ ہزار کرایہ مہینے کا دیتے ہیں۔ پھر وہ کہنے لگے۔ ''میرے پاس ڈرائیور ہیں۔ کئی گاڑیاں ہیں اور گھر پر کام کرنے کے لیے نوکر اور ایک کک بھی ہے۔'' میں اب سمجھنے لگا تھا کہ یہ اب ہمیں متاثر کرنے پر تلے ہیں۔

اتنے میں افطاری کا ٹائم ہوگیا۔ ہم نے روزہ افطار کیا، نماز پڑھی اور سرجی چائے بنا لائے۔ پھر بیٹھے تو فیض صاحب ٹھیک وہاں سے شروع کیا، جہاں ختم کیا تھا۔ ''یہاں ایک گودام ہے جہاں چین سے میں نے سوٹ کیسز منگواتے ہیں اور پورا گودام بھرا پڑا ہے۔ اس کی جانب توجہ دینے کا وقت ہی نہیں ملتا۔''

پہلے میرا ارادہ تھا کہ ان سے پوچھوں کہ آپ شاہد صاحب (سرجی) کو کہہ کر بھی لینے کیوں نہیں آئے؟ اگر لینے نہیں آنا تھا تو انہیں پاکستان سے روانگی کے وقت ہی بتا دیتے...... مگر میں چپ ہو رہا۔ مگر میں نے ان سے جب یہ پوچھا کہ یہ ساتھ میں صاحب کون ہیں تو کہا کہ یہ ٹورنٹو ہی میں رہتے ہیں اور میرے بزنس پارٹنر ہیں۔ آخر میں نے کہہ ہی ڈالا کہ جب آپ شاہد صاحب کو لینے نہ آسکتے تھے تو اپنے اس پارٹنر کو ہی بھیج دیتے۔ اس بات پر وہ بغلیں جھانکنے لگے۔ بات کو گھمانا چاہا تو میں نے دوبارہ انہیں گھیر لیا۔ ''اگر میں نے شاہد صاحب کو پاکستان میں اپنا نمبر نہ دیا ہوتا تو معلوم نہیں یہ کہاں جاتے۔ وہ تو شکر ہے کہ ہم بھی اس وقت گھر پر موجود تھے۔''

وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ سرجی بیچ میں آگئے۔ ''فیض بھائی! آپ چائے پئیں گے؟ میں بناتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کر کچن میں چلے گئے اور وہیں سے مجھے چپ رہنے کے لیے اشارے کرنے لگے۔

فیض صاحب اسی طرح کی باتیں کرتے رہے اور تمام گفتگو میں انہوں نے نظریں اٹھا کر سرجی کی جانب دیکھا تک نہیں تھا۔ سرجی نے ان کے ہمراہ جانے کے لیے اپنا بیگ تیار کر رکھا تھا اور مجھے ایسے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ اتنے میں شہباز آگیا۔ تعارف کروایا تو وہ قہر آلود نظروں سے فیض صاحب کو دیکھنے لگا مگر شکر ہے انہوں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ باتیں کرتے جب تھک گئے تو بولے۔ ''چلو آپ کو سیر کرانے لے جاتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''ہمیں کل صبح سیکیورٹی گارڈ کی ٹریننگ پر جانا ہے، آپ شاہد صاحب کو لے جائیں۔''

میں جان بوجھ کر انہیں اکیلے میں بات کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ جتنا میں نے سن لیا تھا، اس سے زیادہ سننے کی گنجائش بھی نہ تھی۔

وہ مل ملا کر چلے گئے تو شہباز بولا۔ ''یہ کیا سیاپا تھا؟''

میں نے اسے ان کے بزنس، گھر اور رکھ رکھاؤ کا بتایا تو وہ بھی خائف نظر آنے لگا۔ شہباز مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''کیا وہ سرجی کو اپنے ساتھ نیویارک لے جائیں گے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لگتا نہیں۔ پھر بھی یہ تب معلوم ہوگا جب وہ واپس آئیں گے۔''

دراصل سرجی یہ پروگرام بنا کر آئے تھے کہ فیض صاحب انہیں اپنے ہمراہ نیویارک لے جا کر کوئی بزنس شروع کروا دیں گے۔ ورنہ ان کے خیال میں کینیڈا میں تو انہیں صرف انٹری دینی تھی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد دروازے پر بیل ہوئی تو سرجی کو اکیلا پایا۔ فیض صاحب انہیں باہر سے ہی اتار کر جا چکے تھے۔

سرجی کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ ہم سے نظریں نہیں ملا پا رہے تھے۔ میں نے کریدنا مناسب نہ سمجھا اور شہباز کو بھی اشارہ کر دیا۔ سرجی منہ لپیٹ کر لیٹ گئے۔ میں بھی افسردہ تھا۔ اتنی بے حسی پر میں خاموش نہ رہ سکتا تھا۔ مجھے اندازہ تو دیکھتے ہی ہوگیا تھا کہ سرجی اب ٹورنٹو ہی میں رہیں گے۔ میں فیض صاحب کو کچھ سنانا چاہتا تھا مگر وہ شاید میرے تیور بھانپ گئے تھے اسی لیے باہر سے ہی کھسک گئے تھے۔

شہباز بار بار مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں سرجی کے بیگ کو دیکھ دیکھ کر دکھی ہو رہا تھا۔ سرجی کی طرح ان کا بیگ بھی ایک کونے میں اداس سا پڑا تھا۔

بعد میں سرجی ہمارے پاس ہی ٹھہر گئے تھے اور ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

سال بعد ان کی فیملی بھی آ پہنچی۔ فیض صاحب کی بیوی دراصل سرجی کی بیوی کی بہن تھیں اور وہ ایک بار اپنی بہن سے ملنے ٹورونٹو بھی آئی تھیں۔ میری فیملی بھی آچکی تھی۔ ہم نے اپنے گھر اس کا کھانا کیا تھا۔ وہ زیورات سے لدی پھندی ہمارے گھر آئی۔ کھانا کھایا۔ اس نے بھی خوب بڑھ بڑھ کر وہ سب بتایا جو فیض صاحب بتا چکے تھے اور پھر وہ اپنی بہن کو دلاسے دے کر رخصت ہو گئیں۔

چند سال بعد میں اپنے بچوں کے ساتھ نیویارک گیا۔ ہم نیویارک مین ہٹن کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مجھے سمیہ نے کہا کہ فیض صاحب کے اسٹوروں پر چلتے ہیں۔ کیونکہ اسے کچھ شاپنگ کرنی تھی۔ فون کر کے سرجی سے ایڈریس لیا اور جا پہنچے۔ ایک اسٹور میں داخل ہوئے تو وہاں بہت سے اسٹال لگے تھے اور ایک اسٹال پر فیض صاحب کی بیوی کچھ مصنوعی جیولری لگائے کھڑی تھیں۔ ہمیں دیکھا تو ان کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ رنگ زرد پڑ گیا اور مجھے ایسا لگا کہ یہ ابھی گر جائیں گی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس اسٹور میں اسٹال لگانے کے لیے ایک مخصوص جگہ کئی ایک کو کرائے پر دی جاتی ہے اور بھابی صاحبہ وہاں اپنا اسٹال لگاتی ہیں۔

ان کے جھوٹ کا پول کھل چکا تھا اور میں خود سے شرمندہ ہو رہا تھا کہ مجھے یہاں آنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ اسٹال لگا کر سامان بیچنے میں کوئی عار نہیں اور لوگ خاصا کماتے بھی ہوں گے مگر ان کی اپنی لمبی لمبی باتیں انہیں خود ہی پانی پانی کر گئی تھیں۔ انہیں شرمندہ دیکھ کر میں زیادہ شرمندہ ہو رہا تھا کہ کیوں میری وجہ سے ان کی یہ حالت ہوئی تھی۔

میں نے فیض صاحب کا پوچھا تو وہ کچھ مختلف سمتوں میں اشارے کر کے کہنے لگیں کہ اگلے موڑ پر ان کا سوٹ کیسوں کا اسٹور ہے۔ میں جلدی سے وہاں سے نکل آیا۔ سوچا کہ فیض صاحب ہی سے مل لیا جائے۔ وہاں ڈھونڈتے ڈھونڈتے پہنچے تو سامنے دیکھا کہ وہ فٹ پاتھ کے ساتھ سوٹ کیس لگائے ایک ایک کو روک کر اپنا سودا بیچ رہے ہیں۔ میں اپنے پڑھنے والوں سے پھر یہ کہتا ہوں کہ ایسا یا کسی اور قسم کا کام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے مگر کچھ لوگ اپنے آپ کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ طریقہ پاکستان میں آسانی سے چل جاتا ہے مگر یہاں سب ایک دوسرے کو جان لیتے ہیں۔ میں نے دور سے انہیں دیکھا اور ملے بغیر واپس ہو لیا۔ مجھے انہیں شرمندہ نہیں کرنا تھا۔ (میں نے جان بوجھ کر فیض صاحب کا اصلی نام اس داستان میں نہیں لکھا ہے، تاکہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے)۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ چلیں واپس ٹورنٹو میں اپنے اپارٹمنٹ میں چلتے ہیں جہاں سرجی سوئے ہوئے تھے۔ میں اور شہباز کل کی ویکن ہٹ سیکیورٹی کمپنی کی ٹریننگ پر جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

ساڑھے نو بجے ہماری ٹریننگ شروع ہوتی تھی اور اس کے بعد ٹیسٹ تھا۔ یہ سب کچھ چھ بجے تک چلتا۔ ہم دونوں سحری کے بعد لیٹ گئے پھر اٹھے اور نو بجے ویکن ہٹ کے دفتر پہنچے۔ موسم وہی تھا جو چند دن سے چلا آ رہا تھا مگر برف باری بند تھی۔ ہم ٹھنڈ کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔ ٹھٹھرتے ہوئے استقبالیہ پر پہنچے تو کسی نے وہیں سے ہمیں ایک راہداری کا راستہ دکھایا جو ایک بڑے ہال نما کمرے میں ختم ہو رہا تھا۔ وہاں سفید چمک دار میزیں ایک ترتیب سے رکھی تھیں اور ان کے آگے کلاس روم طرز کی کرسیاں پڑی تھیں۔ سامنے ایک بڑی سی کرسی پر مارولینا بیٹھی جھول رہی تھی۔ وہ ہر ایک کو تنقیدی نگاہوں میں رکھ کر اس کا پوسٹ مارٹم کر رہی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ انسٹرکٹر ہے۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ سے تعلق ہے اور آج کا سبق اسی نے پڑھا کر ہمارا امتحان لینا ہے۔ پاس ہونے کے بعد ہی سیکیورٹی گارڈ کا لائسنس چند دن بعد مل سکتا تھا۔ وہ ایک حد سے زیادہ صحت مند مگر نخوت سے بھری لڑکی تھی یا لڑکی سے عورت بن چکی تھی۔ نیلی جین اور سفید شرٹ میں مجھے گھور رہی تھی کیونکہ میں تذبذب میں کھڑا تھا کہ کہاں بیٹھوں...... جہاں کھڑا تھا وہیں مجھے ڈپٹ کر بٹھا دیا۔

میرے ساتھ ایک انڈین بیٹھا تھا اس کا نام وشوا تھا۔ ایک بلونت سنگھ رندھاوا اور بیٹھا تھا اور ساٹھ سال کی عمر کو چھو رہا ہوگا۔ شہباز میرے پیچھے ایک بنگالی کے ساتھ اداس اور اپنا زرد چہرہ لیے بیٹھا تھا۔ ایک سیاہ فام تھا۔ ایک اور پاکستانی تھا جو یہ بتا رہا تھا کہ وہ یہیں پیدا ہوا ہے اور تعلیم بھی کینیڈا میں حاصل کی ہے مگر لہجے سے ہرگز نہ لگتا تھا کہ وہ یہاں پر پلا بڑھا ہے۔ جو کینیڈا کا تعلیم یافتہ ہو وہ کس طرح ایک سیکیورٹی گارڈ کی جاب کے لیے ہمارے ہمراہ بیٹھا ہوا تھا؟ یہ جاب تو ہم تارکین وطن کا نصیب ہوتی ہیں۔

ہم ایک دوسرے سے متعارف ہو رہے تھے کہ مارولینا کی چنگھاڑتی ہوئی آواز پر ہم سب دبک کر خاموش ہو گئے۔ پہلے بتایا کہ وہ دس سال پہلے رومانیہ سے کینیڈا آئی تھی اور آج کل پولیس اکیڈمی میں پڑھاتی ہے۔ زبان اس کی قینچی کی طرح چل رہی تھی اور ہاتھ زبان کے ہمراہ فضا میں چل رہے تھے۔ زبان چلی تو رکنے کا نام نہ لیا۔ پہلے تو میں بغور سنتا رہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پھر بغور سوچتا رہا اور پھر بعد میں بغور اونگھنا بھی شروع کر دیا۔ سخت بور موضوع اس نے چھیڑ رکھے تھے۔ ایک تو الفاظ بمشکل پلے پڑتے تھے اور دوسرا اس سبجیکٹ میں کسی کی کوئی دلچسپی نہ تھی۔

پھر جب اس نے سب کو اونگھتے پایا تو وہ بپھر سی گئی۔ اس کے بعد وہ کچھ بول کر ایک ایک سے پوچھتی کہ اس نے کیا کہا ہے؟ نتیجتاً سب اپنے آپ کو چوکس رکھنے لگے۔ بلونت سنگھ سے پوچھا۔ ”اگر تم رات میں کہیں سیکورٹی گارڈ کی ڈیوٹی دے رہے ہو اور ایک چور گھس آیا۔ اور تم نے اسے پکڑ لیا تو بتاؤ کہ کمپنی تمہیں کیا انعام دے گی؟“

بلونت سنگھ ترنت سے بولا۔ ”کمپنی خوش ہوگی اور زیادہ گھنٹے بھی دے گی۔“

مارولینا کے پھولے چہرے پر کہیں سے ایک طنزیہ سی مسکراہٹ پھیلی اور بولی۔ ”تمہیں سیدھا جیل بھیج دیں گے۔“ بلونت سنگھ پہلے تو ذرا سا سہما اور جب ہمیں حیران دیکھا تو خود بھی حیران سا ہو گیا۔ ہم سب اس لیے حیران ہوئے کہ چور کو پکڑنے پر انعام کی جگہ سزا کیوں؟ بتانے لگی کہ آپ کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ آپ لوگوں کے پاس اسلحہ بھی نہیں ہوتا اور نہ آپ کا یہ کام ہے کہ آپ کو جرائم روکنے ہیں۔ آپ صرف نگرانی کرنے لیے رکھے جاتے ہو۔ ایک واقعہ بتانے لگی کہ ابھی پچھلے دنوں ایک سیکورٹی گارڈ نے کسی چور کو چوری کرتے دیکھا تو اس کے پیچھے بھاگا وہ چور دیوار کودا تو یہ بھی کود گیا۔ پھر اسے پکڑ کر مارا پیٹا اور اسے زخمی حالت میں اپنی طرف سے گرفتار کر کے اپنے آپ کو کسی بڑے انعام کا حقدار ٹھہرایا۔ بعد میں چور نے گارڈ پر کیس کر دیا اور پولیس نے بھی چور کی حمایت کی اور سیکیورٹی کمپنی کو ہرجانے پر ایک لاکھ ڈالر اس چور کو دینے پڑ گئے تھے۔ پھر بلونت سنگھ کی جانب پلٹی۔ ”تمہارے گھنٹے بڑھائے تو جائیں گے مگر جیل میں۔“ بلونت سنگھ نے بمشکل تھوک نگلا اور سہم کر کرسی پر گر گیا۔

مجھے پہلے گھنٹوں کی کہانی سمجھ میں نہ آئی مگر پھر معلوم ہوا کہ تنخواہ تو آپ کو گھنٹوں کے حساب پر ملتی ہے۔ جتنے زیادہ گھنٹے کام، اتنی زیادہ تنخواہ۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی تھی کہ اسے زیادہ سے زیادہ گھنٹے ملیں۔ دو گھنٹے زیادہ کام کرنے سے آپ کا دو دن کا کچن آسانی سے چل سکتا ہے۔

وشوا میرے ساتھ بیٹھا تھا اور بڑھ چڑھ کر انگریزی میں سوالات کر رہا تھا۔ اس کی زبان اور لہجے میں روانی بھی بہت تھی۔ مارولینا کچھ پوچھتی تو ٹھک سے جواب دیتا تھا۔ کافی کا وقفہ ہوا تو ہم سب کافی مشین کے گرد کھڑے ہو گئے۔ تھکاوٹ اور نقاہت سے میری حالت بری تھی۔ روزہ تھا اس لیے نہ میں کچھ کھا سکتا تھا اور نہ پی سکتا تھا۔ میرا دماغ ماؤف تھا۔ بلونت سنگھ ہمارا دوست بن گیا۔ وہ پچھلے ہفتے ٹیسٹ دے کر فیل ہو چکا تھا۔ ہمیں بتا رہا تھا کہ پرچے میں کس قسم کے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ وشوا بے نیاز کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا کہ یہ ٹیسٹ اس کے لیے کچھ بھی نہیں۔ دس منٹ کا وقفہ ختم ہوا اور ہم پھر سے مارولینا کے چنگل میں آ بیٹھے۔ وہ بولتی رہی اور میں اپنی کرسی پر بے ہوش سا بیٹھا رہا۔

تھکاوٹ اور خالی پیٹ کی وجہ سے میرا سر درد شدت اختیار کر چکا تھا۔ شوگر لیول بھی نیچے گر چکا تھا اور یہ مجھے بے ہوش کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے مارولینا کے آگے ہاتھ جوڑے کہ ہمارا روزہ ہے اور مہربانی کر کے ٹیسٹ چار بجے ہی لے لے کیونکہ پونے پانچ بجے افطاری کا وقت ہے۔

وہ بولی۔ ”ایک تو تم مسلمان لوگ مذہب کے بڑے پابند ہوتے ہو۔“ مجھے اندازہ نہ ہوا کہ وہ تعریف کر رہی ہے کہ طنز؟ سر درد کی وجہ سے اب مجھے کچھ سنائی بھی کم دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”یہ ہمارا مذہبی معاملہ ہے اور کوئی اس پر بات نہیں کر سکتا ہے کیونکہ چارٹر میں بھی لکھا ہے۔“ میری بات سن کر اس کے سفید پھولے چہرے پر ایک خوف کا رنگ آیا اور چلا گیا۔ میں نے چارٹر کے کچھ نقاط پڑھے تھے اور وہ بھی خوب جانتی تھی کہ میری بات کا کیا مطلب ہے۔ وہ خاموش ہو رہی۔ کسی کے مذہب پر کوئی بات کرنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ میں نے قانون کی بات کی اور اس کے آگے اس کی ساری اکڑ ہوا ہو گئی۔

چار بجے اس نے پیپر تھما دیے۔ میں نے جلدی جلدی صرف پندرہ منٹ میں اسے بھگتا کر واپس اس کے حوالے کر دیا۔ مجھے پاس ہونے سے زیادہ اپنی حالت کی فکر تھی۔ جو مجھے سمجھ میں آیا وہی لکھ ڈالا۔ مارولینا نے اسی وقت رزلٹ بتا دیا۔ میرے اور بلونت سنگھ کے علاوہ سب فیل ہو گئے تھے۔ شہباز فق کھڑا تھا۔ وشوا، احتجاج کے موڈ میں تھا اور بلونت سنگھ مجھے گلے لگا رہا تھا۔

افطاری کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ شہباز بھی میری طرح بے چین تھا۔ ہم بھاگم بھاگ کافی مشین تک پہنچے۔ ہم نے بیگوں میں دو دو کیلے رکھے تھے۔ پہلے ایک ایک کیلا کھا کر افطاری کی۔ یہ افطاری مجھے دلگیر کر گئی تھی۔ مسلمانوں کے لیے افطاری ایک کھانا نہیں ہوتا بلکہ ایک تقریب اور عبادت بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہوتی ہے۔ ہم اسے عبادت کا حصہ سمجھتے ہیں۔ ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق اہتمام کرتا ہے اور اپنی یہ تقریب ایک عبادت کے طور پر نبھاتا ہے۔ ہم تارک الوطنی کی چکی میں پسنے کے عمل سے گزر رہے تھے۔ ہر ایک کسی نہ کسی طرح اس ذہنی کرب سے گزرتا ہے جس میں آج میں کھڑا تھا۔

کافی مشین چلائی کہ ایک کپ کافی کا بھی حلق میں انڈیل لیں۔ مشین اسٹارٹ ہوئی تو رکنے کا اس نے نام نہ لیا۔ کافی گرنے لگی گھبرا کر شہباز نے اس کی تار کھینچ نکالی۔ وہ سخت اذیت میں تھا کیونکہ وہ فیل ہو چکا تھا اور میں اسے دلاسہ دے رہا تھا۔ ''تمہیں کیا سیاپا پڑا ہے۔ اگلے ہفتے پھر ٹیسٹ دے دینا۔''

وہ گھورتی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا کیونکہ میں نے اس کا جملہ دہرایا تھا۔

مجھے... اب بسوں اور ٹرین سے ڈیڑھ گھنٹے کا سفر کرنا تھا۔ یہ الگ مشقت تھی اور یہی فکر مجھے کھائے جا رہی تھی جو ہمیں اب درپیش تھی۔ بلونت سنگھ ہمارے ساتھ کھڑا بہت چہک رہا تھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو پاس کروا چکا تھا۔ اس نے ہماری پریشانی بھانپی تو کہنے لگا۔ ''میرا کاکا (بیٹا) گاڑی لے کر آ رہا ہے اور تم لوگوں کو اپارٹمنٹ پر چھوڑ دے گا۔''

ہم نے مارے خوشی کے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ہمراہ باہر سڑک کنارے ایک لان کے ساتھ آ کھڑے ہوگئے۔

باہر نکلے تو ایک ویرانی تھی۔ آج ویک اینڈ تھا اور ہمارے آس پاس پچاس پچاس منزلہ عمارتیں سر اٹھائے، روشنیوں میں نہائے خاموش کھڑی تھیں۔ سڑکوں پر کبھی کبھار اکا دکا گاڑی نظر آ جاتی تھی۔ ہم تینوں اکیلے، منفی دس کے درجہ حرارت میں کھڑے کاکے کا انتظار کر رہے تھے۔

بلونت سنگھ ٹھیٹ پنجابی میں بتا رہا تھا۔ ''وہ لدھیانہ سے اسپانسر پر ایک سال پہلے آیا تھا۔ گرمیوں میں تو اپنی گھر والی کے ساتھ کھیتوں میں ٹماٹر چننے کے کھیت پر کام کرتا رہا تھا جو اب سردیاں شروع ہو جانے کی وجہ سے ٹھپ ہو گیا تھا اسی لیے اس کے کاکا نے مشورہ دیا تھا کہ بابو سیکیورٹی کی جاب پکڑ لو۔''

اتنے میں اس نے ایک تھیلے سے کوک ٹن پیک کے دو ڈبے نکالے اور ہمیں کہا۔ ''موسلو۔ روجہ (روزہ) ہے...... یہ ڈرنک پیو۔ مجھے کاکے نے تین ڈبے دے دیے تھے۔'' اپنے لیے ایک بیئر کا ڈبہ نکالا اور ایک ہی سانس میں چڑھا گیا اور کہنے لگا۔ ''یہ کاکے کی نظروں سے چوری کر کے لایا ہوں۔ وہ اپنی بیئر مجھے نہیں دیتا اور کہتا ہے۔ بابو! تمہیں یہ بیئر بھی چڑھ جاتی ہے۔'' سانس لینے کے بعد ایک زوردار قہقہہ بلند کیا جو اس خاموشی کو آرے کی طرح چیر گیا تھا۔ سردار جی کو اپنی کامیابی کا نشہ تو پہلے ہی تھا کہ اب بیئر کا نشہ بھی آ شامل ہوا تو بہکنے لگا... ٹھیٹ پنجابی میں بات کرنے لگا۔ اب وہ شہباز پر پلٹا۔ ''او کاکا! تو کیوں منہ بنائے کھڑا ہے؟ میں بھی تیری طرح پچھلے ہفتے فیل ہو گیا تھا۔ پھر رات کو اپنے کاکے کے تین بیئر کے ڈبے چرائے اور چڑھا گیا اور پھر سب کچھ ٹھیک ہوندا گیا تو بھی آج رات کو دو ڈبے ہی چڑھا لے پھر دیکھ صبح سب ٹھیک ہو گا۔'' پھر اپنی کسی اندرونی جیب سے...... ایک اور ڈبہ نکالا اور شہباز کی طرف بڑھایا۔ شہباز، لاحول پڑھنے لگا۔ ''سردار جی! ہم مسلمان شراب نہیں پیتے۔'' تو جھوم کر بولا۔ ''بیئر شراب نہیں ہوتی۔ شراب تو واڈکا ہوتی ہے۔'' پھر خود ہی وہ ڈبہ چڑھا گیا۔

پھر بہت دیر بلونت سنگھ کچھ سوچتا رہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''تم اپوائنٹس پر آئے ہو؟''

مطلب یہ تھا کہ اپنی پرفیشنل ڈگری کی بنیاد پر آئے ہو۔ شہباز نے جواب دیا۔ ''ہاں جی۔ ہمارا کون سا یہاں کاکا ہے جو ہمیں اسپانسر کرتا؟''

شہباز کی بات کو اس نے سنا ان سنا کر دیا۔ لگتا تھا کہ بابو کو تھوڑی سے چڑھ گئی تھی۔ کہنے لگا۔ ''موسلو (مسلمانو)۔ میرے پاس بہت پیسا ہے۔ جب پنجاب میں تھا تو کاکے کو یہ بتایا کہ ہم بہت قرجائی (قرضائی) ہیں۔ اس سے کہا کہ اپنے بابو کو بلا لو۔ کام کر کے پیسا بنائیں گے اور قرجہ (قرضہ) اتاریں گے۔'' اتنے میں ایک اور بیئر کا ٹن کھول کر چڑھا گیا پھر بولا۔ ''یہاں آنے پر جب کاکے کو بتایا کہ کوئی قرجہ نہیں تو کاکا کہنے لگا۔ بابو تم تو بڑے ہوشیار ہو۔'' یہ کہہ کر ایک اور قہقہہ اب ہمارے کان چیر گیا۔

ٹورنٹو میں سکھ بہت ہیں۔ ایک آیا تو کچھ ہی عرصے میں پورا خاندان گھسیٹ لایا۔ گھر کے چھوٹے بڑے یہاں آ پہنچے۔ گرمیوں میں یہاں کے کھیتوں میں ٹماٹر، آلو چنتے ہیں اور اچھے پیسے بنا لیتے ہیں۔ سردیوں میں کوئی نہ کوئی کیش کی جاب پکڑ لیتے ہیں اور حکومت سے بے روزگاری کے پیسے علیحدہ لیتے ہیں۔ کینیڈا ان کا دوسرا پنجاب ہے۔ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ وہ انڈیا سے ہیں۔ ہمیشہ کہتے ہیں کہ پنجاب سے آئے ہیں۔ یہاں انہوں نے اسپانسر کے نام پر بڑے گھناؤنے طریقے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بھی استعمال کیے ہیں۔ میں نے کئی ایک سے سنا ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو بہوئیں بنا کر لے آئے ہیں۔ پیسا تو سب کا ایمان ہے مگر یہ ان کو پوجتے ہیں۔ میرا سکھوں سے بہت پالا پڑھا۔ مسلمانوں کے ساتھ بہت اچھے ہیں اور یہی چیز ہمیں ایک دوسرے کے قریب رکھتی ہے۔ سب لوگ ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ مذہبی اور رکھ رکھاؤ والے بھی بہت ہیں۔ گرمیوں میں ان کے بابے بوڑھے کسی نہ کسی پارک میں بیٹھے لیڈو کھیلتے نظر آتے تھے۔ اپنے پنجاب کو مقدس سمجھتے ہیں اور اپنے گاؤں کا نام لے کر سوچوں میں پڑ جاتے ہیں۔

کاکا ایک گھنٹے سے ہمیں انتظار کروا رہا تھا۔ ہم بلونت سنگھ کی باتوں میں اتنا کھوئے کہ سردی کا احساس بھی نہ رہا تھا۔ سر، کان، گردن اور جسم ہم نے ڈھانپ رکھے تھے۔ بلونت سنگھ تین بیئر چڑھانے کے بعد ذرا اور کھل کھلا کر بولا تھا۔ شہباز بھی ٹیسٹ کی ناکامی بھول کر بلونت سنگھ کو زیادہ چھیڑ رہا تھا۔ اتنے میں کاکا ایک لشکتی گاڑی میں آیا۔ کلین شیو اور سنجیدہ مزاج کے "کاکا" نے ہمیں بڑی عزت سے اپنی گاڑی میں بٹھایا۔ وہ عرصے سے یہاں کینیڈا میں تھا اور اس پر سے لدھیانہ کا رنگ اتر چکا تھا۔ آدھے گھنٹے میں ہمیں وہ باہر نکل کر بڑی عزت سے اپنی گاڑی سے اپارٹمنٹ کے آگے اتار رہا تھا۔ بعد میں بھی بلونت سنگھ کے ساتھ ایک دو بار جاب پر ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ہفتے میں ستر گھنٹے کام کر کے ڈالر بنا کر لدھیانہ میں اور زمین خریدنے کے چکر میں تھا۔

اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ سرجی پردے کھسکائے باہر دیکھے جا رہے ہیں اور گرم جیکٹ، اونی ٹوپی بھی اوڑھ رکھی ہے۔ پوچھا کہ کیا دیکھا جا رہا ہے؟ تو منمنانے لگے۔ "باہر سردی دیکھ رہا ہوں۔"

شہباز بولا۔ "تو اسی لیے یہ جیکٹ چڑھائی ہوئی ہے؟"

اس پر وہ گویا ہوئے۔ "ہاں۔ باہر سردی بہت ہے۔ اسی لیے تو جیکٹ پہنی ہوئی ہے۔"

حالانکہ ہم اندر سنگل شرٹ میں بیٹھے ہوتے ہیں باہر منفی پچاس درجۂ حرارت ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہاں سرجی باہر کی سردی کو اندر بیٹھے محسوس کر کے کانپتے جا رہے تھے۔ ہمیں بہت بھوک لگی تھی اور سرجی نے مٹر قیمہ بنایا تھا۔ ہم لوگ کھانا ہی کھا رہے تھے کہ خان قیصر دندناتا ہوا نازل ہوا۔ اس کی فیملی پاکستان سے کل آ رہی تھی اور وہ شور مچا کر شہباز سے گالم گلوچ کرنے لگا اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔ تبھی اچانک اس کی نظر سرجی پر آ رکی۔

سرجی کو دیکھتے ہی وہ بولا۔ "یہ کیا ہے مطلب یہ کون ہیں۔" وہ سر جھکائے کھانا کھا رہے تھے قیصر کی آواز پر سہم کر سمٹ گئے۔ خان کا ہمارے ہاں آنا جانا رہتا تھا اور اب اس سے بے تکلفی بھی ہوگئی تھی۔ میں نے اس کو اشارے میں کہا کہ تمیز کے دائرے میں رہے اور پھر سرجی کا مختصر تعارف ہوا۔

خان نے ایک طرح سے انہیں اٹھا کر گلے سے لگایا اور پھر جیسے ان کو احتیاط سے پلیٹ کے ساتھ رکھ دیا پھر بولا۔ "کینیڈا کا ایک اور شکار۔" اور پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔ ہنستے ہوئے ہی اپنے لیے دو روٹیاں کچن سے گرم کر کے لایا اور قیمہ مٹر پر جت گیا۔

خان کی ہنسی پر ہمیں ہنسی آتی تھی، ایسے کہ اس کی دس بار کی کھی کھی جمع کر لیں تو ایک قہقہہ بنتا ہے۔ اس کو آدھا کر لیں تو سمجھیں کہ خان ہنسا ہے اور اس کی ایک کھی کو خان کا مسکرانا کہتے ہیں۔

شہباز اس سے کہہ رہا تھا۔ "خان یاد رکھنا۔ اگلے ویک اینڈ پر تمہارے گھر افطاری ہے۔ ورنہ فرنیچر کا بھانڈا پھوڑ دوں گا کہ کسی کالے سے لیا ہے۔"

خان آج ہواؤں میں اڑ رہا تھا کیونکہ اس کے بچے کل آ رہے تھے بولا۔ "بکواس نہ کر۔ کہہ جو دیا کہ اگلے ویک اینڈ پر میرے گھر پر کڑاہی بنے گی۔"

ہم اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق کر کے اپنا دل خوش کر رہے تھے۔ خان اس رات ہمارے ہاں ہی سو گیا کیونکہ کل اس نے یہیں سے ایئرپورٹ جانا تھا اور سامان ہمارے اپارٹمنٹ میں رکھنا تھا جسے خان کے اپارٹمنٹ میں شفٹ کرنے کی ذمہ داری ہماری تھی۔

میری عینک کے شیشے فریم سے نکل آئے تھے اور پڑھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میری نزدیک کی نظر ٹھیک تھی مگر شمشال کے ٹریک پر مجھے محسوس ہونا شروع ہوا تھا کہ جب میں ڈائری لکھتا ہوں تو الفاظ ناچتے ہیں اور دھندلے پڑتے ہیں۔ میں عینک پاکستان سے لایا تھا۔ کینیڈا میں عینکوں کے کاروبار کا ایک بہت بڑا سلسلہ ہے۔ پورے کینیڈا میں اس کے ایک سو پچاس اسٹور ہیں۔ حکیم آپٹیکل کا نام دیکھا تو اندازہ ہوگیا کہ کوئی مسلمان ہی اس کا مالک ہو سکتا ہے اور بعد میں میرے اندازے کی تصدیق بھی ہوگئی۔

کریمی حکیم ایران سے ساٹھ کی دہائی کے شروع میں کینیڈا آیا تھا۔ وہ عینکوں کے شیشے بنانے کا فن جانتا تھا۔ پہلے اس نے عدسے بنا کر دکانوں پر خود جا کر بیچنا شروع کیے۔ پھر

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اپنی ایک دکان کھولی اور نہایت کم قیمت پر عدسے اور فریم بیچنے لگا۔ دن رات کی محنت رنگ لائی کہ ٹورنٹو کے ہر اہم چوک پر اس کی شاخیں قائم ہو گئیں۔

میں اور سر جی۔ اپنے آپ کو اوڑھے۔ لپیٹے اب حکیم صاحب کی ایک دکان میں کھڑے تھے۔ ایک لڑکی اپنے چہرے سے بہت بڑا فریم لگائے ہمیں پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔ سر جی ہمیشہ زیرِ لب ایسے بولتے ہیں جیسے آپ کی منت سماجت کر رہے ہوں۔ اس دن بھی دکان میں بڑی بڑی الماریوں میں سجے شوکیسوں میں سجے فریموں کو ایک نظر دیکھ کر لڑکی کو کن اکھیوں سے تاڑ رہے تھے۔ آہستگی سے اپنا منہ میرے کان کے پاس لا کر اپنے انداز سے بولے۔ ”سر جی۔ یہاں کی لڑکیاں بہت خوبصورت ہیں! قسم سے دل لگا رہے اگر اتنی سردی نہ ہو۔“

مجھے ان کی بات بالکل سمجھ میں نہ آئی کہ دل لگنے کا سردی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ ان کی اکثر بات کا واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ان کی بات کو سنی ان سنی کر کے کاؤنٹر پر اپنی عینک کا فریم اور عدسے رکھ دیے اور پوچھا۔ ”اس کو ٹھیک کروانے پر کتنا فالتو خرچ ہو گا۔“ مجھے کل آرامشین کا چیک مل گیا تھا اور بہتر ڈالر کمائی کی بہت سی مبارک بادیں بھی وصول کر چکا تھا۔ اب ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ بہتر ڈالر یہ لڑکی مجھ سے ہتھیا نہ لے مگر اس نے فریم دیکھ کر کہا کہ یہ تو میں مفت میں ٹھیک کر دوں گی۔

سر جی پھر سے اپنا منہ میرے کان کے پاس لائے۔ ”سر جی...... یہ خوبصورت ہونے کے علاوہ رحمدل بھی ہے۔ کیا سب ایسی ہی ہوتی ہیں؟“

اگر میں سر جی کی ہر بات کا جواب سوچ سمجھ کر دیتا تو ارسطو ضرور بن گیا ہوتا کیونکہ ارسطو نے کبھی اتنا نہ سوچا ہو گا جتنا اپنے سر جی مجھے سوچنے پر مجبور کر رہے تھے۔

وہاں سے نکلے تو باہر ویرانگی تھی۔ یخ بستہ ہوا کے جھونکے ہمیں کپکپا رہے تھے۔ سر جی کسی کمزور لرزتی ٹہنی کی مانند کانپنے لگے، ایک تو وہ خود منحنی سے تھے اور پھر یہ برفانی جھکڑ ہم دونوں کو اڑا لے جانے کی کوشش میں تھا۔ ساتھ ہی ایک بڑا اسٹور، ڈومینین تھا۔ ہم سردی سے گھبرا کر اس میں جا گھسے۔ اندر کا گرم اور آسودہ ماحول ملا تو ہمیں کچھ قرار نصیب ہوا۔ ہم پھر سے باہر کے برفانی ماحول کو بھول کر اس سپر اسٹور کے جگمگاتے ماحول میں کھو گئے۔

شیشے کی بڑی بڑی الماریوں کے پیچھے نفاست سے کھانے پینے کی اشیا رکھی تھیں۔ سامان کی مقدار اور میعار، دونوں گلائی اسٹور سے کہیں بہتر تھا مگر قیمتیں آسمانوں کو چھو رہی تھیں۔

ہمیں ایک لڑکی نے روکا اور ہم دونوں ٹھہر سے گئے۔ میرا ایمان بھی لرزنے لگا اور جبر کے رسے جو میں نے اپنے وجود پر باندھ رکھے تھے۔ وہ ٹوٹنے لگے۔ سر جی بے ہوش ہونے کو آ گئے تھے۔ ایک مکمل حسن کا نمونہ ہمارے سامنے کھڑی متواتر مسکرائے چلی جا رہی تھی۔ دماغی توازن بھی اس کا درست لگ رہا تھا کیونکہ مجھے ایک لمحے کو شبہ ہوا کہ یہ حور پری ہم جیسے بوکھلائے ہوئے بدیسیوں کو دیکھ کر اتنی واری کیوں جا رہی ہے؟ سیاہ اسکرٹ، سفید شرٹ اور کھلے ہوئے سنہری بال جو اس کے کندھوں پر آ کر ٹھہر سے گئے تھے اور نیلی مسکراتی آنکھیں ہم پر جم سی گئی تھیں۔ ہم دونوں مکمل گنگ تھے۔ وہ والہانہ پن سے بولی۔ ”کیا آپ کو یہاں کا کریڈٹ کارڈ بنوانا ہے؟“ اور یہ بول کر مصافحے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

سر جی نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لیا اور کچھ وقفے کے بعد اس نے نہایت احتیاط سے وہ ہاتھ میرے سپرد کر دیا۔ وہ مرمریں ہاتھ میرے قبضے میں آیا تو میں نے جلد چھوڑ دیا کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ اس کا ہاتھ چھوڑ کر میں اب اس کی نیلی اور شفاف آنکھوں میں جھانکتا تھا جو مسلسل مسکرائے چلی جا رہی تھیں۔ سر جی نے کاؤنٹر کا سہارا لے کر اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا۔

ہم دونوں فوراً کریڈٹ کارڈ بنوانے پر رضا مند ہو گئے اور وہ ہمیں ایک کاؤنٹر پر نہایت ہی عزت اور احترام سے لے گئی۔ وہاں پہلے وہ ہمیں اپنی مترنم آواز میں سمجھاتی رہی کہ اس کارڈ کے کیا کیا فوائد ہیں۔ آپ جتنی شاپنگ یہاں سے کریں گے اس کے آپ کو کتنے پوائنٹ ملیں گے۔ اس کے علاوہ اور بھی ترغیبیں دیتی رہی اور ہم بھی اپنے ہتھیار ڈالتے چلے گئے۔ اگلا مرحلہ فارم پُر کرنے کا آیا تو SIN نمبر اس نے مانگا کہ ہمارے یہاں کا کریڈٹ چیک کرے۔ سر جی یہیں ناک آؤٹ ہو گئے کیونکہ ان کا یہ ٹیکس نمبر ابھی آیا بھی نہ تھا۔ میں نے اپنا ٹیکس نمبر دیا اور اس نے ایک کمپیوٹر میں میرے کوائف ڈالے نتیجتاً کمپیوٹر نے جو کچھ بتایا تو حیرت اس کے چہرے پر ابھری۔ پھر وہی حیرت میرے چہرے پر منتقل ہو گئی۔ خود مجھے بھی یقین نہ آیا تو میں اسکرین پر مزید جھک گیا، ایسا کیسے ہو گیا، میرا دل دھڑکنے لگا۔

(باقی آئندہ)

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

جہنم کدہ

شکیل صدیقی

وہ دونوں فلم کی شوٹنگ کے لیے آتش فشاں کے دہانے میں اترے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہیلی کاپٹر ان کو جس طرح نیچے لے گیا ہے اسی طرح اوپر لے آئے گا مگر قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔

زندگی اور موت کی رسہ کشی پر مبنی واقعہ

گزشتہ ایک ہفتے سے ہوائی آتش فشاں قومی پارک میں بارش ہو رہی تھی۔ ہالی ووڈ سے ایک فلمی یونٹ وہاں شوٹنگ کے لیے آیا ہوا تھا مگر اسے آتش فشاں کے بارے میں بہت کم معلوم تھا، بہرحال انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا، ہفتے کے دن مائیکل بینسن نے کہا۔ ”سب لوگ تیاری کر لیں، بس اب چلتے ہیں۔“

پچاس سالہ بینسن اس لیے ہوائی آیا ہوا تھا تاکہ فلم کا پس منظر فلمبند کر سکے۔ اس کے ساتھ 31 سالہ کیمرا مین ایلینین

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کرس ڈوڈی اور ہیلی کوپٹر پائلٹ کریگ ہوسکنگ بھی تھا۔ انہوں نے منصوبہ بنایا تھا کہ نیچی پرواز کر کے منظر کو فلمبند کریں گے اور اس کے بعد ایک خاص کیمرے سے آتش فشاں کے عمیق ترین حصے کو فلمائیں گے۔

انہوں نے فلمبندی کے لیے جس لوکیشن کا انتخاب کیا تھا وہ خطرناک تھی۔ اس کے نچلے حصے سے دھواں اٹھتا رہتا تھا۔ جب اس کا موڈ ہوتا تھا وہ لاوا اگلنا شروع کر دیتا تھا۔ گزشتہ دس برسوں کے دوران اس آتش فشاں نے گرد و پیش کے کئی قصبوں کو تہس نہس کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ سمندر میں گرنے والے لاوے سے کافی طویل خطۂ زمین حاصل ہو گیا تھا، اس لیے کہ لاوا وہاں جم چکا تھا۔ یہ آتش فشاں ایک جزیرے پر واقع تھا۔

ان دنوں آتش فشاں سویا ہوا تھا اور اس کی گہرائی جو تقریباً تین بال گراؤنڈ کے برابر تھی کسی پتھریلے فرش جیسا بن گیا تھا، لاوے نے جم کر یہ صورت اختیار کر لی تھی۔ آتش فشاں کی فلمبندی سے پیشتر بینسن نے اپنے ہیلی کوپٹر اور ساتھیوں کا بیمہ کرا لیا۔

جزیرے پر کچھ آبادی بھی تھی۔ اس آبادی کے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ جزیرہ ایک دیوی کے قبضے میں ہے جس کا نام مادام اپیلا تھا۔ وہ لفظوں سے اس کی جو تصویر کھینچا کرتے تھے وہ کچھ یوں تھی کہ دیوی کی آنکھیں ہمہ وقت شعلے برساتی رہتی ہیں، بال لاوے کی طرح سیاہ ہیں اور اسے شراب پینا پسند ہے۔ چنانچہ بینسن نے تو ہم پرست نہ ہونے کے باوجود ہیلی کوپٹر میں شراب کی ایک بوتل رکھ لی۔ ”ہمیں تھوڑی دیر کے لیے ایسا ہی بہتر موسم درکار ہے۔“ وہ بولا۔ ”اُمید ہے کہ اپیلا دیوی بھی ہم سے تعاون کرے گی۔“

جب پائلٹ ہوسکنگ نے ہیلی کوپٹر کو آتش فشاں کے دھواں دیتے دہانے کے اوپر گھمایا اور پھر دیوی کو نذرانہ پیش کرتے ہوئے شراب کی بوتل دہانے میں اچھال دی۔ ”دیوی نے جان لیا ہوگا کہ ہم یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔“

دھواں دیتے اس دہانے پر ہوسکنگ نے کوپٹر سے ایک چکر لگایا تو بینسن نے اس کی فلمبندی کی۔ پھر دہانے کے فرش کی طرف کیمرا گھمایا۔ ”ہمارا کام خوش اسلوبی سے ہو گیا ہے، لیکن میں ایک بار پھر فلمبندی کر لوں تو چار چاند لگ جائیں گے۔“ وہ بولا۔

فلمبندی کے دوران کام میں خوب صورتی پیدا کرنے کے لیے بینسن دو یا تین شاٹ لینے کا عادی تھا۔ اس سے پہلے وہ ”ٹرمینیٹر II“ اور ”پیٹریاٹ گیمز“ نامی فلموں میں اپنی عکس بندی کے جوہر دکھا چکا تھا۔ دراز قامت، بھورے بال اور نیلی آنکھوں والے بینسن کو معلوم تھا کہ اس کے پاس کام کرنے والوں کی ایک اچھی اور تجربے کار ٹیم ہے۔ ڈوڈی تقریباً چالیس فلموں میں اپنے جوہر دکھا چکا تھا۔ اس کے بارے میں فلم انڈسٹری میں مشہور تھا کہ وہ بہترین پائلٹ ہے۔

ساڑھے گیارہ بجے کے قریب وہ آتش فشاں کے اوپری کنارے کے پاس سے گزرے جو کوپٹر سے تین سو فٹ کے فاصلے پر تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے ڈوڈی نے شراب کی بوتل اندر پھینکی تھی۔ اچانک پینل بورڈ پر انتباہی روشنی جلنے بجھنے لگی۔ ہوسکنگ نے کہا۔ ”ہمارا فیول ختم ہو رہا ہے، لہٰذا اب ہم نیچے جا رہے ہیں۔“

وہ ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے نیچے جا رہے تھے۔ ان کے بائیں جانب ایک چھوٹے سے تالاب کی شکل میں سرخ لاوا کھول رہا تھا۔ گویا وہ مکمل طور پر آتش فشاں کے اندر پہنچ چکے تھے۔ دھویں کے مرغولوں کے درمیان ہوسکنگ ایسا سطح مقام تلاش کر رہا تھا جہاں کوپٹر کو لینڈ کر سکے۔ خوش قسمتی سے وہ لاوا کے اس تالاب نما جگہ سے دور تھا جسے وہ پہلے دیکھ چکے تھے۔ کوپٹر کو سنبھالنے کے چکر میں اس نے انجن کو اٹھایا تو اس کا افقی گردش والا پر ایک بڑے گول پتھر سے ٹکرا گیا۔ اس طرح..... وہاں سے نکلنے کی کوشش ناکام رہی اور وہ مزید چند فٹ نیچے چلا گیا۔ کوپٹر کی دم ٹوٹ گئی، بیٹریاں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں اور ریڈیو خاموش ہو گیا۔

اندر سلفر ایسڈ کے مرغولے اٹھ رہے تھے اور ان کا دم گھٹ رہا تھا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے۔“ بینسن نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ”ورنہ ہم مر جائیں گے۔“

نزدیکی لاوا کے تالاب سے گہرے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ ان کے پاؤں کے نیچے والی چٹان غالباً پتلی تھی اس لیے ان کے پاؤں گرم ہونے لگے۔ ”میرا خیال ہے کہ جہنم کی گرمی اس سے کم ہوگی۔“ ڈوڈی نے سوچا۔

بیس فٹ کے بعد کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہیں اچھی طرح سے معلوم تھا کہ کوئی انہیں فضا سے نہیں دیکھ سکتا۔ ویسے بھی کوئی ایک گھنٹے تک انہیں تلاش نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ انہیں ایک گھنٹے بعد واپس آنا ہوگا۔ اگر وہ اس وقت تک واپس نہیں جائیں گے تب ہی کسی کو تشویش ہوگی۔ ”ہمیں گرد و پیش میں بھی گھومنا چاہیے۔“ ہوسکنگ نے کہا۔

ڈوڈی کی معیت میں آگے بڑھے تو انہیں اوپری

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کنارے سے نیچے تک چٹانوں سے ایک ٹیڑھا میڑھا راستہ نظر آیا۔ جو تقریباً تین سو فٹ لمبا تھا۔ وہ چٹانوں پر قدم جما جما کر چڑھنے لگے۔ جوش خروش کے جذبے کے تحت انہوں نے پندرہ منٹ میں تقریباً نصف فاصلہ طے کر لیا۔ مگر پھر ان پر تھکن غالب آنے لگی اور جو قدم وہ آگے جانے کے لیے اٹھاتے تھے وہ انہیں پیچھے لے آتا تھا۔ جب ڈھلوان بڑھ گئی تو ان کے گھٹنے ٹیڑھے ہونے لگے اور وہ چاروں ہاتھوں پاؤں سے رینگنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ گرم اور خاکستری راکھ تھی جس پر قدم جمانا دشوار تھے۔ اس معاملے میں ہوسکنگ ان کی رہنمائی کرتا رہا کہ خشک لاوے پر وہ کیسے چڑھیں۔

بالآخر ڈوڈی ایک بڑی چٹان کے قریب پہنچ گئے جس نے راستہ مسدود کر رکھا تھا۔ یہ چٹان آگے کی طرف جھکی ہوئی تھی۔

''میں اب آگے نہیں جا سکتا۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ اس راستے سے نہ آؤ۔'' وہ ابھی پچاس فٹ نیچے تھے۔

بینسن اور ہوسکنگ دائیں جانب مڑ کر اپنے لیے دوسرا راستہ تلاش کرنے لگے۔ ''تم یہاں بیٹھو۔ میں نیچے جا رہا ہوں۔'' ہوسکنگ نے کہا۔ ''میں کوپٹر کے ریڈیو کی مرمت کرنے کی کوشش کرتا ہوں، ممکن ہے بات بن جائے۔''

''مگر وہاں نہ جاؤ۔ وہاں تمہارا دم گھٹ سکتا ہے۔''

''یہاں ہم زیادہ بیٹھ نہیں سکتے، گر جائیں گے۔ باہر جو گیس پھیلی ہوئی ہے۔ وہ ہمارا دم بھی گھوٹ سکتی ہے۔ ہماری آخری اُمید نیچے جانا ہی ہے۔ مگر ابھی صرف میں جاؤں گا۔'' اس نے کہا اور دھوئیں کے مرغولوں میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

آتش فشاں کے فرش تک پہنچنے کے بعد ہوسکنگ کے لیے سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ ہائڈروجن سلفائڈ اور سلفر ڈائی اوکسائڈ سے لڑنا اس کے بس کی بات نہیں تھی، چنانچہ اس نے اپنی قمیص پھاڑ کر ناک پر باندھ لی تا کہ گیس فلٹر ہو کر ناک میں پہنچے۔

اس نے کیمرے سے بیٹری علیحدہ کر لی۔ اس نے سوچا ممکن ہے اس سے ریڈیو چل جائے۔ جب اس کا سانس رکنے لگتا تھا وہ چٹانی ڈھلوان کی طرف چلا جاتا تھا۔ پھر وہ واپس آتا اور کام کرنے لگتا۔

بالآخر اس کی محنت رنگ لائی اور ایک ننھا سا جھما کا ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ بجلی کا سرکٹ جڑ گیا ہے۔ ''ہیلو،

میں ڈی تھری بول رہا ہوں۔ اگر کوئی جہاز یا کوپٹر فضا میں ہو تو اسے آتش فشاں کی طرف بھیجو۔ ہم مصیبت میں گرفتار ہیں۔''

''مگر تم کہاں ہو؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''آتش فشاں کے اندر۔'' ہوسکنگ نے جواب دیا۔ ''کوپٹر اڑنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ بہرحال ہم سے کوئی زخمی نہیں ہوا ہے۔ لیکن ہم اتنی بلندی تک نہیں چڑھ سکتے۔''

''ٹھیک ہے، ایک کوپٹر تمہاری طرف بھیجا جا رہا ہے۔'' دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔

ہوسکنگ نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو بتایا۔ ''رابطہ ہو گیا۔ وہ ایک کوپٹر ہماری مدد کے لیے بھیج رہے ہیں۔''

بینسن اور ڈوڈی کو اس کی آواز سنائی دی نہ ہی وہ دھوئیں کے مرغولوں کی وجہ سے اس کی شکل دیکھ سکے۔

☆......☆

ڈیڑھ بجے کے قریب ڈون شیرون کو ریڈیو پر بتایا گیا کہ ایک کوپٹر آتش فشاں میں گر پڑا ہے اور کچھ لوگوں کی اسے جان بچانا ہے۔

شیرون کے پاس کوپٹر ایجنسی تھی اور وہ مشکل میں گرفتار لوگوں کی مدد کیا کرتا تھا۔ وہ ابھی تک اس جاگتے آتش فشاں کی طرف نہیں گیا تھا اس کے باوجود اس نے کوپٹر کے ٹینک میں فیول بھرا اور جزیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

کال ملنے کے ایک گھنٹے کے بعد وہ اس جزیرے کے نزدیک پہنچ گیا۔ وفتاً ریڈیو پر اسے ہوسکنگ نامی ایک شخص کی آواز سنائی دی۔ ''ہم مصیبت میں ہیں ہماری مدد کی جائے۔''

اس کی آواز سے پتا چلتا ہے کہ یہ مصیبت میں ہے۔ شیرون نے سوچا۔ ''میں اندر آ رہا ہوں۔'' اس نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

ہوسکنگ نے سوچا میں بچ جاؤں گا۔ مگر میرے ساتھیوں کا کیا ہوگا؟ اسے خیال آیا کہ جب اس کی جان بچ جائے گی تو پھر ان کی جان بھی بچانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

شیرون کوپٹر کو لے کر اندر چلا گیا۔ دھوئیں کے مرغولوں کے باعث اسے کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ ''تم کہاں ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''اپنی دائیں جانب دیکھو۔'' ہوسکنگ کی آواز ریڈیو پر سنائی دی۔

شیرون نے نظریں دوڑائیں تو اسے تیس فٹ کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

فاصلے پر ایک کوپٹر دکھائی دیا۔
''میں تمہارے نزدیک آرہا ہوں۔'' اس نے ہوسکنگ سے کہا۔ ''آواز کی سمت آجاؤ۔''
ہوسکنگ دوڑتا ہوا اس طرف گیا۔ پھر جیسے ہی کوپٹر نیچے آیا، وہ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ مشکل ہی سے سانس لے پا رہا تھا۔ شیرون نے کوپٹر کو اٹھانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد وہ رفتہ رفتہ آتش فشاں سے باہر آگیا۔ ہوسکنگ کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آگئے۔ وہ شیرون سے لپٹ گیا۔ کوپٹر وہاں سے نکلنے لگا تو اس کے دونوں ساتھیوں نے دیکھا لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک اور کوپٹر وہاں کہاں سے آگیا۔ جب ان دونوں کو بھی گھٹن محسوس ہونے لگی تو انہوں نے اپنی قمیصیں اتار کر چہرے پر لپیٹ لیں تاکہ فضا میں پھیلی ہوئی زہریلی گیس کے اثرات کم سے کم ان تک پہنچ سکیں۔
انہوں نے ہوسکنگ کو آوازیں دیں، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ''کیا وہ مر گیا؟'' ڈوڈی نے بڑبڑانے والے انداز سے کہا۔
''ایسی جگہ پر کوئی زندہ سلامت رہ بھی تو نہیں سکتا۔'' بینسن نے تبصرہ کیا۔
ڈوڈی مایوسی سے اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ معلوم نہیں وہ زندہ بچے گا یا نہیں۔ اسے اپنے دونوں بچے یاد آنے لگے۔ اس نے دعا مانگنا شروع کر دی کہ خدا انہیں اس سے ملا دے۔ پھر ایک ایک کر کے اسے خاندان کے سارے افراد کی یاد آنے لگی۔

☆......☆

اس علاقے کی رینجرز کے دو سپاہی جیفری جوڈ اور نیل ایکانا بھی آگئے۔ وہ اسی ڈھلوانی راستے پر تھے مگر کام کرنا دشوار تھا۔ اس لیے کہ چار فٹ کے فاصلے کی چیز نظر نہیں آرہی تھی۔ نیچے سے اٹھنے والے دھویں کے مرغولوں سے انہیں اپنی سانس سینے میں رکتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس صورتِ حال میں وہ کسی کو بچاتے تو کس طرح؟ انہوں نے اپنے گیس ماسک پہن لیے۔
اکانا نے ایک میخ ٹھونک کر رسی کا گولا گہرائی میں پھینکا اور پھر اس کے سہارے نیچے جانے لگا۔ جوڈ اور دوسرے فائر مینوں نے احتیاطاً رسی کا وہ سرا تھام لیا۔ کیونکہ میخ کسی وقت بھی زمین سے نکل سکتی تھی۔ اکانا چیخا۔ ''ہم بہت سی رسیاں پھینک رہے ہیں اگر تم لوگوں کو کوئی رسی دکھائی دے تو اسے پکڑ لو۔ ہم تمہیں کھینچ لیں گے اور اس جہنم سے نکال لیں گے۔''
ڈوڈی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ چیخا۔ ''ہم یہاں نیچے ہیں۔''
اکانا کے ہاتھ میں نارنجی رنگ کی جو رسی تھی وہ اسے بار بار آواز کی سمت پھینکتا رہا مگر وہ ڈوڈی کے قریب سے ہو کر بھی نہیں گزری۔ وہ جتنی بار بھی چیخا اس سے اکانا کو قطعی اندازہ نہ ہوا کہ وہ کس مقام پر ہے۔ جب کہ بینسن کی سماعت تک اکانا کی آواز ہی نہیں پہنچی تھی۔
ہوسکنگ رینجرز کے پاس پہنچ گیا، جو اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور تاریکی ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لینے والی تھی۔ وہ اپنے کیمپ میں پہنچ گئے اور آیندہ کے لیے نیا لائحہ عمل تیار کرنے لگے۔

☆......☆

بینسن اور ڈوڈی ڈھلان پر چل رہے تھے کہ اچانک بارش ہونے لگی۔ تھوڑی دیر میں ان کے جسم کانپنے لگے۔ درجۂ حرارت میں کمی واقع ہوگئی۔ ڈوڈی کو خوف کی ایک لہر نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس نے بینسن سے کہا۔ ''اگر ہم اس ڈھلوان سے چھلانگ لگا دیں؟''
''ایسا نہ کرنا، دماغ کو قابو میں رکھو۔ تم خودکشی کی طرف کیوں مائل ہو؟''
بینسن کے اعتماد سے ڈوڈی کو حوصلہ ہوا۔ اس نے سوچا اس کا ساتھی کا ارادہ مستحکم ہے تو اسے بھی اپنا دل مضبوط رکھنا چاہیے۔

☆......☆

اتوار کی صبح شیرون نے اپنے کاپٹر کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ آتش فشاں کے زہریلے مرغولوں نے کاپٹر کے پنکھوں کو زنگ آلود کر دیا ہے۔ چنانچہ اس نے کوپٹر کو ایک طرف کھڑا کر دیا۔
اس کی بینائی بھی متاثر ہو چکی تھی، لہٰذا وہ باقی افراد کی مدد کو نہ جا سکا۔
ادھر، اس جہنم کے دہانے میں مقید ڈوڈی نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی، رات کے تین بج رہے تھے۔ ''میں ساری رات یہاں اس طرح سے نہیں بیٹھ سکتا۔ اس لیے میں ڈھلان پر چڑھ رہا ہوں۔'' اس نے اپنے ساتھی بینسن سے کہا۔
''اوکے، گڈ لک۔'' اس نے جواب دیا۔
ڈوڈی ٹٹولتا ہوا بڑھنے لگا۔ وہ چٹانوں کے رخنوں میں انگلیاں پھنسا کر جسم کو اوپر دھکیل رہا تھا۔ جب وہ چٹان ختم ہوئی تو یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ اب اسے تقریباً چالیس فٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

آگے جانا ہے۔ تھوڑی دیر میں کچھ فاصلہ اور تمت گیا۔ مگر وہاں چکنے چھوٹے پتھر اور ریت پڑی تھی جو مزاحم ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر اس مرحلے پر ہار مان لی تو وہ موت کی نیند سو جائے گا۔ چنانچہ آگے بڑھنا جاری رکھا جائے۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ بجری میں ڈال دیے۔ اس کے بعد طاقت لگا کر اٹھا اور اس نے اپنا پیٹ آتش فشاں کے گڑھے کی لگر (کنارے) پر رکھ دیا۔ پھر وہ وہاں سے باہر نکل آیا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ اس نے یہ کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ اس نے بینسن کو مخاطب کر کے کہا۔ ''میں یہاں سے نکل آیا ہوں۔ انہیں پتا چل جائے گا کہ تم کہاں ہو۔''

چنگھاڑتی ہوا کی آواز میں بینسن کو سنائی نہیں دیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

وہ جب آتش فشاں کی مخروطی جگہ سے نکل آیا تو اس نے عملے کے چند افراد کو نزدیک کھڑے پایا۔ ''میرا ساتھی تقریباً ڈیڑھ سو فٹ نیچے ہے۔ اس رسی کے دائیں جانب۔ تم اسے باہر نکالو۔''

رینجرز نے احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہوئے غذا، پانی کپڑوں کے تھیلے گرا دیے۔ انہیں امید تھی بینسن کو ان میں سے کوئی نہ کوئی تھیلا ضرور مل جائے گا۔

بینسن کو صبح کی ہلکی روشنی میں کچھ ڈبے پڑے نظر آئے۔ وہ غذا کا ڈبا تھا۔ اس کا رواں رواں مسرت سے کھل اٹھا۔ ساتھ ہی اسے تاسف ہوا کہ یہ سب اسی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اگر وہ پہلے شاٹ پر مطمئن ہو جاتا تو یہ نوبت نہ آتی۔

ان چیزوں کے استعمال کے باوجود تیسرے دن اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس لیے کہ پانی ختم ہو گیا تھا۔ جب بارش ہوئی تو وہ منہ کھول کر کھڑا ہو گیا، تاکہ بوندوں سے سیراب ہو سکے۔

وہاں چکرانے والے گیس کے مرغولوں نے اس کے دماغ پر اثر ڈالا۔ اسے محسوس ہوا کہ مادام اپیلا کا ہیولہ اسے دکھائی دینے لگا۔ وہ اپنی زبان لپلپا رہی تھی جیسے اسے ہڑپ کرنا چاہتی ہو۔ ''تم مجھ پر قابو نہیں پا سکتیں مادام!'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔''

پھر اس نے خدا سے دعا مانگی کہ موسم اور روشنی کا انتظام بہتر کر دے تاکہ اسے تلاش کرنے والے اس کی جان بچا سکیں۔

☆......☆

ٹام ہامپٹن ایک اچھا پائلٹ تھا، فلمی عملے نے اس کی خدمات حاصل کر لیں۔ پیر کی صبح اس نے رینجرز کے سپاہی جوڈ کو معاون پائلٹ کی حیثیت سے ساتھ لیا اور آتش فشاں کی طرف پرواز کرنے لگا۔

بینسن کو جب بھاری آواز سنائی دی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اچانک تھوڑی دیر کے لیے مطلع صاف ہو گیا تھا۔ اسے آسمان پر ایک کوپٹر اڑتا نظر آیا۔ اس کے منہ سے مسرت آمیز چیخیں نکلیں اور مجنونانہ انداز میں ہاتھ ہلانے لگا۔ جواباً پائلٹ نے بھی ہاتھ ہلا دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اسے دیکھ چکا ہے۔

وہ تھوڑی دیر کے لیے نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ مگر پھر پائلٹ کے لاؤڈ اسپیکر سے کہا گیا کہ ہم تمہارے لیے حفاظتی جال پھینک رہے ہیں۔ اس کے سہارے تم اوپر آ سکو گے۔

بینسن کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

ہامپٹن نے ہیڈ کوارٹر کو اس جگہ سے آگاہ کیا جہاں اس نے بینسن کو دیکھا تھا۔ وہ کوپٹر کو گڑھے تک لے گیا۔ آتش فشاں سے اب بھی دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے اس لیے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے جال پھینک دیا۔ اس نے دس منٹ تک انتظار کیا۔ وہ اب بھی خالی تھا۔ بینسن نے اسے دیکھ لیا تھا مگر وہ اس کی پہنچ سے دور تھا۔

دوسری بار کوشش کی گئی تو جال ایک چٹان میں پھنس گیا۔ بینسن نے اسے وہاں سے نکالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس اثنا میں کوپٹر وہاں سے اٹھنے لگا۔ حفاظتی جال اس چٹان سے نکل آیا اور اوپر کو اٹھ گیا۔ بینسن نے مایوسی سے سوچا کہ یہ اس کے لیے آخری موقع تھا۔

لیکن نہیں وہ جال ایک بار پھر اس کے لیے لٹکایا گیا۔ بینسن نے لپک کر اسے تھام لیا۔ ''بالآخر ہم کامیاب ہو گئے۔'' ہامپٹن نے اپنے معاون پائلٹ سے کہا۔

بینسن، ڈوڈی اور ہوسکنگ کے جسموں کا پانی خشک ہو چکا تھا، لیکن وہ جلد ہی صحت یاب ہو گئے۔ بینسن نے البتہ آتش فشاں میں رہنے کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا تھا۔ اس نے وہاں اڑتالیس گھنٹے گزارے تھے۔

اس نے صحت یاب ہونے پر اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ ایک کہاوت کے مطابق ایک بلی کو نو بار زندگی ملتی ہے۔ اگر میں واقعی بلی ہوتا تو اس آتش فشاں میں ایک زندگی بھی گزارنا پسند نہ کرتا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 78/5.L تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

www.paksociety.com

ہم زندہ ہیں

کشمالہ حسن

قلم کار کے قلم میں وہ جادو ہوتا ہے کہ اس کے جھوٹ پر بھی سچ کا گمان ہوتا ہے۔ مختلف زبان کے مشہور مصنفین نے چند ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو سچے لگتے ہیں۔ ایسے ہی چند مشہور کرداروں کا ذکرِ خاص

یہ مصنوعی کردار جنہیں لوگ زندہ کردار سمجھتے ہیں

ہم کرداروں کے حصار میں رہتے ہیں۔

اگر ہم کو لکھنے پڑھنے کا شوق ہے تو کتابوں کے افسانوی کردار ہمیں ہر زمانہ میں اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔

اس میں کمال ان لکھنے والوں کا ہوتا ہے جو ان کرداروں کو زندہ جاوید کر دیتے ہیں۔ ایسی کئی مثالیں سامنے ہیں کہ ان کرداروں کو تخلیق کرنے والوں کے نام تو پس منظر میں چلے گئے لیکن وہ کردار زندہ ہیں۔ اور جب تک

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کہانیاں سنی جاتی رہیں گی خواب دیکھے جائیں گے۔ اس وقت تک یہ کردار زندہ رہیں گے۔

یہ کردار دنیا بھر کے ادب کے کردار ہوتے ہیں۔

مصنف انہیں ایسا روپ دے دیتا ہے کہ یہ کردار حقیقی زندگی کے کردار محسوس ہونے لگتے ہیں۔

آپ جب ان کرداروں کے بارے میں پڑھیں گے تو آپ کو بہت کچھ یاد آجائے گا۔ ان کرداروں کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے، ان کی باتیں، ان کے کارنامے۔ یہ سب آپ کی نگاہوں کے سامنے آجائیں گے۔ آئیں آپ کے جانے پہچانے کرداروں سے ایک بار پھر آپ کا تعارف کرواتے ہیں۔

شرلاک ہومز۔ ایک مشہور کردار۔

ایک تصوراتی سراغ رساں اور معالج۔ سر آرتھر کانن ڈائل کا وہ کردار جو آپ کو زندہ اور متحرک محسوس ہوتا ہے۔

مصنف نے اس کردار کی رہائش لندن میں دکھائی ہے۔ شرلاک ہومز ایک ایسا شخص ہے جو منطقی استدلال کی مدد سے تحقیقات کرتا ہے۔ اس کی پہلی کہانی 1887ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس کے بعد اس کردار کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

شرلاک ہومز کی جانچ پڑتال کی عادت کا پتا اس وقت چلا جب وہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا اور اسی عادت نے اسے آگے پہنچ کر ایک باکمال سراغ رساں بنا دیا۔ سر آرتھر نے اس کردار پر کئی ناولوں کے علاوہ بے شمار افسانے بھی تخلیق کیے ہیں۔

ڈاکٹر واٹسن۔

یہ تو ہو نہیں سکتا کہ شرلاک ہومز کا ذکر ہو اور ڈاکٹر واٹسن کا نہ ہو۔ یہ کردار بھی آرتھر کانن ڈائل نے تخلیق کیا تھا۔

یہ شرلاک ہومز کا گہرا دوست ہے۔ شرلاک کسی کیس کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے ڈاکٹر واٹسن سے بحث بھی کرتا ہے اور دونوں کے درمیان اس کیس کے مختلف پہلوؤں پر گرما گرم بحث بھی ہوتی ہے۔

مصنف کا کمال یہ ہے کہ اس نے ان کرداروں کی تصویری کھینچ کر رکھ دی ہے۔ ان کے حلیے، ان کی عادتیں، ان کے بولنے کے انداز۔ یہ سب کچھ شرلاک ہومز کی کہانیوں میں نظر آجائیں گے۔

ایما (EMMA)

جین آسٹن کے مشہور ناول کی مشہور کردار۔

ایک سیدھی سادی بھولی بھالی سی لڑکی۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں اور جب وہ شرمندہ ہو کر اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتی ہے تو اس وقت اس کردار سے ہمدردی اور محبت ہونے لگتی ہے۔

جین آسٹن کے اس کردار نے ایک زمانے میں پڑھنے والوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور وہ اس کردار کو حقیقی تصور کرنے لگے تھے۔

میڈی بوبری۔

مشہور فرانسیسی ناول نگار فلابیر کے شاہ کار ناول کا کردار۔ یہ ناول اس نام یعنی میڈی بوبری کے نام سے 1856ء میں منظر عام پر آیا تھا۔

اس ناول پر الزامات بھی لگائے گئے۔ کیونکہ اس میں ابتذال کا پہلو نمایاں تھا۔ بعد میں اس ناول اور اس کردار کی مقبولیت جب بڑھ گئی تو پابندی ہٹالی گئی۔

میڈی بوبری ہماری سماج کی ایک بے باک کردار ہے۔ اس نام سے ایک مشہور فلم بھی بن چکی ہے۔

ہیری پوٹر۔

یہ زمانہ اسی کردار کا ہے۔ یہ پوری دنیا کے بچے اس کردار کے دیوانے ہو چکے ہیں۔ یہ تخلیق جے کے رولنگ کی ہے۔ گرچہ اس کردار کے حوالے سے بہت تنقید بھی ہوئی ہے کہ یہ ایک جادوئی کردار ہے۔ جو بچوں پر منفی اثرات پیدا کر رہا ہے۔ اس کے باوجود یہ کردار پوری دنیا میں ہر دلعزیز ہے۔

ٹارزن۔

اب ذکر ہے اس کردار کا جو ایک روزمرہ بن کر رہ گیا ہے۔ وہ دیکھو۔ وہ ٹارزن چلا جا رہا ہے۔

اس کردار نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور آج بھی اس کا فسوں قائم ہے۔ نہ جانے کتنی کہانیاں لکھی جا چکی ہیں۔ کتنے کارٹونز بنائے گئے ہیں اور کتنی فلمیں اس کردار کے گرد گھومتی ہیں۔

ٹارزن ایڈگر واٹس بورس کی تخلیق ہے۔ اس کی پہلی کتاب ''بندروں کا ٹارزن'' 1912ء میں سامنے آئی تھی اور اس کردار نے آتے ہی ایک دھوم سی مچا دی۔

مصنف نے اس کردار کا پس منظر کچھ یوں بتایا ہے۔ جان کلاسٹن نام کا ایک بچہ۔ بحری جہاز پر اپنے والدین کے ساتھ سفر کر رہا تھا اس کے والدین خالص برطانوی تھے۔ راستے میں ایک جگہ جہاز میں لڑائی چھڑ جاتی ہے اور

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

سمندری طوفان کی وجہ سے جہاز بھی تباہ ہو جاتا ہے۔
جان کے والدین مر جاتے ہیں اور یہ بچہ کسی نہ کسی طرح بہتا ہوا افریقا کے ایک ساحل تک آ جاتا ہے جہاں ایک بندر کی نظر اس پر پڑتی ہے۔ وہ اس بچے کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ اس کی پرورش کرتا ہے اور یہی بچہ بڑا ہو کر ٹارزن بن جاتا ہے۔ بہادر، ہمدرد، طاقتور، جنگلی جانوروں کا دوست۔

جانور اس کی چیخ یا پکار سن کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں اس کی یہ چیخ بہت مشہور ہوئی۔ آگے چل کر ٹارزن کو جین نام کی ایک لڑکی مل جاتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ برطانیہ چلا آتا ہے لیکن شہر کی فضا اسے راس نہیں آتی۔ وہ اپنی بیوی کو لے کر دوبارہ جنگل چلا جاتا ہے اور وہ آج تک اسی جنگل میں ہے۔ کیونکہ وہ ایک کردار ہے اور کردار فنا نہیں ہوتے۔

اب ایک اور مشہور کردار کا تعارف ہو جائے۔
یہ صاحب ہیں جیمز بونڈ (007)
فلموں سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص اس کردار سے واقف ہے۔ بہادر، ذہین، پھرتیلا، ہرفن مولا قسم کا خفیہ ایجنٹ۔ جس کی ساری زندگی مار دھاڑ اور حسیناؤں کے درمیان گزری ہے۔

اس کردار کو این فلیمنگ نے 1953ء میں تخلیق کیا تھا۔

اس کردار کی کئی کتابیں اور کئی فلمیں سامنے آ چکی ہیں۔ ڈاکٹر نو، فرام رشیا ود لو، گولڈ فنگر، تھنڈر بال، یو اونلی لو ٹوائس، آئی ہر میجسٹی، سیکرٹ سروس ڈائمنڈز آر نا۔ ایوء اور سب سے آخر میں 2012ء میں اسکائی فال۔
ہر فلم نے بے پناہ کامیابی حاصل کی۔
جیمز بونڈ کا کردار ادا کرنے والوں میں شین کونری اور راجر مور وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

اب کچھ مشرقی کرداروں کی بھی بات ہو جائے۔
مشرقی داستانوں اور کہانیوں نے بھی دنیا کو ایسے کردار دیے ہیں جن کو آپ زندہ کردار کہہ سکتے ہیں۔
امراؤ جان ادا۔
یہ ایک تہذیبی کردار ہے۔ اس کردار کے خالق ہیں مرزا محمد ہادی رسوا۔
ان کی کتاب امراؤ جان ادا نے ادب دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ گرچہ امراؤ جان ایک طوائف ہے لیکن اس کا رکھ رکھاؤ کمال کا ہے۔

وہ ادبی ذوق رکھنے والی ایک خوب صورت عورت ہے جو زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کے بعد کندن بن گئی ہے۔
ہندوستان اور پاکستان میں اس کردار پر کئی فلمیں بن چکی ہیں۔
انارکلی۔
ہمارے یہاں کا ایک مشہور ترین کردار۔ محبت اور قربانی کی مثال۔ اس نے شہزادہ سلیم سے محبت کی اور اکبر کے غصے کا شکار ہو گئی۔
یہ کردار امتیاز علی تاج نے تخلیق کیا تھا۔ پھر یہ کردار جب فلموں کی زینت بنا تو بچے بچے کی زبان پر آ گیا۔ اس کردار پر انارکلی اور مغل اعظم جیسی بے مثال فلمیں بن چکی ہیں۔

اب ایک کردار اور ہے۔ اور وہ ہے سلطانہ ڈاکو۔
کیسی کیسی کہانیاں اس کردار سے منسوب ہو گئی ہیں۔ غریبوں کا ہمدرد۔ ناقابلِ یقین کارنامے انجام دینے والا۔ بہروپ بدلنے کا ماہر۔ ظالم اور بے رحم اس کی دہشت سے امراء آدھے رہ جایا کرتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ویسے یہ کردار کچھ افسانوی ہے اور کچھ حقیقی بھی ہے۔ حقیقی ان معنوں میں ہے کہ سلطانہ نام کا ایک شخص انگریزوں کے زمانے میں یوپی میں رہا کرتا تھا۔
اس کا کردار بہت دلچسپ تھا۔ سلطان انگریزوں اور جاگیرداروں وغیرہ سے نفرت کیا کرتا۔ اس کے پاس ایک گھوڑا اور ایک کتا ہوا کرتا۔ کتے کا نام اس نے رائے بہادر رکھا تھا۔ یہ اس کی ظالم امیروں سے نفرت کا انداز تھا۔
انگریزوں کے خلاف سرگرمیوں پر اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔
اس پر فلمیں بھی بن چکی ہیں۔
عمرو عیار۔
یہ بھی مشرق کا ایک دلچسپ افسانوی کردار ہے۔
بلکہ اس کی زنبیل تو عالمی شہرت رکھتی ہے۔ یعنی عمرو عیار کی زنبیل۔ جس زنبیل سے وقت آنے پر دنیا کی ہر چیز نکل سکتی ہے۔
عمرو عیار ایک ذہین اور شاطر انسان ہے۔ وہ دوسروں کے مسائل حل کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے اور زنبیل اس کی بہت مدد کرتی ہے۔
تیس مار خان۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

یہ بھی ہمارے یہاں کا ایک دلچسپ کردار ہے اور صرف پلاننگ کرتے رہنے والوں کے لیے خاص طور پر خیالی پلاؤ بنانے کے لیے مشہور ہے۔

ہم میں سے کون ہے جو اس کردار اور اس کے خیالی پلاؤ سے واقف نہیں ہے۔

تیس مار خان صاحب انڈوں کی ٹوکری لے کر نکلے۔ اب راستے میں خیالی پلاؤ پکاتے ہوئے جا رہے ہیں۔ ان انڈوں سے چوزے نکلیں گے۔ پھر اور انڈے ہوں گے۔ پھر اور چوزے۔

اور ایک دن پورا پولٹری فارم ہو جائے گا۔ پھر شادی ہوگی۔ بیوی آئے گی۔ ایک دن بیوی سے ناراض ہو کر اس کو لات ماریں گے۔

اب جو لات ماری تو انڈوں کی ٹوکری نیچے آ گئی۔ اور خیالی پلاؤ دھرا رہ گیا۔ تو یہ ہیں ہمارے تیس مار خان۔ اس کردار پر بھی فلمیں بن چکی ہیں۔

ملا نصیر الدین۔

یہ کردار بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔ ملا نصیر الدین کا تعلق ترکی کے پس منظر سے ہے۔ جہاں ایک خاص مزاج کے لوگوں کے درمیان ملا صاحب پیدا ہوئے۔

ان کی مزیدار حکایات اور دلچسپ باتیں پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ مثلاً ایک بار بارش میں ملا صاحب دوڑتے ہوئے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ کسی نے آواز لگائی۔ ”ملا صاحب، کہاں جا رہے ہو۔ یہ تو خدا کی رحمت ہے۔“

ملا نے جواب دیا۔ ”اسی لیے تو دوڑ رہا ہوں کہ خدا کی رحمت کہیں پیروں کے نیچے نہ آ جائے۔“

ملا نصیر الدین ایک ایسا کردار ہے جو ہمیشہ زندہ ہے۔

ان کے علاوہ اگر زندہ کرداروں کی تخلیق کے حوالے سے ابن صفی صاحب کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ ناانصافی ہوگی۔

ابن صفی صاحب نے جو کردار تخلیق کر دیے ہیں۔ وہ آج بھی زندہ اور متحرک ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ کے سامنے چل پھر رہے ہوں۔

میری اپنی رائے کے مطابق ان کا ہر کردار اتنا حقیقی ہے کہ اس سے بات کرنے اور اس سے ملنے کی خواہش ہونے لگتی ہے۔

چاہے وہ کرنل فریدی ہو یا کیپٹن حمید۔ قاسم جیسا گرانڈ ڈیل انسان ہو یا عمران جیسا ذہین اور نڈر۔ کوئی بھی ہو۔

ڈاکٹر منیر الدین چغتائی

سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی۔ انہوں نے 1938ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور 1950ء میں ایم اے سیاسیات کے امتحانات پاس کیے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلے گئے جہاں سے انہوں نے 1961ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری لی۔ ان کے مقالے کا عنوان تحریک پاکستان کے بارے میں تھا۔ 68-1967ء میں لندن اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے شعبہ سیاسیات میں بطور لیکچرار ان کی تعیناتی ہوئی۔ 1973ء میں پروفیسر اور 1981ء تا 1982ء فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین رہے۔ فروری 1982ء میں پنجاب یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ متعدد علمی اداروں کے رکن رہے۔ انہیں 14 جولائی 1991ء کو حکومت پاکستان کی طرف سے نفاذ شریعت ایکٹ 1991ء کے تحت قائم کردہ کمیشن کا رکن منتخب کیا گیا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے ادارہ تالیف و ترجمے سے بھی وابستہ رہے۔

مرسلہ: اخلاق عثمانی۔ کراچی

ابن صفی کو پڑھنے والے ان ناولوں کے ہر کردار سے واقف ہیں۔ ایسی زندہ تصویروں کی مثال شاید ہی کہیں اور ملتی ہو۔

اسی لیے ان کی کتابوں کا کمال ہے کہ جس کے پاس ابن صفی کی کتابیں موجود ہیں۔ وہ ہمیشہ انہیں اپنے ذخیرے میں رکھنا چاہتا ہے۔

اردو ادب کے اور بھی کئی کردار ایسے ہیں جو دلوں پر نقش ہو کر رہ گئے ہیں۔ جیسے چچا چھکن۔ یہ بھی ایک انتہائی دلچسپ کردار ہے۔ اور چچا کو پڑھنے کی چاشنی ہی الگ ہے۔

اب ذکر ہے ان کرداروں کا جو صدیوں سے داستانوں میں محفوظ ہیں۔

یہ کردار ہیں مشہور داستان الف لیلہ کے جسے عربین نائٹ بھی کہا جاتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اس کتاب نے پوری دنیا کو بے مثال کرداروں کا تحفہ دے دیا ہے۔ نہ جانے کتنی کہانیاں ان کو مرکز بنا کر لکھی گئی ہیں۔

پوری دنیا میں ان کرداروں پر بے شمار فلمیں بن چکی ہیں۔

آئیں ذرا ان زندہ جاوید کرداروں پر اک نگاہ ڈالتے ہیں۔

شہرزاد۔ وزیر جعفر کی ذہین اور خوب صورت جوان لڑکی۔ جس نے بادشاہ شہریار کو کہانیاں سنائیں۔ اور ان کہانیوں کے کردار امر کر دیے۔

شہریار کی عادت تھی کہ وہ ہر رات ایک لڑکی سے شادی کرتا۔ اور اس سے ایسی کہانی کی فرمائش کرتا جو ختم نہ ہو۔

وہ لڑکی کہانی سناتی اور کہانی ختم ہو جاتی۔ اور صبح ہوتے ہی شہریار اس کی گردن اڑا دیتا تھا۔ ایک رات وزیر جعفر کی بیٹی شہرزاد نے خود کو اس شادی کے لیے پیش کر دیا۔

پھر اس نے بادشاہ کو کہانیاں سنانی شروع کر دیں۔ اور ہر کہانی اتنی دلچسپ کہ بادشاہ کا تجسس بڑھتا ہی چلا گیا۔ ایک کے بعد دوسری کہانی اور اس طرح ایک ہزار راتیں گزر گئیں۔

اور شہریار کو اس لڑکی سے محبت ہو گئی۔ اس نے ہمیشہ کے لیے شہرزاد کو اپنا لیا۔ یہ تو وہ مختصر سا بیک گراؤنڈ ہے جس میں وہ کہانیاں بن گئیں۔ اب ان کہانیوں کے کردار دیکھیں۔

الہ دین (جادوئی چراغ)

پوری دنیا میں مشہور کردار۔ ایک عام سا لڑکا جس کو ایک چراغ مل جاتا ہے۔ اس چراغ کو رگڑنے سے ایک جن سامنے آ جاتا ہے۔

کون ہے جس نے یہ کہانی نہیں سنی۔ پوری دنیا میں ہزاروں کارٹونز، کتابیں اور فلمیں بن چکی ہیں۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

علی بابا۔

ایک غریب آدمی جس کو چالیس چوروں کا خزانہ مل جاتا ہے۔ کھل جا سم سم اور چالیس چور پوری دنیا میں مشہور ہیں۔

قاسم، علی بابا کا لالچی بھائی۔ جو اپنی حماقت سے چوروں کے غار میں جا کر مارا گیا۔

مرجینا۔ علی بابا کی ہوشیار کنیز، جس کی مدد سے علی بابا نے چالیس چوروں کو ٹھکانے لگا دیا۔

اب ایک اور کردار۔ اسی الف لیلہ سے۔ اور وہ ہے سند باد۔ سند باد جہازی۔ جس نے سات سفر کیے اور ہر سفر حیرت انگیز تھا۔

سند باد جہازی پر بھی بے شمار فلمیں بن چکی ہیں کہیں کہیں ایسی ایڈونچرز فلمیں بنی ہیں کہ جسے دیکھتے رہیں۔ اس کے علاوہ حاتم طائی۔

گرچہ حاتم طائی کوئی فرضی کردار نہیں تھا بلکہ 650 عیسوی میں یہ عرب کے جاہلی دور کا نامور شاعر تھا۔

اس شخص میں غیر معمولی شجاعت اور سخاوت موجود تھی۔ عہد اسلام سے کچھ عرصہ پہلے انتقال ہوا۔ اس کی بیٹی سفانہ گرفتار ہو کر آپؐ کے سامنے لائی گئی۔ آپ نے یہ جان کر کہ وہ حاتم طائی کی بیٹی ہے اسے رہا کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ اس کا باپ اعلیٰ ترین اخلاقی قدروں کا حامل تھا۔

حاتم طائی کا دیوان 1876ء میں پہلی بار لندن سے رزق اللہ نے شائع کروایا۔

بہر حال یہ تو ایک حقیقی کردار تھا لیکن الف لیلہ میں آنے کے بعد شہرزاد نے اس کردار سے کہانیاں وابستہ کر دیں۔ سات سوال اور ان کے جواب اور ہر سوال کے لیے حاتم طائی اور اس کی جدوجہد۔ داستان در داستان۔ اس طرح یہ کردار پوری دنیا میں مشہور ہو گیا۔

اس پر بھی ہزاروں قصے کہانیاں لکھی جا چکی ہیں اور فلمیں بن چکی ہیں۔

یہ تھے چند ایسے کردار جو داستانوں اور تاریخ کے اوراق کے درمیان دلچسپ معلوم ہوئے۔ اور میں نے ان کا ذکر کر دیا۔

اب یہاں میں ایک بات اور بھی سوچ رہا ہوں۔ ہم انسان تو فانی ہوتے ہیں۔ آج ہیں تو کل نہیں ہوں گے لیکن کردار ایسے ہوتے ہیں جو صدیوں سے زندہ چلے آ رہے ہیں۔ اور شاید ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

انتہا یہ ہے کہ ان کرداروں کو تخلیق کرنے والوں کو بھی کوئی نہیں جانتا ہوگا۔ وہ بھی فراموش کر دیے گئے ہیں لیکن یہ کردار ان کی نشانیوں کے طور پر اپنے اور اپنے خالق کے ہونے کا احساس دلاتے رہیں گے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ستمبر کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے نویں مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنھوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنھیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جارہا ہے

ماہ ستمبر سے کتنی ہی یادیں جڑی ہیں، کئی عظیم پاکستانی شخصیت نے اس مہینے آنکھ کھولی۔ بہت سے ایسے ہیں، جو اس برس ہم سے جدا ہوئے اور اب ہر سال ستمبر میں ان کی برسی منائی جاتی ہے۔ چند شخصیات ایسی بھی ہیں، جن کا ان صفحات میں پہلے تذکرہ ہوچکا ہے، اس لیے یہاں مختصراً ان کا ذکر کیا جارہا ہے۔

ستمبر کا تذکرہ آتا ہے تو ہر پاکستانی کے ذہن میں سب سے پہلے بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کا نام گونجتا ہے، جن کی برسی ہر سال 11 ستمبر کو انتہائی احترام اور محبت سے منائی جاتی ہے۔ قائداعظم نے اپنی شب و روز محنت، یقین اور لگن سے تاریخ کا دھارا بدل دیا۔ اُن کی کوششوں سے دنیا کے نقشے پر ایک نئی ریاست وجود میں آئی۔ برصغیر کے مسلمانوں کو غلامی کی زنجیر سے نجات دلانا اُن ہی کا کارنامہ تھا۔ ان کے افکار نے پوری مسلم دنیا کو متاثر کیا۔ آپ 25 دسمبر 1876 کو کراچی میں پونجا جناح کے ہاں پیدا ہوئے۔ برطانیہ میں لنکنز سے قانون کی ڈگری حاصل کی اور وطن لوٹ کر وکالت کے پیشے میں قدم رکھا۔ 1896 میں آپ کانگریس میں شامل ہوئے مگر پھر اس سے علیحدہ ہوکر مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ 1916 میں اس جماعت کے صدر ہوگئے۔ 1929 میں اپنے شہرۂ آفاق چودہ نکات پیش کیے۔ ان کی آواز نے مسلمانانِ ہند میں نئی روح پھونکی۔ 1940 کی قراردادِ پاکستان کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ ریاست کی جدوجہد شروع کی۔ 1946 کے انتخابات میں مسلم لیگ نے مسلم اکثریتی علاقوں میں کامیابی حاصل کی۔ اگلے برس پاکستان کا قیام وجود میں آیا۔ وہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے۔ 11 ستمبر 1948 کو اس نابغۂ روزگار شخص کا کراچی میں انتقال ہوا۔

تحریک پاکستان کے مرکزی رہنما اور پاکستان کے پانچویں وزیراعظم حسین شہید سہروردی نے بھی 8 ستمبر 1893 کو مدناپور، بنگال میں آنکھ کھولی۔ انہوں نے آکسفورڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ کلکتہ کے میئر رہے۔ بٹوارے سے قبل بنگال کے وزیراعلیٰ کا منصب سنبھالا۔ قائداعظم نے انہیں بنگال میں مسلم لیگ کی ذمہ داری سونپی۔ جنرل سیکریٹری بھی رہے۔ 16 اگست 1946 کا راست اقدام ان کی وجۂ شہرت بنا۔ قیام پاکستان کے بعد 1949 میں انہوں نے جناح عوامی لیگ کی بنیاد ڈالی، جو بعد میں عوامی لیگ کے نام سے معروف ہوئی۔ 12 ستمبر 1956 کو ملک کے وزیراعظم مقرر کیے گئے، تاہم جلد ہی یہ عہدہ ان سے چھین لیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

گیا۔ 1958 میں جب مارشل لا نافذ ہوا، تو سہروردی نے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ 1963 میں انہیں دل کا دورہ پڑا۔ وہ بیروت کے ایک ہوٹل میں مقیم تھے کہ 5 دسمبر 1963 کی رات ان کی حالت اچانک بگڑ گئی اور وہ انتقال کر گئے۔ ان کے اہلِ خانہ نے ان کی موت کو قتل قرار دیتے ہوئے اس کا الزمات نوکرشاہی پر عاید کیا۔

ستمبر ہی میں پاکستان کے تیسرے گورنر جنرل غلام محمد کی وفات ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اُن ہی کے دور میں بیوروکریسی میں سازشوں کا آغاز ہوا۔ انہوں نے منتخب وزیر اعظم کو برطرف کر کے مشرقی پاکستان کے عوام کو متنفر کر دیا۔ نظریہ ضرورت کا سیاہ فیصلہ بھی ان ہی کے دور میں آیا۔ وہ 25 اپریل 1895 کو لاہور کے ایک متمول خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ علی گڑھ سے گریجویشن کیا۔ پھر سول سروس کی سمت آئے۔ بٹوارے سے قبل لیاقت علی خان کے معاون کی ذمے داری سنبھالی۔ قیامِ پاکستان کے بعد وزیر خزانہ بنے۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد وہ گورنر جنرل ہو گئے۔ وہ بلڈ پریشر، لقوے اور فالج کے مریض تھے۔ شدید علالت کے باعث اسکندر مرزا کو قائم مقام گورنر جنرل کی ذمے داریاں دی گئیں۔ 12 ستمبر 1956 کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔

ملکۂ ترنم کا خطاب پانے والی میڈم نور جہاں نے بھی 21 ستمبر 1928 کو قصور میں آنکھ کھولی۔ وہ اپنے فن میں یکتا تھیں۔ ان کے بغیر برصغیر کے فن موسیقی کی تاریخ نامکمل ہے۔ وہ استاد بابا غلام محمد کی شاگرد تھیں۔ انہوں نے سیکڑوں گیت گائے۔ کئی زبان زد خاص و عام ہوئے۔ 1986 میں بیماری نے پہلا حملہ کیا۔ وہ جلد سنبھل گئیں، مگر امراض تعاقب میں تھے۔ 2000 میں انہیں ہارٹ اٹیک ہوا۔ اُسی برس 23 دسمبر کو یہ منفرد گلوکارہ جہانِ فانی سے کوچ کر گئی۔

☆ ممتاز مفتی

ایسا قلم کار جو ایک عہد کو متاثر کرے، عام طور سے متنازعہ ٹھہرتا ہے۔ ایک سمت اس کے چاہنے والے اور پیروی کرنے والے ہوتے ہیں، جو اس کے ہر لفظ پر ایمان لاتے ہیں... دوسری طرف اس کے مخالفین، جو اس کی ہر تخلیق، ہر خیال کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں، ان کے سقم کی نشاندہی کرتے ہیں، ان کے منفی اثرات کی سمت اشارہ کرتے ہیں۔ اردو ادب میں بھی چند ایسے قلم کار گزرے، جن میں سے ایک آج ہمارا موضوع۔

اردو فکشن کے اوج کی علامات تو تقسیم سے پہلے ہی ظاہر ہونے لگی تھیں، تاہم بٹوارے جیسے بڑے حادثے کے بعد وہ فکشن نگار جو ادبی دنیا میں اپنی شناخت بنا چکے تھے (جیسے کرشن چندر، عصمت، منٹو، بیدی وغیرہ) ان کے قلم نے کیسی لازوال کہانیاں لکھیں۔ تقسیم کا کرب، اس سے جڑے حادثات اور جذبات نے یک دم ان فکشن نگاروں کو لازوال ادب تخلیق کرنے کے وسائل مہیا کر دیے۔ تقسیم کے کچھ برس بعد تک تو ان ہی قلم کاروں کا ڈنکا بجتا رہا، مگر پھر نئے نام فکشن نگار سامنے آئے۔ گو وہ بھی تقسیم کے سانحے سے نہیں نکل سکے مگر انہوں نے اپنی الگ راہ ضرور بنائی۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبداللہ حسین اسی صف کے لوگ تھے۔ اسی گروہ میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور ممتاز مفتی بھی شامل ہوئے اور ان میں جو آخر الذکر تھے... یعنی ممتاز مفتی، وہ کچھ ایسا عجب کر گئے کہ جب جب اردو ادب کا تذکرہ ہوگا، ان کا ذکر ضرور آئے گا۔ شاید تعریف کم ہو، تنقید زیادہ کی جائے مگر آپ اوروں سے دامن بچا کر تو آگے بڑھ سکتے ہیں مگر ممتاز مفتی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جو اردو ادب تخلیق کیا گیا، وہ ممتاز مفتی کے تذکرہ کے بغیر ادھورا نہیں بلکہ اس کی تفہیم کا اہم ترین اوزار بھی ممتاز مفتی ہی ہیں۔

پاکستان میں پہلا مارشل لا لگنے کے بعد اردو ادب میں دو عناصر ظاہر ہوئے، ایک حب الوطنی کا غلبہ، دوسرا مابعدالطبیعیاتی پہلو، جسے روحانی مذہبی رنگ بھی کہا جاسکتا ہے۔ یوں تو اوروں نے بھی اسے بڑھاوا دیا مگر اس ضمن میں تین نام نمایاں ہیں، اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور ممتاز مفتی... بانو

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اور اشفاق کے برعکس ممتاز مفتی نے نہ صرف زیادہ کھلے ڈلے انداز میں لکھا بلکہ ایک معنی میں اردو ادب کے پہلے روحانی سلسلے کی بنیاد بھی رکھ دی جو سلسلہ شہابیہ کہلایا۔ اردو ادیبوں کا ایک گروہ ممتاز بیوروکریٹ اور قلم کار قدرت اللہ شہاب کے گرد اکٹھا ہو کر ان کی روحانی صلاحیتوں پر ایمان لے آیا تھا۔

اور پھر زمانے نے دیکھا کہ اس گروہ کے لیے زندگی آسان ہوتی چلی گئی، ریڈیو اور ٹی وی پر ان کے لیے امکانات کا جنم ہوا، بیرونِ ملک جانے والے وفود میں ان کا نام شامل ہونے لگا، جب سرکاری ادبی تنظیمیں بنتیں، تو انہیں عہدے پیش کیے جاتے۔ مخالفین سلسلہ شہابیہ سے مستفید ہونے والوں میں جناب ابن انشا اور جمیل الدین کا نام بھی لیتے ہیں۔ البتہ ہمیں دوسرا رخ بھی دیکھنا چاہیے۔ یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اشفاق، بانو اور ابن انشا اپنے دور کے بہترین ادیب تھے اور اس زمانے میں ان پر تنقید کرنے کے کئی لوگ ان کا پاسنگ بھی نہیں تھے۔

یوں تو ممتاز مفتی نے تواتر سے افسانے لکھے مگر ان کا ضخیم ناول ”علی پور کا ایلی“ سب سے اہم تخلیق ٹھہری۔ اسے ادبی سطح پر سراہا بھی گیا، تنقید بھی ہوئی، مگر اسے جو شہرت ملی، اس کا سبب اس سے جڑا تنازعہ تھا... اس زمانے میں آدم جی ایوارڈ سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ہوا کرتا تھا۔ یہ ناول بھی ایوارڈ کے لیے نامزد ہوا۔ اس کے لیے لابنگ بھی ہوئی مگر ایوارڈ جمیلہ ہاشمی کے ناول کے حصے میں آیا، جو ممتاز مفتی سے جونیئر تھیں۔ اس واقعے کا ہونا تھا کہ ادبی حلقوں میں شدید بحث چھڑ گئی۔ دونوں ناولوں کا موازنہ شروع ہو گیا۔ علی پور کا ایلی کا نیا ایڈیشن چھپا، تو اس کے ماتھے پر یہ جھومر بھی لگا دیا گیا کہ ”وہ ناول جسے آدم جی ایوارڈ نہیں ملا!“ یوں سوانحی رنگ میں رنگے قیام پاکستان سے پہلے کے زمانے کو منظر کرتے اس ناول کی شہرت عروج پر پہنچ گئی۔

دھیرے دھیرے ممتاز مفتی کے مزاج اور تخلیقی سفر میں تبدیلی آنے لگی۔ قدرت اللہ شہاب کا ساتھ ملنے کے بعد ان کے موضوعات اور فکر بدل گئی۔ وہ ایسے مضامین لکھنے لگے، جن میں صوفیوں اور بزرگوں کا تذکرہ ہوتا، جن میں پاکستان کے عالمی قوت بننے، امت مسلمہ کے قیادت سنبھالنے کی پیشگوئیاں ہوتیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ پیشگوئیاں سقوط ڈھاکا میں کسی قسم کا رخنہ نہ ڈال سکیں۔

نہ صرف ممتاز مفتی، بلکہ اب اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی تحریروں میں بھی شہاب کا ذکر بڑھنے لگا.... ان سے جڑی روحانی کہانیاں بھی عام ہونے لگیں۔ البتہ اوروں کے برعکس ممتاز مفتی کے ہاں شدت تھی۔ ”لبیک“ ان کی ایک ایسی کتاب ٹھہری، جسے پڑھ کر ہزاروں افراد سرشار ہو گئے۔ اس سے بھی تنازعات جڑے۔ علماء کی جانب سے اعتراض کیا گیا کہ اس میں خالق کائنات سے اپنی محبت کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ ذرا غیر محتاط ہو گئے، مگر کتاب بیسٹ سیلر ثابت ہوئی۔ یہ حج کا سفر نامہ تھا اور یہ سفر انہوں نے قدرت اللہ شہاب کے ساتھ کیا تھا۔ اس کتاب میں شہاب کی روحانی صلاحیتوں، بزرگانِ دین سے اُن کی قربت اور ان کے درجات کی تفصیل ملتی ہے، جو خاصی متنازعہ ہے۔ انہوں نے اپنے شہرۂ آفاق ناول ”علی پور کا ایلی“ کا دوسرا حصہ ”الکھ نگری“ بھی لکھا۔ یہ کتاب سوانح عمری اور یادداشتوں کے بین بین تھی۔ اس میں بھی قدرت اللہ شہاب کے روحانی پہلو کو فکشن اور اسرار میں لپیٹ کر پیش کیا گیا۔ گو یہ کتاب بھی بیسٹ سیلر ثابت ہوئی، مگر یہ اپنی مقبولیت اور معیار کے معاملے میں ”علی پور کا ایلی“ سے کوسوں دور نظر آئی۔ زندگی کے آخری برسوں میں ممتاز مفتی نے ایک کتاب ”تلاش“ لکھی۔ اس کا موضوع بھی مذہب اور روحانیت تھا، البتہ اس وقت تک ان میں خاصا ٹھہراؤ آچکا تھا۔ یہ کتاب نسبتاً متوازن ہے۔

ممتاز مفتی کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈالیں، تو وہ تمام کہانیاں ملتی ہیں، جنھیں وہ اپنے ناول اور افسانوں میں بیان کیا کرتے تھے۔ وہ 11 ستمبر 1905 کو بٹالہ، پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام ممتاز حسین تھا۔ ان کے والد مفتی محمد حسین ان کے ناول ”علی پور کا ایلی“ کا مرکزی کردار تھے۔ انہوں نے دو شادیاں کیں۔ والد اور ان کے درمیان ایک ایسا تعلق رہا، جس میں کئی نفسیاتی الجھنیں تھیں۔

تعلیمی سفر مختلف شہروں میں طے ہوا۔ وہ میانوالی اور ملتان میں زیرِ تعلیم رہے۔ میٹرک ڈیرہ غازی خان سے اور ایف اے امرتسر سے کیا۔ بی اے کا مرحلہ اسلامیہ کالج لاہور سے طے ہوا۔ لاہور کے زمانے میں باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ اس کا سبب وہاں کی ادبی فضا ٹھہری۔ پاک ٹی ہاؤس ادیبوں کی بیٹھک ہوا کرتا تھا۔ تقریبات اور نشستوں کا بھی رواج تھا۔ اوائل میں وہ لاابالی اور لبرل نوجوان کے طور پر شناخت کیے جاتے تھے۔ سگمنڈ فرائڈ کے کام سے خاصے متاثر تھے۔ مستند ادیبوں کے بجائے غیر معروف ادیب کے دلدادہ تھے۔ سویڈن کے کئی غیر معروف ادیبوں کے ناول ان کے ہاتھوں میں نظر آتے۔ ان کا پہلا افسانہ ”جھکی جھکی آنکھیں“ لاہور سے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

نکلنے والے جریدے ادبی دنیا میں شائع ہوا۔ تب ہی وہ ممتاز حسین سے ممتاز مفتی بن گئے۔ بعد میں انہوں نے تواتر سے افسانے لکھے، جن کے موضوعات اور زبان پر اس زمانے میں خاصی بحث ہوئی۔ یہ تحریریں کسی کسی سطح پر معاشرے کی برائیوں کو بھی اجاگر کرتی تھیں۔

ان کے مجموعے ''ان کہی''، ''گہما گہمی''، ''چپ''، ''روغنی پتلے'' اور ''سمے کا بندھن'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ناول ''علی پور کا ایلی'' انہیں شہرت کی بلندیوں پر لے گیا۔ ہندوستان گئے، تو وہاں کا بھی سفرنامہ لکھا۔ ''اوکھے لوگ'' اور ''پیاز کے چھلکے'' کے عنوان سے ان کے خاکے شائع ہوئے، جنھیں اہم ٹھہرایا جاتا ہے۔

ممتاز مفتی کی زندگی کے جائزے میں تضادات دکھائی دیتے ہیں۔ ابتدا میں وہ مذہب سے بیزار تھے مگر آخر میں مذہب کی جانب اتنا لگاؤ ہوگیا کہ یہی ان کی کتابوں کا موضوع ٹھہرا۔ اسی طرح ابتدا میں وہ تقسیم ہند کے مخالف تھے لیکن پھر ایک محب وطن پاکستانی کے طور پر ظاہر ہوئے۔ اس کا سبب قدرت اللہ شہاب سے قائم ہونے والا تعلق ہی رہا ہوگا۔

ممتاز مفتی کے اثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی کتابیں آج بھی بے حد مقبول ہیں اور ان کے نظریات پر آج بھی بحث جاری ہے۔ جہاں چاہنے والے لاکھوں، وہیں مخالفین کی بھی کمی نہیں۔ ان کی شخصیت اور فن پر پی ایچ ڈی کے مقالات لکھے گئے۔ ان کے بیٹے عکسی مفتی نے بھی تصوف کو موضوع بنایا۔ ممتاز مفتی نے طویل عمر پائی۔ 91 کی سال کی عمر میں 27 اکتوبر 1995 کو اسلام آباد میں ان کا انتقال ہوا۔

☆ عبدالقادر

جادوگر کسے کہتے ہیں؟

وہ جو کچھ ایسا کر گزرے ہماری ذہنی ترتیب توڑ ڈالے اور لگی بندھی فکر میں دراڑ ڈال دے۔ مگر فقط ایسا کر گزرنا جو معمول سے ہٹ کر ہو... جادو نہیں کہلاتا، یہ تو اتفاق ہے۔ ہاں، اس عمل کو جمالیاتی تقاضوں کے ساتھ مسلسل دہرانا اور ہر بار ہمیں حیران کر دینا اصل جادوگری ہے۔

کسی زمانے میں کرکٹ تیز بالروں کا کھیل تھا۔ یا پھر درمیانی رفتار کے ایسے بالروں کو اہمیت دی جاتی، جن کی گیند کبھی تو پڑ کر باہر نکلتی، کبھی اندر آجاتی۔ مگر یہ کس نے سوچا تھا کہ جلد دنیائے کرکٹ پر دھیمی رفتار سے گیند کرنے والے ایسے بالر چھانے والے ہیں، جن کی گیند زمین پر پڑ کر زاویہ ہی بدل لے گی، تیزی سے گھومے گی۔ اور کدھر گھومے گی، اس کی کسی کو خبر نہیں ہوگی کہ وہ بولر ایک ہی ایکشن سے گیند کرے گا مگر ہر گیند میں اپنی جادوگری بھر دے گا۔ آپ کو یاد ہوگا، دو عشروں پہلے آف اسپین بولنگ میں ثقلین مشتاق کی مہارت نے ہماری آنکھیں خیرہ کر دی تھیں۔ ایک ہی انداز، ایک ہی رفتار سے گیند کرتے مگر ہر گیند کا رویہ مختلف ہوتا۔ ایک پڑ کر اندر جائے، دوسری باہر۔ شین وارن کا ڈنکا بھی پوری دنیا میں بجا۔ پہلے تو لیگ بریک ہی شان دار پھر گگلی بھی انوکھی مگر جو شخص اس میدان میں سب کا استاد ٹھہرا... جس نے ان طلسماتی گیندوں کی بنیاد ڈالی۔ گگلی نامی فن کا اوج بخشا، وہ تھا عبدالقادر۔ ایک پاکستانی اسپنر، جس کی عظمت کے سامنے شین وارن سے یاسر شاہ تک، سب ہی اپنا سر خم کرتے ہیں۔

ان کے طلسم نے 67 ٹیسٹ میچز میں 236 وکٹیں اپنے نام کیں۔ ایک اننگز میں 56 کے عوض نو کھلاڑیوں کو پویلین بھیجنا ان کی بہترین کارکردگی رہی۔ پانچ بار ٹیسٹ میچز میں دس وکٹیں لینے کا کارنامہ انجام دیا۔ ون ڈے کرکٹ میں اپنی صلاحیتوں کے خوب جوہر دکھائے۔ 104 مقابلوں میں 132 وکٹیں لیں۔ پانچ وکٹیں لینے کا کارنامہ اس فارمیٹ میں دو بار انجام دیا۔ یہ اعداد و شمار قابل فخر ہیں مگر یہ اس اصلی عبدالقادر کی کہانی سامنے نہیں لاتے، جسے ایک زندہ داستان کہا جاتا ہے... جس نے ایک ایسے فن کو اوج بخشا جسے پہلے پہل رد کر دیا گیا تھا۔

عبدالقادر 15 ستمبر 1955 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ کم سنی ہی میں کرکٹ نے گرویدہ بنا لیا۔ پہلے گلی محلے میں کرکٹ کھیلتے رہے، پھر کلب کرکٹ کا حصہ بنے۔ وہاں سے فرسٹ کلاس کرکٹ کے میدانوں میں قدم رکھا۔ وہیں ان کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں۔ ان کا فرسٹ کلاس ریکارڈ شان دار ہے۔ انہوں نے لاہور اور حبیب بینک کی ٹیم کی نمائندگی کی۔ ایک اننگز میں پانچ وکٹیں لینے کا کارنامہ 75 بار اور میچ میں دس وکٹیں لینے کا کارنامہ 21 بار انجام دیا۔ گو بلے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بازنہیں تھے مگر فرسٹ کلاس میں انہوں نے دو سنچریاں بھی بنائیں۔

76-75 کے سیزن میں انہوں نے حبیب بینک کی طرف سے اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ نیشنل اسٹیڈیم میں انہیں یونائیٹڈ بینک کے خلاف میدان میں اتارا گیا۔ پہلی ہی اننگز میں چھ وکٹیں لے اڑے۔ اعلان ہوگیا کہ ایک ایسا نوجوان پاکستان کرکٹ میں قدم رکھ چکا ہے جو مستقبل کا درخشاں ستارہ بنے گا۔ بہاولپور کے خلاف 17 وکٹیں لیں تو بورڈ حکام کے کان کھڑے ہوگئے۔ بس، پھر وہ نہیں رکے۔ ان کا نام خوف کی علامت بن گیا۔ فرسٹ کلاس میں انہوں نے کئی ریکارڈ بنائے۔ 209 میچز میں 960 وکٹیں اپنے نام کیں۔ بیٹسمین کی حیثیت سے 3,740 رنز اسکور کیے۔

آئیں، اب ان کے شان دار ٹیسٹ کیریر پر نظر ڈال لیں

ٹیسٹ ان کا اصل میدان تھا۔ وہاں ان کا راج تھا۔ یہ صلاحیت اور جذبے کا امتزاج تھا، جس نے انہیں اپنے وقت کا سب سے خطرناک بالر بنادیا۔ دیگر لیگ اسپنرز کی طرح ٹاپ اسپن، فلیپر کے علاوہ ان کے پاس ..... دو طرح کی گگلی تھی، جس کا توڑ کسی کے پاس نہیں تھا۔ کتنے ہی مشکل مقابلوں میں اس پُراسرار بالر نے پاکستان کو فتح دلائی۔ کہتے ہیں، جس زمانے میں انہوں نے لیگ اسپن کے فن کا انتخاب کیا، انٹرنیشنل کرکٹ میں یہ دم توڑ رہا تھا۔ اس پر پھبتیاں کسی جاتیں، اس طرز کے گیند باز کو ٹیم پر بوجھ تصور کیا جاتا تھا۔ اس کا سبب بھی تھا۔ ان برسوں میں اچھے لیگ اسپنرز کا کال تھا۔ کچھ کھلاڑیوں نے اپنی سی کوشش کی، مگر خود کو منوا نہ سکے۔ اور پھر منظر میں عبدالقادر کی آمد ہوئی... دنیا بدل گئی۔ 77ء سے 90ء تک ان کی گھومتی، بل کھاتی گیندیں کھلاڑیوں کو نچاتی رہیں۔

یہ قذافی اسٹیڈیم تھا جہاں سے انہوں نے دسمبر 1977 میں انگلینڈ کے خلاف اپنے ٹیسٹ کیریر کا آغاز کیا۔ میچ میں فقط ایک ہی وکٹ حاصل کر سکے۔ اس وقت ٹیم کے کچھ اعلیٰ عہدے داروں کا خیال تھا کہ انہیں اگلے میچ سے ڈراپ کر دینا چاہیے مگر قسمت ان کے ساتھ تھی۔ انہیں دوسرے ٹیسٹ میچ میں موقع ملا، جس سے انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ حیدرآباد میں ہونے والے اس مقابلے میں دوسری اننگز میں وہ پانچ وکٹیں لے اڑے۔ اس سیریز میں انہوں نے بارہ وکٹیں لیں۔ یہ ایک شان دار آغاز تھا۔ اگلی ٹیسٹ سیریز بھی انگلینڈ کے خلاف تھی، جہاں وہ زخمی ہونے کی وجہ سے مقابلے سے باہر ہوگئے۔ یہ ایک گہرا صدمہ تھا۔ چوٹ شدید تھی مگر یہ بہادر کھلاڑی شکست تسلیم کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوا تھا۔ جلد انہوں نے دھماکا خیز واپسی کی۔ لارڈز کے تاریخی میدان میں انہوں نے چھ وکٹیں حاصل کر کے پاکستان کو ایک یادگار فتح دلائی، جس کی کسی کو توقع نہ تھی۔

آسٹریلیا کا دورہ یادگار رہا۔ ماہرین کے مطابق اس وقت وہ اپنے کیریر کے عروج پر تھے۔ سیریز میں ٹوٹل 22 وکٹیں اپنے نام کیں۔ پہلی بار مین آف دی سیریز ٹھہرے۔ یہ کسی بھی پاکستانی بالر کی جانب سے آسٹریلیا کے خلاف ایک سیریز میں بہترین کارکردگی تھی۔ پہلے دو میچز میں انہوں نے مرد میدان کا ٹائٹل حاصل کیا۔ ایک میں سات اور دوسرے میں گیارہ کھلاڑیوں کو ان کی جادوئی گیندوں نے پویلین کا راستہ دکھایا۔ اس سیریز کے بعد یہ طے ہوگیا کہ دم توڑتا لیگ اسپن کا فن پھر زندہ ہوگیا ہے۔ اور یہ کارنامہ تھا ایک پاکستانی نوجوان کا۔

انگلینڈ کے خلاف ہوم سیریز نے ان کی عظمت پر تصدیق کی مہر ثبت کردی، جب انہوں نے تین بار پانچ وکٹیں لینے کا کارنامہ انجام دے کر سیریز میں 19 کھلاڑیوں کو ٹھکانے لگایا اور یوں پاکستان پہلی بار انگلینڈ کو سیریز ہرانے میں کامیاب رہا۔ سری لنکا کے خلاف ہوم سیریز میں بھی بہت اچھی کارکردگی رہی۔

1987 میں پاکستان نے انگلینڈ کو اسی کی سرزمین پر شکست دی، تو اس کا سہرا عبدالقادر کے سر تھا۔ تین ماہ بعد جب انگلینڈ کی ٹیم پاکستان کے دورے پر آئی، تو اس کے کوچ نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے عبدالقادر کو قابو کرنے کا گر سیکھ لیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا اس بار پاکستان لیگ اسپنر کو منہ کی کھانی پڑے گی مگر جو کچھ ہوا، وہ تاریخ کا حصہ ہے... تین ٹیسٹ میچز میں یہ جادوگر 30 وکٹیں لے اڑا۔ قذافی اسٹیڈیم ... جہاں سے انہوں نے اپنے کیریر کا آغاز کیا تھا اس نے آگے بڑھ کر اس وقت انہیں گلے لگالیا جب عبدالقادر نے ایک اننگز میں انگلینڈ کے نو کھلاڑیوں کو پویلین بھیج دیا۔ جنہیں نے وہ پرفارمینس دیکھی، وہ اسے آج بھی یاد کرتے ہیں۔ اپنی اسی حیران کن کارکردگی کے طفیل وہ دو سو وکٹوں کا سنگ میل عبور کرنے والے پاکستان کے پہلے بالر ٹھہرے۔ ایک اعزاز جو ان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ بڑھتی عمر نے تو کارکردگی کو زیادہ متاثر نہیں کیا تھا، تجربے نے انہیں پریشان رکھا۔ پھر ان کے ساتھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پاکستان کی آن لائن لائبریری
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماےراحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://www.paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
http://paksociety.com

موتیا بند

آنکھ کا ایک مرض جو اکثر بڑھاپے میں ہوتا ہے۔ جسم میں جہاں اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہاں آنکھ کے عدسے میں بھی دھندلا پن پیدا ہو جاتا ہے اور مریض کو کم نظر آنے لگتا ہے یہاں تک کہ کچھ عرصے بعد بالکل نظر نہیں آتا ہے۔ اس وقت اس کا آپریشن کیا جاتا ہے اور دھندلا عدسہ نکال دیا جاتا ہے پھر تین ماہ بعد مریض کو موٹے شیشے کی عینک دی جاتی ہے۔ جس سے وہ دوبارہ دیکھ سکتا ہے۔ یہ مرض پیدائشی بھی ہو سکتا ہے مگر بہت کم۔ جوانوں میں یہ مرض زیادہ تر آنکھ میں چوٹ لگنے سے ہوتا ہے۔

مرسلہ: زاہد حسین۔ راولپنڈی

زیادتیاں بھی بہت ہوئیں۔ وہ صاف گو اور بے باک انسان ہیں، اسی باعث بورڈ کے عہدے داروں کے سامنے خود کو بے آرام محسوس کرتے۔ بے شک 90 میں ہندوستان کے خلاف ٹیسٹ سیریز میں ان کی کارکردگی غیر متاثر کن رہی، چار ٹیسٹ میچز میں فقط چھ وکٹیں حاصل کر سکے، مگر اس کی وجہ پچز اور کنڈیشنز تھیں۔ پھر کپتان نے بھی انہیں صحیح سے استعمال نہیں کیا۔ وہ بھی اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں سے اکتا گئے تھے۔ دسمبر 90ء میں جب وہ انگلینڈ کے خلاف قذافی اسٹیڈیم میں میدان میں اترے، تو یہ اعلان کر چکے تھے کہ یہ ان کا آخری میچ ہوگا۔ قذافی اسٹیڈیم نے ایک بار پھر اپنے سپوت کو گلے لگایا۔

وہ زمانہ ٹیسٹ کا تھا، ون ڈے اتنا مقبول فارمیٹ نہیں تھا، کئی عظیم پاکستان ٹیسٹ کھلاڑی ون ڈے میں یکسر ناکام رہے مگر 1983 ورلڈ کپ سے اپنے ون ڈے کیریر کا آغاز کرنے والے اس کھلاڑی نے ادھر بھی خود کو منوایا۔ پہلے ہی میچ میں چار کھلاڑیوں کو آؤٹ کر کے مین آف دی میچ ٹھہرے۔ عالمی مقابلے میں بارہ کھلاڑیوں کو پویلین کا راستہ دکھایا۔ 84 کی ورلڈ سیریز کپ میں وہ پندرہ وکٹیں لے اڑے۔ سری لنکا اور ویسٹ انڈیز کے خلاف سیریز میں بھی کارکردگی متاثر کن رہی۔ 88-89 کے ویلز ایشیا کپ میں انہوں نے جم کر پرفارم کیا۔ اگلے برس ہونے والے نہرو کپ میں بھی وہ چھائے رہے۔ انہوں نے اپنا آخری ون ڈے 1993 میں سری لنکا کے خلاف کھیلا۔

کپتانی کی ذمے داریاں بھی سنبھالیں مگر اس میدان میں انہیں ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک سبب تو یہی تھا کہ ان کی حق گوئی کی عادت پاکستانی کپتان کے منصب کے لیے مناسب نہیں تھی، پھر قسمت نے بھی ساتھ نہیں دیا۔ انہوں نے پانچ ٹیسٹ میچز میں پاکستان کی قیادت کی۔ چار میں شکست ہوئی۔ انہیں جاوید میاں داد کی عدم موجودگی میں انگلینڈ کے خلاف کپتان سونپی گئی تھی مگر شکست کا آسیب پاکستان سے چمٹ گیا۔ ون ڈے میں انہیں زیادہ موقع نہیں ملا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد وہ بہ طور تجزیہ کار اور کومنٹیٹر ہمیں نظر آئے۔ وہ بورڈ کے سخت ناقد تھے۔ غلطیوں کی نشان دہی سے نہیں چوکتے۔ شاید اسی وجہ سے ایک عرصے تک انہیں کوئی عہدہ پیش نہیں کیا گیا۔ 2008 میں انہیں چیف سلیکٹر بنایا گیا۔ وہ زمانہ پریشان کن تھا۔ بھارت کی ٹیم پاکستان آرہی تھی، اسے تین ٹیسٹ اور پانچ ون ڈے کھیلنے تھے، مگر ممبئی حملوں کی وجہ سے یہ دورہ ملتوی ہو گیا۔ اب سری لنکا کی ٹیم پاکستان کے دورے پر آئی، مگر بدقسمتی نے پاکستان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ لاہور میں سری لنکن کرکٹ ٹیم پر حملہ ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا، جب کسی کرکٹ ٹیم کو دہشت گردوں نے نشانہ بنایا۔ سیریز ملتوی ہو گئی۔ وہ کچھ ہی عرصے بورڈ کے ساتھ چل سکے۔ 2009 میں انھوں نے بغیر کوئی وجہ بتائے استعفیٰ دے دیا۔

ساری زندگی تنازعات ان کا تعاقب کرتے رہے، اس کی وجہ ان کی صاف گوئی تھی۔ بال ٹیمپرنگ ایک سنگین ایشو ہے۔ ہمیشہ یہی کہا گیا کہ یہ غیر قانونی ہے، مگر 2004 میں عبدالقادر کے ایک انٹرویو نے کھلبلی مچا دی، جس میں انہوں نے کہا تھا کہ تمام کامیاب پاکستانی بولر گیند سے چھیڑ خانی کیا کرتے رہے ہیں۔ یہ انٹرویو پی ٹی وی سے نشر ہوا تو یہ حصہ حذف کر دیا گیا۔

☆ نواب زادہ نصر اللہ خان

ممکن ہے، آپ پاکستان کے کامیاب ترین سیاست دانوں کی فہرست بنائیں، تو ان کا نام اس میں شامل نہ ہو، مگر جب آپ ان صاحبان کا تذکرہ کریں گے جنہوں نے سیاست میں عزت کمائی، قابلِ احترام ٹھہرے، غیر متنازعہ قرار پائے... تو ان کا نام سرفہرست ہوگا۔ نواب زادہ نصر اللہ خان جمہوری فکر کے علم بردار تھے، ان کی زندگی کا کل مقصد جمہوریت کا فروغ اور اس کی بحالی تھی۔ پاکستان میں چار مارشل لا لگے، عشروں فوج کی حکومت رہی، اس حساب سے آپ سمجھ ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

سکتے ہیں کہ 13 نومبر 1916 کو پیدا ہونے والے نواب صاحب ساری زندگی مصروف عمل رہے۔ اور وہ زمانے بھی، جب ملک میں جمہوریت تھی، نواب صاحب ٹک کر نہیں بیٹھے۔ وہ حکومتوں کے غیر جمہوری غیر آئینی اقدامات کی نشاندہی میں جتے رہے۔ شاید اسی باعث ان پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ حزب مخالف کی سیاست کی، جن کے نتیجے میں مارشل لا کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ حامی انہیں بابائے جمہوریت کہتے، مخالفین کہا کرتے کہ وہ جمہوریت کے دور میں مارشل لگوانے اور مارشل لا کے دور میں جمہوریت کی بحالی کے لیے جدوجہد کیا کرتے تھے۔

بحالی جمہوریت کے لیے جب کبھی کوئی اتحاد بنا، اس میں نواب صاحب کا کردار کلیدی ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان ہی کوششوں سے یہ اتحاد وجود میں آتا، مختلف الخیال افراد ایک چھتری تلے جمع ہوتے، ایک میز پر بیٹھتے، تو یہ نواب صاحب کی فہم و فراست کے وسیلے ممکن ہوتا۔ چونکہ دیگر منظم جماعتوں کے برعکس وہ ایک چھوٹی سی جماعت کے سربراہ تھے، جو کسی طور اتحاد کو ہائی جیک نہیں کرسکتی تھی، اس لیے ان پر اعتبار کیا جاتا اور انہیں سربراہ چن لیا جاتا۔ وہ 1956 میں پاکستان کا پہلا دستور بنانے والی دستور ساز اسمبلی کا حصہ تو نہیں تھے لیکن اس کے تحفظ میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ایم آر ڈی کی تحریک کے وہ مرکزی رہنما تھے۔ جب حکومتوں سے مذاکرات ہوتے، تو نواب صاحب کو کمیٹی میں ضرور شامل کیا جاتا۔ بڑی مثال بھٹو صاحب سے ہونے والے مذاکرات ہیں۔ نصراللہ خان کی سیاست میں جمہوریت اور اسلام اہم عناصر رہے۔ انہوں نے ختم نبوت تحریک میں سرگرم کردار ادا کیا۔ البتہ ممتاز دولتانہ کی زرعی اصلاحات کی مخالفت میں پیر نوبہار شاہ کے ساتھ مل کر ”انجمن تحفظ حقوق زمینداران تحت الشریعہ“ قائم کرنا کسی طور ایک قابلِ تعریف فیصلہ نہیں تھا۔ ایک سمت وہ جمہوریت اور شہری حقوق کے علمبردار تھے، دوسری جانب جاگیرداری کے تحفظ کے لیے تحریک چلا رہے تھے۔

نواب زادہ نصراللہ خان کا تعلق ملتانی پٹھانوں کی بابر شاخ سے تھا۔ ان کے اجداد اٹھارویں صدی میں مظفر گڑھ کے علاقہ میں آباد ہوئے۔ انگریز سرکار نے ان کے والد سیف اللہ کو 1910 میں سر کے خطاب سے نوازا اور انہیں خان گڑھ کے علاقے میں گیارہ گاؤں الاٹ کیے۔ اس خاندانی پس منظر کے حامل افراد عام طور سے حکومت کے وفادار رہتے ہیں، مگر ان کا معاملہ دیگر تھا۔ خاندانی روایت سے انحراف کرتے ہوئے وہ انگریز سرکار کے ناقدین کی صف میں جا کھڑے ہوئے۔ 1933 میں طالب علم کی حیثیت سے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ اپنے بزرگوں کے برعکس حکمران مخالف جماعت مجلس احرار میں شمولیت اختیار کی جو شدت پسند نظریات رکھتی تھی۔ احرار کا نصب العین انگریزوں کا برصغیر سے انخلا تھا۔

قیام پاکستان کے لیے وہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے متحرک رہے۔ 1951 کے صوبائی انتخابات میں انہوں نے خان گڑھ کے دو حلقوں سے کامیابی حاصل کی مگر جب مسلم لیگ کی حکومت نے شہری حقوق پر قدغن لگانی شروع کی تو نصراللہ خان نے ان پالیسیوں پر شدید تنقید کی اور پارٹی سے مستعفی ہوگئے۔ ایوب مارشل لا کے خلاف وہ موثر ترین آوازوں میں سے ایک تھے۔ اس زمانے میں وہ عوامی لیگ کا حصہ تھے، جس کے سربراہ حسین شہید سہروردی تھے۔ (بعد میں جب مجیب اس کے سربراہ بنے، تب تک حالات بدل چکے تھے)

1962 کے انتخابات میں نواب صاحب رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے۔ مستقبل قریب میں ان ہی کی منظم کوششوں سے جنرل ایوب خان کے خلاف ڈیموکریٹک فرنٹ (این ڈی ای) نامی اتحاد وجود میں آیا۔ وہ اس کے کنوینر تھے۔ 1965 کے صدارتی انتخاب میں نصراللہ خان نے فاطمہ جناح کی حمایت میں اپوزیشن پارٹیوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ گو فاطمہ جناح کو مبینہ دھاندلی کے نتیجے میں شکست ہوئی، نصراللہ خان کو بھی قومی اسمبلی کے انتخابات میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، مگر پارلیمانی نظام کی بحالی کے لیے جمہوری تحریک زور پکڑ چکی تھی۔

مجیب کے چھ نکات کی وجہ سے وہ عوامی لیگ سے دور ہوگئے تھے لیکن ایوب خان کی آمریت کو ختم کرنے کے لیے انہوں نے شیخ مجیب کی جماعت سمیت تمام جماعتوں کو جمہوری مجلس عمل (ڈیک) کے اتحاد میں جمع کرلیا۔ 70ء کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

انتخابات میں پیپلز پارٹی کا غلغلہ تھا۔ نصراللہ خان نے غلام مصطفے کھر کے ہاتھوں دو حلقوں میں شکست کھائی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت بنی تو انہوں نے نچلا بیٹھنے کی بجائے پیر پگاڑا کی سربراہی میں حزب مخالف کو متحد کرنا شروع کر دیا۔ یہ کوششیں فوراً تو سودمند نہیں ہوئیں، مگر 77ء کے انتخابات سے پہلے وہ پیپلز پارٹی کے سامنے نو جماعتوں کا قومی اتحاد تشکیل دینے میں کامیاب رہے۔ گو بھٹو کی قوت کے سامنے اس اتحاد کی شکست طے تھی مگر انتخابات میں ہونے والی دھاندلی نے اسے احتجاج کا ایک مضبوط جواز فراہم کر دیا۔ جو مذاکراتی کمیٹی بنی، نواب صاحب اس میں شامل تھے۔ مذاکرات طول پکڑ گئے، کمیٹی میں شامل پروفیسر غفور کا دعویٰ ہے کہ معاملات طے پا گئے تھے مگر ضیاء الحق نے احتجاجی سرگرمیوں کو جواز بنا کر مارشل لا لگا دیا۔

اب نواب صاحب نئے روپ میں نظر آئے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کو اس کے زبردست مخالفین کے ساتھ بٹھا کر ضیاء حکومت کے خلاف تحریک بحالی جمہوریت (ایم آر ڈی) کی بنیاد رکھی، ملک گیر احتجاج شروع ہوا۔ اسی تحریک کے نتیجے میں جنرل ضیاالحق ریفرنڈم کروانے پر مجبور ہوئے اور پھر 84ء میں انہیں انتخابات کروانے پڑے۔ نصراللہ خان کی اتحادی سیاست جنرل ضیا کی موت کے بعد جمہوری ادوار میں بھی چلتی رہی۔ انہوں نے بے نظیر بھٹو کی 1988 میں بننے والی حکومت کو گرانے کے لیے کمبائنڈ اپوزیشن کے نام سے اتحاد بنایا۔ 1990 کے انتخابات کے بعد میاں صاحب کے خلاف پیپلز پارٹی سے مل کر آل پارٹیز کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ بے نظیر بھٹو کی دوسری حکومت... وہ واحد حکومت تھی، جس میں نصراللہ خان نے شمولیت کی اور حزب اختلاف سے دور رہے۔ وہ قومی کشمیر کمیٹی کے چیئرمین بنے۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت کو صدر فاروق لغاری نے رخصت کر دیا۔ اب میاں صاحب حکومت میں آئے۔ نصراللہ خان ایک بار پھر سرگرم ہو گئے۔ مگر ان کی اصل کاوشوں کا ثمر 12 اکتوبر کے بعد نظر آیا، جب وہ جنرل مشرف کے خلاف دو دائمی حریفوں بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کو بحالی جمہوریت کی تحریک ... یعنی اے آر ڈی کی چھتری تلے لے آئے۔

ان کی عمر خاصی ہو گئی تھی۔ دھیرے دھیرے گرتی صحت نے انہیں محدود کر دیا۔ 27 ستمبر 2003 کو اس جید سیاست داں کا انتقال ہوا۔

وہ بہت نفیس اور شائستہ انسان تھے۔ فن گفتگو پر عبور حاصل تھا۔ مطالعہ وسیع۔ اپنی تقریروں میں اشعار کا خوب استعمال کرتے۔ سادہ زندگی گزاری۔ لاہور میں ریلوے اسٹیشن کے پاس نکلسن روڈ کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے، جو ان کی جماعت کا صدر دفتر بھی تھا۔ اس مکان میں کیسے کیسے سیاست دان آ کر بیٹھے، کتنے اہم فیصلے ہوئے... اب یہ سب تاریخ کا حصہ ہے۔

☆ معین خان

جست لگانا... ہوا میں تیرتے ہوئے جانا، گولی کی رفتار سے آتی گیند دبوچ لینا اور پھر خوشی کا جشن... ان الفاظ سے ایک وکٹ کیپر کی تصویر ابھرتی ہے۔ بلاشبہ گیارہ کھلاڑیوں میں یہ سب سے منفرد ہوتا ہے کہ اس کی ذمے داریاں اوروں سے یکسر مختلف۔ نہ صرف وکٹ کے پیچھے چوکس کھڑے رہنا اچھے وکٹ کیپر کی ذمہ داری ہے، بلکہ اسے نفسیاتی جنگ کا ماہر بھی ہونا چاہیے۔ وہ بلے باز کے سب سے قریب ہوتا ہے، ہمہ وقت اس کا ذہن پڑھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ یوں تو دنیا کی تاریخ میں کئی عظیم وکٹ کیپر گزرے مگر ایک پاکستانی کھلاڑی ایسا بھی تھا جس نے وکٹوں کے پیچھے کھڑے ہوتے، بلے بازوں کا ذہن پڑھنے کے علاوہ ایک اور ذمہ داری بھی خود پر ڈال لی تھی۔ اور پھر اسے نبھایا بھی خوب۔ یہ تھی ساتھی کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کرنا۔ جب حالات کٹھن ہوں تو بالر کا کاندھا تھپکنا، یہاں تک کہ جب کپتان مایوس ہو جائے، تو اس کا حوصلہ بڑھانا... جی ہاں یہ صرف معین خان تھے، جن کا جوش اور ولولہ ساتھی کھلاڑیوں کو مایوسی کی گہرائی سے کھینچ نکالتا۔ کرکٹ کی تاریخ نے وہ منظر بھی دیکھا، جب ایک مشکل میچ میں نائب کپتان معین خان نے اپنے کپتان اور مایہ ناز فاسٹ بالر وسیم اکرم کا کاندھا تھپکا۔

معین اپنے حریف راشد لطیف کے برعکس وکٹ کے پیچھے کبھی خاموش کھڑے نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ بولتے رہتے تھے۔ کبھی اردو میں، کبھی انگریزی میں۔ اس کا مقصد نہ صرف اپنے بالر اور کھلاڑیوں کا حوصلہ بڑھانا ہوتا، بلکہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بلے باز کی توجہ منتشر کرنا اور اسے مشتعل کرنا بھی ان کا مقصد ہوتا تھا۔ بیشتر معاملات میں وہ کامیاب رہتے۔ البتہ ان کی اس عادت کی وجہ سے مخالفین نے کبھی انہیں پسند نہیں کیا۔ نیوزی لینڈ کے ایک سابق کپتان نے پھبتی کسی تھی۔ ''دیگر ٹیموں کے کھلاڑی تو چھوڑیں صاحب، ان کے اپنے ساتھی بھی انہیں پسند نہیں کرتے۔''

یہ بات تعصبانہ ہے، ورنہ 92ء کے ورلڈ کپ میں نیوزی لینڈ کے خلاف ایک شان دار چھکا جڑنے والے، پاکستان کو کئی میچوں میں فتح سے ہم کنار کرنے والے اور ایشیا کپ اپنا نام کرنے والے معین خان سے کون محبت نہیں کرتا۔ ایسا توانائی سے بھرپور کھلاڑی اور کہاں ملے گا۔

وکٹ کیپنگ کے ساتھ ساتھ بلا تھامنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ بیٹنگ کی بے پناہ صلاحیت ان میں تھی۔ اپنی بلے بازی سے کئی میچ جتوائے۔ 69 ٹیسٹ میچز میں انہوں نے 28.55 کی مناسب اوسط سے 2741 رنز بنائے، جن میں چار سنچریاں بھی شامل ہیں۔ ان مقابلوں میں انہوں نے 128 کیچ پکڑے اور 20 کھلاڑیوں کو اسٹیمپ آؤٹ کیا۔ ون ڈے کے وہ اسپیشلسٹ تھے۔ 219 مقابلوں میں اترے۔ 3266 رنز داغے۔ بارہ نصف سنچریاں بنائیں۔ 214 بار گولی کی رفتار سے آتی گیند دبوچی۔ 73 کھلاڑیوں کی گلی اڑا کر انہیں پویلین کی راہ دکھائی۔ اس عرصے میں کئی ورلڈ ریکارڈ انہوں نے بنائے۔ ان کے کمالات میں ایک کمال... ثقلین مشتاق کی جادوئی گیندوں کو پرکھنا، سمجھنا اور اس کے مطابق ردعمل ظاہر کرنا بھی تھا۔ آپ کو یاد ہی ہوگا۔ ایک زمانے میں ثقلین مشتاق کے دوسرا نامی مہلک ہتھیار نے بلے بازوں کے ہوش اڑا دیے تھے، انہیں اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ ٹپا کھانے کے بعد گیند کہاں گھومے گی۔ البتہ وکٹوں کے پیچھے کھڑے معین خان کبھی غلطی نہیں کرتے۔ مشتاق احمد کی گگلی سے بھی ان کی خوب نبھتی تھی۔ کبھی اس نے انہیں پریشان نہیں کیا۔

معین خان 1990 سے 2004 تک پاکستانی ٹیم کا حصہ رہے۔ معین خان نے نومبر 1990 میں ویسٹ انڈیز کے خلاف ملتان میں اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ اسی ٹیم کے خلاف پہلا ون ڈے کھیلا۔ 2004 میں وہ آخری بار سری لنکا کے خلاف میدان میں اترے۔ ون ڈے کیریر کا آخری میچ بھی سری لنکا ہی کے خلاف کھیلا۔ انہوں نے قومی ٹیم کے مینیجر کی حیثیت سے بھی ذمے داریاں نبھائیں، مگر کیسنو جانے کے اسکینڈل کی وجہ سے انہیں اپنے عہدے سے ہاتھ دھونا پڑا۔ تنقید بھی بہت ہوئی۔ ان دنوں انہیں پاکستان کا ناپسندیدہ ترین شخص تصور کیا جاتا تھا۔ اپنے شان دار کیریر میں انہوں نے کپتانی کا فریضہ بھی انجام دیا، جس پر تفصیل سے آگے بات ہوگی۔ وہ 2014 کے اوائل میں ہیڈ کوچ بھی رہے۔

ویسے معین کا ذکر راشد لطیف کے بنا ادھورا ہے۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ دونوں کا تعلق کراچی سے تھا اور دونوں ایک ہی زمانے میں ٹیم میں جگہ بنانے کے لیے زور مار رہے تھے۔ ایک کرکٹ تجزیہ کار کے مطابق یہ پاکستان کی بدقسمتی تھی کہ اس کی تاریخ کے دو بہترین وکٹ کیپر ایک دوسرے کے مدمقابل آن کھڑے ہوئے۔ اس زمانے میں حال یہ تھا کہ کبھی راشد ٹیم کا حصہ بنتے، کبھی معین۔ البتہ معین کو مواقع زیادہ ملے، اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ان کے لیے ٹیم میں راشد کے مقابلے میں زیادہ قبولیت تھی۔ وہ وسیم اکرم کے بھی قریب تھے، جو اس زمانے میں بااثر ترین کھلاڑی تھے۔ پھر راشد سٹے بازی کے حوالے سے اپنے انکشافات کے باعث بھی متنازعہ ٹھہرے۔

بے شک یہ افسوس ناک امر ہے کہ دو بہترین بلے باز ایک ہی زمانے میں میسر تھے مگر شاید اسی تقابلے کی وجہ سے دونوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کیا اور پاکستان کو کئی فتوحات دلائیں۔ یہ درست ہے کہ تکنیکی بنیادوں پر راشد بہتر کیپر تھے۔ زیادہ پھرتیلے، زیادہ چست، مگر بلے بازی میں معین ان سے آگے تھے، ون ڈے میں ان کی اوسط بہتر تھی۔ پھر ٹیم پلیئر ہونے کے معاملے میں بھی معین کو ترجیح دی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ 1992 کا ورلڈ کپ، جس کا پاکستان فاتح ٹھہرا، اس میں معین ہی کو آزمایا گیا۔ اسی طرح 1999 کے عالمی مقابلے میں، جب پاکستان نے فائنل تک رسائی حاصل کی، معین ہی نے دستانے پہن رکھے تھے۔

آئیں، ذرا ماضی میں پلٹتے ہیں:

23 ستمبر 1971 کو راولپنڈی میں پیدا ہونے والے معین خان میں وکٹ کیپنگ کی صلاحیت بہ درجہ اتم موجود تھی، البتہ خود کو شناخت کرنے میں انہیں کچھ وقت لگا۔ شاید بڑے کھلاڑیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک بار انہوں نے اپنی قابلیت کو پہچان لیا، تو پھر مڑ کر نہیں دیکھا۔ وکٹ کیپنگ ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ قومی ٹیم تک رسائی سہل نہیں تھی۔ فرسٹ کلاس کی دشوار گھاٹی سے گزرنا پڑا، مگر محنت کش معین نے ہر رکاوٹ عبور کی۔ اعتماد کی بحالی میں انہیں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ایک بار ٹیم کا حصہ بن گئے، تو کارکردگی میں تسلسل

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

آگیا۔ 1992 کے ورلڈکپ سیمی فائنل میں پاکستان اور نیوزی لینڈ کے درمیان ایک سنسنی خیز میچ کھیلا گیا۔ پاکستان کو 8 گیندوں پر 9 رنز درکار تھے، جب معین نے ایک یادگار چھکا داغ کر میچ کا پانسہ پلٹ دیا۔ فائنل میں انہوں نے تین کیچ پکڑ کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ ان میں سے ایک این بوتھم کا کیچ بھی تھا جنہیں وسیم نے اپنا شکار بنایا۔ آپ کو یاد ہی ہوگا، وسیم ہی اس میچ میں مرد میدان ٹھہرے تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کوچنگ کی سمت آگئے۔ انہوں نے انڈیا میں ہونے والی لیگ میں حیدرآباد ہیروز کی کوچنگ کی۔ بعد میں وہ لاہور بادشاہ کی کوچنگ کرتے نظر آئے اور اسے فاتح بنایا۔ پاکستان ٹیم کے ساتھ بھی وابستگی رہی۔ خود بھی وہ فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلتے رہے۔ 2005 میں انہوں نے ٹی 20 کے ڈومیسٹک مقابلوں میں پہلی سنچری اسکور کی۔ کراچی ڈولفن سے کھیلتے ہوئے لاہور کے خلاف انہوں نے فقط 59 گیندوں پر 112 رنز داغے۔

معین کو اپنے کیریر میں کئی تنازعات کا سامنا رہا۔ کبھی ڈسپلن کی خلاف ورزی، کبھی گیند کے ساتھ چھیڑ خانی، البتہ سٹے بازی کا الزام سب سے گمبھیر معاملہ تھا۔ تحقیقاتی ٹیمیں بنیں، تفتیش ہوئی مگر کسی کیس میں انہیں قصوروار نہیں ٹھہرایا گیا۔

99ء کے ورلڈکپ فائنل میں شرمناک شکست کے بعد یہ طے تھا کہ پاکستانی کھلاڑیوں کو اب سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میچ فکسنگ کے الزامات بھی لگے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ٹیم کے چند کھلاڑیوں نے فیصلہ کیا تھا کہ دباؤ کم کرنے کے لیے ریٹائرمنٹ کا اعلان کردیا جائے مگر معین خان نے اس کی بھرپور مخالفت کی... فائنل کے بعد سینئر کھلاڑیوں نے کچھ عرصے بعد پاکستان لوٹنے کا فیصلہ کیا مگر معین فوراً پاکستان آگئے۔ انہوں نے پی ٹی وی کے ایک پروگرام میں شرکت کی جہاں ان سے میچ فکسنگ کے بارے میں بھی سوال ہوا۔ ان کا موقف واضح تھا۔ ”آپ جسے قصوروار پائیں، اسے پھانسی پر لٹکا دیں۔“

ان کے اس دلیرانہ اور کھرے موقف کے بعد دھیرے دھیرے وہ تنقید کے دائرے سے باہر آگئے۔ بطور کپتان بھی معین کی کارکردگی بری نہیں تھی۔ انہیں ٹیم کی سپورٹ حاصل تھی۔ کھلاڑیوں سے ان کی اچھی نبھتی تھی۔ انہوں نے دو تین بڑے ٹورنامنٹ جتوائے مگر اس وقت کرکٹ بورڈ تبدیلیوں کے عمل سے گزر رہا تھا، اس لیے انگلینڈ کے خلاف ہوم سیریز میں ناکامی کے بعد نیا کپتان چن لیا گیا۔

آخر میں معین کی ایک خوبی کا تذکرہ ضروری ہے۔ پاکستانی ٹیم میں اختلافات عام ہیں۔ کپتان کسی سینئر پلیئر سے ناراض، سینئر کھلاڑی کوچ سے نالاں، ایسے میں معین خان ناراض کھلاڑیوں کے درمیان پل کا کردار ادا کیا کرتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ایک طویل عرصے تک ان کا خلا پر نہیں ہوسکا۔

☆ اعجاز احمد

پاکستانی کھلاڑیوں میں مستقل مزاجی کی کمی رہی ہے۔ ایک میچ میں تو یادگار فتح حاصل کرکے ”پش اپ“ لگاتے ہیں، اگلا میچ اس بری طرح ہارتے ہیں کہ سر ہی نہیں اٹھا پاتے۔ یوں تو اس ضمن میں کئی کھلاڑیوں کا نام لیا جاسکتا ہے مگر اعجاز احمد کا معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ کبھی مخالف بولروں پر یوں گرجتے برستے کہ ان بے چاروں کی گھگھی بندھ جاتی، اٹھا اٹھا کر گیند باؤنڈری سے باہر پھینکتے، کرارے اسٹروک کھیل کر چوکے چھکے لگاتے... تبصرہ نگار خوب داد دیتے، تماشائی بھنگڑے ڈالتے، ناظرین تالیاں بجاتے، مگر اگلے میچ میں ایک ناقابلِ فہم شارٹ کھیل کر اپنی وکٹ گنوا دیتے۔

ماہرین کے مطابق اس کا سبب اعجاز کی تکنیک تھی۔ ہما شما کی کیا حیثیت، جاوید میاں داد کا مؤقف پیش کیے دیتے ہیں۔ ایک بار لاہور میں بھارت کے خلاف اعجاز احمد نے ایک لازوال اننگز کھیلی۔ کمنٹری کرتے ہوئے جاوید میاں داد نے کہا۔ ”انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہیے، جلدی جلدی بڑے شاٹس کھیل کر میچ ختم کردیں“ یعنی اس وقت انہیں اعجاز کی صلاحیت پر اس قدر اعتماد تھا۔ اور کچھ عرصے بعد جب وہ جنوبی افریقا کے خلاف ایک اہم موقع پر صفر پر آؤٹ ہوگئے، تو جاوید میاں داد نے جھنجلا کر کہا تھا۔ ”یہ ان کی تکنیک کا مسئلہ ہے، انہیں کسی سے مشورہ کرکے اِسے صحیح کروانا چاہیے۔“ دراصل اعجاز احمد کا بلے تھامنے کا انداز انوکھا تھا، ان کے ہاتھ میں وہ بلا کم، قصائی کا بغدا زیادہ لگتا۔ چل جاتا، تو مخالفین کی تکا بوٹی کر دیتا، نہیں چلتا، تو اعجاز پویلین لوٹ جاتے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

20 ستمبر 1968 کو سیالکوٹ میں پیدا ہونے والے اعجاز احمد کے بارے میں کچھ ناقدین کی رائے یہ ہے کہ وہ اس پائے کے کھلاڑی قطعی نہیں تھے کہ اتنے طویل عرصے تک قومی ٹیم میں کھیل سکتے، مگر ان کا نعم البدل نہ ہونے کی وجہ سے وہ اتنے برسوں تک ٹیم کا حصہ بنے رہے۔ اس ضمن میں ان کی بیٹنگ اوسط بھی بہ مثال پیش کی جاتی ہے، جو ٹیسٹ اور ون ڈے دونوں ہی میں اس زمانے کے دیگر کھلاڑیوں سعید انور، انضمام، عامر سہیل، سلیم ملک سے کم تھی۔ شاید ان تجزیہ کاروں کی بات جزوی طور پر درست ہو۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ اعجاز احمد نے اپنے کیریر میں کئی اہم اننگز کھیلیں۔ ان کی اوسط چاہے کم ہو، مگر وہ میچ وننگ کھلاڑی تھے۔ اُن کا بلا میچ کا نقشہ بدل سکتا تھا۔ پھر یوں بھی ہوتا کہ انہیں ڈراپ کیا جاتا، تو ٹیم کا مڈل آرڈر تاش کی طرح ڈھے جاتا۔ عوامی دباؤ پر سلیکٹرز پھر انہیں واپس لاتے اور وہ ایک سنچری داغ کر ٹیم میں اپنی جگہ پکی کر لیتے۔

انہوں نے 60 ٹیسٹ میچز کھیلے۔ اوسط 37.67 تھی جو مناسب ہے، مگر جو 3315 رنز انہوں نے اسکور کیے، ان میں بارہ سنچریاں شامل تھیں۔ ان میں سے چھ سنچریاں انہوں نے دنیا کی بہترین ٹیم یعنی آسٹریلیا کے خلاف بنائیں اور کسی بھی پاکستانی کی جانب سے آسٹریلیا کے خلاف سب سے زیادہ سنچریوں کے ریکارڈ میں میاں داد کے ساجھے دار ہے۔ اسی طرح ڈھائی سو ون ڈے میچز میں انہوں نے دس سنچریوں اور 37 نصف سنچریوں کی مدد سے ساڑھے چھ ہزار رنز بنائے۔ الغرض مسئلہ یہ رہا کہ یا تو وہ بڑی اننگز کھیلتے یا فوراً ہی آؤٹ ہو جاتے۔ ذرا اعداد و شمار کو دیکھیں۔ ٹیسٹ کرکٹ میں وہ 92 بار بلا لیے میدان میں اترے اور 33 بار ''سنگل فگر'' ہی میں (یعنی دس کا ہندسہ عبور کیے بغیر) آؤٹ ہو گئے۔ 54 بار وہ بیس سے کم اسکور پر آؤٹ ہوئے۔ وقت پڑنے پر تیز رفتاری سے بلے بازی کرنے والے اور زوردار ہٹ لگانے والے اعجاز احمد نے چار ورلڈ کپ کھیلے مگر کسی میں وہ پُراثر نہیں رہے۔

اعجاز احمد عمران خان کے زمانے میں پاکستانی ٹیم کا حصہ بنے۔ ابتدا میں ان اور آؤٹ ہوتے رہے۔ 92ء کے ورلڈ کپ کا بھی حصہ تھے مگر شاید کسی نے انہیں نوٹس نہیں کیا۔ ٹیم کی فتح کے بعد انہیں ڈراپ کر دیا گیا مگر وہ جلد واپس آئے۔ دھیرے دھیرے ٹیم کا مستقل حصہ بن گئے۔ ان کے ہاں مستقل مزاجی کی کچھ کمی تھی، مگر اچھی اننگز ہر بار ٹیم میں ان کی جگہ پکی کر دیتی۔ عمران خان نے اعجاز احمد کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کے بعد جب وسیم اکرم کپتان بنے تو انہوں نے بھی

ستمبر 2016ء کا دلفریب شمارہ ایک نظر میں

ڈاکٹر شیر شاہ سید، منظر امام
ڈاکٹر عبد الرب بھٹی
تنویر ریاض، اور سلیم انور
کی دلچسپ تحریریں آپ کی منتظر

رخ تقدیر

بعض انسانوں کی تقدیر قدم قدم پر بڑے ڈرامائی انداز میں چونکاتی ہے..... جب مایوسی کے اندھیروں سے امید کی کرن پھوٹی تو وہ بھی تقدیر کی اس مہربانی پر حیران تھا۔ آخری صفحات پر **سلیم فاروقی** کا تحفہ

ننگ و ناموس کی داستان

ہنگامہ خیز تاریخی لمحات کی جھلک..... ایک ایسا سلسلہ جو ورق در ورق ایک نئی داستان کا آغاز بھی ہے اور انجام بھی۔ **الیاس سیتاپوری** کے قلم کا جادو

شیش محل

ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی جانب گامزن سفر کا دلچسپ پڑاؤ۔ جہاں پیار کرنے والے ایک دوسرے سے بے خبر پاس سے گزر جاتے ہیں۔ **اسماء قادری** کا دلفریب سلسلہ

ماروی

ماورائی طاقتوں اور کائنات کے رمز کی جانب اشارہ کرتے دلچسپ واقعات کا احوال۔ **محی الدین نواب** کے خیالات کی پرواز

پھر یاد آئی

اللہ کی آزمائشوں سے گھبرانے اور خود فریبی میں مبتلا لوگوں کا قصہ جن کے لیے صرف اپنا سکھ اور دکھ اہم ہے، باقی کچھ نہیں۔ **طاہر جاوید مغل** کا خوبصورت ساتھ۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ان پر اعتماد کیا۔ ڈاؤن جیسی مشکل پوزیشن ان کے حصے میں آئی، جس پر وہ بڑے اعتماد سے کھیلا کرتے۔ ون ڈے میں انہوں نے کچھ متاثر کن اننگز کھیلیں، جن میں بھارت کے خلاف لاہور میں کھیلی جانے والی *139 رنز کی اننگز قابلِ ذکر ہے، جس کے لیے انہوں نے فقط 68 گیندوں کا سامنا کیا اور نو چھکے جڑے۔ آسٹریلیا، انگلینڈ اور ویسٹ انڈیز کے خلاف بھی انہوں چند یادگار اننگز کھیلیں۔ زمبابوے کے خلاف 132 رنز کی اننگز دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ پھر 1999 کے پیپسی کپ میں انڈیا کے خلاف 90 رنز کی انتہائی مشکل اننگز۔ پاکستان نے اس روز 21 رنز پر تین وکٹیں کھو دی تھیں، اگر اس روز اعجاز جم کر نہ کھیلتے، تو پاکستان کی شکست یقینی تھی۔ اسی برس انہوں نے شارجہ میں انگلینڈ کے خلاف بھی 137 رنز داغے۔ تجزیہ کاروں کے مطابق بظاہر 1999 ان کے لیے خوش قسمت ثابت ہو رہا تھا مگر ورلڈ کپ کے بعد سب بدل گیا۔

1999 کا ورلڈ کپ جن کھلاڑیوں کے لیے بدبختی لایا، ان میں اعجاز بھی شامل تھے۔ جن بلے بازوں کو شکست کا ذمے دار ٹھہرایا گیا، وہ ان کے سرخیل ٹھہرے۔ انہیں ٹیم سے ڈراپ کر دیا گیا۔ اپنی عادت کے عین مطابق انھوں نے بھرپور کم بیک کیا، مگر اس مختصر سے عرصے میں یونس خان کی ٹیم میں آمد ہو چکی تھی جن کی تکنیک ابتدا میں اتنی پختہ نہیں تھی مگر وہ خود کو بہتر بنانے اور ایک طویل جنگ لڑنے کے لیے تیار تھے۔ (اسی قابلیت نے چھ برس بعد یونس کو پاکستان کا نمبرون ٹیسٹ پلیئر بنادیا)

اعجاز کو واپسی کے بعد انگلینڈ اور نیوزی لینڈ کے خلاف آزمایا گیا، مگر وہ ناکام رہے۔ شاید انہیں ایک اور موقع دیا جاسکتا تھا، تھوڑا انتظار کرلیا جاتا اور وہ فارم پھر حاصل کر لیتے مگر اگلے ورلڈ کپ کی تیاریوں کے نام پر جن افراد کو قربانی کا بکرا بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا، ان میں اعجاز احمد کا نام بھی شامل کرلیا گیا اور یوں ان کا کیریر اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس وقت وہ پاکستان کی جانب سے سب سے زیادہ ون ڈے میچز کھیلنے والے کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے۔ بعد میں انضمام الحق، شاہد آفریدی اور یونس خان نے اس سنگ میل کو عبور کیا۔

ٹیسٹ کرکٹ میں انہوں نے سری لنکا کے خلاف ایک ڈبل سنچری اسکور کی تھی۔ 211 رنز کی وہ اننگز دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی میچ میں وسیم اکرم نے اپنے کیریر کی دوسری ہیٹ ٹرک اسکور کی تھی۔

اعجاز احمد کے کیریر میں ایک انوکھا واقعہ ہوا، جس کی کرکٹ کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ وہ 21 اپریل 1997 کا دن تھا۔ پاکستان اور سری لنکا کے درمیان ٹیسٹ میچ جاری تھا۔ اعجاز احمد اور سلیم ملک کریز پر تھے۔ اعجاز احمد سنچری سے فقط تین رنز دور تھے۔ اچانک ایک پریشان کن لمحہ آیا... دونوں سینئر کھلاڑی کنفیوژن کا شکار ہوگئے۔ وہ ایک ہی اینڈ پر اکٹھے ہوئے۔ دوسرے طرف بیلز اڑا دی گئیں۔ پاکستان کا ایک کھلاڑی رن آؤٹ ہوا... مگر ایک سوال تھا۔ کس کھلاڑی کو آؤٹ قرار دیا جائے، اعجاز احمد کو یا سلیم ملک کو؟

ٹی وی ری پلے دیکھ کر لگتا تھا کہ سلیم ملک آؤٹ ہوئے ہیں، مگر تھرڈ امپائر نے اعجاز احمد کو آؤٹ قرار دے دیا۔ میدان میں موجود تمام افراد حیران تھے، اعجاز تاسف سے سر ہلاتے ہوئے پویلین لوٹ گئے، مگر اس اثناء میں ٹی وی پر ری پلے دکھایا جاتا رہا۔ آخر تھرڈ امپائر کو غلطی کا احساس ہوا۔ اعجاز کو واپس بلایا گیا۔ سلیم ملک پویلین لوٹ گئے۔ اعجاز نے کریز پر آنے کے بعد اپنی سنچری مکمل کی۔

اعجاز کے ناقدین ان کی ایک خوبی کو سراہتے ہیں۔ وہ بلا کے پھرتیلے تھے۔ انہیں بلاشبہ پاکستان کا بہترین فیلڈر کہا جاسکتا ہے۔ جس زمانے میں پاکستان کی فیلڈنگ انتہائی کمزور تھی، اعجاز نے بین الاقوامی معیار کے قریب جانے کی کوشش کی۔ 1999 کے ورلڈ کپ میں پاکستان کا گروپ مقابلوں میں آسٹریلیا سے ٹاکرا ہوا تھا۔ اس میچ میں اعجاز اپنی صلاحیتوں کے اوج پر تھے۔ لگتا تھا، ان کے بدن میں بجلیاں بھر گئی ہیں۔ انہوں نے چار پانچ بار یقینی باؤنڈریز بچائیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں ڈراپ کرنے میں جلدی کی گئی۔ کرکٹ بورڈ احتساب کے نام پر کچھ کر دکھانا چاہتا تھا اور اس کے لیے اعجاز احمد آسان شکار ثابت ہوئے۔ 1999 ورلڈ کپ کے بعد جب انہوں نے آسٹریلیا کے خلاف ٹیسٹ سنچری اسکور کی تھی۔ ون ڈے میں تین نصف سنچریاں بنائیں۔ اس کے باوجود بورڈ نے اُن پر اعتماد نہیں کیا۔ جب معین خان اپنے دورِ کپتانی میں زخمی ہوگئے، تو ایسے اشارے ملنے لگے کہ اعجاز احمد کو عارضی طور پر یہ ذمہ داری سونپی جاسکتی ہے۔ انہیں کپتان تو نہیں بنایا گیا، مگر ٹیم میں منتخب کرلیا گیا۔ انہوں نے وقار یونس کی کپتانی میں سنگاپور کا رخ کیا، جہاں نیوزی لینڈ کے خلاف ایک دھواں دار اننگز کھیلی۔ جنوبی افریقا کے خلاف نصف سنچری اسکور کی۔ دونوں میچز میں وہ مردِ میدان ٹھہرے۔ اس کے باوجود انہیں اگلی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ICC چیمپئنز ٹرافی میں ڈراپ کرنا سراسر زیادتی تھی۔ 2003 میں نیوزی لینڈ کے خلاف انہیں آخری بار آزمایا گیا، پھر سلیکٹرز نے پلٹ کر ان کی سمت نہیں دیکھا۔

ہاں، بورڈ نے مختلف حیثیتوں میں ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا۔ انہیں 2009 میں پاکستان کی انڈر 19 کا کوچ بنایا گیا، نیوزی لینڈ میں ہونے والے ورلڈ کپ میں ان کی کوچنگ کا چرچا رہا۔ پاکستان نے فائنل تک رسائی حاصل کی، جہاں ایک کانٹے دار میچ میں انہیں آسٹریلیا کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ انہیں قومی ٹیم کی کوچنگ کی ذمے داری بھی سونپی گئی تھی، مگر اصل اختیار وقار یونس کے پاس تھا۔

☆اعتزاز احسن

سیاست کی دنیا عجیب ہے، آج آپ ہیرو ہیں، مگر کل آپ کو یکسر بھلا دیا جائے گا۔ ماضی میں آپ ولن کی شہرت رکھتے تھے، اس بار آپ نیکوکاروں کی فہرست میں کھڑے ہوں گے۔ کل آپ کا نعرہ انقلاب تھا، آج استحکام...

جو صاحب ہمارا موضوع سخن، ان کے سفر زندگی میں یہ مقام ایک سے زائد بار آیا، مگر وکلا تحریک سب سے اہم واقعہ تھا۔ ایک وقت تھا، جب وہ وکلا تحریک کے سرخیل تھے، حقیقی لیڈر۔ پورا ملک ان کا احترام کرتا تھا، معزول جج صاحبان بالخصوص افتخار چوہدری کے ہر پل وہ ساتھ رہتے۔ وکلا تحریک کی پالیسی سازی میں ان کا کردار کلیدی تھا۔ الغرض وہ عدلیہ کی آزادی کی علامت بن گئے تھے۔ ان کی نظم ”ریاست ہوگی ماں کے جیسی“ زبان زد خاص عام ہوئی... وہ پرویز مشرف کا دور تھا۔ وکلا سڑکوں پر آئے، تو اپوزیشن کو حکومت مخالف تحریک کے لیے ایک موثر پلیٹ فورم مل گیا۔ اس وقت مسلم لیگ ن اور پیپلز پارٹی اس تحریک کی نمایاں ترین جماعتیں تھیں۔ اعتزاز احسن سیاسی طور پر پی پی کا حصہ تھے، البتہ بطور وکیل وہ میاں نواز شریف کے کیس کی پیروی بھی کرتے رہے۔ وکلا میں تو انہیں نمایاں مقام حاصل تھا ہی۔ تو کہا جاسکتا ہے کہ جب وہ وکیلوں کے ساتھ ساتھ اپوزیشن کی بھی نمائندگی کر رہے تھے۔

9 مارچ کو افتخار چوہدری نے استعفیٰ دینے سے انکار کیا، تو وکلا تحریک کا آغاز ہوا۔ قافلے ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے۔ وکلا قائدین پر پھول نچھاور ہوا کرتے۔ (ہاں، یہی قافلہ کراچی پہنچا، تو حالات بگڑے، بارہ مئی کا سانحہ ہوا!) رانا بھگوان داس کی سربراہی میں سپریم کورٹ کے بینچ نے حکومتی پٹیشن رد کرتے ہوئے افتخار چوہدری کو بحال کر دیا، مگر حالات اب بھی کشیدہ تھے۔ اسی کشیدگی کے نتیجے میں کچھ عرصے بعد ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی اور تمام ججز کو فارغ کر دیا گیا۔ انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ کہا جاتا ہے، انہیں قید تنہائی میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ آخر امریکی سینٹ کے ارکان نے جنرل پرویز مشرف کو خط لکھا کہ اعتزاز احسن کو فوراً رہا کیا جائے۔ (یہ اس بات کی جانب اشارہ تھا کہ عالمی دنیا میں انہیں کس نظر سے دیکھا جاتا تھا!) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حراست کے.... دوران حکومت کی طرف سے انہیں جج بحالی تحریک سے علیحدگی کے عوض رہائی کی پیشکش ہوئی تھی، مگر انھوں نے اسے ٹھکرا دیا۔ 31 جنوری 2008 کو وہ نظر بندی توڑ کر باہر آ گئے، مگر انہیں پھر گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ الغرض اعتزاز احسن اور ان کے ساتھیوں نے انتہائی مشکل حالات میں اس تحریک کو چلایا۔

بالآخر الیکشن ہوئے، پی پی حکومت میں آگئی۔ توقع یہی تھی کہ پی پی افتخار چوہدری کی بحالی کا وعدہ پورا کرے گی، مگر آصف علی زرداری کے ارادے مختلف تھے۔ یہاں اعتزاز احسن اور پی پی کے درمیان ایک دراڑ پڑ گئی۔ انہوں نے اپنی حمایت وکلا تحریک کے پلڑے میں ڈال دی۔

اور یوں وہ ایک سیاست داں سے آگے بڑھ کر حق گوئی و بے باکی کی علامت بن گئے۔ انہوں نے ایک دانشور کی حیثیت اختیار کرلی۔

تحریک پھر شروع ہوئی۔ اعتزاز احسن مرکز نگاہ تھے۔ اب ن لیگ قیادت کر رہی تھی۔ بالآخر 2009 میں چیف جسٹس بحال ہوئے... اور تب اعتزاز احسن کے کیریر میں ایک عجیب موڑ آیا۔

پی پی ان سے پہلے ہی ناراض تھی، بحال ہونے والے جج صاحبان بھی اپنی راہ پر ہولیے۔ کچھ عرصے بعد ججز اور وکلا رہنماؤں کے درمیان فاصلے اتنے بڑھ گئے کہ اس وقت کے صدر سپریم کورٹ بار، علی احمد کرد ایک انتہائی سخت بیان دینے پر مجبور ہو گئے۔ اعتزاز احسن کا موقف بھی دھیرے دھیرے بدل رہا ہے، مگر حیرت انگیز امر ان کے چاہنے والوں کو سب سے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

زیادہ اعتراض تھا، وہ پی پی پی کی سیاست میں ان کی دوبارہ شمولیت تھی۔ اس وقت پی پی کرپشن اور بدانتظامی کے الزامات سہہ رہی تھی۔ اب وہ پی پی قائدین کے کیسز کی پیروی کرنے لگے۔ گو انہوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ کبھی افتخار چوہدری کے سامنے کیس نہیں لڑیں گے، مگر وہ وقت بھی آیا، جب انہیں اپنے مؤقف کے خلاف جانا پڑا۔ اور یوں... وہ اعتزاز احسن جو سچائی، دلیری اور انصاف کی علامت بن گئے، فقط ایک سیاست دان کی شناخت پر اکتفا کرنے پر مجبور ہوگئے۔ بے شک وہ وکیل بھی اعلیٰ پائے کے ہیں، انہوں نے دو سابق وزرائے اعظم بے نظیر بھٹو اور میاں محمد نواز شریف کے مقدمات لڑے۔ سب سے زیادہ تنخواہ لینے والے وکلا میں شمار ہوتا ہے، مگر یہ کوئی اہم حوالہ نہیں!

حالاتِ زندگی کی تفصیلات کچھ یوں ہیں کہ چوہدری اعتزاز احسن 27 ستمبر 1945 کو مری، ضلع راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ قابل طالب علم تھے۔ ایچی سن کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم رہے۔ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کیمبرج یونیورسٹی برطانیہ کا رخ کیا۔ وہاں ان کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ وطن واپسی پر انہوں نے سی ایس ایس کے امتحان میں شرکت کی۔ گو امتحان میں کامیاب رہے، مگر فوجی ڈکٹیٹر کے سخت ناقد ہونے کے باعث ملازمت قبول نہیں کی۔ (کچھ کتابوں کے مطابق وہ گنتی کے ان پاکستانیوں میں شامل ہیں جنہوں نے مقابلہ کا امتحان پاس کرنے کے باوجود ملازمت ٹھکرادی تھی)

اس فیصلے کے بعد سیاست میں آمد لگ بھگ طے تھی۔ کیریر کا آغاز 70 کی دہائی میں ہوا۔ جھکاؤ بھٹو کی جانب تھا۔ جب مارچ 1975 میں گجرات سے پیپلز پارٹی کے رکن صوبائی اسمبلی منتخب ہونے والے چودھری انور کو قتل کردیا گیا، تو خالی ہونے والی نشست سے چودھری اعتزاز احسن نے الیکشن لڑا اور بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ انہیں صوبائی کابینہ میں اطلاعات اور منصوبہ بندی کی وزارت ملی۔

1977 کے انتخابات میں اپوزیشن نے پیپلز پارٹی پر دھاندلی کے الزامات لگائے۔ یوں ایک تحریک شروع ہوئی جو مارشل لا پر منتج ہوئی۔ اسی دوران لاہور میں وکلا کی ایک ریلی پر پولیس فائرنگ کا واقعہ ہوا۔ اعتزاز احسن نے احتجاجاً وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ ان کٹھن حالات میں اس راست اقدام سے پارٹی کی سبکی ہوئی۔ انہیں ڈسپلن کی خلاف ورزی کرنے پر پارٹی سے نکال دیا گیا۔ البتہ وابستگی قائم رہی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایم آر ڈی کی تحریک میں ایک سرگرم کارکن کے طور پر نظر آئے۔ اب وہ پھر پی پی کے جیالے تھے۔ اس دوران متعدد بار گرفتار ہوئے۔ قید و بند کی صعوبتیں سہیں۔ انہیں بغیر کوئی مقدمہ چلائے جیل میں رکھا گیا۔

1988 میں وہ لاہور سے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1990 میں ایک بار پھر قومی اسمبلی تک رسائی حاصل کی۔ وزارتیں بھی اُن کے پاس رہیں۔ البتہ پی پی کی حکومت ختم ہونے کے بعد ہواؤں کا رخ تبدیل ہوگیا۔ 1993 کے انتخابات میں انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ 1994 میں وہ پاکستانی سینیٹ کے رکن بن گئے۔ انہیں قائد ایوان منتخب کیا گیا۔ 1996 سے 1997 تک وہ قائدِ حزبِ اختلاف کے منصب پر فائز رہے۔ 2002 کے انتخابات میں انہوں نے لاہور اور بہاولنگر سے قومی اسمبلی کی سیٹ پر الیکشن لڑا اور دونوں ہی پر کامیاب رہے۔

2007 میں حالات تبدیل ہوئے۔ وہ وکلا کے ساتھ جا کھڑے ہوئے۔ 2008 کے عام انتخابات میں حصہ لینا چاہتے تھے، مگر وکلا کے قومی کنونشن کی طرف سے انتخابی بائیکاٹ کے فیصلے کے بعد اپنے کاغذات نامزدگی واپس لے لیے۔ وکلا کا موقف تھا کہ مشرف کے ہوتے ہوئے انتخابات شفاف نہیں ہوسکتے۔ ججز کی بحالی کے بعد کچھ عرصے تو ان کے اور زرداری صاحب کے درمیان تناؤ رہا، مگر پھر وہ پارٹی کا نہ صرف حصہ بن گئے، بلکہ ہر پلیٹ فورم پر زور شور سے اس کی وکالت کرتے نظر آئے۔ دھرنوں کے زمانوں میں ان کی چودھری نثار کے خلاف دھواں دار تقریر کا بڑا چرچا رہا۔ بعد میں بھی ان کے فنِ خطابت کی جھلکیاں نظر آتی رہیں۔

کچھ حلقوں کا کہنا ہے کہ بینظیر بھٹو کے قتل کے بعد ان کا نام پارٹی کی سربراہی کے لیے تجویز کیا گیا تھا، اس وقت وکلا تحریک عروج پر تھی اور وہ عالمی دنیا کی مرکز نگاہ تھے، مگر محترمہ کی وصیت کی بنیاد پر یہ عہدہ ان کے بیٹے کو منتقل ہوا۔ اعتزاز احسن ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ انسانی حقوق کے علمبردار ہیں۔ ہیومین رائٹس کمیشن آف پاکستان کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ باکمال مصنف ہیں۔ ان کی کتاب ''سندھ ساگر اور قیامِ پاکستان'' کا بہت چرچا ہوا۔ اوروں کے مانند ان پر بھی کرپشن کے الزامات لگے۔ جنوری 2009 میں مائع گیس کے کاروبار میں غیر قانونی منافع کمانے والوں کی فہرست جاری ہوئی تو اس میں اعتزاز احسن کا نام بھی شامل تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

فلم نگری

سو سال کی بچی

انور فرہاد

فلمی دنیا میں وہ اداکارہ اپنی مثال آپ کہلائی کیونکہ ایک سو دو سالہ زندگی میں بھی وہ کسی نو عمر لڑکی سے کم نہ تھی۔ چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق میں وہ اس پیرانہ سالی میں بھی کسی الہڑ مٹیار سے کم نہ تھی۔ اسی لیے امیتابھ بچن اسے سو سالہ بچی کہہ کر مخاطب کرتے۔ اس سو سالہ بچی کے ساتھ فلم نگری کے کم سنی میں ناموری پانے والے کا تذکرہ سونے پر سہاگا ہے کیونکہ اس سے قبل اتنی سی عمر میں کسی اور فنکار نے آسکر ایوارڈ حاصل نہیں کیا ہے۔

فلم نگری سے ایک بزرگ ترین اور ایک سب سے کم عمر فنکار کا تذکرہ

آپ نے دو، چار، چھ اور آٹھ سال کی بچی تو دیکھی ہوگی مگر سو سال کی بچی دیکھی ہوگی نہ سنی ہوگی لیکن یہ سچ ہے کہ ایسی بھی ایک بچی تھی جس کی عمر سو برس تھی اس سو سالہ بچی کا تعلق چونکہ شوبز سے تھا۔ اس لیے اس کا ذکر خیر آپ کے لیے یقیناً دلچسپی کا سبب ہوگا۔

اس بچی کی عمر جب سو سال کی ہوئی تو اس کی سالگرہ پر بگ بی نے اسے "سو سال کی بچی" کے نام سے منسوب کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ارے ہاں بھئی! وہی بگ بی جو ماضی میں اینگری ینگ مین اور اب بڑھاپے میں اسٹائلش بڈھا کے نام سے مشہور ہے۔ اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ موصوف کوئی اور نہیں ون اینڈ اونلی امیتابھ بچن ہیں جنہوں نے سو سال کی ایک بوڑھی خاتون کو سو سال کی بچی کہا۔ حیران پریشان نہ ہوں۔ میں اس سو سالہ بچی کا نام بھی بتا دیتا ہوں یہ بالی ووڈ کی نامور اداکارہ زہرا سہگل تھیں۔

ان کے مزید تعارف کے لیے یہ بتاؤں گا کہ اگر آپ نے کنگ خان اور ڈمپل گرل پریٹی زنٹا کی فلم ''ویر زارا'' دیکھی ہے تو اس فلم میں ویر اور زارا کی محبت کا آغاز جس ہستی کے باعث ہوتا ہے اور فلم میں اس کا نام بے بے ہے۔ بے بے کا لاجواب کردار ادا کرنے والی اداکارہ ہی وہ سو سالہ بچی ہے جس کا نام نامی اور اسم گرامی زہرا سہگل تھا۔

ان کی مزید پہچان کے لیے عرض ہے کہ ''چینی کم'' نامی فلم میں جس اداکارہ نے امیتابھ بچن کی ماں کا کردار کیا ہے وہی وہ سو سالہ بچی ہیں۔ 2012ء میں جب وہ سو سال کی ہوئیں تو بوڑھے اور امیتابھ بچن نے انہیں سو سال کی بچی کا خطاب عطا کیا۔

ہر بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے امیتابھ جیسے پڑھے لکھے اور باشعور آدمی نے سو سال کی بوڑھی کو سو سال کی بچی کیوں کہا؟

اس کی وجہ امیتابھ بچن کی زبانی ہی سنیے۔

''وہ ایک بے حد زندہ دل شخصیت ہیں اور اپنی حس مزاح کے لیے مشہور ہیں۔ وہ ایک پیاری چھوٹی سی بچی کی طرح ہیں۔ وہ اس عمر میں بھی بے حد انرجی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ میں نے انہیں کبھی مایوس نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ ہنستی کھلکھلاتی رہتی ہیں۔

102 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ 10 جولائی 2014ء کو دہلی کے ایک اسپتال میں یہ ہنستی مسکراتی اداکارہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔

ان کے انتقال پُرملال کے بعد بھارت جیسے ملک کے طول و عرض میں جہاں مسلمان دشمنی کے بارے میں بہت سے قصے مشہور ہیں۔ میڈیا نے انہیں زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی موت کو بھارتی شوبز کا عظیم سانحہ قرار دیا۔ پرنٹ میڈیا میں ان کے بارے میں بے شمار مضامین چھپے۔ الیکٹرونک میڈیا میں ہفتوں ان کے فنی کارناموں پر مذاکرے اور دیگر پروگرام پیش کیے گئے۔

پاکستانی میڈیا نے بھی اس نابغۂ روزگار فنکارہ کے بچھڑنے کو فن کی دنیا کا بڑا نقصان قرار دیا۔ ان کی زندگی کا کچھ حصہ لاہور میں بھی گزرا تھا جب کہ ان کی ایک بہن عذرا بٹ بھی لاہور میں رہتی تھیں۔ اس طرح ان کا کچھ تعلق پاکستان سے بھی تھا۔

عام طور پر برصغیر میں اداکاراؤں کی عمر جب ڈھلنے لگتی ہے تو وہ گھر بیٹھ جاتی ہیں۔ آرٹ اور فن کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلیتی ہیں یا اولڈ کریکٹر ادا کرنا شروع کردیتی ہیں۔ ایسی اداکارائیں بھی زیادہ دنوں تک اپنی فنی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتیں کیونکہ اب انہیں جو چھوٹے موٹے کردار ملتے ہیں ان کا معاوضہ بھی چھوٹا ہوتا ہے جب کہ ایسے کردار بھی فلموں میں کم ہی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے وہ تھکی تھکی اور بے جان سی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ مگر زہرا سہگل کا معاملہ ان تمام باتوں سے مختلف تھا۔ وہ ایسی تھیں کہ سو سال کی عمر میں بھی ایسی تر و تازہ ہوتی تھیں کہ ان کو سو سال کی بچی سمجھا جاتا تھا۔ ان کی غیر معمولی خوبیوں کی وجہ سے انہیں ''صدی کی لاڈلی'' کا خطاب بھی ملا۔ 2008ء میں انہیں اقوام متحدہ کے پاپولیشن فنڈ ''لاڈلی میڈیا ایوارڈ'' کے تحت انہیں یہ اعزاز دیا گیا تھا۔ دہلی کی سابق وزیر شیلا ڈکشٹ کے ہاتھوں یہ ایوارڈ پیش کیا گیا تھا۔

یہ ایوارڈ وصول کرتے وقت تقریب کے شرکاء کو مخاطب کرتے ہوئے زہرا سہگل نے کہا تھا۔

''آپ لوگ مجھے اب دیکھ رہے ہیں جب میں بوڑھی اور بدصورت ہوں۔ کاش آپ لوگوں نے مجھے تب دیکھا ہوتا جب میں جوان اور خوب صورت تھی۔''

یہ ایک حقیقت تھی جس کا اظہار انہوں نے کیا مگر یہ بھی سچ ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے آپ کو بوڑھا نہیں سمجھا۔ اکثر وہ فلموں اور ڈراموں کی پرفارمنس کے بعد ہنستی مسکراتی ہوئی حفیظ جالندھری کی نظم ''ابھی تو میں جوان ہوں'' گنگنایا کرتی تھیں۔

آج کی نئی نسل اپنے اساطیر کے بارے میں بہت کم جانتی ہے کیونکہ انہیں اس کی جستجو ہی نہیں ہوتی۔ اگرچہ انہیں اس بات کا علم بھی ہونا چاہیے کہ ماضی میں جن لوگوں نے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اس سے ان کے ملک اور معاشرے کو ان کی تہذیب اور ثقافت کو کتنا فائدہ پہنچا ہے۔

زہرا سہگل بھی ایک ایسی ہی نابغۂ روزگار شخصیت کی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

مالک تھیں جنہوں نے شوبز کے مختلف شعبوں میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ جن لوگوں نے انہیں فنکارہ کے روپ میں دیکھا ہے وہ انہیں جیتے جی کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ وہ برصغیر کی ایسی اداکارہ تھیں جنہوں نے چار نسلوں کے ساتھ کام کیا۔ یعنی پرتھوی راج، راج کپور، ششی کپور اور رنبیر کپور۔ ہے ناں حیران کن بات؟ پرتھوی راج کے ساتھ انہوں نے پرتھوی راج تھیٹرز میں 1945ء میں کام کرنا شروع کیا تھا۔ نئی نسل نے تو انہیں بینڈ اٹ لائک بیکھم، سایہ، دل سے، ویر زارا، سانوریا اور امیتابھ بچن کی لندن میں بننے والی فلم ''چینی کم'' میں ہی دیکھا ہوگا لیکن پرانے شائقین فلم جانتے ہیں کہ زہرا سہگل دس برس تک تھیٹر فلم اور ٹی وی پر کام کرتی رہی ہیں۔

ہم صدی کی جس لاڈلی کا ذکر کررہے ہیں وہ 27 اپریل 1912ء میں سہارن پور (یوپی انڈیا) میں ممتاز علی خان اور ناطقہ بیگم کے گھر پیدا ہوئی تھیں۔ ممتاز علی خان اور ناطقہ بیگم کا تعلق ریاست رام پور سے تھا۔ ان کا خاندان روہیلہ پٹھانوں کا زمیندار اور متمول خاندان تھا۔ زہرا اپنے سات بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھیں۔ ان کی پرورش مسلم روایات کے مطابق ہوئی۔ زہرا جس زمانے میں رام پور میں ہوش سنبھال رہی تھیں اس دور میں عام طور پر چھوٹی عمر میں بچیوں کی شادی کردی جاتی تھی۔ ان کا خاندان خاصا مذہبی تھا۔ برقع اوڑھنا جہاں لازمی خیال کیا جاتا تھا لڑکیوں کو پڑھانے لکھانے کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی تھی۔ ایک بار زہرا نے اپنی آنکھوں میں سرمہ ڈال لیا تھا جس پر گھر والوں نے ان کی اچھی خاصی کلاس لے لی تھی۔ چودہ برس کی عمر سے ہی برقع اوڑھنے کی پابندی لگا دی گئی تھی۔ وہ پنج وقتہ نمازی تھیں اور رمضان کے پورے روزے نہایت باقاعدگی سے رکھتی تھیں۔

اس قدر مذہبی خیالات کے حامل خاندان میں ہونے کے باوجود زہرا سہگل کے والدین روشن خیال بھی تھے اور جدید رجحانات سے ہم آہنگی کو برا تصور نہیں کرتے تھے۔ زہرا کی والدہ ناطقہ بیگم اپنی نوجوانی کے دور میں ہی انتقال کر گئی تھیں لیکن ان کی خواہش کے پیش نظر زہرا اور ان کی ایک بہن کو لاہور کے مشہور و معروف کوئین میری گرلز کالج میں داخلہ دلوا دیا گیا تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم کا بندوبست چکراتا کے مقام پر کیا گیا تھا جو دہرادون کے قریب ہے۔ لاہور کے کوئین میری کالج میں اشرافیہ کی بیٹیاں ہی تعلیم حاصل کرسکتی تھیں۔ اس کالج کا تمام اسٹاف مکمل طور پر انگریز تھا۔ اس کے باوجود مسلمان لڑکیوں کے لیے پردے کا خاص اہتمام تھا۔ اساتذہ جب کالج میں لیکچر دینے آتے تو پردے کے پیچھے بیٹھ کے لیکچر دیتے تھے۔ انگریزوں کو مسلم لڑکیوں کے پردے میں رہنے سے کوئی پریشانی نہ تھی۔

انسانی زندگی کا ایک دور وہ ہوتا ہے جب وہ اپنے بارے میں فیصلے کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ یہ حق کسی دوسرے کے پاس ہوتا ہے۔ ایسے میں فیصلہ ساز اگر دانائی اور دور بینی کو بروئے کار لائے تو اس شخص کا نصیب سنور جاتا ہے جس سے متعلق فیصلہ ہونا ہوتا ہے۔ اس تناظر میں اگر یہ کہا جائے کہ زہرا سہگل کی زندگی میں دو فیصلوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا تو غلط نہ ہوگا۔ ایک فیصلہ ان کی والدہ کا تھا۔ دوسرا والد کا۔ دونوں فیصلے ذہنی وسعت اور ترقی پسندانہ سوچ کے آئینہ دار تھے۔ ان کے والدین نے زمانے کی رفتار کا صحیح اندازہ کرلیا تھا۔ اس لیے بچیوں کو اپنی ہدایات سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ دور جدید کے ہمراہ قدم ملا کر چلنے کی آزادی دی۔ تاکہ وہ معاشرے میں انفرادیت قائم کر سکیں۔ زہرا سہگل کا کہنا ہے۔

''ہم سب ہی بہنوں نے کسی نہ کسی میدان میں سرفرازی حاصل کی۔''

زہرا سہگل کی والدہ ناطقہ بیگم کے جس فیصلے کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ یہ تھا کہ انہوں نے بیٹی کو رام پور سے لاہور کے معروف تعلیمی ادارے کوئین میری کالج میں پڑھانے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانے کے اعتبار سے اس اقدام کو غیر معمولی قرار دیا جاسکتا ہے۔

زہرا کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اس کے بھائی بہن کہتے تھے۔

''اسے تو لڑکا ہونا چاہیے تھا۔''

رام پور کے گھٹن زدہ ماحول میں زہرہ بچپن میں ان خطوط پر سوچا کرتی تھیں۔

''میں لڑنا چاہتی ہوں۔ گانا چاہتی ہوں اور ناچنا بھی چاہتی ہوں۔''

لاہور میں ان کی ہم جماعت لڑکیوں کا پہناوا شلوار قمیص تھا۔ اس لیے رام پور سے آئی لڑکی کا جو کرتہ اور تنگ موری والا پاجامہ ہوتا اس کا خوب مذاق اڑتا۔ انگریز استانیوں پر یہ بات جلد کھل گئی کہ ان کی یہ شاگردہ بڑے گنوں والی ہے۔ اسے ایسے تھیٹر اور رقص سے متعلق اس کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

سرگرمیوں کی خوب حوصلہ افزائی ہوتی۔ ایک استانی نے ایک بار یہ خیال ظاہر کیا کہ زہرا اگر انگلینڈ میں ہوتی تو تھیٹر کے ذریعے سے ہفتے میں پانچ پاؤنڈ ضرور کما لیتی۔

یہ سن کر زہرا کے دل میں لندن جانے کی خواہش نے انگڑائی لی۔ رام پور آکر گھر والوں کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ ان کے ماموں جو ولایت جا رہے تھے انہوں نے زہرا کی حمایت کردی۔ والد رضا مند ہو گئے اور وہ ماموں کے ہمراہ ہی خشکی کے راستے افغانستان، ایران اور عراق سے ہوتے ہوئے مصر پہنچیں۔ پھر وہاں سے اسکندریہ کی بندرگاہ سے بحری جہاز کے ذریعے یورپ کا رخ کیا۔

اس سفر کی ابتداء میں قلات میں زہرا سہگل کو اغوا کرنے کی کوشش ہوئی تھی جسے ان کے ماموں نے ناکام بنا دیا تھا۔ مصر میں ان کی ملاقات ماموں زاد بھائی سے ہوئی جنہوں نے تجویز کیا کہ وہ اداکاری کی بجائے رقص پر توجہ دیں کیونکہ انہیں ردھم کا غیر معمولی شعور حاصل ہے۔ انہیں کزن کی بات معقول لگی۔ اس زمانے میں ایزاڈورا ڈنکن کا ڈنکا بجتا تھا۔ جس کے اندازِ رقص سے زہرا بے حد متاثر تھیں۔ ان دونوں باتوں نے رقص میں خود کو منوانے کے بارے میں قائل کرلیا اور رقص کی باقاعدہ تربیت حاصل کرلینے کی ٹھان لی تو پھر لندن کی بجائے جرمنی اس کام کے لیے زیادہ موزوں نظر آیا جہاں اس کام کے لیے زیادہ بہتر ادارے موجود تھے۔ تین برس تک جرمنی میں رقص کے رموز کی تربیت حاصل کی۔ اتفاق سے اس زمانے میں نامور ہندوستانی رقاص اودے شنکر اپنے طائفہ کے ساتھ جرمنی میں اپنا بیلے شو کرنے آئے۔ جس کو دیکھنے کے لیے زہرا بھی گئیں۔ یہ 1931ء کی بات ہے اودے شنکر کو ان کی رقص سے دلچسپی نے متاثر کیا تو چھوٹتے ہی انہیں اپنے طائفہ میں شمولیت کی دعوت دے دی۔ زہرا سہگل نے وطن واپس آکر اس دعوت کو قبول کرلیا۔

اودے شنکر کے طائفہ کا حصہ بننے کے فیصلے سے ہی وہ فیصلہ جنم لیتا ہے جس کا میں نے ان کی والدہ کے انہیں لاہور میں تعلیم دلانے کے بعد دوسرے اہم فیصلے کا ذکر کیا تھا جو ان کے والد کا تھا۔ ان کا خاندان اس وقت یوپی میں تھا جب اودے شنکر کا تار انہیں موصول ہوا جس میں ان سے استفسار کیا گیا تھا کہ کیا وہ بارہ دن کے اندر اندر طائفہ میں شمولیت اختیار کرسکتی ہیں؟ زہرا نے ڈرتے ڈرتے تار باپ کو دکھایا۔ وہ اسے جیب میں ڈال کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ادھر یہ بے چین اور مضطرب کہ جانے والد کی عدالت سے کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے؟ پندرہ منٹ بعد وہ کمرے سے برآمد ہوئے تو فوراً ہی بیٹی کو اجازت کی نوید سنائی۔ باپ کے اس فیصلے کے بارے میں زہرا سہگل نے معروف ادیب اور ہندوستانی تھیٹر پر گہری نظر رکھنے والے زبیر رضوی کو اپنے ایک انٹرویو میں بتایا۔

”آپ اندازہ کیجیے کہ ایک باپ نے ان پندرہ منٹوں میں کیا کچھ سوچا ہوگا۔ جذبے اور کیفیات کے کیا مدو جزر آئے ہوں گے مگر انہوں نے وقت اور حالات کی نزاکت اور سنگینی کا احساس کرتے ہوئے ایک بے حد عملی باپ کے روپ میں اس احساس کو جھٹک دیا ان کے خاندان کی بیٹی ایک ہندو رقاص کے ٹروپ میں جگہ جگہ ناچے گی۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ میں بے حد ضدی ہوں اور وہ میرے لندن جانے کی پچھلی کوششوں سے واقف تھے اس لیے انہوں نے اپنے سارے جذبوں پر قابو پاتے ہوئے بڑے پُروقار انداز میں مجھے اس راستے پر جانے کی اجازت دے دی جو میری منزل کی طرف جاتا تھا۔ میرے شوق کی تکمیل کی خاطر یہ ان کی اپنی روایتوں سے کتنی بڑی بغاوت تھی۔

14 اگست 1935ء کو زہرا سہگل نے کلکتہ کے نیو ایمپائر تھیٹر میں اودے شنکر کے ساتھ مل کر پہلی بار پیشہ ورانہ رقص کیا۔ اسی سال اودے شنکر کے طائفہ میں شامل ہو کر کئی ممالک کا دورہ کیا۔ 1933ء میں اودے شنکر نے الموڑہ میں رقص کی تربیت کے لیے اسکول قائم کیا تو زہرا سہگل نے ان کا بھرپور انداز میں ساتھ دیا۔ اس ادارے کا نصاب بنایا اور جرمنی میں انہوں نے جو کچھ سیکھا تھا اسے نئے سیکھنے والوں کو منتقل کیا۔

یہیں انہوں نے کامیشور سہگل کو پہلی بار دیکھا جس کی ایک پینٹنگ انہیں بہت اچھی لگی تھی۔ کامیشور بھی آہستہ آہستہ انہیں اچھا لگنے لگا۔ مگر کامیشور ان سے کچھ زیادہ ہی متاثر تھے۔ موصوف پینٹر کے ساتھ ساتھ ڈانسر بھی تھے۔ زہرا کی محبت میں رقص و موسیقی سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگے۔ دو سال تک اس آگ میں سلگنے کے بعد آخر کار انہوں نے زہرا سے اپنی چاہت کا اظہار کر ہی دیا اور ساتھ ہی شادی کی پیشکش کردی۔ زہرا انہیں پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی ضرور تھیں مگر انہوں نے کبھی اس حد تک نہیں سوچا تھا۔ کامیشور سہگل کی آفر پر وہ قدرے پریشان ہو گئیں اور سوچنے لگیں۔ یہ شادی کیسے ہوسکتی ہے؟ یہ حضرت تو عمر میں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بھی مجھ سے آٹھ سال چھوٹے ہیں۔ چلو اس بات کو بھی اگر نظر انداز کر دیا جائے تو اس حقیقت کا سامنا کیسے کیا جائے گا کہ موصوف میرے ہم مذہب نہیں۔ کیا اس بات سے مسائل جنم نہیں لیں گے؟ شادی بیاہ ایک معاشرتی مسئلہ ہوتا ہے۔ اپنوں، بے گانوں اور برادری کے جذبات کی بھی پاسداری کرنی پڑتی ہے اور ایسا ہی ہوا۔ گھر والوں کے علاوہ دوسروں نے بھی اس شادی کی بڑی مخالفت کی مگر ساری مخالفت پر سہگل جی کا عشق بھاری رہا۔ انہوں نے زہرا بی بی کو بڑی مشکلوں سے رضا مند کر ہی لیا اور زہرا بی بی نے گھر والوں کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا۔ مخالفت کرنے والوں نے یہ سوچ کر ہتھیار ڈال دیے کہ جب دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو ہماری ناپسندیدگی سے کیا ہوگا۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی؟ رہی ذات پات کی بات۔ تو عشق نہ پوچھے ذات۔ محبت کرنے والے ایسی باتوں پر کب دھیان دیتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ 1942ء میں دونوں کی شادی ہو گئی اور زہرا، زہرا سہگل بن گئیں اور کامیشور سہگل کی بے قراری کو قرار آ گیا۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی کیونکہ زہرا اس وقت تک ایک رقاصہ کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ اس شادی میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی شریک ہونے والے تھے لیکن پنڈت جی شریک نہ ہو سکے۔ اس شادی سے چند روز پہلے انہیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ گرفتاری کی وجہ اس تحریک میں شمولیت تھی جس کا سلوگن تھا ''ہندوستان چھوڑ دو۔'' ظاہر ہے یہ مطالبہ انگریز حکمرانوں سے تھا۔

شادی کے کچھ عرصے کے بعد جب اودے شنکر کا تربیتی مرکز بند ہو گیا تو زہرا سہگل اور کامیشور سہگل اودے شنکر کی اجازت سے لاہور آ گئے اور یہاں انہوں نے اپنا ڈانس اسکول Zuresh کے نام سے کھول لیا۔ یہ نام میاں بیوی دونوں کے ناموں سے اخذ کر دیا تھا۔ دونوں اپنے مشن کی تکمیل میں لگ گئے مگر یہ سلسلہ تادیر قائم نہ رہ سکا۔ سیاسی حالات کی گرماگرمی سے ہندو مسلم تناؤ بڑھنے لگا ان کی چھوٹی بہن عذرا نے جو اس زمانے میں بمبئی میں پرتھوی تھیٹر سے وابستہ تھیں زہرا سہگل کو مشورہ دیا کہ وہ بمبئی آ کر فلم انڈسٹری میں قسمت آزمائیں۔ بہن کی تحریک پر وہ لاہور میں اپنا اسکول بند کر کے بمبئی پہنچ گئیں مگر بمبئی کی فلم انڈسٹری میں آ کر انہوں نے فلموں کے رقص دیکھے تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے پرتھوی تھیٹر کا رخ کیا۔

پرتھوی راج اداکارہ کی حیثیت سے ان پر اعتماد کرنے پر تیار نہیں ہوئے البتہ رقص میں مہارت کی وجہ سے انہیں ڈانس ڈائریکٹر بنا دیا۔ مگر وہ کوشش کرتی رہیں کہ انہیں اداکارہ کے طور پر بھی کام کرنے کا موقع دیا جائے اور پھر انہیں ''دیوار'' کے نام سے اسٹیج کیے جانے والے ڈرامے میں ریمپ کا ایک کردار مل گیا۔

فلموں اور ڈراموں کے کردار اگرچہ محض کردار ہوتے ہیں مگر ان کی ادائیگی کے بعد ان کا اچھا یا برا ردِعمل آرٹسٹ کی زندگی پر ہوتا ہے۔ برے رول ادا کرنے والے کو لوگ اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ زہرا سہگل کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ کئی لوگوں کے علاوہ ان کی ساس نے بھی ان کے ریمپ کے کردار پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ زہرا سہگل خود یہ نہیں چاہتی تھیں ایسے کردار کریں جن سے ان کی ساکھ متاثر ہو۔ ان کی کوششوں سے انہیں مرکزی کردار ملنے لگے۔ انہوں نے ڈراموں کی ہیروئن کی حیثیت سے پرتھوی راج تھیٹر کے بہت سے ڈراموں میں کام کیا جن میں شکنتلا، پٹھان اور غدار کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ پرتھوی راج تھیٹر سے ان کا ساتھ چودہ برسوں پر محیط ہے۔ وہ اس دوران کام کرنے کے تجربے کو بہت خوشگوار قرار دیتی تھیں۔

ڈرامے حقیقتاً اکیڈمی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسٹیج پر اداکاری کرنے سے ہی آرٹسٹ کی فنی صلاحیتیں سنورتی ہیں، نکھرتی ہیں۔ اسی لیے یورپ میں اسٹیج ڈراموں کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ماضی میں برصغیر میں یہ رواج ہمارے یہاں بھی تھا۔ تھیٹر کے ڈراموں کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اداکار تھیٹر سے منجھ کر ہی فلموں میں جاتے تھے۔

زہرا سہگل کی ڈراموں میں پرفارمنس دیکھ کر ہی فلم والوں نے ان کو چانس دیا۔ خواجہ احمد عباس نے اپنی فلم ''دھرتی کے لال'' میں انہیں چانس دیا۔ یہ 1946ء کی بات ہے۔ اس کے بعد چیتن آنند نے اپنی فلم ''نیچا نگر'' میں انہیں اداکاری کا موقع دیا۔

معروف براڈ کاسٹر اور برصغیر کی فلم انڈسٹری پر اتھارٹی سمجھے جانے والے عارف وقار کے بقول ''یہ دونوں فلمیں بائیں بازو کے دانش وروں اور کارکنوں کی محنت کا ثمر تھیں۔ اس لیے ملک گیر طور پر یہ فلمیں پسند کی گئیں۔''

خواجہ احمد عباس اور چیتن آنند کی فلموں میں کامیاب اداکاری کے بعد زہرا سہگل کے لیے فلم انڈسٹری کے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

تاریخ اپریل فول

اپریل لاطینی زبان کا لفظ اپریلس Aprilis یا اپرائر Aprire سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے پھولوں کا کھلنا، کونپلیں پھوٹنا۔ قدیم رومی قوم موسم بہار کی آمد پر شراب کے دیوتا کی پرستش کرتی اور اسے خوش کرنے کے لیے شراب پی کر اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتی تھی۔ یہ جھوٹ رفتہ رفتہ اپریل فول کا اہم حصہ بلکہ غالب حصہ بن گیا۔ انسائیکلو پیڈیا انٹرنیشنل کے مطابق مغربی ممالک میں یکم اپریل کو عملی مذاق کا دن قرار دیا جاتا ہے۔ اس دن ہر طرح کی نازیبا حرکات کی چھوٹ ہوتی ہے اور جھوٹے لوگ مذاق کا سہارا لے کر دوسروں کو بے وقوف بناتے ہیں۔

اپریل فول کی دردناک حقیقت: جب عیسائی افواج نے اسپین کو فتح کیا تو اس وقت اسپین کی زمین پر مسلمانوں کا اتنا خون بہایا گیا کہ فاتح فوج کے گھوڑے جب گلیوں سے گزرتے تھے تو ان کی ٹانگیں گھٹنوں تک خون میں ڈوبی ہوتی تھیں۔ جب قابض افواج کو یقین ہو گیا کہ اب اسپین میں کوئی بھی مسلمان زندہ نہیں بچا پھر بھی جاسوس گلی گلی گھومتے رہے کہ کوئی مسلمان نظر آئے تو اسے شہید کر دیا جائے۔ جو مسلمان بچ گئے وہ اپنے علاقے چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں جا بسے اور وہاں جا کر اپنے گلوں میں صلیبیں ڈال لیں اور عیسائی نام رکھ لیے۔ اب بظاہر اسپین میں کوئی بھی مسلمان نظر نہیں آ رہا تھا مگر عیسائیوں کو یقین تھا کہ سارے مسلمان قتل نہیں ہوئے کچھ چھپ کر اور اپنی شناخت چھپا کر زندہ ہیں۔ اب مسلمانوں کو باہر نکالنے کی تراکیب سوچی جانے لگیں اور پھر ایک منصوبہ بنایا گیا۔ پورے ملک میں اعلان ہوا کہ یکم اپریل کو تمام

دروازے کھل گئے۔ ماہر رقص کی حیثیت سے ان کی شخصیت پہلے سے جانی مانی تھی اس لیے فلم والوں نے ان کی اس فنی صلاحیت سے بھی فائدہ اٹھانے میں کسی بخل سے کام ... نہیں لیا۔ فن کا بھرپور مظاہرہ کیا جس کا ثبوت بازی، نو دو گیارہ، سی آئی ڈی اور آوارہ ہے۔ یہ اس دور کی قابل ذکر فلمیں ہیں جن کی ریوگرافی زہرا سہگل نے دی تھی۔ ان فلموں کی کامیابی میں رقص کو بھی اہمیت حاصل رہی جس کا بھرپور فائدہ زہرا سہگل کو پہنچا اور وہ فلم انڈسٹری میں اہمیت حاصل کر گئیں۔

ایک انٹرویو کے دوران جب ان سے پوچھا گیا۔ ”کوریوگرافر کے طور پر ان دنوں کا وہ کون سا کام ہے جو آپ کبھی نہیں بھلا پائیں گی؟“

”میں نے راج کپور کی فلم آوارہ کا ڈریم سیکونس ”گھر آیا میرا پردیسی“ کوریوگراف کیا تھا۔ کام کرتے ہوئے میں کھوسی جاتی تھی۔ اس کے بعد دوبارہ ویسا کام نہیں ہو سکا۔“ اس وقت ہم نے سب کچھ اپنے ہاتھوں سے کیا تھا۔ اب کریٹیوٹی پر تیکنیک حاوی ہو گئی ہے۔ تکنیک مردہ ہے اور کریٹیوٹی زندہ۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ دل سے لوگوں کے ساتھ جڑ نہیں پاتے ہیں۔“

اس ایک چھوٹے سے جملے میں بہت بڑی بات پنہاں ہے۔ کریٹیوٹی کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

زہرا سہگل فلم انڈسٹری میں اچھی طرح سیٹ ہو گئی تھیں۔ ان کی فلموں میں اداکارہ کے طور پر کارکردگی جاری تھی اور کوریوگرافر کے طور پر بھی جب کہ ان کے شوہر کامیشور سہگل آرٹ ڈائریکٹر کے طور پر فلموں کا کام کر رہے تھے۔ دونوں کی زندگی کی گاڑی بڑے اچھے انداز سے رواں دواں تھی کہ ان کی خوشیوں کو جانے کس کی نظر لگ گئی۔ ایک دن کامیشور سہگل نے خود موت کو گلے لگا لیا۔ خودکشی کر لی۔ آرٹسٹ لوگ بڑے حساس ہوتے ہیں۔ جانے سہگل جی کو اس اقدام پر کس دکھ، کس صدمے نے مجبور کیا تھا۔ زہرا سہگل شوہر کی اس طرح جدائی پر ٹوٹ کے رہ گئیں۔ یہ سانحہ 1956ء میں رونما ہوا تھا۔ اس صدمے نے زہرا سہگل کو بمبئی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنی بہن کے پاس دہلی چلی گئیں اور کملا دیوی چٹو پادھیائے کی سنگیت اکیڈمی میں کام کرنے لگیں۔

اس دوران ان کے بہنوئی ڈاکٹر زیڈ احمد جو معروف کمیونسٹ لیڈر بھی تھے انہوں نے زہرا سہگل کو مشورہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

مسلمان غرناطہ میں اکٹھے ہو جائیں تاکہ انہیں ان ممالک میں بھیج دیا جائے جہاں وہ جانا چاہیں۔ مارچ کے پورے مہینے اعلانات ہوتے رہے۔ الحمرا کے نزدیک بڑے بڑے میدانوں میں خیمے نصب کردیے گئے جہاز آکر بندرگاہ پر لنگر انداز ہوگیا۔ مسلمانوں کو ہر طریقے سے یقین دلایا گیا کہ انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ جب مسلمانوں کو یقین آگیا کہ اب ہمارے ساتھ کچھ نہیں ہوگا تو وہ سب غرناطہ میں اکٹھے ہونا شروع ہوئے۔ اس طرح حکومت نے تمام مسلمانوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور ان کی بڑی خاطر مدارت کی۔ یہ کوئی پانچ سو برس پہلے یکم اپریل کا دن تھا۔ تمام مسلمانوں کو ایک بحری جہاز پر بٹھایا گیا۔ مسلمانوں کو اپنا وطن چھوڑتے ہوئے بڑی تکلیف ہو رہی تھی مگر اطمینان تھا کہ چلو جان بچ گئی۔ جرنیلوں نے مسلمانوں کو الوداع کیا اور جہاز وہاں سے چل دیے۔ ان مسلمانوں میں بوڑھے، جوان، خواتین، بچے اور کئی مریض بھی تھے جب جہاز سمندر کے عین وسط میں پہنچے تو منصوبہ بندی کے تحت جہاز میں سوراخ کر کے کپتان و ملاح کشتی میں سوار ہو کر فرار ہو گئے نیتجتاً جہاز ڈوب گیا اور تمام مسلمان سمندر میں ابدی نیند سو گئے۔ اس کے بعد اسپین بھر میں جشن منایا گیا کہ ہم نے اپنے دشمنوں کو بے وقوف بنایا۔ پھر یہ دن اسپین کی سرحدوں سے نکل کر پورے یورپ میں فتح کا عظیم دن بن گیا اور اسے انگریزی میں First April Fool کا نام دیا گیا۔ آج بھی عیسائی دنیا اس دن کی یاد بڑے اہتمام سے مناتی ہے اور لوگوں کو جھوٹ بول کر بے وقوف بنایا جاتا ہے۔

مرسلہ: زویا اعجاز۔ لاہور

دیا۔ ”اس غم کی شدت کو کم کرنے کے لیے مناسب یہی ہے کہ تم کہیں باہر چلی جاؤ۔“

انہیں یہ مشورہ اچھا لگا اور اسکالرشپ پر وہ انگلینڈ چلی گئیں۔ یہ سوچ کر گئیں کہ وہاں زیادہ عرصہ قیام نہیں کریں گی۔ جب دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے گا تو وطن لوٹ آئیں گی۔ انسان جو سوچتا ہے اکثر ویسا نہیں ہوتا۔ زہرا سہگل کو بھی اپنی سوچ کے برخلاف کوئی 25 برس تک ادھر رکنا پڑا۔ اس پڑاؤ کا انہیں فائدہ ہی ہوا۔ یورپ میں برصغیر کے مقابلے میں فن اور فنکاروں کو ترقی کرنے کا زیادہ بہتر موقع ملتا ہے۔ اس 25 سال کے دوران زہرا سہگل نے ٹی وی کے علاوہ فلموں میں بھی بہت کام کیا۔ ان کی بیٹی ڈاکٹر کرن سہگل جنہوں نے ماں کی سوانح Zohra Segal Fatty لکھی ہے۔ ان کا کہنا ہے۔ ”زہرا سہگل نے ایسے وقت میں برطانوی ٹی وی پر اپنی جگہ بنائی جب ایشیائی کردار بھی گوروں سے کرائے جاتے تھے۔“

زہرا سہگل نے شروع شروع میں چھوٹے موٹے رول کیے۔ ان کی شہرت کا صحیح معنوں میں آغاز ٹی وی سیریل ”جیول ان دی کراؤن“ میں لیڈی چیٹرجی کے کردار سے ہوا۔ ”مائنڈ یور لینگویج“ اور ”تندوری نائٹس“ میں بھی ان کی پرفارمنس بہت عمدہ رہی۔ کئی انگریزی فلموں میں بھی انہوں نے کام کیا۔

ڈھائی عشروں کے بعد وطن واپس لوٹیں تو ابتداء میں تھیٹر میں ان کو کام نہ ملا جس سے انہیں خاصی مایوسی ہوئی بعد ازاں انہیں معروف تھیٹر ڈائریکٹر ابراہیم القاضی نے لورکا کے ڈرامے The house of bemarda alba کے اردو روپ ”دن کے اندھیرے میں“ مرکزی کردار ادا کرنے کی آفر کی جسے انہوں نے قبول کرلیا۔ اس ڈرامے میں کام کرتے ہوئے زبیر رضوی نے انہیں دیکھا تو اپنی قابل قدر کتاب ”عصری ہندوستانی تھیٹر“ میں لکھا۔ ”ہندوستانی اسٹیج کی مشہور اداکارہ زہرا سہگل نے اپنی 81 سال کی عمر کے باوجود اس ڈرامے میں قدسیہ بیگم کا مرکزی کردار بڑے اعتماد اور ٹھسے کے ساتھ ادا کیا۔ پیرانہ سالی نے ان کی زبان میں کوئی جھول ڈالا اور نہ ہی ان کی اداکاری کی صلاحیتوں کو مرجھانے دیا۔ عجب ہوا کہ وہ ایک بار بھی نہ لڑکھڑائیں نہ ہی انہوں نے کوئی بھول چوک کی۔ وہ اس عمر میں بھی ناظرین کو اپنی اداکاری اور اس کی ساحری میں اسیر رکھنے میں کامیاب رہیں۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

زہرا سہگل کی ایک بہن عذرا بٹ ان دونوں لاہور میں اجوکا کے پلیٹ فارم سے تھیٹر کر رہی تھیں۔ 1993ء میں اجوکا والوں نے کمال یہ کیا کہ شاہد محمود ندیم کے تحریر کردہ ڈرامے ''ایک تھی نانی'' میں چالیس برس بعد دونوں بہنوں کو اسٹیج پر ایک دوسرے کے روبرو کر دیا۔ دونوں نے اپنی یادگار پرفارمنس سے لاہوریوں کو لوٹ لیا۔

واضح رہے کہ تقسیم کے بعد زہرا سہگل ہندوستان میں رہ گئی تھیں جب کہ عذرا ساٹھ کی دہائی میں پاکستان آگئی تھیں۔ بہنوں کے بچھڑنے کی اس کہانی سے انسپائر ہو کر ہی شاہد محمود ندیم نے ''ایک تھی نانی'' نامی ڈراما لکھا تھا۔

زہرا سہگل پاکستان میں مختصر قیام کے بعد بمبئی واپس گئیں تو بالی ووڈ کے ساتھ ان کا ٹوٹا رشتہ نئے سرے سے جڑ گیا۔ اس دوران انہوں نے کئی فلموں میں یادگار کردار کیے۔ ''چینی کم'' میں انہوں نے امیتابھ بچن کی والدہ کا کردار ادا کیا۔

امیتابھ بچن کہتے ہیں۔ ''چینی کم'' کے سیٹ پر زہرا ہمیشہ سب کو بڑے پیار سے پرانی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔''

''چلو عشق لڑائیں'' میں انہوں نے گوندا کی دادی کا کردار کمال خوب صورتی سے نبھایا۔ شاہ رخ خان کے ساتھ ''کل ہو نہ ہو، دل سے اور ویر زارا'' میں بھی بہت خوبصورت اداکاری کی۔ مشہور فلم ''ہم دل دے چکے صنم'' میں بھی ان کی اداکاری کو پسند کیا گیا تھا۔ 2007ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''سانوریا'' ان کی آخری فلم تھی۔ زہرا سہگل نے ''بھاجی آن دا بیچ'' اور ''بینڈ اٹ لائیک بیکھم'' جیسی آف بیٹ فلموں میں بھی اداکاری کی۔

زہرا سہگل کے لیے دنیا ایک اسٹیج اور اس اسٹیج پر کام کرنے والے اداکار۔ وہ اپنے ہر کردار میں جان ڈال دیتی تھیں۔ ان کی اداکاری میں مصنوعی پن کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ ہندوستانی فلموں کی طرح انگریزی فلموں میں بھی ان کی کامیاب اداکاری کی وجہ سے انہیں سراہا گیا ایسی کامیاب فلموں میں نیور سے ڈائی، لعل نیو لینز، بینڈ ایٹ لائیک بیکم اور ٹیلز وریٹ انٹس میڈنس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اچھے پرفارمر اپنی اچھی پرفارمنس کے لیے اچھے کردار اچھے ڈرامے یا فلم کا انتخاب کرتے ہیں۔ زہرا سہگل بھی بڑی چھان پھٹک کے بعد ہی کسی ڈرامے یا فلم میں کام کرنے کی ہامی بھرتی تھیں۔ انہوں نے بی بی سی کے ایک انٹرویو میں کہا تھا۔

''جب تک مجھے کہانی پسند نہیں آتی اور میں اپنے کردار میں خود کو اتار نہیں لیتی اس وقت تک میں کام نہیں کرتی۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مجھے کہانی پسند آئی لیکن میرے کردار میں جان نہیں تھی۔ اس وقت میں نے اسے دوبارہ لکھوا کر فلم کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ چینی کم میں، میں نے مالا کے ساتھ ایسا ہی کام کیا۔ امیتابھ بچن کی ماں بننا آسان کام نہیں تھا۔''

فنون لطیفہ کی مختلف اصناف، اس سے وابستہ افراد سے کیا تقاضا کرتی ہیں اس بابت زہرا سہگل کا بڑا واضح مؤقف تھا۔ ان کی دانست میں ''ہر کلا، ہر آرٹ خواہ وہ تھیٹر ہو یا شاعری، مصوری ہو یا سنگیت آپ سے پوری توجہ مانگتا ہے۔ اس میں پوری طرح ڈوبے بغیر یکتائی حاصل نہیں ہوتی۔ اب یہ کیا فضا اور ماحول ہو گیا ہے کہ صبح آپ کی مصروفیت کچھ اور ہے۔ دوپہر میں کچھ اور شام کو آپ تھیٹر کرنے آگئے۔ آرٹسٹ کو پورے طور پر اور کل وقتی انداز میں تھیٹر سے جڑنے کے مواقع نہیں ملے تو یہ افسوس ناک ہے۔''

زہرا سہگل اپنے انداز کی واحد فنکارہ تھیں، انہیں جس روپ میں بھی پیش کیا جاتا وہ اس میں پوری طرح فٹ نظر آتیں۔ اس کی چند مثالیں کچھ یوں ہیں۔

اداکاری اور رقص کی ماہر پرفارمر زہرا سے جب 1964ء میں بی بی سی ٹیلی ویژن پر پیش کیے جانے والے پروگرام ''پڑوسی'' میں میزبانی کے فرائض انجام دینے کو کہا گیا تو ناظرین حیران رہ گئے، انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی پرانی اور منجھی ہوئی میزبان ہوں۔ اسی طرح جب 1983ء میں پنڈت روی شنکر نے اپنے بھائی اودے شنکر کی یاد میں ایک پروگرام کیا جس میں زہرا سہگل نے شاعرانہ کلام اس طرح پیش کیا کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ گئے۔ اردو اور پنجابی شاعرانہ کلام انہوں نے نہایت دل آویز طریقے سے پیش کیا کہ یہ ان کی پہچان بن گیا۔ لوگ اکثر ان سے حفیظ جالندھری کی مشہور نظم ''ابھی تو میں جوان ہوں'' گا کر سنانے کی فرمائش کرنے لگے۔

زہرا سہگل کی پوری زندگی میں کوئی وقت ایسا نہیں گزرا جب وہ بیکار رہی ہوں۔ وہ نہ صرف ایک اداکارہ بلکہ کوریوگرافر، ڈانسر اور ٹی وی، اسٹیج اور فلم کی اداکارہ تھیں۔ خوش شکل نہ ہونے کے باوجود انہوں نے فلم

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

انڈسٹری میں نام کمایا۔ انہوں نے بڑے سے بڑے کردار بھی ادا کیے اور مثبت بھی۔ ان کا کہنا تھا۔ ''ایک آرٹسٹ کو ہر کردار کرنا چاہیے۔''

انہوں نے کبھی اپنی ظاہری شکل وصورت کے حوالے سے کوئی احساسِ کمتری پیدا نہیں ہونے دیا کیونکہ ان کے وجود کی خوب صورتی اور ان کے اندر کے فطری آرٹسٹ نے ظاہری کمی کو پورا کر دیا تھا۔

وہ ایک فطری اداکارہ تھیں اس لیے ان کی دوسری فلم چیتن آنند کی ''نیچا نگر'' ہی سے ناقدین نے ان کی فنی صلاحیتوں کا اعتراف کیا جب کہ فرانس کے فلمی میلے کانز میں انہیں اس فلم کی بہترین پرفارمنس پر ''گولڈن پام'' ایوارڈ بھی دیا گیا۔

ایوارڈ اور اعزاز پرفارمرز کے لیے مزید بہتر کارکردگی کا سبب بنتے ہیں۔ ترقی کرنے کے لیے آکسیجن کا درجہ رکھتے ہیں۔ زہرا سہگل کو ان کی دوسری فلم میں جو ایوارڈ ملا۔ اس کا سلسلہ رکا نہیں۔ انہیں آنے والے دنوں میں بھی مختلف نوعیت کے ایوارڈز اور اعزازات ملتے رہے۔ 1998ء میں انہیں بھارت کا دوسرا سب سے بڑا سول ایوارڈ پدم بھوشن سے نوازا گیا۔ جب کہ 2008ء میں انہیں اقوام متحدہ کے پاپولیشن فنڈ لاڈلی میڈیا ایوارڈ کے تحت ''رواں سال کی لاڈلی'' کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا عزت دی گئی۔

کوئی بھی آرٹسٹ ایک دن میں یا ایک پرفارمنس سے ترقی کی منزل تک نہیں پہنچتا۔ زہرا سہگل نے بھی بتدریج کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے تھیٹر کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی ٹی وی چینلز کے ڈراموں اور سیریلز میں بھی اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے، دوردرشن کے لیے بنائی گئی سیریل ''اماں اور میں'' میں مرکزی کردار کر کے ناظرین اور ناقدین کو متاثر کیا لیکن ان کی شہرت کا باعث بننے والا ٹی وی ڈراما ''ملا نصیرالدین'' تھا۔ اس میں مرکزی کردار ادا کر کے اپنی اداکاری کا لوہا منوالیا تھا۔ برطانوی ٹی وی چینل کے بھی کئی ڈراموں میں اپنی فنی کارکردگی سے ناظرین کو متاثر کیا۔

وقت اور حالات کا دھارا کب کدھر مڑ جائے کسی کو پتا نہیں ہوتا۔ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی جس کے لیے چودہ سال کی عمر سے برقع اوڑھنا لازمی ہو گیا تھا جو روزے نماز کی پابندی سے ادائیگی کرتی تھی۔ کس کو معلوم تھا کہ اس کی زندگی میں ایک ایسا موڑ بھی آئے گا جب اسے ایک ایسے شخص سے ازدواجی رشتہ جوڑنا پڑے گا جو اس کا ہم مذہب نہیں ہوگا۔ جو ہندو مت کا پیروکار ہوگا۔ زہرا کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس رشتے پر آمادہ ہونا پڑا۔ انہوں نے خاندان کے لوگوں کی مخالفت کے باوجود کامیشور سہگل سے کورٹ میرج کی۔ کامیشور نے زہرا کے والدین کو مطمئن کرنے کے لیے شادی سے پہلے اسلام قبول کرلیا تھا۔ ان کے دو بچے ہوئے ایک بیٹی کرن اور ایک بیٹا پون کمار۔ بیٹی ڈاکٹر کرن سہگل ایک کتھک ڈانسر بھی ہے۔ بیٹے پون کمار کی شادی منشی پریم چند کی پوتی سیما رائے سے ہوئی۔

دونوں بچوں کو زہرا اور ان کے شوہر کی طرف سے اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے کی آزادی دی گئی۔ ان سے ان کے ماں باپ نے کہا۔ ''تمہیں مکمل اختیار حاصل ہے تم مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرو یا ہندو مت اختیار کرلو۔''

بچوں نے تھوڑے عرصے کے لیے دونوں مذہب قبول کیے پھر دونوں ہی ترک کر دیے۔ اس دوران زہرا لادین بھی ہو گئیں جب کہ ان کے شوہر کامیشور سہگل نے کبھی کسی مذہب کو نہیں اپنایا۔ یعنی وہ بھی لادین ہی رہے۔

زہرا سہگل کی ایک بہن عذرا بٹ تھیں جن کا ذکر کئی حوالے سے کیا جا چکا ہے بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ پاکستان کی نامور آرٹسٹ ہما نواب کی والدہ تھیں۔ ہما نواب کی والدہ اور زہرا سہگل کی بہن عذرا بٹ کا انتقال 93 سال کی عمر میں 2010ء میں لاہور میں ہوا۔

2013ء میں برصغیر پاک و ہند کی سینما کی عمر 100 مکمل ہوئی تھی لیکن زہرا سہگل نے ایک سال پہلے ہی یعنی 2012ء ہی میں اپنی زندگی کے 100 برس مکمل کرلیے تھے۔ یوں وہ فن کی دوڑ میں ہندوستانی سینما سے بھی ایک سال آگے نکل گئی تھیں۔

102 برس کی عمر میں بھی زہرا سہگل میں نوجوانوں جیسا دم خم تھا۔ وہ ڈراما ہو یا فلم اپنی پرفارمنس کے دوران بڑے جوش اور جذبے کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ ہر شاٹ کے بعد ہنستی مسکراتی اور کھلکھلاتی نظر آتی تھیں۔ سیٹ پر موجود ساتھی فنکاروں سے چھیڑ چھاڑ کرتی تھیں اور اکثر ابھی تو میں جوان ہوں گنگنا کر یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی تھیں کہ وہ واقعی اس عمر میں بھی جوان ہیں۔ ان کی انہی اداؤں کے پیش نظر امیتابھ بچن نے انہیں سو سال کی بچی کہا تھا۔

شوہر کے بچھڑنے کے بعد وہ زیادہ تر اپنی بیٹی ڈاکٹر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کرن سہگل کے ساتھ دہلی میں رہیں۔ اپنے ابتدائی فنی کیریئر کے دوران انہوں نے ایک رقاصہ کی حیثیت سے طائفوں کے ساتھ جاپان، مصر، یورپ اور امریکا کا سفر کیا اور بھارت کے مخصوص رقوص کا مظاہرہ کیا۔ بیرون ملک انہیں جو پذیرائی حاصل ہوئی اس نے ان کے مستقبل پر بہت خوشگوار اثرات مرتب کیے۔

پیرانہ سالی میں انہوں نے جتنے بھی کردار ادا کیے وہ ماں اور دادی کے کردار تھے۔ ان کے بارے میں ان کا کہنا تھا۔ ''یہ تمام کردار میری زندگی کی سچائیوں سے جڑے ہوئے ہیں۔''

27 اپریل 1912ء کو سہارن پور میں ڈپٹی کلکٹر محمد ممتاز الحسن کے ہاں آنکھ کھولنے والی صاحبزادی زہرہ بیگم نے 10 جولائی 2014ء کو ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

زہرا سہگل ہی کی طرح ایک اور فنکار ہے جسے ہندوستان جنم جات کلاکار یعنی پیدائشی فنکار کہتے ہیں۔ بولی ووڈ سے جڑی زہرا سہگل اگر بزرگ ترین فنکارہ تھیں تو کمسن ترین فنکار ہیں اے آر رحمٰن اسی لیے سوچا کہ دونوں کو یکجا کر دوں لیکن ان پر کچھ لکھنے سے پہلے یہ بتاتا چلوں کہ اے آر رحمٰن کو اس وجہ سے زہرا سہگل سے ملا رہا ہوں کہ وہ کم عمر ہوتے ہوئے بھی فنی یا کبھی بچوں پر بنی فلم کے حوالے سے دو دو آسکر ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں جس کا خواب عرصہ دراز سے دیکھا جا رہا تھا لیکن وہ خواب تعبیر سے دور تھا۔ خواب شرمندہ تعبیر بھی ہوتے ہیں جب کوئی انہیں دیکھتا ہے۔ اس لیے خواب ضرور دیکھنا چاہیے۔ بالی ووڈ والے بھی بڑے دنوں سے ایک خواب دیکھ رہے تھے۔ آسکر ایوارڈ حاصل کرنے کا خواب...... مگر اس خواب کی تعبیر کسی چنچل حسینہ کی طرح لبھاتی تھی، للچاتی تھی اور قریب آتے آتے ایک دم دور چلی جاتی تھی مگر وہ دن آ ہی گیا جب آسکر ایوارڈز کے خواب کی تعبیر حقیقت بن کر ان کے سامنے آ گئی۔ لیجنڈ موسیقار اے آر رحمٰن نے بیک وقت دو اور نغمہ نگار گلزار نے ایک آسکر ایوارڈ ایک ہی فلم میں حاصل کر لیا۔ یہ کامیابی صرف بھارتی فلمی صنعت ہی کے لیے نہیں پورے ایشیا کے لیے قابلِ فخر ہے۔ وہ آسکر ایوارڈز جن کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ انہیں حاصل کرنے کی اہلیت امریکی اور یورپی ممالک کے فنکاروں اور تیکنیک کاروں ہی کو حاصل ہے۔ یہ سوچ 81 ویں اکیڈمی ایوارڈ کی تقریب میں غلط ثابت ہوگئی جب Slumdog Millionair نے دنیا بھر کی بہترین فلموں کو پیچھے دھکیل کر 8 کیٹیگریز میں آسکر اپنے نام کر لیا جن میں بھارتی موسیقار اور نغمہ نگار بھی شامل ہیں۔ یہ بھی کچھ کم اعزاز کی بات نہیں کہ اے آر رحمٰن نے بیک وقت دو آسکر اپنے نام کیے۔ ایک فلم کی موسیقی کمپوز کرنے پر دوسرا اس فلم کا ایک نغمہ گانے پر۔ اے آر رحمٰن میوزک کی کمپوزیشن کے ساتھ ساتھ ایک گانا... اپنی ہر فلم میں گاتے بھی ہیں۔ اس فلم میں بھی انہوں نے ایک گانا گایا اور اس کی گائیکی کا انعام آسکر کی صورت میں حاصل کر لیا۔

8 آسکر ایوارڈ جیت کر دنیا بھر کے فلمی حلقوں میں تہلکہ مچانے والی فلم ''سلم ڈاگ ملنیئر'' کہنے کو تو برطانوی فلمساز و ہدایت کار کی فلم ہے لیکن ایک لحاظ سے بھارتی فلم ہے کیونکہ ایک بھارتی ناول کی کہانی پر بننے کے علاوہ اس کی تمام تر فلمبندی بھارت میں ہوئی اور فنکاروں اور تیکنیک کاروں کی بڑی تعداد بھارتیوں ہی کی ہے۔ اس فلم کو بہترین فلم کے علاوہ اس کی ہدایت کاری پر فلمساز و ہدایت کار ڈینی بوائل کو بہترین ہدایت کار کا آسکر ملا جب کہ ایڈیٹنگ، اسکرین پلے، سینماٹوگرافی اور ساؤنڈ اسکنگ کے اعزازات بھی اسی فلم کے حصے میں آئے ہیں۔

''میں اے آر رحمٰن کو سیلوٹ کرتا ہوں۔'' بھارت کے مشہور فلم ساز و ہدایت کار سبھاش گھئی آسکر ایوارڈ و ترکی عظمت کو سلام کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''انہوں نے ہم سب کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ برسوں سے ہماری فلم انڈسٹری کے لوگ آسکر کا جو خواب دیکھ رہے تھے وہ آخر کار شرمندۂ تعبیر ہوا اور اہم بات یہ ہے کہ اس خواب کی بے حد حسین تعبیر کا سہرا اے آر رحمٰن جیسے نوجوان موسیقار کے سر بندھا ہے۔'' سبھاش گھئی نے اس موقع پر اس بات کا بھی اظہار کیا۔ ''اے آر رحمٰن نے ہندوستانی فلم انڈسٹری کے لیے ترقی کے دروازے کھول دیے ہیں۔ دنیا کو معلوم ہو گیا ہے کہ ہندوستانی فلمیں بھی کسی سے کم نہیں ہوتیں۔ اب ہمارے ہاں ایسی فلمیں بنانے کی کوشش کی جائے گی جو آسکر کے معیار پر پوری اتریں گی۔ اس مقابلہ آرائی سے ہماری فلموں کو کافی فائدہ پہنچے گا۔

''سلم ڈاگ ملنیئر'' کی شاندار کامیابی پر نہ صرف فلمی دنیا بلکہ عام شہریوں میں بھی زبردست جوش و خروش کا اظہار کیا گیا۔ خاص طور پر میوزک ڈائریکٹر اے آر رحمٰن کو ہر کوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

www.paksociety.com

مبارک باد پیش کر رہا ہے۔ دوسرے بے شمار لوگوں کے علاوہ میلوڈی کوئن لتا منگیشکر نے بھی اچھے انداز میں انہیں ٹریبیوٹ پیش کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں۔ ''میں نے جب ''روجا'' میں ان کی میوزک سنی تھی اسی وقت کہہ دیا تھا کہ یہ لڑکا اپنا نام روشن کرے گا۔ آج میرا وہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ اس نے اپنا ہی نہیں بھارت اور تمام بھارتیوں کا سر فخر سے بلند کردیا ہے۔'' وہ کہتی ہیں۔ ''بات آسکر ایوارڈ حاصل کرنے کی نہیں بلکہ خوشی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی موسیقی کو دنیا نے تسلیم کرلیا ہے۔''

دنیا بھر میں جتنے بھی ایوارڈز دیے جاتے ہیں ان میں آسکر ایوارڈ سب کا بادشاہ ہے۔ اس لیے ایوارڈ کے جیتنے والوں کو بھی فن اور ٹیکنالوجی کی دنیا کا شہنشاہ تصور کیا جاتا ہے۔ چار دانگ عالم میں ان کی شہرت ہو جاتی ہے۔ ''سلم ڈاگ ملینیئر'' کی عظیم الشان کامیابی سے نہ صرف اس فلم میں پرفارم کرنے والے فنکار اور تیکنیک کار شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگے ہیں بلکہ بمبئی کے باندرہ ریلوے اسٹیشن سے متصل ایک کچی بستی یا جھونپڑ پٹی جہاں جگہ جگہ کچرے کے انبار لگے ہیں، لکڑی اور ٹن کی چادر سے بنے ڈربے نما گھر مکینوں کی مفلوک الحالی اور تنگ دستی کی منہ بولتی تصویریں ہیں، جس کی تنگ گلیوں میں بہتے گندے پانی سے بچ کر نکلنا راہ گیر کے لیے جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ یہ جھونپڑ پٹی بھی آج اس فلم کی بدولت دنیا بھر میں مشہور ہو گئی ہے۔ بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز بن گئی ہے۔ پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کے نمائندے روز ہی اس غریب بستی کے ان باصلاحیت ننھے فنکاروں سے ملنے اور بات چیت کرنے کے لیے آتے ہیں جنہوں نے 81ء ویں اکیڈمی ایوارڈ جیتنے والی فلم ''سلم ڈاگ ملینیئر'' میں مرکزی کرداروں جمال ملک (دیو پٹیل)، لاتیکا (فرائیڈا اپنٹو) اور سلیم (سدھر متل) کے بچپن کے رول کیے ہیں۔

انگریزی زبان میں بنائی گئی اس فلم کے ڈائریکٹر اور اسکرپٹ رائٹر برطانوی ہیں جب کہ اس فلم کی کہانی بھارتی مصنف اور سفارت کار وکاس سوروپ کے ایوارڈ یافتہ ناول ''کیو اینڈ اے'' سے ماخوذ ہے۔ اس فلم کے تمام اداکاروں کا تعلق بھارت سے ہے۔ اس فلم کی کہانی کا لب لباب یہ ہے کہ ممبئی کے باندرہ ریلوے اسٹیشن سے متصل ایک پس ماندہ ترین بستی دھاروی کا ایک اٹھارہ سالہ اَن پڑھ اور سڑک چھاپ نوجوان صرف اپنی گمشدہ محبت سے رابطہ

کرنے کے لیے کوئز شو ''کون بنے گا کروڑ پتی'' میں شرکت کرتا ہے اور غیر متوقع طور پر کامیابی حاصل کر کے کروڑ پتی بن جاتا ہے۔ کوئز شو کے میزبان کے نامہربان رویے کے باوجود وہ ہر سوال کا درست جواب دیتا چلا جاتا ہے۔ ایک اَن پڑھ نوجوان کا انتہائی مشکل سوالات کا جواب دینا اس پروگرام کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اسے پولیس کی تفتیش اور تشدد کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ نوجوان بتاتا ہے کہ اپنی گزری ہوئی زندگی میں وہ زمانے کا ہر رنگ دیکھ چکا ہے اور ان تمام سوالوں کے جواب بھی اس نے اپنے جیتے ہوئے شب و روز ہی میں ڈھونڈے ہیں۔

کہانی کے حوالے سے بظاہر اس فلم میں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ بس اتنی سی بات ہے کہ جہاں آج کے انسان نے اتنی ترقی کرلی ہے وہاں ایسی بھی بستیاں ہیں جن کے رہائشیوں کو زندگی کی بنیادی ضرورتیں بھی میسر نہیں۔ مصنف اور ہدایت کار نے ایسے لوگوں کی تصویر کشی کے لیے ایک عام سی تفریحی کہانی کا انتخاب کیا اور اس کے ذریعے ایسی ہی ایک بستی اور اس کے لوگوں کو منظر عام پر لایا ہے۔ ایسی بستیاں صرف ممبئی ہی میں نہیں پاکستان سمیت بیشتر ممالک میں موجود ہیں اور اقوام عالم کو اپنے متعلق سوچ اور فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ بیشتر بڑی فلمیں ایسے ہی موضوعات کو سامنے رکھ کر بنائی جاتی ہیں۔ بھارتی شہرۂ آفاق ہدایت کار ستیہ جیت رائے کی اولین فلم ''پوتھیر پنچالی'' بھی ایک پس ماندہ گاؤں کے پس منظر میں تھی۔ جب کہ پاکستان میں بننے والی فلم ''جاگو ہوا سویرا'' بھی غریب مچھیروں کی زندگی کی عکاسی کرنے والی فلم تھی۔ مچھلی کے ٹھیکیداروں کے استحصال کی کہانی تھی۔ بھارت میں بھی ایسی کئی فلمیں بنی ہیں جن میں زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم لوگوں کی کہانیاں فلمائی گئی ہیں۔ آکروش، انکوش، البرٹ پنٹو کو غصہ کیوں آتا ہے۔ سلیم لنگڑا وغیرہ شامل ہیں۔ ایسی ساری فلموں سے چاہے وہ کہیں بھی بنی ہوں۔ بین الاقوامی طور پر پذیرائی حاصل کی ہے۔

''سلم ڈاگ ملینیئر'' اکیڈمی ایوارڈ حاصل کرنے سے پہلے دو بین الاقوامی فلمی میلوں میں نمائش کے بعد سب سے پہلے نومبر 2008ء میں محدود پیمانے پر امریکا میں ریلیز کی گئی۔ امریکا میں اس فلم کی ڈسٹری بیوشن کے حقوق جس کمپنی نے حاصل کیے تھے۔ وہ انہی دنوں ختم ہو گئی تھی مگر اس فلم

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

نے خلافِ توقع تیزی سے مقبولیت حاصل کی اور دسمبر 2008ء میں اسے پورے امریکا میں نمائش کے لیے پیش کردیا گیا۔ جنوری 2009ء میں برطانیہ میں بھی اس فلم نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ آسکر ایوارڈ سے پہلے اس فلم نے مغربی دنیا میں متعدد ایوارڈ جیتے۔ جن میں گولڈ گلوب بھی شامل ہے۔ یہ فلم گولڈن گلوب ایوارڈز کی چار کیٹیگریز (بہترین فلم، بہترین ہدایت کار، بہترین اسکرین پلے اور بہترین موسیقی) میں فاتح رہی۔ تمام فلمی ماہرین اور ناقدین نے اسے 2008ء کی بہترین فلم قرار دیا۔

اکیڈمی ایوارڈ کے لیے پہلے سال بھر کی بہترین فلموں اور ان کی کیٹیگریز کے لیے نامزدگی کی جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس بار جس فلم کو 13 کیٹیگریز میں نامزد کیا گیا تھا۔ اسے صرف دو آسکر مل سکے جو بہترین آرٹ ڈائریکشن اور بہترین میک اپ سے متعلق ہیں۔ اس فلم کا نام The curious case of bejamin button ہے۔ یہ فلم امریکی مصنف کی کہانی پر بنائی گئی ہے اور ایک ایسے شخص Benja min button کے شب و روز کا احاطہ کرتی ہے جو اپنی پیدائش کے وقت سے ہر لحاظ سے ایک 70 سالہ بوڑھا نظر آتا ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی جسمانی ساخت بڑھاپے سے جوانی کی سمت سفر کرتی ہے۔ بینجمن کا رول معروف اداکار بریڈ پٹ نے کیا ہے۔ جب کہ اس کے ہدایت کار ڈیوڈ فنچر ہیں۔ اس کے مقابلے میں 10 کیٹیگریز میں نامزد ہونے والی فلم "سلم ڈاگ ملینیئر" کو 8 کیٹیگریز میں ایوارڈ ملے۔ یہ بھی اس فلم کی خوبیوں میں ایک اہم خوبی ہے کہ اس فلم نے اتنی زیادہ کیٹیگریز میں آسکر اپنے نام کیا۔ نغمہ نگار گلزار کے لکھے ہوئے گانے "جے ہو" کو بہترین گیت کا آسکر ایوارڈ ملنا بھی بڑی بات ہے۔ کسی ہندی گیت کی عالمی سطح پر پذیرائی کوئی معمولی بات نہیں۔ بقول لیجنڈ گلوکارہ لتا منگیشکر "خوشی کی بات یہ ہے کہ ہندوستانی موسیقی کو دنیا نے تسلیم کیا ہے۔" گلزار اس گیت کے بارے میں کہتے ہیں۔ "گیت کے بول جتنے اچھے ہیں اس کی دھن بھی اتنی ہی اچھی ہے اور اسے فلمایا بھی بہتر انداز میں گیا ہے۔ سب کچھ اوریجنل معلوم ہوتا ہے۔" وہ بتاتے ہیں کہ جب اے آر رحمٰن نے میرے گیت پر دھن بنانا شروع کیا تو میں خود بھی حیرت میں پڑ گیا کیونکہ یہ سب سے الگ تھا۔

اس گیت کی بھی ایک کہانی ہے۔ دلچسپ بھی اور حیران کن بھی۔ یہ گیت حقیقتاً "سلم ڈاگ ملینیئر" کے لیے لکھا اور کمپوز نہیں کیا گیا تھا۔ اے آر رحمٰن نے پروڈیوسر ڈائریکٹر سبھاش گھئی کی فلم "یووراج" کے لیے اسے ریکارڈ کروایا تھا لیکن بعد میں سبھاش گھئی نے یہ کہہ کر اس گانے کو یووراج میں شامل کرنے سے انکار کردیا کہ اس کی اب اس فلم میں گنجائش نہیں ہے۔ اے آر رحمٰن کا کہنا ہے کہ سبھاش گھئی کی فلمیں بہترین موسیقی کے لیے جانی جاتی ہیں۔" کیونکہ وہ موسیقی اور خاص طور پر دل کو چھو لینے والی محبت بھری موسیقی کی خاصی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔" اس تناظر میں دیکھا جائے تو فلمساز و ہدایت کار سبھاش گھئی کے انکار کے بعد موسیقار اے آر رحمٰن کوئی اعتراض بھی نہیں کرسکتے تھے۔ انہوں نے اس بات کو سبھاش کی مرضی سمجھ کر قبول کرلیا اگرچہ انہوں نے "یووراج" کی موسیقی میں کچھ نئے تجربات کیے تھے۔ جن میں یہ مسترد کیا ہوا گیت بھی شامل تھا۔ یہ گیت گلزار کو بھی بہت پسند تھا۔ انہوں نے اپنے طور پر بھی اس بات کی کوشش کی کہ اسے فلم سے خارج نہ کیا جائے لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ گھئی نے جو فیصلہ کیا تھا اس میں اٹل رہے۔ پھر جب اے آر رحمٰن کو "سلم ڈاگ ملینیئر" میں میوزک ڈائریکٹر منتخب کیا گیا تو انہوں نے اس فلم کے ڈائریکٹر ڈینی بوائل کو یہ گیت سنایا۔ ڈینی نے اسے نہ صرف پسند کیا بلکہ اپنی فلم میں شامل کرنے کی رضامندی بھی دے دی۔ اس طرح وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا والی بات سچ ثابت ہوگئی۔ اس گیت کو تو دراصل آسکر ایوارڈ کا جھومر اپنے ماتھے پر سجانا تھا۔ ایسے ہی موقع کے لیے بڑے بوڑھے کہتے ہیں۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے گلزار اس بات کا کریڈٹ کہ اس ہندی گیت نے دنیا کا سب سے بڑا ایوارڈ حاصل کرکے ایک تاریخ رقم کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا سہرا اے آر رحمٰن کے سر بندھتا ہے۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ گلزار بڑے شاعر ہی نہیں بڑے انسان بھی ہیں۔

اس فلم کی شاندار کامیابی پر جہاں اس کے تمام ایوارڈ ونرز کو مبارک باد دی گئیں۔ وہاں سب سے زیادہ تعریف اے آر رحمٰن کی بھی کی گئی ایک طرح سے وہ اس کامیابی کے اصل دولہا ہیں۔ عام لوگوں کے علاوہ بھارت کے صدر پرتھبیا پاٹل، وزیراعظم من موہن سنگھ، بھارتی پارلیمنٹ کے اسپیکر سومناتھ چیٹر جی اور دیگر وزراء نے دل کھول کر اے آر رحمٰن کو مبارک باد دی اور اس بات کا اظہار کیا کہ ان کی کارکردگی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

نے دنیا بھر میں بھارت کا نام روشن کیا ہے۔ اے آر رحمٰن کی بہترین کارکردگی کا اعتراف کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا۔ یونیورسٹی کے مطابق اے آر رحمٰن نے دو آسکر ایوارڈ حاصل کر کے واقعی ایک کارنامہ انجام دیا ہے، ساتھ ہی ان کی شعبہ موسیقی میں غیر معمولی خدمات ہیں جن کا اعتراف اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے ذریعے ہی کیا جاسکتا ہے۔

ہر چیز کے دو رخ ہوتے ہیں۔ اچھائی کے ساتھ ساتھ اس کی برائی بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح ''سلم ڈاگ ملینئر'' کا بھی حال ہے۔ مغربی ممالک میں دھوم مچانے والی اس فلم کو بھارت میں وہ رسپانس نہیں ملا جس کی توقع کی جارہی تھی۔ حالانکہ اس کی پوری کاسٹ بھارتی اداکاروں پر مشتمل ہے جب کہ اس فلم کی بدولت موسیقار اے آر رحمٰن کی صورت میں بھارت کو دو آسکر ایوارڈ جیتنے کا موقع بھی ملا اور گلزار نے ہندی گیت کو پوری دنیا میں سرفراز کرایا۔ بھارت میں اس فلم کو ہر طرف سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب اسے مغربی ممالک میں منعقد ہونے والے ایوارڈ میں نامزدگی ملنا شروع ہوئی۔ اس فلم کو تنقید کا نشانہ بنانے والوں میں لیجنڈ امیتابھ بچن کے علاوہ عامر خان، راج ببر، ہیمامالنی، شلپا سیٹھی اور دیگر شامل ہیں۔ امیتابھ بچن کا کہنا ہے جب بھی مغرب میں بھارتی پس منظر پر کوئی فلم بنائی جاتی ہے تو اس میں ہمیشہ بھارت کے تاریک پہلوؤں ہی پر توجہ دی جاتی ہے۔ اس فلم میں بھی ممبئی کی ایک انتہائی پس ماندہ اور غریب بستی کے حالات دکھائے گئے ہیں۔

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں کے مصداق ''سلم ڈاگ ملینئر'' کے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ خاص طور پر بھارت کا مخصوص فلمی طبقہ اس فلم کے خلاف اپنے دلوں کی بھڑاس نکالتا رہا لیکن جب اس فلم کو پے در پے ایوارڈز ملتے گئے اس کے بعد بھارتی حلقے بھی اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ گولڈ گلوب، بافٹا اور پھر آسکر ایوارڈز کے بعد بھارت میں بھی بالآخر اس فلم کے خلاف بیانات اور احتجاجی جذبات کے اظہار کا سلسلہ رکا۔ امیتابھ بچن نے اے آر رحمٰن اور گلزار کو آسکر ایوارڈ حاصل کرنے پر مبارک دی اور کہا میں ان دونوں کو آسکر جیتنے پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ ان کی اس کامیابی پر میں بہت خوش ہوں۔ اے آر رحمٰن میری نظر میں بلاشبہ بہترین موسیقار ہیں۔ ان کے آسکر جیتنے پر فلم سازوں کا حوصلہ بلند ہوا ہے۔

پاکستان میں بھی اس حوالے سے کئی لوگوں نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا ہے کہ اس کامیابی سے ایشیا کا نام روشن ہوا ہے۔ ایسے لوگوں میں پی ٹی وی کے سابق سینئر پروڈیوسر یاور حیات کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ''بالی ووڈ انڈسٹری کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ اس نے وقت کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے بین الاقوامی مارکیٹ میں اپنی جگہ بنائی۔ جس کا نتیجہ ہے کہ آج ہالی ووڈ کے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بھی ان کے ساتھ مشترکہ فلم سازی کررہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے۔'' بالی ووڈ کو اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ آسکر ایوارڈ میں دھوم مچانے والی فلم کے فنکار، تکنیک کار اور موسیقار نغمہ نگار سمیت سب کا تعلق بھارت سے ہے جنہوں نے دنیا کے سب سے بڑے آسکر ایوارڈ کو اپنے نام کر کے بھارت ہی کا نہیں پورے ایشیا کا نام روشن کیا ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''سلم ڈاگ ملینئر'' کی کامیابی سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ پاکستان سمیت دیگر ایشیائی ممالک بھی اگر اس طرح کی فلمیں بنائیں تو عالمی پذیرائی حاصل کرسکتے ہیں۔''

آسکر کی تقریب کا اصل دولہا اے آر رحمٰن تھا جس نے بیک وقت دو آسکر ایوارڈ جیت کر اپنے لیے ہی نہیں تمام ایشیائی ممالک کے آرٹ لورز کے لیے خوشیوں کے ساتوں دروازے وا کردیے ہیں۔ ان کی اس عظیم الشان کامیابی پر اعلیٰ حکومتی عہدیداروں سے لے کر جھونپڑپٹیوں کے مکینوں تک نے انہیں مبارک باد دی جب کہ وہ آسکر ایوارڈ لے کر وطن واپس لوٹے تو سب سے پہلے کڑپا میں اپنے پیر خواجہ سید عارف حسینؒ کے مزار مقدس پر حاضری دینے پہنچے۔ انہیں سلام کیا، فاتحہ خوانی کی اور ان کے مزار پر بیٹھ کر عزت دینے والے رب العالمین کا شکریہ ادا کیا۔ رحمٰن کی ایک پرانی عادت ہے کہ اپنا ہر کام شروع کرنے سے قبل اور کام کے اختتام کے بعد اپنے پیر بابا کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ ان کی روح کو ایصال ثواب پہنچاتے ہیں اور اللہ سے رجوع کرتے ہیں۔ ''اے مولا کریم! میں تو تیرا ایک عاجز بندہ ہوں تو اپنے اس نیک بندے کے طفیل میری مدد فرما۔ میرے کام میں بہتری فرما۔ بے شک عزت، شہرت اور عظمت دینے والی ذات صرف تیری ہی ہے۔''

اس حاضری کے وقت بھی رحمٰن کے آنسو اس کے دل

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کی ترجمانی کررہے تھے۔ اظہارِ تشکر کے طور پر اس کے بہنے والے اس کے آنسو اپنے مولا کریم سے وہ کچھ کہہ رہے تھے جو شاید الفاظ کی صورت میں وہ کبھی بیان نہیں کرسکتا تھا۔ اس مزار سے اس کی عقیدت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی والدہ کے بقول اسی دوبار میں بیٹھ کر اس نے زندگی اور موت دینے والی ذات سے رحمٰن کی زندگی کی دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی تھی۔ وہ کہتی ہیں کہ جس طرح ماں کی سفارش پر سخت گیر باپ بچوں کی ضد پوری کردیتا ہے اسی طرح اللہ کے نیک بندوں کے صدقے سے مانگی ہوئی دعائیں بھی رب العزت قبول فرمالیتا ہے۔

کہتے ہیں کہ رب راضی تے سب راضی۔ اللہ رکھا رحمٰن پر بھی رب شروع ہی سے راضی ہے۔ آسکر ایوارڈ کا اعزاز تو اسے بہت بعد میں ملا جب کہ بہت پہلے سے اسے بھارتی فلم انڈسٹری کے لیجنڈ موسیقار کی حیثیت سے شہرت مل چکی تھی۔ اس کی شہرت صرف برصغیر پاک و ہند تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کے چاہنے والے دنیا بھر میں موجود تھے۔ اس نے اتنی سی عمر میں دنیائے موسیقی میں وہ مقام حاصل کرلیا جس کا بہت سے موسیقار صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ وہ آیا، اس نے دیکھا اور فتح کرلیا۔ یہ بات اس پر صد فیصد پوری اترتی ہے۔ وہ کہانیوں کا ایسا کردار ہے جس کے پاس نہ تو جادو کی چھڑی ہے۔ نہ ہی وہ منہ میں سونے کا چمچ لے کر کسی محل میں پیدا ہوا بس وہ اچانک دیکھتے ہی دیکھتے شہرت کی بلندیاں عبور کرگیا۔ بغیر کسی سہارے سفارش با اثر و رسوخ کے بغیر صرف دس سال کے عرصے میں موسیقی کی دنیا میں شہرت اور پسندیدگی کے آسمان کو چھولیا۔ اے آر رحمٰن نے بہ طور موسیقار اپنے کیریئر کی ابتداء تامل فلم ''روجا'' کی موسیقی دے کر کی۔ ''روجا'' کی موسیقی نے نہ صرف بھارت میں دھوم مچائی بلکہ اس کی شہرت بیرونِ ملک بھی پہنچ گئی۔ مشہور امریکی جریدے ٹائم میگزین نے 2005ء میں ''روجا'' کے میوزک البم کو ٹاپ ٹین مووی ٹریکس آف آل ٹائم میں شامل کیا۔ یہی جریدہ اے آر رحمٰن کو ''مدراس کا موزارٹ'' بھی قرار دے چکا ہے۔ پہلی ہی فلم کی موسیقی نے اے آر رحمٰن کو بہترین موسیقار کے نیشنل ایوارڈ کا حقدار بنا دیا اور بعد ازاں اس کے ایوارڈز کی فہرست طویل تر ہوتی گئی جو بالآخر اکیڈمی ایوارڈ تک پہنچ گئی۔ یہ اس کا ریکارڈ ہے کہ اپنی تقریباً ہر فلم کے لیے رحمٰن نے کوئی نہ کوئی ایوارڈ حاصل کیا ہے۔ تامل فلم انڈسٹری میں دھوم مچانے کے بعد اے آر رحمٰن نے رام گوپال ورما کی فلم ''رنگیلا'' کی موسیقی ترتیب دے کر بالی ووڈ میں قدم رکھا۔ یہاں آکر بھی اس خداداد صلاحیتوں کے مالک نے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے۔ موسیقار کے ساتھ ساتھ وہ گلوکار بھی ہے لیکن وہ منتخب گانوں ہی میں اپنی آواز کا جادو جگاتا ہے۔ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جانے کے باوجود اس کی طبیعت میں انکساری کا پہلو نمایاں ہے۔ رحمٰن کی کامیابی کی شاید یہ وجہ بھی ہے کہ وہ اپنی ہر فلم کی موسیقی ترتیب دیتے وقت کچھ نئے تجربے بھی کرتا ہے۔ رحمٰن ایسے موسیقار کے طور پر بھی جانا پہنچانا جاتا ہے جو نئے گانے والوں کو آگے لانے اور ابھرنے کا موقع دیتا ہے۔

رحمٰن پر مولا کیوں مہربان ہے؟ یہ تو وہی جانتا ہے۔ البتہ ہمارے ہاتھ اس الجھی ہوئی ڈور کا ایک سرا آیا ہے۔ بہت ممکن ہے اس مہربانی کی یہی وجہ ہو۔

غالباً 1996ء میں اے آر رحمٰن اپنی والدہ اور شاعر محبوب کے ساتھ صرف دو دن کے لیے مدراس سے لاہور آیا تھا۔ اس دوران جہاں اس نے اپنے روحانی استاد نصرت فتح علی خان سے ملاقات کی وہاں لاہور کے ایک معروف صحافی کو ایک انٹرویو بھی دیا تھا۔ یہ ٹیپ شدہ انٹرویو آج بھی صحافی مذکور کے پاس محفوظ ہے جو اس وقت شائع ہونے کی بجائے تقریباً اس برس بعد اشاعت پذیر ہوا، جب انٹرویو لیا گیا تھا اس وقت صحافی کو یہ کہہ کر اس کی اشاعت کی اجازت نہیں دی گئی تھی کہ اس کی اشاعت سے استاد نصرت فتح علی خان کہیں کسی مصیبت میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ کیونکہ بعض حلقوں کی طرف سے استاد نصرت پر کڑی اور بے جا تنقید کی جاتی تھی۔ ایسے حالات میں اگر اے آر رحمٰن کا یہ انٹرویو شائع کیا گیا تو کم ظرف لوگ اس عظیم الشان سچ کو یہ کہہ کر داغدار کرنے کی کوشش ضرور کریں گے کہ ایک قوال کو ولی اللہ ثابت کرنے کی مہم شروع کردی گئی ہے۔

اے آر رحمٰن کا وہ انٹرویو کیا تھا۔ اس کا ایک خاص حصہ اللہ رکھا رحمٰن ہی کی زبانی سنیے۔

''نیویارک میں استاد نصرت فتح علی خان کا ایک بڑا کنسرٹ جاری تھا۔ استاد اپنی مشہور قوالی ''اللہ ہو'' سنا رہے تھے جس میں ہزاروں مسلمانوں کے ساتھ ہزاروں گورے گوریاں بھی ''اللہ ہو'' کا ورد کرنے میں مصروف تھے۔ ''اللہ ہو'' کے ورد اور میرے دل کی تال جب ایک ہوئی تو مجھ پر راز افشا ہوا کہ سچ کیا ہے؟ کنسرٹ کے بعد جب میں مدراس واپس آیا تو ہر وقت میرے دھیان میں ''اللہ ہو'' کا ورد رہنے لگا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرا دل دھڑک دھڑک کر اللہ ہو اللہ ہو کہہ رہا ہو۔ پھر ایک رات میرے پیر بابا میرے خواب میں آئے اور انہوں نے مجھے بشارت دی۔ پروردگار نے تیرے اور تیرے اہل خانہ کے لیے کلمہ پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ ''ہم سب گھر والوں نے اگلی صبح کلمہ طیبہ پڑھا اور مسلمان ہوگئے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بپھرے سمندر میں

فرزانہ نکہت

مہم جوئی کے شوق میں کبھی کبھی زندگی داؤ پر لگ جاتی ہے۔ وہ بھی سمندر کے نیچے مونگے کی چٹانوں کے درمیان اتری تھی کہ سمندر کی لہروں نے غضب ڈھا دیا۔ زندگی اور موت کی آنکھ مچولی شروع ہو گئی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ موت اس کا مقدر بن چکی ہے۔

نازکی عورت کا خاصہ ہے پھر بھی اس نے ناقابل یقین مرحلہ طے کرلیا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

جب چوالیس سالہ ویوین سلیئر اس تیس فٹ لمبی فائبر گلاس کی بنی ہوئی کشتی میں کھڑی اپنے چہرے پر ماسک ٹھیک کر رہی تھی تو ڈائیو ماسٹر کیون پیٹرسن نے اسے خبردار کیا۔ ”اپنے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ رہنا، ورنہ مصیبت میں پڑ جاؤ گی۔“

وہ آٹھ غوطہ خور ویسٹ انڈیز میں ٹوباگو کے شمال مشرق میں گوٹ آئی لینڈ اور لٹل ٹوباگو کے درمیان دو میل کے رقبے پر بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے جزائر کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

منیر نیازی

ممتاز اردو اور پنجابی شاعروں ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم پائی جنگِ عظیم دوم کے دوران ہندوستانی بحریہ میں بھرتی ہوگئے لیکن جلد ہی ملازمت چھوڑ کر گھر واپس آگئے۔ زمانہ طالب علمی میں مشق سخن شروع کردی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور آگئے اور اصولِ معاش کے لیے مختلف کام کیے۔ شاعری میں منفرد سوچ اور اسلوب کے مالک ہیں۔

مرسلہ: عنایت مسیح۔ کراچی

درمیان پھیلی ہوئی مونگے کی چٹانوں کو کھوجنے کی مہم پر روانہ ہونے والے تھے۔

فرینک نے پانی میں جہازوں کی رہنمائی کرنے والی... تیرتی ڈوری کی بھاری چرخی اتار رکھی تھی جس کے ساتھ خالی پیپے بندھے ہوئے تھے۔ اس رسی کی مدد سے سمندر میں بھٹکنے والا آدمی جلد ہی کشتی میں واپس آسکتا تھا۔

ویوین نے اپنے ٹینک میں ہوا کا دباؤ چیک کیا۔ پھر جب اس نے کشتی سے پانی میں الٹی چھلانگ لگائی تو جھاگ بھرے گرم سمندری پانی نے فوراً ہی اسے اپنے اندر کھینچ لیا۔ اس کے ڈائیو کمپیوٹر نے جو کپاس کے ساتھ ایک ٹیوب کے ذریعے ائر ٹینک تھا فوراً ہی خودکار طریقے سے اپنا کام کرنے لگا۔ 19 مارچ 1997ء کو سمندر میں لگایا جانے والا یہ ویوین کا 61واں غوطہ تھا۔ یہ اس نرم لب و لہجے والی فلاڈلفیا کے ایک دفتر میں کمپیوٹر پر کام کرنے والی عورت کے لیے واقعی ایک اعزاز کی بات تھی۔

سمندر میں اترنے کے بعد ویوین، جین فیری اور کیری کے چھوڑے ہوئے بلبلوں کا تعاقب کرنے لگی جو پچھتر فٹ کی گہرائی میں بڑے آرام سے تیرتے چلے جارہے تھے۔ بیس فٹ کی تیراکی کے بعد پانی کے بہاؤ میں اتنی تیزی پیدا ہوگئی کہ ویوین کو اپنے آپ بہہ جانے سے روکنے کے لیے کسی چیز پر گرفت میں کرنے کی کوشش کرنی پڑی۔ اس نے ایک زیر آب چٹان کے قریب تیرتے ہوئے اپنی رفتار کم کرنے کی کوشش کی لیکن سمندر کی تیز و تند موجوں نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو فوراً ہی ان کے راستے سے ہٹا کر جانب شمال دھکیل دیا۔ ویوین پانی کے تیز بہاؤ کے ساتھ بہتی ہوئی کیری سے جا ٹکرائی۔ ''اوہ! یہ دھارا بیس ناٹ کا تو ہوگا۔'' اس نے سوچا۔ اپنے آپ کو پانی میں بھٹک جانے سے بچانے کے لیے وہ تختی کے ساتھ ایک انچ کے ساتھ چمٹ گئی۔ اس کے بازو اتنی قوت صرف کرنے پر درد کرنے لگے۔

ہوا کا ذخیرہ تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ اس نے فرینک کو اشارے سے بتایا کہ وہ اوپر جا رہی تھی لیکن بیس فٹ اوپر پہنچتے ہی اس نے ڈھیلی پڑی ہوئی اشارتی ڈوری کو تنتے دیکھا۔ مخالف سمت سے آنے والی پانی کی روئیں اسے اپنے ساتھیوں سے دور لے جا رہی تھیں۔ اس نے اپنی صدری میں ہوا بھری اور اشاراتی ڈوری سے سوگز جانب شمالی سطح آب پر ابھر آئی۔ اس نے دائرے کی صورت میں چکر لگایا اور لائف بوٹ دیکھ لی۔

''ارے بھئی میں یہاں ہوں۔'' وہ اس کی طرف منہ کرتے ہوئے زور سے پکاری۔

کشتی کے کپتان وان کیمبل نے اس کی آواز نہ سنی۔ جبکہ ویوین نے سوچا تھا کہ وہ مجھے ضرور دیکھ لیں گے۔

لیکن اب پانی کی تیز و تند رو اسے کشتی سے دور دھکیلنے لگی تھیں۔ ویوین نے اپنا ماسک مضبوطی سے چہرے پر لگایا اور اپنے اسنارکل کے ربڑ کے ماؤتھ پیس کو دانتوں کے درمیان دبا لیا۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ لائف بوٹ سے اسے ضرور دیکھ لیا جائے گا اس لیے اسے پُرسکون رہنا چاہیے۔ لیکن جلد ہی وہ گوٹ آئی لینڈ کی سرسبز ترائیوں اور لٹل ٹوباگو کے درمیان کی جانب شمالی بحر اوقیانوس کی طرف بہتی چلی گئی۔

جین فیری جو اس پروگرام کا انچارج تھا، کشتی میں آبیٹھا۔ دوسرے غوطہ خور اس کے پیچھے ہولیے۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

''ویوین کہاں ہے؟''

''اس نے سب سے پہلے چٹان کو چھوڑا تھا۔'' فرینک نے جواب دیا۔ ''میں نے اسے اشاراتی ڈوری کے قریب دیکھا تھا۔ وہ بخیریت تھی۔''

پانچ منٹ گزر گئے۔ پھر دس منٹ اور گزر گئے۔ غوطہ خوروں نے لٹل ٹوباگو کے اردگرد کا تمام علاقہ چھان مارا لیکن انہیں ویوین کا کوئی سراغ نہ ملا۔ وان کیمبل نے کشتی کا گیئر بدلا اور اسے دائرے کی صورت میں سمندر میں دوڑانے لگا۔

فرینک نے دوسری لائف بوٹوں کو ریڈیو سگنلز بھیجے کہ وہ ان کے ساتھ مل کر سمندر میں ویوین کو تلاش کریں۔ جب

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اس نے مائیکروفون رکھا تو وہ بے حد افسردہ اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ ''اپنی تمام زندگی میں ایسی صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوا۔'' اس نے شکستہ سی آواز میں کہا۔

جینن کو یاد آیا کہ ویوین نے گزشتہ دن غوطہ خوری سے واپس آنے کے بعد اس سے شدید سر درد اور اعصابی دباؤ کی شکایت کی تھی۔

''اللہ کرے وہ کسی حادثے سے محفوظ ہو۔'' اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔ ''اس کے پھیپھڑوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔''

''ہم اس کی تلاش جاری رکھتے ہیں۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میرے خیال میں وہ یہاں نزدیک ہی کہیں ہوگی۔''

ادھر دس فٹ اونچی تیز و تند لہروں کے دوش پر ڈولتے ہوئے ویوین بپھری ہوئی رووں بدلتے مدوجزر اور ہوا کے تیز و تند جھکڑوں میں پھنس گئی۔ یہ پُرقوت قوتیں ایک دوسرے پر غلبہ پانے کے لیے جزائر کے ساحلوں کے قریب آپس میں الجھ رہی تھیں۔ جونہی ایک لہر ویوین کے اسنارکل سے ٹکرائی اس نے منہ بھر کر نمکین پانی تھوک دیا۔

وسطِ دوپہر کا سورج اس کے سر پر چمک رہا تھا۔ اس کی طبیعت مالش کر رہی تھی۔ شمال مشرق سے متواتر چلتی رہنے والی تجارتی ہوا کے ساتھ سمندر کے پانی میں سرنگیں بنا بنا کر جانب شمال بہنے والی تیز رووں نے اسے کھوجنے جانے والے رقیبے سے اور بھی دور دھکیل دیا۔

''شاید میں سمندر میں بہت دور آگئی ہوں اسی لیے وہ مجھے نہیں دیکھ پا رہے۔'' اس نے پریشانی کے عالم میں سوچا اور اپنی صدری میں ہوا کا دباؤ بڑھا دیا۔ وہ سطحِ آب پر کندھوں تک اوپر ابھر آئی لیکن اسی وقت ایک بپھری ہوئی لہر نے اسے شمالی جانب دھکیل دیا۔

درجن بھر کے قریب کھوجی کشتیاں تمام دن ٹوباگو اور لٹل ٹوباگو کے درمیان ویوین کو تلاش کرتی رہیں۔ بلیو ویسٹرن ان کے جنرل منیجر رنگی میکلین نے ٹرمیں ڈاڈ اور ٹوباگو کے کوسٹ گارڈز سے ایک کھوجی ہوائی جہاز بھجوانے کی درخواست کی لیکن انہوں نے ایسا جہاز بھجوانے سے معذوری ظاہر کردی۔ اس پر میکلین نے ایک پرائیویٹ کمپنی سے رابطہ کیا۔ ''جلدی سے ایک کھوجی جہاز بھجوادو۔ اخراجات کی پرواہ مت کرو۔ ہمیں ہر قیمت پر اس عورت کو تلاش کرنا ہے۔''

کیری فیری غوطہ خور کشتی کے دنبالے میں سمٹا سکڑا بیٹھا ہوا دوربین آنکھوں سے لگائے سمندر کی ابھرتی ڈوبتی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔ جب سے ویوین ان غوطہ خوروں کے گروپ میں شامل ہوئی تھی، وہ اس کا مستقل ساتھی اور رہنما تھا۔ وہ دونوں اکٹھے کیریبین میں غوطہ خوری کی کئی مہمات سر کر چکے تھے۔ اب اسے رہ رہ کر یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ اس کی دوست کہیں جان سے ہاتھ ہی نہ دھو بیٹھی ہو۔ ''حوصلہ رکھو ویوین۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''ہم تمہیں ضرور تلاش کرلیں گے۔''

قارئین متوجہ ہوں
پرچا نہیں ملتا
کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔
☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔
رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس 0301-2454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

لیکن تیز و تند لہروں نے کشتی کا آگے بڑھنا مشکل بنا دیا۔ یہ بپھری لہریں اس کے اگلے حصے سے ٹکراتے ہوئے اسے پیچھے دھکیلنے لگیں۔

''اب کیا کریں؟'' جین فیری مایوسی سے بولا۔ ''ہم صرف ایک بندے کی خاطر چھ بندوں کی جانیں ہلاکت میں نہیں ڈال سکتے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کشتی کا رخ موڑا اور ساحل کی طرف واپس ہولیا۔

ادھر بپھری اور تیز و تند لہروں سے لڑتے بھڑتے ویوین کی ہمت جواب دینے لگی۔ ''کشتی کہاں گئی؟'' اس نے پریشانی کے عالم میں خود سے سوال کیا اور اپنے ڈائیو کمپیوٹر پر نگاہ ڈالی۔ اسے کشتی کا اتا پتا گم کیے چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ ایک دم ہی اس کے ذہن میں ایک خوف ناک خیال پیدا ہوا۔ ''وہ لوگ شاید سطح آب پر کسی زندہ چیز نہیں بلکہ کسی لاش کے ابھر آنے کے منتظر ہیں۔''

''کوئی بھی مجھے تلاش نہیں کر رہا؟'' اس نے با آواز بلند خود کلامی کی۔ ''لیکن میں بھی اتنی آسانی سے حوصلہ ہارنے والی نہیں۔''

ویوین کو جنوب مغرب میں ٹوباگو کے ہرے بھرے جنگلات کی پٹی دکھائی دے رہی تھی۔ مسلسل گرتی بلند ہوتی موجوں نے اسے بحر اوقیانوس کے کھلے پانیوں میں دھکیلنے کے ساتھ ہی یہ نظارہ بھی اس کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔

''اوہ خدایا! میں کہاں گئی؟'' وہ کراہی۔

ٹوباگو اب جنوب میں تھا اور افق پر موہوم سا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ تیز روئیں اور تجارتی ہوائیں اسے جزیرے کے شمال مشرقی سرے کی طرف بہائے لیے جارہی تھیں۔ ''مجھے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔'' ویوین نے پرعزم انداز میں سوچا۔ اپنے بچالیے جانے کی امید اسے اب فضول ہی معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کے ساتھی شاید اسے غرقاب فرض کر کے وہاں سے جا چکے تھے۔ اس نے اپنے لمبے نیلے پنجوں (Fins) کے ساتھ زور زور سے پانی کو چیرنا شروع کر دیا۔ وہ تیز و تند آبی دھاروں کے ساتھ اس وقت تک لڑتی رہی جب تک اس کی طاقت جواب نہ دے گئی۔ پھر بھی وہ پرعزم تھی۔ ''میں ہرگز اس بے رحم سمندر کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہوں گی۔''

بلیو ویسٹرن ان کے غوطہ خور خاموشی سے بائیوب میں چکراتی کھوجی کشتیوں کو دیکھ رہے تھے۔ نہ تو کوسٹ گارڈ کا جہاز اور نہ ہی پرائیویٹ چارٹرڈ شدہ جہاز ویوین کو کہیں تلاش کر سکے تھے۔

''ہم اسے ضرور تلاش کر لیں گے۔'' میکلین نے امریکیوں کو یقین دلایا۔

جین نے سطح سمندر پر نظریں دوڑائیں۔ ''اب تو اندھیرا ہونے کو آرہا ہے ریگی۔''

''ہم امید کا دامن نہیں چھوڑ سکتے۔'' میکلین بولا۔

پانی میں مسلسل ٹانگیں چلاتے چلاتے ویوین کو اب اپنی ٹانگیں بے حد بھاری معلوم ہونے لگی تھیں لیکن اس نے آرام کا خیال اپنے ذہن سے نکال دیا تھا۔ اس نے نیوجرسی میں اپنے دوست لیری کا تصور کیا۔ وہ اس وقت اپنے کام سے گھر واپس آچکا ہوگا اور اپنے بھورے لیبریڈار کتے کو کھلا پلا رہا ہوگا۔ وہ زندگی اسے اب کسی دوسرے ہی سیارے کی معلوم ہو رہی تھی۔ پھر اس نے پنسلوانیا میں موجود اپنے والدین کا تصور کیا۔ جنھیں فون پر اس کی موت کی خبر دی جارہی ہوگی۔ نہیں! ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہوگا۔ وہ زندہ رہے گی۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے اپنے اندر ایک نئی ہمت اور حوصلہ ابھرتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ پہلے سے زیادہ مستعدی اور تیزی کے ساتھ پانی میں ٹانگیں چلانے لگی۔

سورج کی کرنیں اس وقت کائنات کو بمشکل ہی روشن کر رہی تھیں جب ویوین نے کسی موٹر بوٹ کی آواز سنی۔ وہ پوری قوت سے ٹانگیں چلاتی ہوئی سطح آب پر ابھری اس نے اپنے سے کچھ فاصلے پر ایک سفید کشتی کو پانی میں رواں دیکھا۔

''ارے! میں یہاں ہوں۔'' وہ سر کے اوپر زور زور سے بازو لہراتے ہوئے پوری آواز کے ساتھ چلائی مگر وہ کشتی جلد ہی لہروں میں غائب ہوگئی۔

ویوین کی گردن تکلیف سے سوج گئی تھی۔ وہ بدستور پوری قوت اور مستعدی کے ساتھ تیز آبی دھاروں کو چھیرتے ہوئے ٹانگیں چلا رہی تھی۔ پھر ایک دم ہی اسے کوئی پھنکارتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ایک بپھری ہوئی تیز و تند لہر نے اپنے دوش پر بلند کرتے ہوئے ٹوباگو کے شمال مشرقی ساحل کی چٹانوں کی طرف اچھال دیا۔ اس نے کسی چیز کو گرفت میں لینے کے لیے ہاتھ چلائے ایک چٹان میں ابھرے ہوئے ایک تیز ریزر جیسے پتھر نے اس کے ہاتھ زخمی کر دیے۔ پھر ایک تیز و تند لہر نے اسے ایک چٹان کی طرف اچھال دیا۔ وہ بڑی بے بسی سے اس پر سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پُراثر تحریروں اور رنگا رنگ سلسلوں سے مرصع ستمبر 2016ء کا دلہن نمبر حاضر ہے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

رفعت سراج ...... **یہ کہاں بچیں کہ دل ہے** ...... کی نئی قسط کے ہمراہ

انجم انصار و **ڈاکٹر ثمن بلال** کے پُرلطف ناولوں کی نئی اقساط

فاخرہ گل کا اثرانگیز مکمل ناول **محبت ہے سمندر سی**

نیلوفر عباسی ...... کی زندگی کے فسانے کا خوب صورت بیان **رضوانہ پرنس** کے مشّاق قلم سے

دلہن نمبر کے لیے **شائستہ زریں**
پاکیزہ کے مہمان میں تعارف کرائیں
گی **شگفتہ یاسمین** اور ان کے دولھا کا

عقیلہ حق ، نگہت اعظمی اور سعدیہ رئیس کی اچھوتی تحریریں دلہن نمبر کے لیے

اس کے علاوہ

عذرا فردوس، ہاجرہ ریحان، طیبہ عنصر مغل ، ہالہ احمد، نظیر فاطمہ،
سلمیٰ غزل، فرح طاہر قریشی ، و دیگر مایہ ناز مصنفات کی مسحور کُن تحریریں

اس کے ساتھ ساتھ پڑھیے دلچسپ مستقل سلسلے جو صرف آپ جیسے باذوق پڑھنے والوں کے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پھسلتی ہوئی نیچے جانے لگی۔ اسے ڈر لگنے لگا کہ اس طرح وہ ضرور اپنے بازو اور ٹانگیں تڑوا لے گی۔ جلد ہی وہ اسی سمندر میں واپس آ گئی جس سے وہ سات گھنٹے سے لڑتی بھڑتی چلی آ رہی تھی۔

خون آلود ہاتھ کے ساتھ، ٹھٹھرتی ہوئی اور انتہائی تھکاوٹ زدہ ویوین اپنی نظروں کے سامنے چٹانوں کو سایوں میں گم ہوتے دیکھتی رہی۔ پھر وہ گویا ہوش میں آ گئی۔ ''میں ہرگز ہرگز ہار نہ مانوں گی۔'' اس نے ایک عزمِ صمیم سے سوچا۔

اس نے ایک بار پھر اپنے کمپیوٹر پر نگاہ ڈالی۔ پھر بمشکل تمام ٹانگیں چلاتی ہوئی جنوبی ساحل کی طرف بڑھنے لگی۔ چاند نکل آیا تھا۔ اس کی کرنوں سے سمندر کی لہریں چاندی کی طرح چمکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ اسے جلد ہی کچھ دوری پر ٹمٹماتی روشنیوں کا ایک جھنڈ سا دکھائی دے گیا۔ شاید وہ ٹوباگو کے شمال مشرقی ساحل پر واقع کوئی گاؤں تھا۔ وہ خاصی دوری پر تھا لیکن اس نے اس کی اُمید کو کافی سہارا دیا۔

پھر ایک دم ہی تیز بارش ہونے لگی۔ تیز ہواؤں نے اس کے چھینٹوں میں ایسی کاٹ پیدا کر دی کہ وہ ویوین کو اپنے جسم میں کھبتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اس کی ساحل تک پہنچنے کی جدوجہد سست پڑ گئی۔ پھر جب یہ طوفان باد و باراں دم توڑ گیا تو اس نے ایک بار پھر اپنی بھرپور جدوجہد شروع کر دی۔ اسے اب اپنی ٹانگیں اپنے جسم کا حصہ ہی معلوم نہ ہو رہی تھیں۔

کچھ دیر گزرنے کے بعد اس نے ایک سیاحتی جہاز کی بتیاں ٹرین ڈاؤ کی روشن و پُررونق بندرگاہ کی طرف جاتے دیکھیں۔ اس نے بڑی حسرت سے اس میں سوار لوگوں کا تصور کیا کہ انہوں نے خوب رنگ برنگے لباس پہن رکھے ہوں گے اور عرشے پر بجنے والے بینڈ کی موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔

ویوین کو اپنے دماغ میں دھندسی بھرتی محسوس ہو رہی تھی۔ شدید تھکاوٹ سے وہ بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ پھر اسے اونگھ آ گئی لیکن جلد ہی کسی چیز نے اسے چونکا دیا۔ اس وقت سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اس کی کرنیں پُرحدت تھیں۔ اس نے اپنے دائیں طرف کھلی خلیج میں پانی کے اوپر جھاگ جگمگاتی ہوئی دیکھی۔ پانی اور ناریل کے درختوں سے پرے بلندی پر مکانات

بکھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ ٹوباگو کے مشرقی ساحل کی بلڈی بے یا فونی خلیج تھی۔ اسے بچ نکلنے کے لیے صرف آدھ میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی تمام تر قوت مجتمع کی اور پوری قوت سے پانی میں ٹانگیں چلانی شروع کر دیں۔ پھر یکا یکی سمندر بپھر گیا اور اسے تیز و تند لہروں کے بھنور میں اچھال دیا۔ وہ ایک چٹان کے قریب ایک انتہائی خطرناک مقام پر آن گری تھی۔ ''میں ہرگز ہرگز اس ظالم سمندر سے شکست نہ کھاؤں گی۔'' اس نے ایک عزمِ صمیم کے ساتھ سوچا اور اس خطرناک مقام سے کھلے سمندر میں جانے کے لیے سرتوڑ کوشش کرنے لگی۔ وہ اب ادھ موئی ہو چکی تھی۔ اس کے بازوؤں اور ٹانگوں میں ناقابلِ برداشت درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اسے جسم کے ہر حصے جسم کا ساتھ چھوڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ جلد ہی تجارتی ہوا چلنا شروع ہو گئی۔ اس جگہ پانی کے بہاؤ کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ ویوین نے جدوجہد ترک کر دی اور اپنے آپ کو سمندر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اس کی تمام تر توانائی اور قوتیں نچڑ چکی تھیں۔

پھر جب اس نے ہاتھ پیر چلانے کے لیے قوت مجتمع کی اور ساحل کی طرف پلٹی تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کے سامنے تھوڑے ہی فاصلے پر ناریل کے درختوں کی قطار نیم ہلالی صورت میں ساحل پر دور تک پھیلتی چلی گئی تھی۔ اس قطار کے پیچھے ہری بھری پہاڑیوں پر مکانات بکھرے دکھائی دے رہے تھے۔

وہ اپنی تمام تر قوتِ ارادی سے کام لیتے ہوئے اس ریتیلے ساحل کی طرف تیرنے لگی۔ اس کے قریب آتے آتے ایک جھاگ بھری تیز و تند لہر نے اسے سطحِ آب سے بلند کر کے اس ریتیلے ساحل پر لا پٹخا۔ وہ بے جان سی وہاں ڈھے گئی۔ اس وقت اسے اپنے قریب ہی بچوں کی چہکاریں سنائی دیں۔ یہ ٹوباگو کے ایک اسکول کے بچے تھے جو دوڑ دوڑ کر اس کے پاس آ رہے تھے۔

''میں بچ نکلی ہوں۔ میں زندہ ہوں۔'' اس نے فتح مندی کے احساس کے ساتھ سوچا۔ اپنے ایک طرف دور موجیں لیتے ہوئے سمندر کو دیکھتے ہوئے اسے اب بھی یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ واقعی ساڑھے سولہ گھنٹے تک اس سے نبرد آزما رہی تھی اور اس سے لڑتے بھڑتے چودہ میل کا فاصلہ طے کر گئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

روڈیو

علیم شاھد

انسان خیر و شکر کا مرکب ہے۔ اس کے اندر فرشتوں جیسی سادگی ہے تو درندوں جیسی خونخواری بھی۔ یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنی جبلت میں مضمر کس جذبے کو سامنے لاتا ہے۔ ماضی بعید میں رومی حکمران انسانوں کا مقابلہ درندوں سے کراتے، لطف لیتے تھے۔ وقت بدل گیا لیکن اطوار نہیں بدلے۔ ماضی میں قیدیوں کو زبردستی درندوں کے مقابلے پر بھیجا جاتا تھا۔ آج انسان برضا و رغبت بپھرے سانڈ کا مقابلہ کرتا ہے اور اسے کھیل قرار دیتا ہے۔ ایک ایسے ہی کھیل کا آنکھوں دیکھا حال۔

انسان اور بپھرے سانڈ کے درمیان ہوئے مقابلے کا احوال

Rodeo ایک گیم ہے ایک کھیل ہے۔ ایک دلچسپ اور خطرناک کھیل۔ خوف ناک طاقت کا مظاہرہ ہے، یہ، جو انسانوں اور جانوروں کے درمیان کھیلا جاتا ہے۔ اس میں انسانوں اور جانوروں دونوں کو ہی شدید محنت اور ہارڈ ٹریننگ سے گزارا جاتا ہے اور ان میں وہ صلاحیت، ہمت اور حوصلہ پیدا کیا جاتا ہے کہ یہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس میں حصہ لیتے ہیں جس میں معمولی سی چوک سے بھی جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اس کھیل میں انسان بپھرے ہوئے طاقت ور جنگلی بچھڑوں، جنگلی بیلوں پر جھپٹتے ہیں انہیں پچھاڑتے ہیں ان کی ٹانگیں باندھ کر بے بس کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان پر وار کر کے ان کی جان بھی لے لیتے ہیں۔ جواب میں جانور بھی اپنی پوری قوت سے اپنا دفاع کرتے ہیں اپنی جان بچانے کے لیے بھرپور درندگی سے مقابل پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اسے گراتے ہیں۔ ٹکریں مارتے ہیں۔ سینگوں پر اچھالتے ہیں اور زمین پر گرا کر اس بری طرح روندتے ہیں کہ دیکھنے والوں کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔ دل کی دھڑکنیں ساتھ چھوڑنے لگتی ہیں۔

Rodeo مقابلہ دیکھنے کے لیے مجھے جہانگیر نے اکسایا تھا۔ 18 مئی کے لیے اس نے بکنگ بھی کرالی تھی۔ وہ دو بجے دوپہر میں مجھے ساتھ لے کر Cdstro velly کے لیے روانہ ہوا۔ ہم ڈبلن بلیوارڈ سے اندرونی سڑک پر پہنچے۔ یہ پہاڑوں کے بیچ کیسٹرو ویلی تک جانے والی سڑک ہے۔ درمیان میں 580 فری وے نامی شاہراہ کے نیچے ہرے بھرے پہاڑی جنگل کے درمیان گراسی میدان ہے جس میں Cow Boys اسٹائل کا اسٹیڈیم بنا ہوا ہے جو چاروں طرف سے کھلا ہوا ہے۔ شائقین کے بیٹھنے کے لیے لکڑی کی سیڑھی نما بینچیں ہیں۔ ایک طرف لکڑی کا بنا ہوا اصطبل ہے جس میں گھوڑے، گائیں، بھینسے ہوتے ہیں۔ باہر ایمبولینس کا اسکواڈ بھی تیار رہتا ہے۔ سیکیورٹی بھی الرٹ رہتی ہے۔

بچھڑے زنجیروں سے باندھ کے رکھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ منتظمین کا ایک پویلین ہے جہاں سے کی جانے والی کمنٹری اسٹیڈیم میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے لہو کو گرماتی رہتی ہے۔ پویلین میں ڈاکٹروں کی ٹیم ہوتی ہے جو ہر ایمرجنسی کے لیے تیار رہتی ہے۔

ہم جب پہنچے تو سڑک کے کنارے ایک میل تک پھیلے رقبے پر گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میدان بھی گاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ مرد، عورتیں اور بچے جن میں اکثریت روایتی کاؤ بوائے ٹائپ گوروں کی تھی، دیکھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ کم وبیش پانچ ہزار گاڑیاں تھیں اور دس ہزار سے زیادہ عوام اسٹیڈیم میں موجود بھی تھے۔ موسم ٹھنڈا تھا ہوائیں چل رہی تھیں۔ شائقین رنگ برنگے لباسوں میں ملبوس تھے۔ ریڈ اینڈ یلو ٹی شرٹ، بلو ٹائٹ جینز، بڑے بڑے گاگلز اور بڑے شیڈ والے ہیٹ لگائے ہیوی اسپورٹ شوز پہنے ہوئے لوگوں نے اسٹیڈیم کو ڈیکوریٹ اور میچ کو سیلیبریٹ کیا ہوا تھا۔ روڈیو ویبز کمیونٹی ہائی لائٹ ہو رہی تھی۔

ہم نے خاصی دور گاڑی کھڑی کی اور پیدل چل کر گراؤنڈ میں پہنچے اور بینچ نما سیٹوں پر بیٹھ گئے۔

یہ روڈیو کا کیلی فورنیا میں سب سے بڑا ہارس اینڈ کیٹل فائٹنگ شو تھا جس میں انتہائی ماہر گھڑ سوار، گائیں، بھینسوں پر سواری کرنے والے ریکارڈ ہولڈر شرکت کر رہے تھے۔ یہ اس صوبے کا سب سے بڑا مقابلہ تھا جس میں سان ہوزے، ہیورڈ، ڈبلن، لاس ویگاس، لاس اینجلس کی ٹیمیں حصہ لے رہی تھیں۔

یہ میکلکین رانچ ہے۔ یہاں گھوڑے پالے اور سدھائے جاتے ہیں۔ ان ٹیڑھے میڑھے راستوں، اونچی نیچی ہری بھری پہاڑیوں پر ”سخت جنگلی کاؤ بوائے گھڑ سواری“ کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ ایسی ہی رانچوں میں گائیں، بھینسیں، بچھڑے بھی پالے جاتے ہیں۔ اسی رانچ میں یہ ایک گراؤنڈ کی برابر مسطح رقبہ ہے۔ جس میں کاؤ بوائے اسٹیڈیم بنایا گیا ہے۔ یہ اسٹیڈیم کھلا ہوا ہے۔ بالکل سادہ سا، ساتھ ہی جنگلی بچھڑوں، گائیوں، بھینسوں کی ٹیمیں مقابلے میں حصہ لینے کے لیے تیار تھیں۔ برابر کے اصطبل میں سدھائے ہوئے برق رفتار گھوڑے اور گھڑ سوار بھی تیار تھے۔

پویلین سے منتظمین عوام کی آگاہی کے لیے اناؤنسمنٹ کر رہے تھے۔ دلچسپ میوزک بھی بجائی جا رہی تھی۔ ایسا مقابلہ بڑے شہروں میں ہر سال ہوتا ہے۔

پہلے اعلان کے مطابق ایک جاندار بچھڑے کو اصطبل سے چھوڑا گیا جو انتہائی تیزی اور غصہ سے میدان میں بھاگتا ہوا آیا۔ پیچھے ایک تیز رفتار گھڑ سوار اپنے اصطبل سے نکلا اور بچھڑے کا تعاقب کرتے ہوئے اس پر لہراتا ہوا پھندا پھینکا جو بچھڑے کی گردن میں پھنس گیا۔ گھڑ سوار نے سواری کے دوران ہی بچھڑے کو کھینچا پھر گھوڑے سے اتر کر تیزی سے بچھڑے کو گرایا اور اس کی ٹانگیں باندھ دیں۔ یہ سارا عمل چند سیکنڈ میں ہوا۔

خطرناک بچھڑے کی دوڑ دیکھ کر پبلک، جس کی سانسیں بند ہو رہی تھیں بچھڑے کو زمین پر بے بس پڑا دیکھ کر بے تحاشا خوشی کا اظہار کرنے لگی۔ زبردست تالیاں بجائی گئیں۔ پھر دوسرے بچھڑے کو اور گھڑ سوار کو میدان میں اتارا گیا۔ یہ ہیورڈ کے ریکارڈ ہولڈر تھے۔ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

مقابلے میں ڈبلن، کیسرو ویلی، فریمونٹ، سان ہوز لے کی ٹیمیں حصہ لے رہی تھیں اور بڑی ہمت حوصلہ اور سخت جانی سے بچھڑوں، گائیوں اور بھینسوں سے مقابلہ کر رہی تھیں۔ میرے آگے ایک بلانڈ گورا بیٹھا تھا۔ ساتھ میں 3 بچے تھے جن کی عمریں 8 سے 12 سال کے درمیان تھیں۔ جب مقابلہ شروع ہوتا وہ قلابازیاں کھانے لگتے۔ دو مرتبہ ان کی ٹانگیں میرے سینے پر لگیں۔ تیسری مرتبہ جہانگیر کی گردن پر۔ جہانگیر بھی گورا ہے اور اب تو بلانڈ گورا ہو گیا ہے۔ وہ مارنے کو بڑھا تو میں نے اسے روک دیا۔

دوسرے مقابلے کا اعلان ہوا اور ایک انتہائی تیز بجلی کی رفتار سے دوڑتا ہوا بچھڑا گراؤنڈ میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے اسی رفتار سے دو گھڑ سوار اس کے تعاقب میں آئے۔ بچھڑا خطرناک تھا تو گھڑ سوار بھی ماہر تھے۔ پہلے جیکی نے دور سے لہراتا ہوا پھندا پھینکا جس نے بچھڑے کے سینگ جکڑ لیے، دوسرے سوار نے اسی پھرتی سے لہراتا ہوا رسے کا پھندا پھینکا جس میں اس کی ایک ٹانگ آگئی اور دونوں سواروں نے مخالف سمتوں سے کھینچ کر اسے بے بس کر دیا۔ ایک سوار نے اتر کر اس کے سینگ پکڑے دوسرے نے اس کی ٹانگیں باندھ دیں۔ یہ طاقت اور مہارت کا مظاہرہ اس تیزی اور پھرتی سے عمل میں آیا کہ حیرت سے آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ چند سیکنڈ میں یہ عمل مکمل ہو گیا۔ بچھڑا بے بس ہو چکا تھا۔

گھڑ سوار کا پھندا اگر فیل ہو جاتا ہے تو بچھڑا اسی تیزی سے گھڑ سوار پر حملہ کرتا اور گھوڑے و گھڑ سوار دونوں کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کو بچانے کے لیے مختلف سمتوں سے ماہر گھڑ سوار میدان میں آتے اور بچھڑے کو قابو کر کے گھڑ سوار کی جان بچا لیتے۔

کامیابی کی صورت میں جتنی کم مدت میں بچھڑے کو زیر کر کے اس کی ٹانگیں باندھی جاتی ہیں۔ وہ کھلاڑی کا پلس پوائنٹ ہوتا ہے۔ اس کے نام کا اناؤنسمنٹ ہوتا ہے۔ لوگ جو بڑی حیرت اور برداشت سے یہ وحشت ناک منظر دیکھتے ہیں، زبردست خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور بے تحاشا تالیاں پیٹتے ہیں۔

اب ایک خطرناک بیل میدان میں آیا جو انتہائی طاقتور تھا۔ ایک سوار اس کی پیٹھ پر بیٹھا تھا۔ بیل کی پیٹھ پر رسی بندھی ہوئی تھی جسے وہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے تھا، دوسرے ہاتھ کو ہوا میں لہرا رہا تھا۔ اسے اس خطرناک بھپرے ہوئے قلابازیاں کھاتے ہوئے بیل کی پیٹھ پر 8 سیکنڈ بیٹھنا ہوتا ہے جو اتنے بگھرے مزاج درندہ پر بیٹھنے والے کے لیے بڑے حوصلہ، بڑے امتحان کا عمل ہے۔ طاقتور بیل اس طرح بھاگتا ہے اس طرح اچھلتا ہے کہ دیکھنے والے کو خوف آتا ہے۔ اس پر بیٹھنے والے کی زندگی داؤ پر لگی ہوتی ہے۔ آٹھ سیکنڈ میں یا تو وہ بیل اسے پیٹھ سے اچھال کر پھینک دیتا ہے یا وہ خود اچھل کر گرتا ہے اور بھاگ کر فینس پر چڑھ جاتا ہے۔ جب بچنے کے لیے فینس (جنگلے) پر چڑھا تو دو تین سیکنڈ دیر ہو جانے پر بیل نے اس پر حملہ کر دیا اور دو مرتبہ اس کی پیٹھ پر سینگ مارے۔ پیچھے کھڑے محافظوں نے اسے پوری قوت سے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اس کا کیا حشر ہوا پتا نہیں کیونکہ کھلاڑیوں کی زندگی بچانے کے لیے ڈاکٹروں اور ایمبولینس وغیرہ کا معقول اور فوری بندوبست ہوتا ہے۔ یہ سارے ہی مقابلے باز بڑے حوصلے، ہمت اور طاقت والے ہوتے ہیں۔ عرصہ دراز کی سخت ٹریننگ سے گزرتے ہیں۔ یہ Sports Commandos ہوتے ہیں۔ جن کے جسم اسٹیل کے اور ہڈیاں ربڑ کی ہو جاتی ہیں۔ جب غصے سے بھپرے ہوئے جانور انہیں روندتے ہیں، ان پر حملے کرتے ہیں، انہیں بے رحمی سے گھسیٹتے ہیں تو دیکھنے والے شائقین پر بھی خوف اور ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد انتہائی فربہ موٹی تازی گائے انتہائی تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی آئی اور گراؤنڈ میں موجود منتظمین پر حملہ کر دیا جنہوں نے سیکنڈوں میں بھاگ کر فینس پر چڑھ کر اپنی جان بچائی گائے مسلسل جنگلے پر ٹکریں مارتی رہی۔

اس قسم کے جان لیوا، جان ہار مقابلے میں نے زندگی میں نہیں دیکھے تھے۔ یہ وہ مقابلے تھے جو برسوں کی سخت ٹریننگ کے بعد تیار کیے جاتے ہیں۔ اس میں چوک جانے والے جیکی کی ہڈیاں، پسلیاں اور زندگی کی سلامتی نہیں رہتی۔ دیکھنے والے Enjoy بھی کرتے ہیں اور ان پر لرزہ بھی طاری ہوتا ہے۔ وہ بری طرح خوف سے چیخنے لگتے ہیں۔ جتنی دیر میں وہاں رہا جسم پسینے پسینے ہوتا رہا۔ تین گھنٹے بعد ہم گھر واپس آئے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

سراب

راوی : شہباز ملک

قسط: 113

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب۔ ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com
DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اتنی پریشانیوں کے بعد ہم کسی نہ کسی طرح اندر پہنچ ہی گئے تھے۔ وسیم اور سفیر بھی اندر آچکے تھے۔ ہم نے پہلے کمرے کی تلاشی لی۔ وہ خالی تھا۔ پہلے کمرے کے بعد دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ بھی خالی تھا۔ ہم تیسرے کمرے کی طرف بڑھے۔ وہ کمرا گلیارے کے آخری کونے پر تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہی اہم کمرا ہے۔ میں نہایت احتیاط کے ساتھ دبے قدموں ادھر بڑھ رہا تھا۔ میری کوشش تھی کہ چاپ کی ہلکی سی بھی آواز نہ گونجے۔ ابھی میں گلیارے کے درمیان میں ہی پہنچا تھا کہ یکایک ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ لائٹ جل اٹھی تھی۔ وہی گلیارا جو کچھ دیر قبل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا یکایک جگمگا اٹھا تھا۔ ایسا لگا تھا کہ پورے گھر میں سرچ لائیٹ لگا دی گئی ہو۔ اس تیز روشنی میں اپنی طرف اٹھی ہوئی گنز کو بھی میں نے دیکھ لیا تھا۔

ہمارے چاروں طرف مسلح لوگ کھڑے تھے۔ ان سب کی رائفلوں اور پستولوں کا رخ ہماری طرف تھا۔ ہم سب پوری طرح گھر گئے تھے۔ ہمیں نہایت چالاکی سے دام میں لایا گیا تھا۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے گنتی کی۔ وہ تعداد میں کل گیارہ بندے تھے۔ ان میں اہم کون ہے یہ سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ ایسا لگا جیسے مائیک پر کسی نے حکم دیا ہو''سب اپنے اپنے ہاتھ سروں پر رکھ کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جائیں۔''

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تاکہ معلوم کر سکوں کہ آواز کا مخرج کہاں ہے۔ تبھی پھر وہی کھرکھراتی ہوئی آواز سنائی دی''سنا نہیں۔ ہری اپ...جلدی کرو۔''

حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو سر پر رکھا تاکہ سفیر اور وسیم نے بھی اپنے اپنے ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ ہم تینوں قطار سے کھڑے ہو گئے۔ تبھی ان میں سے ایک نے حکم دیا''اوئے آگے چل۔''

حکم دینے والے کا چہرہ میں دیکھ نہیں پایا تھا لیکن اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مقامی نہیں ہے۔ اس کا لب و لہجہ بھی پاکستانی نہیں تھا۔ اس بندے کے حکم دینے کے بعد ہی کسی نے میری پیٹھ پر رائفل کی نال لگا کر کہا''سنا نہیں۔ آگے بڑھو۔''

میں نے پہلا قدم اٹھایا تھا کہ سنگل موڈ کا فائر ہوا۔ دھماکے کی گونج ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ کلاشن کا برسٹ چلا۔ میں سمجھ گیا کہ عبداللہ پر فائر ہوا ہے یا پھر عبداللہ نے فائر کیا ہے۔ اس لیے کہ وسیم اور سفیر تو میرے ساتھ ہیں۔ ایک وہی باہر رہ گیا تھا۔

مجھے رکتے دیکھ کر رائفل کی نال دوبارہ میری پیٹھ میں چبھی اور کسی نے غرا کر کہا''ابے آگے بڑھتا کیوں نہیں ہے؟''

''ہاں ہاں سن لیا۔'' وسیم کی آواز سنائی دی''نال سے گدگدی تو نہ کرو۔ آگے بڑھ تو رہا ہوں لیکن یہ باہر پٹاخے کیوں پھوٹ رہے ہیں۔''

''تیری برات آرہی ہے۔ مخول سوجھ رہا ہے۔ ابھی سارا مخول نکل جائے گا۔'' کسی نے جواب میں کہا اور پھر کسی سے بولا''جا دیکھ باہر کیا ہو رہا ہے۔''

''ابھی تو تم نے کہا کہ تمہاری برات اتری ہے۔ اتنی جلدی بھول گئے۔ بھائی میاں بولتے رہو تمہارا بولنا اچھا لگ رہا ہے۔'' وسیم نے پھر اسے چھیڑا۔

''خاموشی سے آگے بڑھ ورنہ تیرے سر میں روشندان بنا دوں گا۔ ایک دم فسٹ کلاس، ہوادار۔ ادھر سے ہوا جائے گی اور ادھر سے نکلے گی۔'' ایک دوسرے رائفل بردار نے کہا۔ پھر اس نے مجھے آگے دھکیلا۔

رائفل کی نال کے دھکے پر میں آگے بڑھا۔ پھر تو ایسا لگا جیسے اس میں دھکا دینے کی مشین فٹ ہو گئی ہے۔ مسلسل دھکا دینے لگا تھا۔

آگے ہی آگے بڑھتے ہوئے میں سیڑھیوں تک پہنچ گیا۔ باہر سے گولیوں کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔ کبھی سنگل فائر ہوتا اور کبھی برسٹ چلتا۔ اندر والے اس طرح مطمئن تھے جیسے انہیں یقین ہو کہ حملہ کرنے والے کسی بھی حالت میں کامیاب نہیں ہو پائیں گے۔ شاید اسی لیے ان کی پوری توجہ ہماری طرف تھی اور وہ ہمیں رائفل کی نال سے دھکا دیتے ہوئے آگے بڑھنے پر مجبور کر رہے تھے۔ اب ہم سیڑھیوں تک پہنچ چکے تھے۔

ساڑھے چار فٹ چوڑی سیڑھیاں اوپر کی طرف جا رہی تھیں۔ دھکا کھا کر میں اوپر کی طرف بڑھا۔ ایک کے بعد ایک سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بالآخر اوپری منزل پر پہنچ گیا۔ مجھے دھکیلنے والے نے کہا''الٹے ہاتھ پر جو کمرا ہے اس میں داخل ہونا ہے۔''

حکم کے مطابق میں اس کمرے میں مڑ گیا۔ وہ ایک کافی بڑا ہال نما کمرا تھا۔ اسے شاید ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ دو صوفہ سیٹ بچھے ہوئے تھے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظر جس پر پڑی اسے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھنچ گئی۔ وہ امداد شاہ تھا جو ایک پائنچے کا پتلون پہنے صوفے پر نیم دراز

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

تھا۔اس کے برابر میں ایک اور بندہ بیٹھا ہوا تھا۔دونوں کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی امداد شاہ بولا'' ناصر خاناں یہی وہ بندہ ہے۔ہمیں تو لگتا ہے پولیس کا افسر ہے۔اسے نچوڑنے سے بہت کچھ معلوم ہوجائے گا۔''

اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ باہر پھر برسٹ چلا۔اب مجھے فکر ہونے لگی تھی کہ عبداللہ عقل سے کام نہیں لے رہا ہے۔وہ اکیلا ہے۔اسے احتیاط سے قدم اٹھانا چاہیے تھا۔اس کی جگہ سفیر یا وسیم ہوتے تو اتنی فکر نہ ہوتی اس لیے کہ یہ دونوں چھپ کر حملہ کرنے کے ماہر تھے جب کہ عبداللہ کو اس قسم کی جنگ کا تجربہ نہیں تھا۔وہ بے وقوفی میں کسی نہ کسی برسٹ کا شکار ہوجائے گا۔ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ امداد شاہ نے جسے ناصر خان کے نام سے مخاطب کیا تھا وہ دانت پیس کر بولا'' یہ پولیس افسر ہے تو اسے ذبح کرنے میں زیادہ مزہ آئے گا۔اس کی ویڈیو بھی بناؤں گا اور نیٹ پر بھی ڈالوں گا تاکہ دوسرے پولیس والوں کو سبق ملے۔وہ جان لیں کہ ہم سے ٹکرانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔''پھر وہ اٹھ کر میرے قریب آیا اور میرے چہرے کو ٹھوڑی پر ہاتھ لگا کر اوپر اٹھاتے ہوئے بولا'' بندہ تو مضبوط لگتا ہے۔حرام کی خوراک کھاتا ہے نا۔''پھر اس نے میرے سر پر منڈھی روسی ٹوپی کا ایک کونا اوپر اٹھا کر بولا'' واہ کیا کان ہے۔بالکل کیک جیسے کرارے۔انہیں چبا چبا کر موی بناؤں گا تاکہ دیکھنے والوں کو زیادہ لطف آئے۔ہمارا معاوضہ بھی بڑھ جائے۔وہ لوگ خوش ہو کر ڈبل پیسا دیں گے۔''

میرا دل دھک سے رہ گیا کہ کہیں یہ ہینڈ سیٹ نہ دیکھ لے مگر وہ تو ٹوپی کے ساتھ منسلک تھا اس لیے اسے نظر نہیں آیا۔اس نے میرے کان کی لو کو چٹکی سے پکڑا اور اتنے شدید انداز میں انگوٹھے کے ناخن کو گڑا کر مسلا کہ میرے پورے جسم میں تکلیف کی لہر دوڑ گئی۔'' مزہ آئے گا۔بہت مزہ آئے گا.... مجھے پولیس والوں کو اذیت دے کر ذبح کرنے میں خوب مزہ آتا ہے۔''

''اچھا.... یہی شوق میرا بھی ہے لیکن ذرا جدا ہے۔جس کی گردن پر میں چھری پھیرتا ہوں وہ جہنمی ہوتا ہے اس لیے مجھے بھی بہت لطف آتا ہے۔''وسیم نے اونچی آواز میں کہا۔

''ابا کرتا ہوں ابتدا تم سے ہی کردوں تاکہ تم دیکھ سکو کہ مزہ کیسے آتا ہے،تمہیں یا ہمیں۔''وہ وسیم کی طرف دیکھ کر بولا۔

''صحیح کہا،اتنی بار وطن دشمنوں کو ذبح کیا ہے۔ایک بار وطن کے نام پر ذبح ہو کر بھی دیکھنا چاہیے۔''وسیم خاموش رہنے پر تیار ہی نہیں تھا۔

ناصر شاہ بھی بڑبولا لگ رہا تھا۔وہ اپنی ہانکے جا رہا تھا'' انٹرنیٹ پر میں نے اپنی کئی کارگزاری کی کلپ ڈالی ہے۔وقت ملے تو دیکھ لینا لیکن تم کیسے دیکھو گے کیونکہ تمہیں اب ذبح ہونا ہے اور اس دوران تمہیں یوٹیوب دیکھنے کا بھی موقع نہیں ملے گا۔''

وہ مسلسل بھونک رہا تھا۔میں نے ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا'' ابے تو بھی تو کچھ بول؟ کیسی موت تجھے پسند ہے؟''

'' دیکھ بھائی اس سے نہیں مجھ سے پوچھ کہ مجھے کیسی موت پسند ہے۔''وسیم نے چٹکی لی'' مجھے فرائیڈ چکن بہت پسند ہے۔تیرے پاس کوئی میرے سائز کی کڑھائی اگر ہے تو اسے تیار کرلے۔مجھے میری پسندیدہ موت چاہیے ہی چاہیے ویسے ابھی تک یہی ہوا ہے کہ جو ہمیں موت دینے کا سوچتا ہے اسے موت مل جاتی ہے... تیری قسمت بھی کہیں دھوکا نہ دے جائے۔''

''ہاہاہا... بڑا سورما بن رہا ہے۔''اس نے اپنے ساتھی کی طرف مڑ کر کہا'' اس کی باتیں سن۔اسے بڑا گھمنڈ ہے۔اتنا مار،اتنا مار کہ جسم کا ہر ریشہ کہے''اس نے باضابطہ ایکٹنگ شروع کردی۔اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر بیٹھ گیا پھر جڑے ہوئے ہاتھ کو اٹھا کر رونے کے انداز میں بولا'' مجھے معاف کردو۔اب میں کبھی پولیس میں شامل نہیں ہوں گا۔ابھی استعفا دے دوں گا۔''

'' لگتا ہے پرانے ڈراما باز ہو۔اچھی ایکٹنگ کرتے ہو۔''وسیم نے پھر چوٹ کی۔میں نہیں چاہتا تھا کہ وسیم زیادہ بولے۔ناصر کی باتیں سن کر مجھے لگ رہا تھا کہ وہ بڑبولا اپنی بڑائی ثابت کرنے کے لیے وقت سے پہلے کچھ کر بیٹھے گا۔اس لیے کہ ایسے لوگ کسی بھی وقت آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

'' ویسے رہائی کی صورت کیا ہوگی۔اس پر بھی بات کر لو۔''میں نے پہلی بار زبان کو حرکت دی۔

'' کوئی صورت نہیں۔اب گوٹ ہماری کوٹ میں ہے۔تم لوگ صرف جواب دو گے۔''اس نے ڈرامائی انداز میں ٹہلتے ہوئے کہا۔مجھے وہ گینگ مین سے زیادہ کوئی مسخرہ لگ رہا تھا۔

'' پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔''میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"ابھی سوال جواب کا وقت نہیں آیا ہے۔" وہ ٹہلتے ہوئے مجھ سے دور چلا گیا پھر بڑی تیزی سے قریب آیا اور الٹے ہاتھ کا تھپڑ میرے منہ پر مار کر بولا "تم لوگوں نے میرے بہت سے لوگ مارے ہیں۔ اب میں سب کا بدلہ لوں گا۔ اپنے ایک ایک شہید کا بدلہ۔"

"ابے جہنمی شہید کب سے کہلانے لگے۔" وسیم نے پھر لقمہ دیا۔

"اگر تم خاموش نہ ہوئے تو تمہیں بھی اپنے شہیدوں کی خدمت کرانے کے لیے بھیجنا پڑے گا۔" اس نے وسیم کے پاس پہنچ کر اس کے بالوں کو پکڑ کر جھٹکا دیا اور الفاظ چبا چبا کر بولا "میں نے کہا نا' مجھے پولیس والوں کو اذیت دیتے ہوئے مزہ آتا ہے۔"

"وطن دشمن سب سے زیادہ اگر کسی سے نفرت کرتے ہیں تو وہ فوجی ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ پولیس والے وطن کے محافظ ہوتے ہیں اور چور ڈاکوؤں کو خطرہ محافظ سے ہوتا ہے۔ تم چور ہو یا ڈاکو۔" وسیم نے بالوں پر پڑنے والے جھٹکوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"میں چور یا ڈاکو نہیں مجاہد وطن ہوں۔" ناصر نے اس بار زیادہ زور سے جھٹکا دیا۔

مجھ پر تشدد ہو تو قبول ہے لیکن میرے سامنے میرے کسی ساتھی پر کوئی تشدد کرے یہ مجھے منظور نہیں۔ میرے اندر غصے کی ایک تیز لہر سی اٹھی اور میں نے بندھے ہاتھوں کو جھٹکا دیا۔ کبھی کبھی قسمت ایسے موقعہ پر ساتھ دے دیتی ہے جب تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ یہ جھٹکے کا اثر تھا یا رسی کی گانٹھ باندھنے والے کا قصور' کہ گانٹھ ڈھیلی پڑ گئی۔ دوسرا جھٹکا گانٹھ سے برداشت نہیں ہوا اور میرا ہاتھ آزاد ہو گیا۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور سامنے کھڑے بندے پر اچھل کر جا پڑا اور اس کے پستول کو چھینتا ہوا ایک دوسرے بندے پر گرا... بس یہ ایک منٹ کا کھیل تھا۔ وہ سمجھ بھی نہ پائے اور میں تین بندوں کو دھکیلتا ہوا۔ کمرے سے باہر لے گیا تھا کہ کمرے میں دھماکا ہوا اور ساتھ ہی ناصر کی مکروہ آواز گونجی "بہت ہو گیا۔ اگر اپنے بندوں کی زندگی عزیز ہے تو پستول پھینک دو ورنہ یہ والی گولی تمہارے اس بڑبولے ساتھی کے سر میں دھنسے گی۔"

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ وسیم کی طرف ہے۔ اسی وقت وسیم کی آواز سنائی دی "اگر گولی چلا سکتے ہو تو چلاؤ میں بھی تو دیکھوں تم صرف ڈرامے باز ہو یا گولی بھی چلا سکتے ہو۔" پھر وسیم نے ہذیانی انداز کا قہقہہ لگایا تھا۔

اس کی ہنسی نے اس بندے کو مزید مشتعل کر دیا۔ وہ چیخ کر بولا "ابھی تک تیری ملاقات کسی جی دار سے ہوئی نہیں ہے۔ آج میں تجھے دکھاؤں گا کہ تشدد کیسے کیا جاتا ہے؟"

"تشدد کہتے کسے ہیں تجھے اس کا پتا ہے؟" سفیر نے چیخ کر کہا۔ "تشدد ایسے کی جاتی ہے۔" اس آواز کے ساتھ دھپ کی آواز سنائی دی تھی۔ شاید اس نے پیروں کا استعمال کیا تھا اور کوئی سفیر کی لات کھا کر گرا تھا۔

بغیر سوچے سمجھے لائحہ عمل تیار کیے بنا جب انسان کوئی قدم اٹھا لیتا ہے تو اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔ میری جلد بازی نے میرے دوستوں کی زندگی پر خطرے منڈلا دیئے تھے۔ وہ سب بھی جذباتی ہو اٹھے تھے۔ ایسے نازک وقت میں کیا کرنا چاہیے میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اندر سے فائر کی آواز سنائی دی اور وسیم کی چیخ گونجی۔ گھبرا کر میں نے آواز دی "امداد شاہ اپنے بندے کو روک لے۔ میں اندر آ رہا ہوں۔"

"نہیں پہلے پستول پھینکو ورنہ دوسرے والے پر فائر کرنے والا ہوں۔" ناصر نے چیخ کر جواب دیا۔

میں نے پستول اندر پھینکا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر سر پر رکھا پھر اندر داخل ہو گیا۔ جیتی ہوئی بازی ایک بار پھر پلٹ گئی تھی۔ ناصر شاہ نے میری طرف دیکھ کر کہا "تو نے چانکیہ مہاراج کا نام سنا ہے؟ نہیں نا... آج میں تجھے اس کے سکھائے سبق کا ایک باب سکھاؤں گا۔"

"چانکیہ کی پوری کتاب میں نے پڑھی ہے۔ لیکن وہ تو ہند کا ایک مکار وزیر تھا۔ تجھے کیسے اس کا نام یاد آ گیا۔" میں نے جواب میں کہا پھر وسیم پر نظر ڈالی۔ وہ بالکل صحیح تھا۔ شاید اسے ڈرانے کے لیے اس نے فائر کیا تھا۔ گولی یقیناً اس کے بہت قریب سے گزری ہو گی اور اضطراری طور پر اس کی چیخ نکل گئی ہو گی اور اسی لمحے میں نے پستول پھینک کر خود کو اس کے حوالے کر دیا۔ اگر تھوڑا سا صبر کر لیتا تو اس کی چال سمجھ جاتا لیکن اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔

میرے اندر آتے ہی اس کے دو آدمیوں نے مجھے جکڑ لیا۔ میں اگر چاہتا تو ایک ساتھ دونوں کو اٹھا کر پھینک دیتا لیکن میں خود ہتھیار ڈال چکا تھا اس لیے ان لوگوں نے آسانی کے ساتھ میرے دونوں ہاتھ دوبارہ باندھ دیئے۔

"اب اگر بدمعاشی کی تو بغیر وارننگ کے تمہارے کسی نہ کسی ایک بندے کو گولی مار دوں گا۔" اس نے پستول نیچا کر کہا "تو بات ہو رہی تھی مہاراج چانکیہ کی۔ وہ بدمعاش نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

سیاست داں تھا۔ سیاست کیسے کی جاتی ہے یہ بات وہ اپنے شاستر میں لکھ گیا ہے اور آج میں اس کا سبق دوہراؤں گا کہ کیسے کسی کی زبان کھلوائی جاتی ہے۔'' کہہ کر وہ مڑا اور ایک ڈنڈا اٹھا لایا۔

''ابے کبھی سچ بھی بول لیا کر، یہ ڈنڈا نہیں ڈنڈی ہے۔ اس سے میرا کیا بگڑے گا۔'' وسیم نے ڈنڈے کو دیکھ کر کہا ''ایسے ڈنڈے سے تو میں کان کھجایا کرتا ہوں۔ ذرا اور موٹا ڈنڈا لے کر آ۔''

''ابھی تو اس کو سنبھال۔'' کہہ کر اس نے پاگلوں کی طرح اس پر ڈنڈے برسا دیئے۔ اگر اس وقت میں رسیوں میں جکڑا ہوا نہ ہوتا تو وہی ڈنڈا اس کی پیٹھ پر برسانا شروع کر دیتا۔ غصے کی وجہ سے میں مسلسل ہاتھوں کی کلائیوں کو موڑ رہا تھا۔ بندھن ڈھیلے کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن رسی نائیلون کی تھی جتنی کوشش کر رہا تھا۔ رسی گوشت میں اترتی جا رہی تھی۔ یہی حال سفیر کا تھا۔ وہ اب رسی سے آزاد نہ ہونے کی وجہ سے زبانی جنگ پر تیار ہو گیا تھا۔ اس نے بھی چیخ چیخ کر اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ صرف وہی ایک بندہ ایکشن میں تھا۔ زبانی حملے بھی وہی کر رہا تھا۔ باقی سب خاموش تھے۔ ایسے جیسے وہ منظر میں رہتے ہوئے بھی غائب ہوں۔ اس وقت میرا ذہن اتنا بے قابو تھا کہ مجھے اس کا نام بھی یاد نہیں آ رہا تھا جب کہ کچھ ہی دیر پہلے امداد شاہ نے اس کا نام لیا تھا۔ ناصر شاہ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

''ابے اگر ہمت ہے تو میرے ہاتھ کھول دے۔ پھر دیکھ میں تجھے کیسا سبق سکھاتا ہوں۔'' وسیم نے کہا۔

''اگر اس کی رسی نہیں کھول سکتا تو میری رسی کھول دے۔ پھر تجھے مزہ میں چکھاتا ہوں۔'' سفیر چیخا۔

وہ رک گیا۔ میں نے بے چارگی سے وسیم کی طرف دیکھا۔ اگر مجھے دوستوں کی زندگی عزیز نہ ہوتی تو میں پیروں سے بھی اس کی مرمت کر سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اچھال بھری تو ہمیں گھیرے کھڑے کسی نہ کسی شخص کی گن چل جائے گی اور میں کسی دوست کو گولی کھاتا دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ پاگل شخص دو چار منٹ بعد خود ہی رک جائے گا۔ شاید وہ نفسیاتی بیمار تھا اسی لیے ایسی حرکتیں کر رہا تھا۔ اسے رکتا دیکھ کر میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تو وہ بولا:

''تیری باری بھی جلد آئے گی۔ ابھی اس سے تو نمٹ لوں۔'' اتنا کہہ کر اس نے ایک بار پھر وسیم کی پیٹھ پر ڈنڈا مارا۔

مجھے ایسا لگا کہ وہ ڈنڈا اس کی پیٹھ پر نہیں میرے دل پر لگا ہو۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ہمارے اردگرد پوری طرح مستعد کئی مسلح افراد گن تانے کھڑے تھے۔ اب وہ پہلے سے زیادہ ہوشیار تھے۔ لیکن میں دوسری بار جذبات میں آنے والا نہیں تھا۔

''ناصر خاناں عقل سے کام لے۔ یہ سب ایک ساتھ رہیں گے تو ایک سے دوسرے کو حوصلہ ملے گا۔ ان کو پہلے الگ الگ کمروں میں بند کر پھر ایک ایک کر کے سوال جواب کر۔'' امداد شاہ نے ٹہوکا دیا۔

ابھی تک میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ ان دونوں میں بڑا کون ہے۔ ویسے امداد شاہ نے جو بتایا تھا اس کے مطابق تو ناصر شاہ بڑا تھا لیکن امداد شاہ اسے اس طرح مخاطب کر رہا تھا جیسے وہ بڑا ہے۔

''آپ کا حکم ہے تو ایسا ہی کرتا ہوں۔ چل اوئے سورما۔'' اس نے ڈنڈے سے مجھے آگے دھکیلا۔ ''بس ایک گھنٹے میں تو فر فر بولنے لگے گا۔ پہلے تیرا ہی علاج کرتا ہوں۔''

ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن میں چاہتا تو پلٹ کر اس کا سر توڑ سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ میرے بہت نزدیک آ چکا تھا۔ ٹرینڈ بندے یہ غلطی کبھی نہیں کرتے۔ دشمن کی پہنچ سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں بازی پلٹ نہ جائے۔ مگر وہ جوش میں ہوش کھو بیٹھا تھا۔ اگر میں چاہتا تو بڑی آسانی سے اپنا سر مار کر اس کا چہرہ پھوڑ سکتا تھا لیکن میں مجبور تھا۔ وسیم اور سفیر کی وجہ سے بے بس ہو گیا تھا۔ اس کے کام میں رخنہ نہیں ڈال رہا تھا۔ اسی لیے وہ مجھے آسانی سے دھکا دیتا ہوا ایک بند کمرے کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا کہ اس کے ساتھ کتنے بندے باہر آئے ہیں اور ان میں سے کتنے مسلح ہیں۔

اس کے ہاتھ میں صرف ڈنڈا تھا لیکن اس کے پیچھے پانچ بندے تھے جن کی گن کا رخ میری طرف تھا۔ میری جسارت نے ان سب کو دہلا دیا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں اگر چاہوں تو اکیلا ہی ان سب سے نمٹ سکتا ہوں۔ اس لیے پوری طرح مستعد تھے۔ شکاری کتوں کی طرح چاق و چوبند تھے۔

''او سورما۔ تجھے پتا ہے اب میں تیرے ساتھ کون سا سلوک کرنے والا ہوں؟ اگر نہیں پتا ہے تو سن۔'' کہہ کر اس نے ڈنڈے سے میری پیٹھ کھجائی۔ ''تیرا اہم کس کام کے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

لیے استعمال کریں گے ابھی تک اس کا فیصلہ نہیں ہوا تھا اسی لیے خالی پڑا ہے۔''

اس نے ڈنڈے سے ہی دروازہ کھولا۔ وہ کمرا بالکل خالی تھا۔ ایک دوسرا دروازہ بھی سامنے تھا جو یقیناً گیلری میں کھل رہا ہو گا۔ اس نے مجھے کمرے میں دھکیلنے کے بعد کہا ''یہاں آس پاس کوئی آبادی نہیں ہے۔ آتے وقت دیکھ ہی لیا ہو گا کہ دور و نزدیک صرف ویران میدان ہے یا پہاڑیاں ہیں۔ یہاں سے کسی کو مدد کے لیے بھی بلانا چاہے گا تو کوئی نہیں آئے گا۔ اسی لیے ہم نے اس گھر کو پسند کیا تھا۔ اب اس گھر میں صرف تم سب کی چیخ گونجے گی اور میرے قہقہے۔ تیرے ہر ساتھی کے ایک ایک جوڑ کو میں الگ کروں گا اور لطف لوں گا۔''

ابھی اس کا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کے عقب میں کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ میں نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے آنے والے مسلح بندوں میں سے ایک گرا تھا۔ ناصر نے ایک غیر پارلیمانی الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اسے آواز دی لیکن جواب کی جگہ ایک دوسرا بندہ گرا۔ ابھی تیسرا بندہ بولا ''یہاں کوئی ہے جو بے آواز پستول سے فائر کر رہا ہے۔''

''ابے...'' اس نے بولنے والے کے ساتھ اپنے رشتے کا اعلان کیا اور چیخا ''اگر گولی چلتی تو خون بہتا۔ دیکھ اسے دونوں کو ہوا کیا ہے۔ اس کی آواز پر تیسرا بندہ ادھر بڑھا تھا کہ وہ بھی دھپ سے گر پڑا۔ اس کے ساتھ جو بندہ تھا وہ بھی گرا تھا۔ ایک ایک کر کے پانچوں گرے تھے۔ اب صرف ناصر شاہ رہ گیا تھا کہ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اپنے سر کو اس کی ناک پر مارا تھا۔ ٹکر ایسی تھی کہ اس کی ناک کا بھرتا بن گیا ہو گا۔ وہ چیخنا چاہتا تھا مگر اس کے منہ سے صرف خون کی دھار نکلی تھی۔ یقیناً اس کے سامنے کے دانت بھی ٹوٹے تھے۔ اتنی دیر سے میں خود پر ضبط کیے ہوئے تھا۔ میرے سامنے میرے جگر پر ڈنڈے برسائے گئے۔ شاید یہ اسی کا شاخسانہ تھا کہ میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور پوری طاقت سے سر دے مارا۔ اب اسے موقع دینا فضول تھا۔ میں نے دوبارہ اس کے چہرے پر سر مارا۔ وہ الٹ کر گرا تھا کہ اندر کمرے سے بھی کسی کے گرنے کی آواز کے ساتھ کسی کی آواز آئی تھی ''ارے اسے ہوا کیا۔''

بولنے والا شاید ادھر بڑھا تھا کہ کوئی اور گرا۔ ساتھ ہی سفیر کی آواز سنائی دی۔ ''جیتے رہو۔ شاباش' پوری بازی پلٹ دی۔''

میں نے اس کمرے کے اندر کی طرف دیکھا۔ دو بندے زمین پر گرے ہوئے تھے۔ امداد شاہ اس میں سے ایک کی رائفل کی طرف جھپٹا تھا کہ وہ بھی زمین پر گر گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ عبداللہ ایکشن میں آ چکا ہے اس لیے کہ ایک وہی باہر رہ گیا تھا۔ میری نظریں اسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے خیال آیا کہ میری ٹوپی میں ہینڈ سیٹ ہے۔ ابھی تک اسے استعمال کرنے کا خیال تک نہیں آیا ہے۔ میں نے سرگوشی میں اسے پکارا ہی تھا کہ سامنے والے والی گیلری کا ادھ کھلا دروازہ پوری طرح کھل گیا اور میں حیران رہ گیا۔

اب تک میں یہی سوچ رہا تھا کہ دشمنوں کو ایک کے بعد ایک بے ہوشی کی نیند سلانے کا کام عبداللہ انجام دے رہا ہے۔ لیکن دروازے کے درمیان بلیو پائپ جیسا کام انجام دینے والا پلاسٹک سے بنا پستول مرجس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ گیلری سے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی پوچھا ''کوئی بچا تو نہیں۔''

''نہیں... باہر کی پوزیشن کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''باہر شاید ہی کوئی ہو اس لیے کہ ایک کے بعد ایک عبداللہ صاحب اور میں نے مشترکہ کوشش سے سب کو سلا دیا ہے۔ ابھی تو میں اتنے آرام سے پیڑ پر چڑھا اور پھر وہاں سے کود کر گیلری میں آ گیا۔'' مرجس نے پُرجوش انداز میں جواب دیا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ راوی امن چین لکھتا ہے ورنہ فائر ہو رہا ہوتا۔'' وسیم نے جواب دیا اور مرجس سے بولا ''او بھائی میری پیٹھ میں زور کی خارش ہو رہی ہے۔ کھجانا ہے اس لیے جلدی سے ہاتھ کھول دو۔''

مرجس ہنستا ہوا آگے بڑھا اور اس نے باری باری سے وسیم اور سفیر کے ہاتھ کھول دیئے۔ پہلے وسیم کے ہاتھ آزاد ہوئے تھے۔ وہ میری طرف آ گیا تھا اور اب میرے بندھن کھول رہا تھا۔ میں نے کلائی کو اِدھر اُدھر موڑتے ہوئے کہا ''وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ایسا کرو کہ ان بوریوں کو اٹھاؤ اور گاڑی میں ڈالو۔''

''اللہ کا خوف کریں شہباز۔ اتنی ساری بوریوں کو لادنا آسان نہیں ہے۔'' وسیم نے کراہتی آواز میں کہا۔

''سب کو نہیں' صرف ان دونوں کو۔'' میرا اشارہ ناصر شاہ اور امداد شاہ کی طرف تھا۔

''اچھا ایسے بولیں نا۔'' کہہ کر اس نے امداد شاہ کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

بے ہوش جسم کو کندھے پر لاد لیا پھر بولا ''بھائی میں تو اپنے حصے کا بیگار کرنے چلا۔ دوسرا والا ذرا موٹا اور بھاری ہے اسے سفیر اٹھائے گا۔''

''میں ہوں نا۔'' کہہ کر مرجس نے ناصر کو اپنی پیٹھ پر لادوا۔ تبھی میں نے کہا ''وسیم تو جوش میں ہے۔ تم ہوش سے کام لو۔ اسے رہنے دو۔ تم وسیم کے ساتھ ڈنڈا ڈولی کر کے اس بندے کو لے جاؤ۔ اسے میں اور سفیر اٹھالیں گے۔''

مرجس نے اسے زمین پر پٹک دیا۔ سفیر نے ہنستے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ کو پکڑ کر کہا ''آپ ٹانگیں پکڑیں۔''

ان دونوں کو ہم گاڑی تک لے کر آئے۔ گاڑی کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ عبداللہ پچھلی سیٹ پر لیٹا ہوا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا ''کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں۔ ایک گولی ران کو چھوتی ہوئی نکل گئی ہے۔''

''دکھاؤ... زخم زیادہ گہرا تو نہیں ہے؟'' میں نے کہا۔

''نہیں جناب۔ خون بہنے لگا تھا اس لیے رومال سے زخم کو باندھا ہے۔ چلنے پھرنے سے زخم کھل جاتا اس لیے میں نے لیٹ جانا مناسب سمجھا۔ ویسے اب خون بھی بند ہو چکا ہے۔''

ان دونوں قیدیوں کو عقبی ڈالے میں ڈال کر مرجس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ہم واپس اپنے نئے ڈیرے کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں مجھے یاد آیا کہ میں نے تو مرجس سے پوچھا ہی نہیں کہ وہ فرشتہ رحمت بن کر کیسے آ گیا۔ اس لیے کہ اسے تو میں نے گاڑی سے باہر آنے کے لیے بھی منع کر دیا تھا۔ میرے سوال پر اس نے کہا۔ ''جب اندر گولیاں چلیں تو میں دبک گیا۔ ابھی اندر بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے کہ عبداللہ صاحب لنگڑاتے ہوئے پہنچ گئے۔ ان کو زخمی دیکھ کر میں گھبرا اٹھا۔ نزدیک پہنچتے ہی عبداللہ صاحب نے بتایا کہ اندر سب پھنس گئے ہیں۔ تب میں نے دل میں کہا کہ اب مجھے ہی کچھ کرنا ہے ورنہ آپ سب مارے جائیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے عبداللہ صاحب سے کہا کہ مجھے ایک پستول دے دیجئے۔ میں اندر جا رہا ہوں۔ تب انہوں نے دو پستول دیے۔ ایک سے گولی چلتی تھی اور دوسرے سے بے ہوش کیا جاتا تھا۔ میں پستول لے کر حویلی میں داخل ہوا اور گیٹ پر کھڑے شخص کو پہلے نشانہ بنایا۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی میں شیر ہو گیا اور سیدھے راستے سے اندر جانے کی بجائے۔ پیڑ کے سہارے اوپر چڑھا۔ گیلری میں پہنچ کر جھانکا تو تین چار بندے آپ کو گھیرے کھڑے تھے۔ میں نے ایک ایک کر کے انہیں بے ہوش کیا اور پھر گیلری میں آگے بڑھا۔ وہاں ایک کھڑکی تھی جس سے کمرے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے وہیں سے کمرے کے اندر والوں کو بھی سلا دیا۔''

''واہ جوان واہ... تم نے کمال کر دیا۔''

''سیدھی سی بات ہے کہ جب زندگی خطرے میں ہو تو چیونٹی بھی شیر بن جاتی ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا ''اگر میں اس وقت ہمت نہ دکھاتا تو آپ لوگوں کی مدد کیسے کرتا۔''

میں نے ہنس دیا اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا تھا۔ میری زندگی ہی ایسی ہوگئی تھی جیسے پانی پر بہتا ہوا کوئی پتا جو لہروں کی تال پر خود ہی بہتا چلا جاتا ہے۔ جب کسی چیز میں پھنستا ہے تو کوئی قسمت کی بھیجی ہوئی تیز لہر اٹھتی ہے اور وہ پھر بہنے لگتا ہے۔ اس وقت بھی تو یہی ہوا تھا کہ حالات نے مجھے روک دیا تھا۔ ایک الجھاؤ ہے میں الجھ گیا تھا کہ مرجس تیز لہر بن کر آیا اور میں پھر سے پانی پر بہنے لگا۔ زندگی کا ایک عجیب مذاق میرے ساتھ جاری ہے۔

''کن سوچوں میں الجھی ہیں اے چشم گریاں تاک، مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا۔'' وسیم کے شعر نے مجھے پھر سے حال کی دنیا میں لا پھینکا۔

''سوچ رہا ہوں کہ اب کیا کرنا چاہیے۔'' میں نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔

''یہ لو... خود ہی پلان بناتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں۔ جناب من آپ ہی نے ارشاد فرمایا تھا کہ ہم پنڈی جانے والے ہیں۔'' وسیم نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''بات تو ٹھیک ہے کہ ہمیں پنڈی جانا چاہیے اور جلد سے جلد نکل لینا چاہیے۔''

''تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ آج ہی رات کے اندھیرے میں ہی اس شہر سے دور بہت دور چل دیتے ہیں۔'' سفیر نے کہا تھا کہ وسیم نے تان لگائی:

''چل چل وے دنیا دی اس...'' وہ سیٹ سے پیٹھ لگانے سے گریز کر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ پیٹھ پر ڈنڈے کی جلن باقی ہوگی مگر وہ اظہار نہیں کر رہا ہے۔

''ابھی بھی ہم خطرے میں ہیں۔ نیٹ ورک عیاں نہیں ہوا ہے کہ امداد شاہ کے ساتھ کتنے لوگ ہیں۔'' میں نے وسیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''میرا ارادہ تو یہ تھا کہ میں انہیں ان کے چہرے سے نقاب اتاروں لیکن میرا دل

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کہتا ہے کہ ان کی جڑیں پنڈی میں ہی ہیں۔ مرشد کی خانقاہ میں، اس لیے اسے وہیں لے جا کر پوچھ تاچھ کروں گا۔''

''لیکن انہیں اس گاڑی میں لے جانا آسان نہیں ہے کیونکہ جگہ کم ہے۔'' سفیر نے جواب میں کہا۔

''ہاں یہ بات تو ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کی ذمے داری مرجس کی ہے۔'' میں نے مرجس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آپ بے فکر رہیں۔ ایک اور گاڑی میری نظروں میں ہے۔ اسے ایک ہفتے کے لیے لے آؤں گا۔'' مرجس بولا۔

میں نے ستائش بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا ''گڈ... کیا ابھی مل جائے گی؟''

''بالکل۔ آپ لوگوں کو گھر چھوڑ کر میں نکل جاؤں گا۔ اس گاڑی کو واپس کروں گا اور دوسری لے آؤں گا۔ کیسی گاڑی مناسب رہے گی۔'' مرجس نے پوچھا۔

''فور وھیل لینا۔ کنڈیشن اچھی ہو۔ پیسوں کی فکر نہ کرنا۔'' میں نے جواب دیا۔

''انشاء اللہ میں اے ون گاڑی لے کر آؤں گا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

وسیم اور سفیر خاموش تھے۔ عبداللہ کے چہرے پر تکلیف کے آثار صاف نظر آرہے تھے مگر وہ مجھے زخم دیکھنے نہیں دے رہا تھا۔ کہیں گولی اندر ہی نہ ہو۔ میرے ذہن میں فکر در آئی۔ عبداللہ جس قسم کا بندہ تھا، اس سے بعید نہیں کہ وہ اپنی تکلیف کو ظاہر کرے کہ اس کی وجہ سے سب پریشان ہو جائیں۔ یقیناً وہ اپنی تکلیف چھپا رہا ہے۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر نظر موڑ لی۔ رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی۔ اندھیرا ابھی کم ہونے لگا تھا۔ غیر دانستہ طور پر میری نگاہ ونڈ اسکرین کے پار چلی گئی اور میں چونک پڑا۔ ہم ڈھلان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ رستہ ہی ایسا تھا۔ چکراتی ہوئی سڑک تھی۔ بلندی سے نیچے دیکھا جائے تو پوری سڑک نظر آجاتی۔ سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک نیچے کی جانب جا رہی تھی۔ ونڈ اسکرین سے نیچے والی سڑک نظر آئی تھی اور وہاں ایک جگہ سرچ لائٹوں کی وجہ سے دن کا سماں تھا۔ پولیس نے ناکا لگا رکھا تھا۔ یہ ایک خطرناک بات تھی اس لیے کہ ناکے تک پہنچنے میں ہمیں دس سے بارہ منٹ لگتے۔ ہماری گاڑی میں پیچھے کی طرف دو دو مسٹنڈے بندھے پڑے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی پولیس والے ہماری خاطر داری شروع کر دیتے۔ اب کیا کیا جائے میری سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے سفیر کی توجہ مبذول کرائی۔ وہ بھی پریشان ہوا تھا۔ اس نے کہا ''یہ تو ایک خطرناک بات ہے۔''

گاڑی کی اسپیڈ مرجس نے کم کر دی تھی مگر رکا نہیں تھا۔ میں مسلسل سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ تبھی میری نظر سڑک کنارے اگی جھاڑیوں پر پڑی۔ ہم اب جس جگہ تھے وہاں سے پولیس کا ناکا نظر نہیں آرہا تھا۔ درمیان میں پہاڑی آگئی تھی۔ میں نے پہاڑی کو نظر میں تولا اور پھر مرجس سے کہا ''جھاڑیوں کے نزدیک پہنچ کر گاڑی روک لینا۔''

''جی اچھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیوں کیا ان جھاڑیوں میں گاڑی کو چھپانا ہے؟'' سفیر نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ ان دونوں کو یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی ایک اتر جائے گا۔ وہ دور سے جھاڑیوں پر نظر رکھے گا۔ مجھے امید نہیں کہ انہیں چھ گھنٹے سے قبل ہوش آئے پھر بھی کسی کو رہنا ضروری ہے۔ ایک گھنٹے بعد ہم پھر آئیں گے اور اسے لے جائیں گے۔''

''میں اتر جاتا ہوں۔'' عبداللہ نے کہا۔

''نہیں تم پہلے ہی زخمی ہو۔ شہر پہنچتے ہی تمہیں میں اسپتال لے جانے کی سوچ رہا ہوں۔ وسیم اتر جائے گا۔'' میں نے عبداللہ سے کہا۔

''وسیم نہیں میں اتروں گا اور آپ سب سے موبائل کے ذریعہ رابطے میں رہوں گا۔'' سفیر بولا۔

''ہاں سفیر اتر سکتا ہے۔'' میں نے کہا تھا کہ مرجس نے گاڑی روک لی۔

سفیر اور وسیم نیچے اترے۔ میں بھی ان کی مدد کے لیے نیچے اتر چکا تھا۔ ہم سب نے ان دونوں کو نیچے اتارا اور ڈنڈا ڈولی کر کے جھاڑیوں میں پہنچا دیا۔ انہیں کافی اندر لے جا کر لٹایا تھا تا کہ گزرنے والوں میں سے کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔

''کیوں نا بے ہوشی کی ایک ایک سوئی اور ان کے جسم میں چبھو دی جائے؟'' مرجس نے کہا۔

''نہیں یہ خطرناک بات ہو گی۔ نروس سسٹم بری طرح سوئی چبھنے والا متاثر ہو جائے گا۔'' میں نے اس کام سے اسے روکا۔ کیونکہ وہ پستول نکال چکا تھا۔

اس کا ہاتھ پکڑ کر میں گاڑی تک لے آیا۔ وسیم وغیرہ واپس آگئے تو ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اب یہ ڈر نہ تھا کہ پولیس والے گاڑی کی تلاشی میں لگے تو امداد اور ناصر انہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

مل جائیں گے۔

گاڑی پھر سے چل پڑی۔ ہم نے ایک بہت بڑا رسک لیا تھا۔ ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ امداد شاہ کے بندے آجائیں اور سفیر کو اکیلا پا کر اس پر قابو پالیں لیکن کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا اس لیے کہ پولیس والوں نے بھی ہماری گاڑی دیکھ لی ہوگی اور وہ اب ہمارے نزدیک آنے کے منتظر ہوں گے۔

یہ بات میرے خواب وخیال میں بھی نہ تھی کہ پولیس اس طرح ناکا لگائے گی۔ ورنہ میں کوئی اور راستہ تلاش کرتا۔ جلد بازی میں جو بھی حکمتِ عملی آزمائی تھی اب اس کی کامیابی کی دعا کررہا تھا اور گاڑی چکردار راستے پر آگے بڑھتی چلی جارہی تھی۔ بالآخر ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں پولیس کا ناکا لگا تھا لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو پولیس موبائلوں کی سرخ بتی ہمارا منہ چڑھا رہی تھی۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے چند منٹ پہلے انہوں نے تلاشی روک دی تھی اور تمام پولیس والے واپسی کے لیے چل دیے تھے۔ اسی کو کہتے ہیں چور کی داڑھی میں تنکا۔ ہم اتنا ڈر رہے تھے لیکن ہوا کچھ بھی نہیں۔ میں نے مرجس کو کہا کہ وہ گاڑی کی اسپیڈ کم کرلے تاکہ پولیس کی گاڑیاں دور نکل جائیں۔ مرجس نے رفتار کم کرلی۔ لیکن پوچھے بنا نہ رہ سکا:

''سر آپ لوگ پولیس سے خوفزدہ ہوگئے۔ یہ بات سمجھ نہیں آئی؟''

''بات یہ ہے کہ ہم لوگ اپنا شکار پولیس سے بچا کر رکھتے ہیں تاکہ جو بھی کیس بنے وہ پکا ہو۔ پولیس والے کیس کمزور کردیتے ہیں۔'' وسیم نے فوراً جواب دیا۔

''ہاں یہ بات تو ہے۔ ہمارے ہاں کی پولیس محنت ہی نہیں کرتی۔'' مرجس نے جواب دیا۔

''اسی لیے ہم لوگ پولیس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''یہ پولیس والے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ آپ کا ادارہ اگر نہ ہو تو پورا ملک جرائم کی اماجگاہ بن جائے۔''

وہ بے چارہ زبردستی ہمیں محکمہ خفیہ سے منسلک کیے جا رہا تھا۔ ابھی اس سے کام لینا تھا اس لیے میں نے بھی اسے مغالطے میں ہی رہنے دیا کہ اگر وہ ایسا کچھ سمجھ رہا ہے تو سمجھنے دو۔ مرجس کی سست روی نے کام دکھایا اور پولیس کی موبائلیں دور نکل گئیں۔ اب ان کی ٹیل لائٹ کی سرخی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے مرجس سے کہا ''ایسا کرو کہ گاڑی موڑلو۔ ہم اپنا سامان ساتھ لے لیں۔''

''جی بہتر ہے۔'' کہہ کر اس نے گاڑی کو نہایت چابک دستی سے موڑ لیا۔ میں نے سفیر کو کال کرکے بتا دیا تھا کہ ہم واپس آرہے ہیں۔ ایسا اس لیے کیا تھا کہ کہیں وہ اندھیرے میں ہماری گاڑی کو دشمن کی گاڑی نہ سمجھ لے۔

کچھ ہی دیر میں ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ ابھی گاڑی رکی ہی تھی کہ سفیر جھاڑیوں سے برآمد ہوا۔

''ہاں بھائی ہمارے مال کی پوزیشن کیا ہے؟ لوڈ کیا جاسکتا ہے یا کوئی کلمبا لا رہا ہے؟'' وسیم نے پوچھا۔

''دونوں خواب خرگوش کا مزہ لے رہے ہیں۔ فی الحال ان کے بیدار ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔'' سفیر نے ہنستے ہوئے جواب دیا ''اگر آپ صاحبان نیچے آکر انہیں دوبارہ سے گاڑی میں سوار کرائیں تو زیادہ مناسب ہو گا۔ اکڑو بیٹھے بیٹھے میری کمر میں درد اٹھنے لگا ہے۔''

میرے اترتے ہی مرجس اور وسیم بھی نیچے اتر آئے اور ان دونوں کو دوبارہ سے ڈنڈا ڈولی کرکے گاڑی میں لائے۔ ان کے جسموں کو اندر پٹخنے کے بعد پھر سے سفر شروع ہوگیا۔

جس مکان میں ہم ٹھہرے تھے اس تک پہنچتے پہنچتے اذان کی شیریں آواز گونجنے لگی۔ گویا ساری رات بھاگ دوڑ میں کٹ گئی تھی۔ مرجس نے بریک دبایا تو میں نے اطمینان کی سانس لی کہ کچھ دیر کو آرام مل جائے گا۔

گاڑی سے اتر کر میں نے دروازہ کھولا تاکہ قیدیوں کو فوراً اندر لایا جاسکے اس لیے کہ کسی بھی وقت کسی کے بھی گھر کا دروازہ کھل سکتا تھا۔ کوئی بھی گھر سے نکل سکتا تھا۔ مسجد جاتے ہوئے وہ ہماری کارگزاری دیکھ سکتا تھا کہ ہم کسی بے ہوش آدمی کو اتار رہے ہیں۔

میرے نیچے اترتے ہی وسیم اور سفیر نے پہلے امداد شاہ کو ڈنڈا ڈولی کرکے اندر پہنچایا پھر ناصر کو۔ ان دونوں کو اندر والے کمرے میں پہنچا کر سفیر نے کہا۔ ''آپ ایک بار چیک کرلیں کہ انہیں ہوش میں آنے میں کتنی دیر لگے گی۔''

''ہوش میں آنے کا تعین تو وسیم کرسکتا ہے کہ وہ سوئی والی گن اس کی دریافت ہے۔'' کہتے ہوئے میں نے ان دونوں کے ہاتھ پیروں کی رسی کو چیک کیا کہ کہیں ڈھیلی تو نہیں ہوگئی ہے لیکن بندھن مضبوط تھے۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے خود کو بستر پر گرا دیا۔ دیکھا دیکھی سب ہی لمبے لمبے لیٹ گئے۔ شاید یہ تھکن اور شب بیداری کا نتیجہ تھا کہ کچھ ہی دیر میں میری آنکھ لگ گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

سونا آسان ہے مگر جاگنا کب اپنے اختیار میں ہے۔ میں بھی سویا تو خوب سویا۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب سورج چڑھ آیا تھا۔ ہر طرف دھوپ پھیل چکی تھی۔ میں نے نظریں موڑ کر ادھر دیکھا جدھر دوسرے سو رہے تھے۔ وسیم اور سفیر بھی بے خبری کی نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لیکن عبداللہ بیدار تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھا کھڑکی سے آتی دھوپ سینک رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا "اب کیسی طبیعت ہے؟"

"فرسٹ کلاس' میں نے زخم کا معائنہ کر لیا ہے۔ زیادہ گہرا نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"نہیں... میں خود دیکھوں گا۔" کہہ کر میں عبداللہ کے قریب بیٹھ گیا۔ ابھی میں اس کا پائنچا اٹھا ہی رہا تھا کہ وسیم کی آواز گونجی:

"او بھائی... یہ کیا ہو رہا ہے' یہ کیا ہو رہا ہے۔"

"وہی جو تم دیکھ رہے ہو۔" عبداللہ نے جواب دیا۔

"میں تم سے نہیں شہباز سے پوچھ رہا ہوں کہ اسے شرم نہیں آرہی ہے تو آپ بھی...... ارے بھائی سب کے سامنے تو اسے برہنہ نہ کریں۔ مانا گولی لگی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے بے شرم بنا دیں۔"

"بکواس بند کرو مجھے زخم کا معائنہ کرنا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے دیکھ لیا ہے۔ زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔ دوا میں نے ہی لگائی تھی۔ ان صاحب کو بھی خبر نہیں کہ کب زخم کی ڈریسنگ ہوئی۔" وسیم نے کہا۔

"اچھا' وہ تم تھے۔ شاید اس وقت مجھ پر غشی چھائی تھی۔ مجھے احساس تو ہوا تھا کہ کوئی میرے زخم کو چھیڑ رہا ہے۔" عبداللہ بولا۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ زخم کو صاف کرنے کے بعد میں نے راجا صاحب کا دیا ہوا انجکشن بھی لگا دیا تھا جو انہوں نے وادی میں جاتے ہوئے دیا تھا کہ زخمی کو لگانے سے کمزوری فوراً دور ہو جاتی ہے۔"

"تبھی میں کمزوری محسوس نہیں کر رہا ہوں۔" عبداللہ نے مسکراتے ہوئے جواب میں کہا۔

زخم کو دیکھا تو واقعی وہ گہرا نہیں تھا لیکن کافی لمبا تھا۔ گولی نے گوشت کو جلا دیا تھا لیکن اس زخم کی حالت بتا رہی تھی کہ کافی سارا خون بہا ہے۔ اس لیے کہ پینٹ کا پورا پائنچہ خون سے لت پت تھا۔ میں نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ پینٹ بدل لے۔ عبداللہ لنگڑاتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف چلا گیا جہاں اس کا بیگ رکھا ہوا تھا۔

عبداللہ کے جانے کے بعد میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ سفیر بھی اٹھ چکا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا" یہ مرجس نظر نہیں آرہا ہے۔"

"مرجس مجھے بتا کر گیا ہے۔" عبداللہ نے کمرے کے اندر سے جواب دیا" وہ گاڑی لینے گیا ہے۔"

"کچھ بھی ہو' یہ بندہ ہے کام کا۔ لگتا ہے کہ ہمارے ساتھیوں میں ایک کا اضافہ ہونے والا ہے۔" وسیم نے کہا۔

"رات جس طرح اس نے مدد کی ہے یہ بھلانے کے لائق نہیں۔"

"بس تھوڑی سی پالش کر دی جائے تو بہت کام کا آدمی نکلے گا۔" سفیر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"موقع ملتے ہی میں اسے نشانہ بازی سکھا دوں گا۔ رات میں اس نے سوئی فائر کرنے میں خاصہ وقت لیا تھا۔ بار بار اس کا نشانہ خطا جا رہا تھا۔" وسیم بولا۔

"میں اسے کراٹے بھی سکھا دوں گا۔ اس لیے کہ وہ میرا بہت ادب کرتا ہے۔" سفیر نے لقمہ دیا۔

"ایسا کون بندہ ہے جو تمہارا ادب نہیں کرتا۔ پوری دنیا ادب کرتی ہے صرف ایک موٹا ہے جو تمہیں مکھی کی طرح اڑا دیتی ہے۔" وسیم نے چوٹ کیا۔

"کون ہے جو بیوی سے ڈرتا نہیں... سب اس شہد کی مکھی کو بنتی سہتے ہیں۔" سفیر نے جوابی چوٹ کی۔" ویسے ساوی تو تمہارا اتنا ادب کرتی ہے جسے موٹے موٹے حرفوں میں لکھنا چاہیے۔"

وہ دونوں ایک دوسرے پر جملے کس رہے تھے کہ کمرے کے اندر سے عبداللہ کی آواز آئی" مانی کا فون آرہا ہے۔"

"تو ریسیو کرو نا۔ اس کے لیے بھی اجازت لینی ہے کیا؟" وسیم بولا۔

عبداللہ فون کانوں سے لگائے کمرے سے باہر آیا۔ اس نے دوسری طرف کی بات سن کر کہا" ہاں یہاں ہم سب موجود ہیں۔" پھر وہ دوسری طرف کی بات سننے لگا۔

"کیا کہہ رہا ہے بتاتے بھی جاؤ۔" وسیم چپ نہ رہ سکا۔

"مانی کا کہنا ہے کہ اس نے آمنے سامنے کے دو اپارٹ منٹ دیکھ لیے ہیں۔ کم قیمت میں مل رہے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو بات کر لیا جائے۔" عبداللہ نے وسیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

"بالکل بات یہی کرے۔ مرشد سے نمٹتے ہی ہم وہیں آجائیں گے۔" میں نے عبداللہ سے کہا۔ عبداللہ نے میری بات مائی تک پہنچادی۔ پھر ادھر کی بات سن کر بولا۔ "وہ آج ہی اپارٹمنٹ والوں سے بات کرلے گا۔" پھر اس نے فون بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔

"ایسا کرتے ہیں کہ سادی کو یہ خوش خبری سنا دیتے ہیں۔ وہ خوش ہو جائے گی۔ اسے یہ بھی کہہ دوں گا کہ وہ گھر کے ہر فرد کو یہ بات بتا دے کہ فراق کی گھڑیاں بیتنے والی ہیں، وصال کا موسم قریب ہے۔" وسیم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ باہر کسی گاڑی کے ہارن کی تیز آواز گونجی۔

"لگتا ہے مرتجس آگیا۔" سفیر نے دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ دروازہ کھلا اور مرتجس کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے چہرے پر جوش تھا۔ اس نے اندر آتے ہی کہا۔ "بالکل نئی پراڈو لایا ہوں اور وہ بھی بہت کم کرایہ پر۔ راستے میں پتا ہی نہیں چلے گا کہ ہم بائی روڈ جا رہے ہیں۔"

"کیا تمہاری پراڈو ہوا میں اڑتی ہے؟" وسیم نے اسے چھیڑا۔

"ہوا میں اڑتی نہیں ہے لیکن ایسی سبک چال چلتی ہے کہ کیا بتاؤں۔ اسے چلا کر مجھے بھی بہت مزہ آیا۔" مرتجس نے چہکار بھری آواز میں کہا۔ "ابھی تو میں ایڈوانس میں ایک ہزار روپے دے آیا ہوں۔"

"چلو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ راستے میں دیکھ لیں گے کہ تمہارے دعوے میں کتنی صداقت ہے۔" وسیم نے کہا۔

میں نے اٹھ کر ان دونوں کو چیک کیا کہ کہیں وہ ہوش میں تو نہیں آگئے لیکن وہ دونوں اسی طرح بے ہوش پڑے تھے۔ اب ان کو پنڈی تک لے جانا تھا اور یہ بھی ایک دشوار معرکہ تھا۔ میں نے کافی غور کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ ان دونوں کے جسم میں ایک ایک سوئی اور اتار دی جائے تاکہ راستہ آرام سے کٹ جائے ورنہ ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی پریشانی کھڑی کردیں۔ اس لیے کہ راستہ بھی لمبا ہے اور اس بات کا بھی بھروسا نہیں کہ راستے میں ان کے لوگ ہمیں روکنے کی کوشش کریں۔

"کیا ارادہ ہے سر۔" مرتجس نے پوچھا تو میرے خیالات بکھر گئے۔ میں نے سفیر کی طرف دیکھا تو اس نے وسیم اور عبداللہ پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں نکل جانا چاہیے تاکہ وقت پر ہم پنڈی پہنچ سکیں۔"

"تو پھر مہمانوں کو نہایت احتیاط سے سوار کرا دو۔ یہ خیال رہے کہ ہم ایک طویل راستے پر جا رہے ہیں اور راستے میں جگہ جگہ چیکنگ بھی ہوتی ہے۔" میں نے ہدایت دی تو سفیر نے اثبات میں سر ہلایا لیکن وسیم خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

"آپ بے فکر رہیں... ہم مہمانوں کو احتیاط کے ساتھ ہی نہیں احترام کے ساتھ پچھلی طرف پٹخیں گے۔"

"سر میں کہوں۔" مرتجس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ضرور بولو۔"

"سر اگر آپ کہیں تو میں اسپتال سے مریضوں کے پہننے والے کپڑے لے آؤں۔ آپ میں سے ایک ڈاکٹر بن جائے گا۔ راستے میں کہیں پولیس کا ناکا ہوا تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم مریض کو لے جا رہے ہیں۔"

"واہ جیتے رہو... اچھا آئیڈیا دیا ہے۔ دل کر رہا ہے کہ ہاتھ چوم لوں۔" وسیم نے شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اس کا یہ آئیڈیا مجھے بھی پسند آیا تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لاجواب آئیڈیا ہے۔ فوراً لباس لے آؤ۔"

"میں نے یہ بات راستے میں ہی سوچ لی تھی لیکن ذکر کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ آپ نے بھی میرے خیال کو پسند کیا تو میں کہہ دوں کہ وہ کپڑے میں آتے ہوئے لے آیا ہوں۔ گاڑی میں ہی رکھے ہوئے ہیں۔ نہ صرف کپڑے لائے ہیں بلکہ آکسیجن دینے کا پورا سامان اسپتال سے اٹھا لایا ہوں۔ ایک ہفتے کے وعدہ پر خالی سلینڈر و دیگر سامان لایا ہوں۔"

"واہ... یہ تو بڑی عقلمندی کا کام کیا ہے۔ جس سے لائے ہو اس سے کیا کہا تھا۔" میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے تعریف کی۔

"اس سے کہا کہ ایک ڈراما پارٹی آئی ہوئی ہے۔ ایک ہفتے کے لیے یہ سامان چاہیے۔ کرایہ کے طور پر اسے ہزار روپے دیئے ہیں۔"

"تو پھر دیر کیسی... مہمانوں کو لے جا کر سیٹ کردو۔"

اس وقت مرتجس کا چہرہ کھلا پڑ رہا تھا وہ بہت پُرجوش ہوا تھا۔ اس نے اندر والے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "آپ میں سے کوئی ایک شخص آجائے۔ ہم دونوں مل کر ایک بندے کو اٹھاتے ہیں۔ پھر دوسرے کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اٹھائیں گے۔میں نے پچھلی دونوں سیٹوں کو پھیلا دیا ہے۔دونوں بندوں کو آرام سے لٹایا جا سکتا ہے۔''

وسیم اس کی مدد کے لیے اندر چلا گیا۔پھر جب باہر آیا تو ان دونوں نے ڈنڈا ڈولی کر کے امداد شاہ کو اٹھا رکھا تھا۔وہ اسے باہر لے کر نکل گئے۔سفیر بھی کھڑا ہو گیا تھا۔اس نے ضروری چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں۔اس نے دو چکر لگا لیا تھا کہ وسیم واپس لوٹا اور اس نے ناصر کو بھی اسی طرح باہر پہنچا دیا۔میں نے گھر پر ایک نظر ڈالی۔اچھی طرح سے جائزہ لیا کہ کوئی ضروری چیز رہ تو نہیں گئی ہے لیکن سفیر نے ایسی کوئی چیز چھوڑی نہیں تھی۔آخر میں عبداللہ کو سہارا دے کر ہم باہر آئے۔

دروازے پر کھڑی پراڈو بالکل نئی تھی۔رنگت سیاہ تھی۔گاڑی کی حالت بتا رہی تھی کہ زیادہ استعمال نہیں ہوئی ہے۔میں نے اندر جھانک کر دیکھا' دونوں کو ایسے سلایا گیا تھا جیسے واقعی وہ مریض ہوں۔امداد شاہ کی ناک پر گیس ماسک بھی لگا دیا گیا تھا۔

ان کی کارگزاری دیکھ کر میں مطمئن ہو گیا۔اب اگر کوئی روکتا تو ہم آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ یہ دونوں بے ہوش ہیں اور انہیں طبی امداد کے لیے ہم لے جا رہے ہیں۔وسیم نے عبداللہ کو ایک سفید کوٹ دیتے ہوئے کہا''اگر پڑھ لکھ لیتے تو ڈاکٹر بن جاتے...پھر بھی افسوس کی بات نہیں ہے۔تھوڑی دیر کے لیے بن جاؤ۔اسٹیتھسکوپ بھی ہے اسے گلے میں لٹکا لینا۔''

تیاری ہو چکی تو میں نے مرتجس کو اشارہ کیا اور وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھنے لگا۔ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ایک تو مرتجس مشاق ڈرائیور اور پراڈو کی کنڈیشن بھی اچھی' لگ ہی نہیں رہا تھا کہ ہم سفر میں ہیں۔ہچکولے تک محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

کچھ ہی دیر میں ہم شہر سے کافی دور پہنچ گئے۔چلاس قریب آتا جا رہا تھا۔وقت بھی تیزی سے گزر رہا تھا۔حیرت کی بات یہ تھی کہ وسیم اور سفیر بھی خاموشی سے بیٹھے تھے کوئی کسی پر طنز نہیں کر رہا تھا۔عبداللہ تو یوں بھی چھیڑنے پر ہی بولا کرتا تھا۔اپنی طرف سے وہ کبھی ابتدا نہیں کرتا تھا۔میں نے ایک نظر سب پر ڈالی پھر پیچھے والے حصے کی طرف دیکھا۔وہ دونوں مردے کی طرح پڑے ہوئے تھے مگر باقی لوگوں سے زیادہ آرام میں تھے اس لیے کہ وسیم عبداللہ اور سفیر بالکل ٹھس کر بیٹھے تھے۔خود میں بھی بے آرام تھا لیکن ناصر اور امداد شاہ کافی جگہ گھیرے لیٹے تھے۔ان کے جسم پر اسپتال کا ڈھیلا ڈھالا لباس تھا۔میں نے امداد شاہ کی ناک سے ماسک ہٹا دیا تھا۔وجہ پوچھنے پر سفیر کو بتا چکا تھا کہ جیسے ہی کسی نے رکنے کا اشارہ دیا تو ماسک پھرتی سے لگا دیا جائے گا۔

اندر کا جائزہ لینے کے بعد میں نے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھا۔وہی چٹیل میدان اور سنگلاخ پہاڑیاں۔دور دور آبادی۔آتی جاتی گاڑیاں بھی کم۔دور بہتی ہوئی ندی جو صرف چمکتی ہوئی لکیر نظر آتی تھی۔کبھی دور بہت دور ایک بڑی آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔

''کیا ہم چلاس پہنچ رہے ہیں؟''میں نے مرتجس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں۔ہم چلاس کے نزدیک پہنچ چکے ہیں۔''اس نے سامنے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

چلاس کی اپنی خوبصورتی ہے۔اپنا مقام ہے۔فطرت کا حسن کچھ زیادہ ہی یہاں نمایاں ہے۔میں پہاڑوں کی خوبصورتی کو دیکھنے میں محو تھا کہ وسیم بولا۔''صبح سے پیٹ میں انتڑیوں نے قل کا ورد تواتر سے کیا ہے۔شہر ابھی بھی کافی دور ہے تو کیوں نہ اس ڈھابے پر رک کر کچھ کھا پی لیا جائے۔''

میں نے نظر گھما کر اس طرف دیکھا جدھر وسیم نے اشارہ کیا تھا۔وہ ہوٹل دور سے ہی صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔دوسروں کے ساتھ میں نے بھی صبح سے کچھ کھایا نہیں تھا وسیم نے اشارہ کیا تو یاد آیا کہ مجھے بھی کچھ کھا لینا چاہیے۔میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وسیم نے مرتجس سے کہا۔''بھائی میاں۔ادھر جانے پر کوئی پابندی تو نہیں ہے نا تو کیوں نا اس طرف کا ایک چکر لگا لیا جائے۔اس طرح بھوکوں کو کھانا کھلانے کا ثواب مفت میں حاصل کر لو گے۔''

مرتجس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھنچ گئی اور اس نے گاڑی کا رخ اس ڈھابے کی طرف موڑ دیا۔جیسے ہی گاڑی رکی ایک بچہ بھاگتا ہوا ہمارے پاس آیا''صاحب جی کیا لانا ہے؟''

ہمارے اترنے سے پہلے اس نے آرڈر مانگ لیا تھا۔میں کچھ کہتا کہ وسیم بولا۔''جو فوراً مل جائے وہ لے آؤ۔لیکن روٹی گرم ہونا شرط ہے۔''

''جی بہتر۔''اس نے ادب سے کہا اور اندر کی طرف بھاگا۔

ہم نیچے اتر آئے۔سفیر وسیم اور مرتجس بھی اتر آئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

تھے۔ عبداللہ بھی لنگڑاتا ہوا نیچے اتر کر منجھی کی طرف بڑھنے لگا۔ اتنی دیر سے سب ہیک ہوکر بیٹھے تھے۔ یہاں منجھی نظر آئی تو سب کے سب کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ میں نے بھی نلکے سے چہرے پر چھینٹے ماریں اور پھر آکر ایک منجھی پر لیٹ گیا۔

"یار پتا تو کرلو چکن اصیل مرغ کا ہے یا فارم زدہ۔" وسیم نے لیٹے لیٹے ہانک لگائی۔

"یہاں صرف دیسی مرغ استعمال ہوتا ہے۔ ورنہ ان سڑک کے ہوٹلوں میں کون آئے گا۔" مرجس نے بتایا۔

"تو میرے بھائی یہ بھی پتا کرلو کہ مرغ خاندانی ہے نا یا آوارہ گرد قبیل کا ہے۔" وسیم کی آنکھیں بند تھیں اور زبان چل رہی تھی۔ وہ اگر خاموش رہ جائے تو یہ تعجب کی بات ہوتی۔ جب سے وادی کی سیر کی تھی اس کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے تھے۔ پہلے سے کچھ زیادہ ہی بولنے لگا تھا۔ لیکن اس کی بات کا کوئی بھی برا نہیں مانتا تھا لیے کہ وہ ہر بات ہنسی کے پیرائے میں کہتا۔

"بے فکر رہو وہ تمہارے قبیل کا نہیں ہے۔ اصیل ہی ہوگا۔" سفیر نے چوٹ کی۔

"کاش مرحوم ہمارے قبیل کا ہوتا.. ابھی بچے سے پتا کروادوں گا کہ وہ عاشق ازلی تھا۔ پورے گاؤں کی مرغیاں اس پر مرتی تھیں اور وہ خود ہمارے عشق میں مرا ہے۔" وسیم نے ہانک لگائی۔ ان دونوں کی لایعنی بحث میں دلچسپی مجھے نہ تھی اس لیے میں خاموش تھا۔

کھانے کا انتظار طویل ثابت نہیں ہوا۔ کچھ ہی دیر میں گرم گرم روٹیوں کے ساتھ کڑھائی حاضر ہوگئی۔ مسالا بھی عمدہ تھا۔ کھانے میں ذائقہ آرہا تھا۔ سب ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ میں نے روٹی توڑتے ہوئے کہا۔ "اندر جو مہمان ہیں ان کی صحت کے لیے کچھ نہ کھانا نقصان کا باعث بن سکتا ہے لیکن کیا کریں۔ مجبوری ہے کہ انہیں کھلا نہیں سکتے۔ اس لیے جلدی جلدی کھاؤ اور سفر کا آغاز کردو۔ ہمیں پنڈی تک پہنچنا ہے اور پنڈی ابھی بہت دور ہے۔"

"پنڈی ہنوز دور است۔" نوالا توڑتے ہوئے وسیم نے کہا۔

"اچھا یہ جانتے ہو کہ کس نے کہا تھا کہ ہنوز دلی دور است؟" سفیر نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔

"ایک بچے سے بھی پوچھو گے تو وہ بتا دے گا کہ یہ جملہ حضرت نظام الدین اولیا کا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ بادشاہ نے ان کی شہرت سے جل کر سوچا کہ وہ اگر دلی میں رہیں گے تو

موزمبیق

افریقا کے مشرقی ساحل پر واقع ایک سوشلسٹ جمہوریہ۔ سرکاری نام عوامی جمہوریہ موزمبیق۔ اس کے مشرق میں رودبار موزمبیق، جنوب میں سوازی لینڈ، جنوب و مغرب میں جنوبی افریقا، مغرب میں زمبابوے، شمال مغرب میں زمبیا ملاوی اور شمال میں تنزانیہ کے ملک ہیں۔ رقبہ: 303769 مربع میل۔ آبادی کا غالب حصہ بنتو قبائل پر مشتمل ہے جن میں سے 35000 یورپی افریقی 15,000 ہندوستانی اور 10,000 یورپی شامل ہیں۔ دارالحکومت: مپوتو۔ دیگر اہم شہر بیرا، نمپولا، کوئی مین۔ زبان: بنتو بولیاں۔ پرتگالی سرکاری زبان ہے۔ مذہب: مظاہر پرست 60 فیصد، عیسائی 30 فیصد، مسلم 10 فیصد، سکہ: میٹیکل (Metical)۔

مرسلہ: نوشابہ فتح محمد۔ ایبٹ آباد

لوگ مجھ پر انہیں ترجیح دیتے رہیں گے۔ اس لیے اس نے حکم دیا کہ میرے دلی پہنچنے سے قبل نظام الدین شہر چھوڑ دیں ورنہ سر قلم کر دیا جائے گا۔ ان کے چاہنے والے گھبرا اٹھے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ بادشاہ کے دلی لوٹنے سے پہلے انہیں شہر چھوڑ دینا چاہیے۔ ایک وفد کی صورت میں لوگ آئے اور التجا کی کہ آپ شہر چھوڑ دیں۔ نظام الدین اولیا نے ان کی گزارش پر مسکرا کر کہا کہ ہنوز دلی دور است۔ ان کا یہ جملہ اس لیے مشہور ہوگیا کہ بادشاہ کا راستے میں ہی انتقال ہو گیا۔" خلاف توقع وسیم نے ایک علمی بحث کا جواب علمی انداز میں دیا تھا۔

روٹی کے ساتھ بحث لطف دے رہی تھی کہ میری نظر پراڈو پر پڑی اور میں بوکھلا کر کھڑا ہوگیا۔ روٹی کا ٹکڑا ہاتھ میں تھا جسے میں نے پلیٹ میں رکھا اور پراڈو کی جانب دوڑ لگا دی۔ میری تقلید سفیر نے بھی کی تھی۔ پراڈو سڑک پر مڑ رہی تھی۔ جس وقت ہم کھانا کھا رہے تھے کوئی موقع پا کر پراڈو میں داخل ہوگیا تھا اور اب وہ گاڑی بھگائے لیے جا رہا تھا اور میں افسوس بھرے انداز میں ادھر دیکھ رہا تھا کہ مرجس نے وہیں کھڑی ایک بائیک کو اسٹارٹ کیا اور مجھے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اچک کر اس پر سوار ہوا تھا کہ اس نے پراڈو کے پیچھے بائیک لگا دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک بندہ چیختا ہوا پیچھے دوڑا تھا۔ شاید یہ بائیک اسی کی تھی مگر وسیم

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نے اسے دوڑنے نہیں دیا اور اسے کمر سے پکڑ لیا۔ اب ان دونوں میں بحث ہو رہی تھی۔ میں نے ادھر سے نظریں ہٹا کر پراڈو کو دیکھا۔ وہ سامنے کی طرف ہی چلتی چلی جا رہی تھی۔ آگے پراڈو تھی اور پیچھے ہم۔ دونوں ہی چلاس کی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہماری گاڑی کو اغوا کیوں کیا جا رہا ہے۔ گاڑی چرانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایسی چوری عام ہے۔ پراڈو بالکل نئی ہونے کی وجہ سے چور کو متوجہ کر سکتی ہے اور اس نے اچھے پیسے ملنے کی اُمید پر گاڑی چرالی ہو۔ یا پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ناصر کے آدمی ہمارا پیچھا کر رہے ہوں اور موقع ملتے ہی ناصر اور امداد شاہ کو چھین لے گئے۔ دونوں ہی باتیں ممکن تھیں۔ اس لیے جو بھی قدم اٹھانا تھا وہ بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا تھا۔ اسی خیال کے تحت میں نے مرجس سے کہا ''رفتار کم رکھنا۔ سڑک سیدھی ہے' کافی دور سے گاڑی کو دیکھا جا سکتا ہے اس لیے ہمیں فوراً ان کو گھیرنا نہیں ہے۔ صرف تعاقب کر کے وہ جگہ دیکھنا ہے جہاں یہ گاڑی کو روکیں گے۔''

مرجس کی تمام تر توجہ سڑک کی جانب تھی۔ اس نے نظریں موڑے بغیر کہا۔ ''آپ دیکھ رہے ہیں نا کہ سڑک چکردار ہے۔ آگے جانے والی گاڑی کچھ دیر کے لیے کسی پہاڑی کی آڑ میں چھپ بھی جاتی ہے۔ اگر ان لوگوں نے ناصر اور امداد شاہ کو کسی آڑ میں پہنچ کر اتار دیا اور گاڑی آگے لے گئے تو؟''

مرجس بائیک بھی چابک دستی سے چلا رہا تھا۔ رفتار تیز ہوتے ہوئے بھی اس نے گاڑی کو سنبھال رکھا تھا۔ عام طور پر بائیک میں جھٹکے بہت لگتے ہیں لیکن یہ چھوٹے چھوٹے کھڈوں سے بھی بائیک کو بچا کر چلا رہا تھا اس لیے محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ ہم بائیک پر ہیں۔ باتوں کے درمیان بھی اس نے رفتار کم نہیں کی تھی۔ وہ اسی رفتار سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کا سوال اہم تھا۔ اس نکتے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس گاڑی میں وہ دو بندے تھے جن پر ہمارے آئندہ کا لائحہ عمل منحصر تھا۔ وہی دونوں ہمیں منزل تک پہنچا سکتے تھے۔ انہی سے معلوم ہو سکتا تھا کہ ان کا مرشد سے کس قسم کا کنکشن ہے؟ کہیں مرشد اب ملک سے غداری کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہے۔ کہیں وہ انڈیا کی کسی ایجنسی سے تو جڑا ہوا نہیں ہے؟ میں اسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ مرجس نے پوچھا۔ ''آپ نے بتایا نہیں کہ رفتار کم کرنا ہے یا اسی رفتار سے چلتے رہنا ہے۔ اپنا اندیشہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ سڑک چکردار ہے۔ کسی بھی آڑ میں پہنچ کر وہ پھرتی سے مغویوں کو اتار سکتے ہیں۔''

''ہاں ایسا ممکن ہے۔ لیکن ایک بات اور ہے۔ جس تیزی سے وہ پراڈو چلا رہا ہے۔ ایسا نظر نہیں آ رہا ہے کہ وہ کسی آڑ میں رکے۔ ڈرائیور کی تیزی بتا رہی ہے کہ وہ جلد سے جلد چلاس پہنچنا چاہ رہا ہے۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' مرجس نے اپنا خیال پیش کیا۔ اس کی بات میں دم تھا لیکن میں رسک لینے سے کترا رہا تھا۔ اکیلا ان سے ٹکرانا عقل مندی نہیں تھی۔

ابھی میں اسی سوچ میں تھا کہ کیا کیا جائے کہ میری نظر سڑک کے نیچے پڑی اور میں چونک گیا۔ نیچے ناکا لگا ہوا تھا لیکن ناکا انتہائی چالاکی سے لگایا گیا تھا۔ سڑک اوپر سے نیچے جا رہی تھی اس لیے نیچے کا منظر کافی پہلے نظر آ جاتا تھا۔ لیکن ناکا ایسی جگہ لگایا گیا تھا کہ صرف کھڑی ہوئی گاڑیاں نظر آئیں۔ اس لیے ڈرائیور جب کافی نزدیک پہنچ جاتے تب ہی ناکا نظر آتا۔ مجھے اس لیے نظر آ گیا تھا کہ تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان کے قریب ایک پولیس والا نظر آ گیا تھا اور میں نے سمجھ لیا تھا کہ آگے چیکنگ ہو رہی ہے۔

''ہوشیار آگے پولیس نے ناکا لگایا ہوا ہے۔ چیکنگ ہو رہی ہے۔'' میں نے مرجس کو ہوشیار کیا۔

''کہاں؟'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نیچے... سڑک جب گھوم کر وہاں پہنچے گی تو نظر آئے گا۔ مجھے بھی ایک ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی۔''

''اب کیا کیا جائے۔ میرے پاس تو پسٹل ہے۔''

''پسٹل تو میرے پاس بھی ہے۔ ایک رسک لیتے ہیں۔ پسٹل یہیں جھاڑیوں میں پھینک دو۔'' کہتے ہوئے میں نے اپنی کمر سے پستول نکالا اور اسے جھاڑیوں میں اچھال دیا۔ مرجس نے بھی میری تقلید کی۔ پھر اس نے وہ والی پستول نکالی جو پلاسٹک کی بنی ہوئی تھی اور اس سے سوئی نکلتی تھی۔ جس نے ہمیں ایک بڑی مصیبت سے نجات دلائی تھی۔ وہ اسے پھینکتا کہ میں نے منع کر دیا کہ نہیں' ابھی نہیں۔ یہ کھلونا پستول جیسا ہے۔ اسے مجھے دے دو۔''

اس نے ہاتھ پیچھے کر دیا۔ میں نے پستول کو بائیک کے ساتھ لٹکتے تھیلے میں ڈال دیا ''اب اگر وہ اسے نکالتے بھی ہیں تو کھلونا پستول سمجھ کر توجہ نہیں دیں گے۔''

''بالکل... آپ دور کی کوڑی لاتے ہیں۔''

''اچھا یہ بتاؤ' یہ جگہ جگہ ناکا کیوں لگایا جا رہا ہے۔ پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا؟'' میں نے مرجس سے پوچھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

"دراصل بابوسر میں ایک بڑا حادثہ ہوگیا تھا جب سے پولیس نے چیکنگ بڑھا دی ہے۔ چلاس ہی نہیں گلگت میں بھی چیکنگ عام ہے تاکہ شرپسندوں کو موقع نہ مل سکے۔ اس سے غیر قانونی کام کرنے والوں پر بھی اثر پڑا ہے اور وہ علاقے سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔" مرجس نے کہا تو میں ہنس پڑا۔

"امداد شاہ اینڈ کمپنی تو کھلے عام قانون شکنی کر رہی ہے۔"

"صاحب جی قانون توڑنے والے کہاں نہیں ہوتے۔ سنتے ہیں امریکا جیسے ملک میں ہر روز اتنا جرم ہوتا ہے جو ہمارے ملک میں ایک ہفتے میں نہیں ہوتا۔" مرجس بولا۔

"ہاں یہ تو ہے۔ جرائم پیشہ اپنی راہ خود ہی نکال لیتے ہیں۔ اس لیے کہ شیطان ہر جگہ بہکا سکتا ہے۔ جرم کرنے والے دراصل شیطان کے مرید ہوتے ہیں۔"

باتوں کے درمیان راستہ کٹ گیا اور ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں پولیس رکاوٹ کھڑی کرکے گاڑیوں کی تلاشی لے رہی تھی۔ ہماری پراڈو بھی گاڑیوں کے درمیان کھڑی تھی۔ اس میں ایک ہی بندہ بیٹھا نظر آیا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ پراڈو کئی گاڑیوں کے درمیان تھی اور ایک پولیس آفیسر اس کے نزدیک کھڑا اس سے کچھ پوچھ تاچھ کر رہا تھا۔ مرجس بائیک سے اتر کر ادھر بڑھنا چاہتا تھا کہ میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا اور بولا "یہاں پولیس کے سامنے کوئی بات نہ کرو۔ اسے ناکا سے نکلنے دو۔ ہم آگے جاکر اسے گھیریں گے۔ اس لیے کہ ہماری بائیک ہے اس لیے ہمیں آگے جانے کی اجازت جلدی مل جائے گی۔"

مرجس رک گیا تھا۔ میں نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ دیا۔ ہم پیدل آگے بڑھے۔ مرجس بائیک کو دھکیلتا ہوا گاڑیوں کے درمیان سے آگے نکل رہا تھا کہ میں نے سرگوشی میں اس سے کہا کہ وہ سننے کی کوشش کرے کہ پولیس والا کیا کہہ رہا ہے۔

"بہتر۔" کہہ کر اس نے اپنی رفتار کم کر دی۔ ہم پراڈو کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ پولیس والا شینے زبان میں ڈرائیور سے پوچھ رہا تھا کہ تم نے ناکا دیکھ کر ایک فرلانگ پیچھے گاڑی موڑنے کی کوشش کیوں کی تھی؟

مرجس سرگوشی میں مجھے ترجمہ سنا رہا تھا۔ اس بندے نے کہا "گاڑی روکی نہیں ایک خرابی آرہی تھی اسی لیے بریک دبا دیا تھا۔"

"دیکھنے میں تو گاڑی بالکل نئی ہے۔ کہاں جانا ہے؟"

"چلاس۔"

"گاڑی کس کی ہے؟" اس سوال پر اس نے جس کا نام بتایا وہ ایک مشہور سیاسی شخصیت تھی۔ میں نے بھی نام سن رکھا تھا۔ اس کا نام تعلق بھی اسی پارٹی سے تھا جس سے مرشد نے ٹکٹ لیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مرشد ہی کے اشارے پر مجھے گھیرا جا رہا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی میں چونک گیا۔ گویا ناصر اور امداد شاہ اسی کے کہنے پر چل رہے ہیں۔ یہ ایک خطرناک بات تھی۔ کہ مرشد نے یہاں تک جال پھیلا رکھا ہے۔

ابھی میں اسی سوچ میں تھا کہ افسر نے کہا "گاڑی کسی کی بھی ہو تلاشی تو دینی ہوگی۔ کاغذات دکھاؤ۔"

"کاغذات تو صاحب جی کے پاس ہیں۔ ایک ضروری کام سے گلگت گیا تھا۔ جلد بازی میں کاغذات لینا بھول گیا۔"

"ٹھیک ہے ابھی تلاشی لے کر فارغ کر دوں گا۔ کچھ لانے گئے تھے؟"

"جی نہیں۔ صاحب نے اپنے دوست کو کچھ چیزیں دی تھیں اسے پہنچا کر آرہا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔" کہتے ہوئے افسر نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ جیسے ہی سپاہی نزدیک آیا۔ افسر نے کہا "ان کی گاڑی کی پہلے تلاشی لو تاکہ یہ جا سکیں۔ جلدی کرو کیونکہ یہ گاڑی......."

اس کا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ دو سپاہی گاڑی کی طرف بڑھے اور ایک نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ اندر کا منظر دیکھتے ہی وہ چیخا "صاحب ادھر آئیں۔"

"کیوں اس میں کیا سانپ بیٹھا ہے؟" افسر نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

"سر اس میں دو لاشیں ہیں۔ انسان کی لاشیں۔"

افسر اس طرح چونکا جیسے کسی نے اس کے سر پر ہتھوڑا مارا ہو۔ وہ اپنے موٹی توند کے ساتھ پھدکتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے ڈرائیور کا کالر چھوڑا نہیں تھا۔ وہ اسے تقریباً کھینچتا ہوا گاڑی کی سمت بڑھا۔ پراڈو تک پہنچ کر اندر جھانکنے لگا۔ وہاں کھڑے تماشبین بھی لاش کا ذکر سنتے ہی چونک گئے تھے اور اب ان سب کی نظریں پراڈو پر ٹک گئی تھیں۔ ڈرائیو کرنے والے نے بھی اندر جھانکا اور پیچھے کی طرف لپکتے ہوئے امداد شاہ و ناصر شاہ کو دیکھ لیا۔ انہیں دیکھتے ہی اس کا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ رنگت سفید پڑ گئی۔

اس کے خوفزدہ چہرے پر نظر ڈال کر افسر نے مسکراتے ہوئے کہا ''تم نے کیا سمجھا تھا۔ میرے ایریا سے قتل کر کے نکل جاؤ گے۔ میں کوئی ایسا ویسا افسر نہیں ہوں۔ میرے ایریا میں کوئی مجرم چھپ ہی نہیں سکتا۔'' پھر اس نے اپنا موبائل نکالا اور... نمبر بولا۔ ''میں ابھی فون کر کے صاحب سے پوچھتا ہوں کہ یہ لاش کس کی ہے۔''

ڈرائیور کے گرد سپاہیوں نے گھیرا ڈال دیا تھا۔ تماشا دیکھنے والے بھی بھیڑ لگا رہے تھے۔ چیکنگ کرنے والے تمام سپاہی اپنا کام چھوڑ کر ڈرائیور کے گرد کھڑے ہو گئے تھے جیسے انہیں شبہ ہو کہ یہ دوڑ لگا دے گا۔

ڈرائیور کی حالت دیکھنے والی تھی۔ یا تو وہ نیا تھا یا پھر اس بات سے ڈر گیا تھا کہ اب اس پر دو قتل کا الزام لگنے والا ہے۔ اس نے گھبرا کر باضابطہ رونا شروع کر دیا تھا۔ اتنا بڑا کام کرنے چلا تھا اور ایسا بزدل تھا' یہ دیکھ کر مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ وہ روتے کے ساتھ بولتا جا رہا تھا۔ ''سر یہ میری گاڑی نہیں ہے۔ اور نہ میں نے قتل کیا ہے۔ میں تو عام سا چور ہوں۔ گاڑیاں چرانا میرا پیشہ ہے۔ آپ گلگت تھانے سے پتا کر لیں ایک سال پہلے بھی میں چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔''

''تو اس بار تم نے گاڑی چرانے کے لیے مالک کو ہی قتل کر دیا۔ ساری کہانی سمجھ میں آ گئی ہے۔ تم نے گاڑی چرائی۔ مالکان نے روکا تو تم نے انہیں قتل کر دیا' اب لاش کو ٹھکانے لگانے کی کوشش میں تھے۔ کسی ویرانے میں اس کو پھینکنے والے تھے کہ پکڑے گئے۔'' اس وقت آفیسر شرلاک ہومز بنا ہوا تھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے ایک سپاہی کو آنکھ سے اشارہ کیا تھا جس نے ڈرائیور کی کلائی میں ہتھکڑی پہنا دی تھی۔

''یقین کریں سر۔ میں نے مرڈر نہیں کیا ہے۔'' وہ گڑگڑا رہا تھا۔

جوش میں اس کی توند کچھ زیادہ ہی پھول پچک رہی تھی۔ بار بار اس کی پینٹ کھسک کر نیچے آ جاتی جسے وہ پھر سے اوپر کر لیتا تھا۔ شاید کسی بڑے مجرم کو پکڑنے کا یہ پہلا موقع تھا اس لیے کہ اس کی سانس بھی پھول رہی تھی۔ وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بول رہا تھا۔ ''ابھی پتا چل جائے گا کہ یہ کس کی لاش ہے اور تو قتل کر کے اسے کہاں لے جا رہا تھا۔''

اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے افسر کو رعب جمانے کا پہلی بار موقع ملا ہے۔ یوں بھی یہ علاقہ دیگر علاقوں سے زیادہ پرامن ہے۔ جرائم کی شرح بہت کم ہے۔ ایسی حالت میں قتل کے مجرم کا ہاتھ آ جانا بڑی بات ہے۔

''سر یقین کریں میں نے یہ گاڑی پیچھے رہ گئے ہوٹل سے چرائی ہے۔ آپ مجھے ہوٹل تک لے چلیں۔ وہاں اب بھی اس کا مالک بیٹھا ہو گا۔ جلدی سے چل کر اسے گرفتار کر لیں۔ وہی قاتل ہے۔''

''ہمیں کیا احمق سمجھ رکھا ہے جو میں تجھے وہاں لیے جاؤں اور وہاں تیرے ساتھی گھات لگا کر پولیس پارٹی پر حملہ کر دیں۔''

''نہیں سر۔ میں سچ بول رہا ہوں۔ آپ چل کر تو دیکھیں۔ اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں گا تو آپ مجھے شوٹ کر دینا۔''

''ساری بات کا پتا چل جائے گا۔ بس تھوڑا اور صبر کر لے۔ تھانے پہنچ کر تو فرفر بولے گا۔'' افسر نے کہا پھر مڑ کر تماش بینوں سے بولا۔ ''اے تم لوگ کیوں کھڑے ہو، سب جاؤ۔ بھاگو۔ اپنی اپنی گاڑی راستے سے ہٹاؤ۔''

پولیس افسر کی ڈانٹ سنتے ہی وہاں جمع ہو گئے لوگ اپنی اپنی راہ لگ گئے۔ اب صرف ہم رہ گئے تھے۔ میرا ذہن تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ معاملہ مزید الجھتے جا رہا تھا۔ اگر ناصر شاہ اور امداد شاہ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتے تو ہماری محنت برباد ہو جاتی۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ ان دونوں کو پولیس سے کیسے چھینا جائے۔ وہ اسے مردہ سمجھ رہے تھے اس لیے کہ انہوں نے اب تک ان دونوں کو دور دور سے ہی دیکھا تھا۔ بند کھڑکی کے شیشوں سے۔ اگر نزدیک سے دیکھتے یا چیک کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ دونوں صرف بے ہوش ہیں۔

''کیا سوچنے لگے۔ پولیس والے کی نظر ہم پر پڑ گئی تو وہ پھر چیخے گا۔'' مرجس نے نیچی آواز میں کہا۔

تبھی وہ افسر موبائل کی طرف ڈرائیور کو کھینچتے ہوئے بڑھا اور اندر بیٹھتے ہوئے ایک سپاہی سے بولا ''تم پراڈو ڈرائیو کرو گے۔ تھانے لے کر آؤ گے۔ میں ملزم کو لے کر جا رہا ہوں۔''

میں نے مرجس سے سرگوشی میں کہا ''اب ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔''

''کیا؟ کیا کرنا ہو گا؟''

''اگر ہمارے مجرم پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو بات الجھ جائے گی۔ انہیں دوبارہ قبضے میں لینے کے لیے اسلام

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

آباد سے آرڈر نکلوانا پڑے گا۔ اگر آرڈر آتے میں دیر ہو گئی تو یہ پولیس والے رشوت لے کر اسے چھوڑ بھی سکتے ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ ہمارے ہاں کی پولیس رشوت خوری میں نمبر ون ہے۔ واقعی انہیں پولیس کے چنگل سے چھڑانا پڑے گا۔''

موبائل تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اب اس جگہ صرف ہم اور پراڈو کو اسٹارٹ کرنے والا سپاہی رہ گیا تھا۔ وہ ابھی پراڈو اسٹارٹ ہی کر رہا تھا کہ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ شیشہ لگا ہوا تھا اس لیے وہ میری بات سن نہیں سکتا تھا اس لیے میں نے کھڑکی کے بند شیشے پر دستک دے کر اسے شیشہ کھولنے کو کہا۔ سپاہی نے حیران نظروں سے مجھے دیکھا پھر اس نے شیشہ نیچے کرنے کے لیے بٹن دبا دیا۔ بٹن دبتے ہی شیشہ نیچے آ گیا۔ سپاہی نے کڑے لہجے میں شستہ زبان میں مجھ سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

میں نے اترتے ہوئے بائیک کے تھیلے سے کھلونا پستول نکال لیا تھا۔ جیسے ہی شیشہ نیچے ہوا اور سپاہی نے سر باہر نکال کر سوال کیا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کے گال کا نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ ایک ننھی سی سوئی نکلی اور اس کے گال میں پیوست ہو گئی۔ اس نے اضطراری طور پر اپنے گال پر ہاتھ پھیرا ہی تھا کہ سیٹ پر لڑھک گیا۔ موبائل دور جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس شرلاک ہومز افسر کے سر پیٹنے کا سامان ہو گیا تھا۔ جب وہ تھانے پہنچے گا تو اپنے افسران کے سامنے خوب بولے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اپنی بہادری کے فرضی قصے بھی گھڑ لے لیکن جب بے چارا سپاہی ہوش میں آنے کے بعد رپورٹ کرنے پہنچے گا تو وہ افسر اپنے بال نوچنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس وقت اس کا چہرہ دیکھنے کے لائق ہوگا۔

یہی کچھ سوچ کر میں اس بے ہوش سپاہی کو کھسکا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور مرجس کو اشارہ کیا کہ وہ پیچھے آئے۔ پھر میں نے اسٹیئرنگ سنبھال لی۔ آٹو میٹک گاڑیوں کو ڈرائیو کرنے کا ایک اپنا مزہ ہے۔ گاڑی بھاگتی چلی گئی۔

ہمارا نیا سفر شروع ہو چکا تھا گو کہ میرا رخ شہر کی طرف تھا لیکن میں شہر میں داخل ہونے کی بجائے آگے نکل جانے کا سوچ رہا تھا کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ شہر میں داخل ہوتے ہی آفت ٹوٹ پڑے گی۔ اس پورے علاقے میں شاید ہی کسی کے پاس پراڈو ہو اس لیے اسے دیکھتے ہی لوگ پہچان لیں گے۔ پولیس والے پہلے ہی اسے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ اندر کچھ نہ بھی ملتا پھر بھی وہ ہمیں بری طرح رگڑ دیتے۔ اس لیے میں نے مرکزی سڑک پر ہی آگے بڑھنا مناسب سمجھا۔ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ جیب میں رکھا موبائل گنگنا اٹھا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے موبائل نکالا اور اسکرین پر نظر ڈالی۔ سفیر کا نام جگمگا رہا تھا۔ میں نے موبائل کو کان سے لگا کر کہا ''بولو۔''

''آپ کہاں ہیں۔ پراڈو کی کوئی خبر؟''

''پراڈو اس وقت میرے پاس ہے اور میں اسی میں بیٹھا ہوں۔''

''اسی روڈ پر ہیں نا؟''

''ہاں کیوں؟''

''ہم نے ایک سوزوکی حاصل کر لی ہے اور چلاس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔''

''میں چلاس کے قریب مرکزی شاہراہ پر ہوں۔''

''تو کسی مناسب جگہ پر رک جائیں۔ ہم آ رہے ہیں۔''

''موبائل پر رابطہ رکھنا۔ میں سڑک کنارے کھڑا ہوا مل جاؤں گا۔'' کہہ کر میں نے پراڈو کا بریک دبا دیا۔ میرے پیچھے مرجس تھا۔ گو کہ وہ کافی دور تھا لیکن سڑک سیدھی تھی اس لیے نظر آ رہا تھا کہ وہ نزدیک آتا جا رہا ہے۔ مجھے رکتے دیکھ کر شاید وہ چونکا تھا اس لیے کہ اس کی اسپیڈ مزید بڑھ گئی تھی۔

نزدیک آتے ہی اس نے بائیک روکی اور پوچھا ''کیا بات ہے۔ آپ رک کیوں گئے؟''

''سفیر وغیرہ آ رہے ہیں۔ اس گاڑی کو کسی آڑ میں چھپانا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تھوڑا سا آگے جائیں تو ایک جھاڑیوں کا طویل سلسلہ نظر آ جائے گا۔ جنگلی جھاڑیاں اتنی اونچی اور گھنی ہیں کہ اس میں آرام سے بس چھپائی جا سکتی ہے۔''

''تم بائیک مجھے دے دو اور پراڈو کو جھاڑیوں میں پہنچا دو۔ لیکن ٹھہرو، اس سپاہی کو پہلے یہیں اتار دو۔ سڑک کنارے پڑا دیکھ کر کوئی بھی اسے اسپتال یا تھانے پہنچا دے گا۔''

مرجس اور میں نے سپاہی کو سہارا دے کر نیچے اتارا اور پھر اسے وہیں سڑک کنارے لٹا دیا۔ مرجس پراڈو کی طرف بڑھ گیا اور میں نے بائیک سنبھال لی۔ اب وہ آگے تھا اور میں اس کے پیچھے۔ ہمارا رخ اب بھی چلاس ہی کی طرف تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اگر دیر ہوتا دیکھ کر وہ جوافسر تھانے سے نکل پڑا اور اس نے پراڈو

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

دیکھ لی تو ہماری خیر نہیں۔

میں خیالوں میں ڈوبا بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ پراڈو رک گئی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ سڑک سے کچھ ہٹ کر جھاڑیوں کا ایک سلسلہ سا پھیلا ہوا تھا۔ جھاڑیاں بھی کافی بڑی تھیں۔ درمیان درمیان میں درخت بھی تھے جن کی وجہ سے جھاڑیوں پر جنگل کا گمان ہو رہا تھا۔ ان جھاڑیوں کے اندر پراڈو کو آسانی سے چھپایا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی رک کر دیکھتا تبھی یہ گاڑی نظر آتی۔ گزرنے والی کسی گاڑی میں بیٹھے شخص کو آسانی سے پراڈو نظر نہیں آسکتی تھی۔ میں نے بائیک روک کر کہا ''ٹھیک ہے کسی طرح جھاڑیوں میں اسے لے جاؤ۔''

مرجس اسے داہنی جانب سے پہاڑی کی جانب لے جانے لگا۔ کافی آگے جانے کے بعد وہ ہلکا سا مڑا اور پھر واپس آنے لگا۔ آدھے راستے میں اس نے پراڈو کا رخ جھاڑیوں کی طرف کیا اور پھر اسے اندر کی طرف لے جانے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ جھاڑیوں میں داخل ہو گیا۔ پھر اندر جا کر اس نے گاڑی روک دی اور اتر کر جھاڑیوں میں سے راستہ بناتا ہوا واپس آ گیا۔

ابھی مرجس مجھ تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ ایک سوزوکی آ کر رکی اور اس سے وسیم نے ہانک لگائی۔ ''لو بھائی ہم بھی آ گئے۔''

''ایسا کرو اس بائیک کو کچھ دور لے جا کر کھائی میں گرا دو۔ اب ہم سب ایک ساتھ بڑھیں گے۔''

''تو پھر دیر کس بات کی ہے؟''

''آپ کا انتظار تھا کہ آپ آئیں تو ان جھاڑیوں میں کھڑی پراڈو میں لیٹے دونوں بندوں کو اتار کر لایا جائے۔ تا کہ ہم انہیں بھی ساتھ لے جا سکیں۔'' مرجس نے ہنستے ہوئے کہا۔

سفیر اتر آیا۔ عبداللہ اندر ہی رہا۔ اگر وہ اترتا بھی تو میں اسے واپس بھیج دیتا۔ سفیر، وسیم اور مرجس کو جھاڑیوں کی طرف بڑھتے دیکھ کر میں بھی ادھر بڑھا۔

مرجس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا تھا کہ میرے ذہن میں ایک نئے خیال نے سر ابھارا اور میں نے کہا۔ ''پراڈو کو یہاں چھوڑنا مناسب نہیں؟''

''کیوں؟'' وسیم نے سوال کیا۔

''پتا نہیں وادی سے لوٹنے کے بعد سے صحیح بات صحیح وقت پر سوجھتی ہی نہیں۔''

''ایسا کیا ہو گیا... یہ رہ کر وادی کو یاد کرنے کا بہانہ کیوں؟ کہیں وہ لڑکی کیا نام تھا جو زبردستی سر ہو رہی تھی وہ یاد تو نہیں آ رہی ہے؟'' سفیر نے کہا۔

''ہاتھ مار دوں گا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''جب کسی کے ذکر پر ہونٹ مسکرا دیں تو دال میں کچھ کالا ضرور ہوتا ہے۔'' وسیم نے لقمہ دیا ''ویسے پتھر میں جونک لگ جائے یہ ممکن نہیں۔ ایک ہی جونک کافی ہے۔ جو شب گزرنے کی آس میں بیٹھی ہے۔ نام بھی وہی ہے۔''

''عقل سے کام لو۔ مجھے یہ خیال ابھی آیا۔ تم لوگ بھی عقل بیچ کر کھا گئے ہو۔ کوئی تو توجہ دلاتا۔''

''ہم تو آپ کے پیچھے پیچھے پھر رہے تھے۔ جناب عالی ہم پورے دس کلومیٹر پیچھے تھے۔''

''ابھی ابھی یہ خیال آیا ہے کہ یہ گاڑی تو مرجس نے کرایہ پر لی ہے۔ جس کے بھی ہاتھ لگی وہ اسے یا تو کباڑ مارکیٹ لے جائے گا یا تھانے۔ دونوں ہی میں ہمارا نقصان ہے۔ اس لیے کہ گاڑی کرایہ پر لی گئی ہے۔ کباڑ مارکیٹ میں بکی تو مالک رقم مرجس سے مانگے گا اور اگر پولیس تک پہنچی تو پولیس والے نمبر سے مالک تک پہنچیں گے اور وہ بتا دے گا کہ گاڑی مرجس لے گیا تھا۔ دونوں طرح مرجس کا پھنسنا ضروری ہے۔''

''پولیس نے اس گاڑی کو جب قبضے میں لیا تھا تو کیا نمبر نوٹ نہیں کیا ہوگا؟'' مرجس بولا۔

''میری نگاہیں افسر پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ ایک بار بھی نمبر پلیٹ کی طرف نہیں گیا تھا۔ سامنے کی طرف نمبر پلیٹ نہیں ہے، نمبر پلیٹ ہے پیچھے کی طرف ہے اور وہ بڑبولا ایسا جذباتی ہوا کہ اس نے ایک بار بھی نمبر دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اور نہ ہی کسی سپاہی کو کہا تھا۔'' میں نے اس کے خدشے کو دور کیا۔

''اگر ایسی بات ہے تو میں ایک کام کر سکتا ہوں۔''

''کیا؟''

''نہایت اسپیڈ سے اس علاقے سے نکل جاؤں۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''یہی کرنا ہوگا۔ اسے یہاں سے نکالو۔ ہمیں تیزی سے اس علاقے سے نکل جانا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ اچھل کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور جھاڑیوں کو روندتے ہوئے پراڈو کو نیچے لے آیا۔

سفیر اور وسیم جھاڑیوں کو پھلانگتے ہوئے نیچے آئے۔ ہم سب کو آتے دیکھ کر عبداللہ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔ آپ میں سے کوئی بھی سوزوکی میں نہیں بیٹھا؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''اس لیے کہ اب تم پراڈو میں بیٹھو گے۔'' وسیم نے کہا۔ ''پلان بدل چکا ہے۔''

''تو کیا باقی سب سوزوکی میں بیٹھیں گے؟''

''نہیں، اب ہم سب پراڈو میں سوار ہو کر پنڈی جائیں گے۔''

''اور یہ سوزوکی؟''

''یہ بھی ساتھ جائے گی اس لیے کہ اس کی قیمت ادا کر کے کاغذات لے لیے ہیں۔ وہاں پہنچ کر اسے سیل کر دیں گے۔ بائیک بھی ساتھ جائے گی لیکن سوزوکی میں لاد کر۔'' میں نے کہا۔

''چلو یہ اچھا ہوا... ورنہ اس کھٹارا سوزوکی میں تو جوڑ جوڑ ہل جاتا۔'' عبداللہ نے مسکراتے ہوئے جملہ کسا ''تمہاری پسند ہوتی ہی ایسی ہے۔''

''شکر کرو کہ بروقت میرے دماغ میں یہ بات آ گئی کہ سوزوکی خرید لی جائے۔ ورنہ ابھی تک اسی ہوٹل پر بیٹھے تسبیح گن رہے ہوتے۔'' وسیم نے جوابی وار کیا۔

میں نے پراڈو میں بیٹھتے ہوئے کہا ''بیکار کی بحث چھوڑو اور جلد از جلد آ کر بیٹھو۔ سوزوکی وسیم ڈرائیو کرے گا۔ اور ہمارے پیچھے پیچھے آئے گا۔''

وسیم سفیر اور مرجس نے مل کر بائیک کو سوزوکی پر لاد دیا اور پھر ہمارا نیا سفر شروع ہو گیا۔ مرجس تیز رفتاری سے پراڈو بھگا رہا تھا۔ ہمیں جلد سے جلد اس علاقے سے نکل جانا تھا۔ مرجس کا کہنا تھا کہ وہ شام سے پہلے ناران پہنچا دے گا۔ اسپیڈ بھی تائید کر رہی تھی۔ سوزوکی کافی پیچھے رہ گئی تھی لیکن موبائل پر رابطہ قائم تھا۔ دراصل وسیم ایک ہوٹل پر بھی رکا تھا کیونکہ سوزوکی کا انجن گرم ہو گیا تھا جب کہ پراڈو پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی خطرہ تھا تو پراڈو پر۔ پولیس آفیسر کو جب احساس ہو گا کہ پراڈو پہنچی نہیں یا سپاہی تھانے پہنچ گیا تو وہ وائرلیس میسج سے تمام تھانوں کو الرٹ کر دے گا۔ پھر اندر لیٹے ناصر اور امداد شاہ بھی مسئلہ کر سکتے تھے۔ میں نے ایک گھنٹا پہلے جائزہ لیا تھا۔ وہ اسی طرح بے ہوش تھے۔ گو کہ بے ہوشی کا دورانیہ کافی طویل کر دیا تھا اس لیے مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا کہ یہ خطرناک ثابت نہ ہو۔ منزل پر پہنچ کر چیک کروں تو پتا چلے کہ دونوں کی روح نکل چکی ہے یا دماغی حالت بگڑ گئی ہے۔ اس خیال نے مجھے فکر میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں جلد سے جلد انہیں کسی محفوظ مقام پر لے جا کر ہوش میں لانا چاہتا تھا۔ اسی خیال سے میں نے مرجس سے پوچھا ''اگر شام تک ہم ناران پہنچ گئے تو ٹھہریں گے کہاں؟''

''ٹھہرنے کی ضرورت کیا ہے۔ ہم چلتے رہیں گے۔''

''میں کچھ تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہاں کوئی محفوظ جگہ مل جائے۔ تم تو اس علاقے میں آتے جاتے رہے ہو گے۔ کیا یہاں کوئی گھر حاصل نہیں کر سکتے؟'' مجھے ان دونوں کی بے ہوشی پر فکر ہونے لگی تھی۔ میں نے ایک پروگرام بنا لیا تھا۔ اس پروگرام کو عملی شکل دینے کے لیے کسی جگہ رکنا ضروری تھا۔ مرجس کو میں ابھی بتانا نہیں چاہتا تھا اس لیے تھکن کا بہانہ بنایا تھا۔

''ہوٹل تو کئی ہیں لیکن گھر حاصل کرنا ذرا مشکل ہے۔ پھر بھی میں بات کرتا ہوں۔'' مرجس نے کچھ دیر سوچا پھر جیب کو بائیں ہاتھ سے ٹٹولا اور موبائل نکال کر بولا ''سر اگر ہو سکے تو اس میں حسن پینٹر کا نام ڈھونڈ دیجیے۔''

میں نے موبائل کو ہاتھ میں لیا اور نام تلاش کرنے لگا۔ ایچ میں جاتے ہی حسن پینٹر کا نام نظر آ گیا۔ میں نے نمبر پش کر کے موبائل مرجس کو تھما دیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے موبائل کو کان سے لگایا۔ ادھر سے سوال ہوا تھا کہ مرجس بولا ''میں مرجس بول رہا ہوں گلگت والا مرجس۔ میں چلاس آ رہا ہوں۔''

وہ کچھ دیر تک دوسری طرف کی باتیں سننے لگا پھر بولا۔ ''میرے ساتھ ایک ٹورسٹ پارٹی ہے۔ وہ ہوٹل میں نہیں بلکہ کسی گھر میں ٹھہرنا چاہتی ہے۔ کرایہ مناسب دے گی اگر ممکن ہو تو کوئی گھر ڈھونڈ لو۔'' ادھر سے آئے جواب کو سن کر اس نے کہا ''واہ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تمہارا گھر خالی ہے۔ میں بس پہنچنے ہی والا ہوں۔'' پھر اس نے موبائل بند کیا پھر میری طرف دیکھ کر بولا ''یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ میرے دوست کا گھر خالی ہے۔ اس کے گھر والے پشاور گئے ہوئے ہیں۔ وہ اپنا گھر کرایہ پر دینے کے لیے تیار ہے۔''

''آدمی تو اعتبار کا ہے نا؟'' سفیر نے پوچھا۔

''میرا دوست ہے۔ فکر نہ کریں۔''

''دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا... ہر کسی پر فوراً اعتبار نہ کیا کرو۔ ویسے ہم اپنی آنکھیں کھلی رکھیں گے۔'' سفیر ہنس کر بولا۔ جواب میں مرجس بھی ہنسنے لگا۔ سفیر کی بات پر اس کے چہرے پر ناگواری کی جھلک آئی تھی لیکن فوراً ہی اس نے خود پر قابو پا لیا تھا۔

''بات یہ ہے کہ ہم نے اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ لوگوں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ جب کہ تم نے ابھی تک

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

صرف دوست دیکھے ہیں اسی لیے فوراً اعتبار کر لیتے ہو۔ ہمارے ساتھ رہو گے تو انسان کی پہچان سیکھ لو گے۔'' سفیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو مرجس نے قہقہہ لگایا اور بولا:

''سر آپ لوگوں کو ٹریننگ دی جاتی ہے۔ ہم لوگ سیدھے سادے اتنی چالاکی کہاں سے لائیں۔''

''فکر نہ کرو ہمارے تجربے سے بہت کچھ سیکھ لو گے۔'' سفیر خلافِ توقع مزا کے انداز میں باتیں کر رہا تھا جب کہ یہ انداز وسیم کا تھا۔ اس کے اندر چلبلا پن تھا۔ عبداللہ اس وقت بھی خاموش تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے اگر وسیم رہتا تو اس کی سنجیدگی پر ایک دو کمنٹ ضرور کرتا۔

میں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔ چلاس نزدیک آتا جا رہا تھا۔ چھوٹا سا قصبہ۔ پختہ مکانات نظر آنے لگے تھے۔ آبادی نزدیک آتی جا رہی تھی کہ میں نے مرجس سے کہا۔ ''رفتار کچھ آہستہ کر لو۔ وسیم کافی پیچھے رہ گیا ہے۔''

''آپ ان کو موبائل پر خبر کر دیں کہ وہ چلاس ہوٹل کی طرف آ جائیں۔ مشہور ہوٹل ہے وہیں ہم انہیں مل جائیں گے۔ ہوٹل کے قریب ہی میرے دوست کا گیراج ہے۔''

میں نے عبداللہ کو اشارہ کیا کہ وہ فون کر دے اور میں خود باہر کے مناظر کو دیکھنے لگا۔ ایک جانب پہاڑیاں اور دوسری جانب چمکتی ہوئی لکیر جیسی ندی اور درمیان سے گزرتی ہوئی سانپ کی طرح لہراتی سڑک۔ اس سڑک پر بھاگتی پراڈو۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم ایک دوسری دنیا میں سفر کر رہے ہیں۔ وادی کی سرزمین بھی خوبصورت تھی لیکن ایسی خوبصورتی اسے کہاں سے ملتی جو خدا نے میرے وطن کو عطا کر رکھی ہے۔ اس کے بوٹے بوٹے میں حسن ہے۔ اس کے ذرے ذرے میں سحر ہے جو ہر محبِ وطن کو مسحور کر لیتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے ہی کچھ اپنوں نے اس سرزمین سے اپنے اجداد کی دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے کچھ سانپ پال لیے ہیں جو ہم پر ہی پھنکارنے لگے ہیں۔ ایسے ہی غدارانِ وطن میں ایک نام ہمارے پرانے دشمن مرشد کا بھی آتا ہے جو پہلے تو اپنی حاکمیت برقرار رکھنے کے لیے غنڈا گردی کیا کرتا تھا۔ سیاست کی سیڑھی لگا کر حکومتی ارکان میں شامل ہونا چاہتا تھا لیکن اب وہ کھل کر دشمنانِ وطن کا ساتھ دینے لگا ہے۔ گو کہ یہ ابھی تک تحقیق کی طالب تھی لیکن مجھے تو اسے ہر حال میں سلاخوں کے پیچھے پہنچانا تھا۔ اپنا بدلہ لینا تھا۔

میرے خیالات کی رو تب ٹوٹی جب پراڈو رکی۔ وہ سڑک کنارے بنا ایک گیراج تھا جس میں کئی پرانی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دو مزدور بچے ایک پرانی کار کو گھس رہے تھے۔ بچے وطن کا مستقبل ہوتے ہیں۔ ان پھولوں کی آبیاری کرنا ضروری ہے لیکن حالات ان ماؤں سے بھی یہ کہلوا دیتا ہے کہ جا بیٹا ان ننھے ننھے ہاتھوں میں اوزار سنبھال کر مزدوری پر جٹ جا جو میں نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔ تجھے اونچی کرسی پر بیٹھنے کا خواب دیکھا تھا لیکن پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے مجھے تیری قربانی دینی پڑ رہی ہے۔ آہ زندگی بھی کیسا جوا ہے کہ جیت کی اُمید میں ہر کوئی کھیلنے پر مجبور ہے۔ مجھے بچوں کے ننھے ہاتھوں پر ترس آ رہا تھا لیکن اس وقت میں کچھ بھی کر نہیں سکتا تھا اس لیے اپنی نگاہوں کو ان کی طرف سے موڑ لیا اور اس آدمی کو دیکھنے لگا جو مرجس سے محوِ گفتگو تھا۔ کچھ دیر ان دونوں میں باتیں ہوئیں اور پھر مرجس مڑ کر عبداللہ کے پاس آیا اور بولا۔

''صاحب جی یہ ایک دن کا پانچ سو روپے کہہ رہا ہے۔ آپ زخمی ہیں اس لیے میں نے ہاں کہہ دیا ہے۔''

عبداللہ سمجھ گیا کہ مرجس دانستہ اسے گروپ لیڈر قرار دے رہا ہے اس لیے وہ بولا ''اسے بلاؤ۔''

مرجس نے اشارہ کیا اور وہ بندہ اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

''دیکھو بھائی۔ میں کراچی کا بندہ ہوں۔ پیسوں کی میں نے کبھی پروا نہیں کی۔ پہاڑی سے پھسل جانے کی وجہ سے پیر میں موچ آ گئی ہے۔ اسی لیے میں ہوٹل میں ٹھہرنے کی بجائے گھر کو ترجیح دے رہا ہوں۔ تاکہ آرام سے دو چار دن گھر جیسے ماحول میں وقت گزار سکوں۔''

''جی... مرجس نے بتایا ہے کہ آپ پہاڑی سے پھسل گئے تھے۔'' اس نے کہا تو میں نے اطمینان کی سانس لی کہ دونوں کا بیان ایک جیسا ہے۔ اگر پیر میں موچ والی بات میں فرق آ جاتا تو اسے شک ہو جاتا۔ میں نے بات کو مختصر کرنے کے لیے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ فوراً... میرے قریب آ گیا۔

''دیکھو بھائی' صاحب جی ذرا غصے والے ہیں۔ وہ جو دے رہے ہیں لے لو.. باقی پیسے میں تمہیں چپکے سے دے دوں گا۔'' میری بات پر اس نے سر ہلا دیا اور پھر جیب سے چابی نکال کر مرجس کو دیتے ہوئے بولا۔

''گھر کی ہر چیز استعمال کر سکتے ہو لیکن احتیاط کرنا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

جو چیز جہاں سے اٹھائی ہو اسے وہیں رکھنا۔‘‘

’’جی بہتر ہے۔‘‘ مرتجس نے چابی لیتے ہوئے کہا اور واپس پراڈو میں آ گیا۔ اس نے بمشکل پانچ منٹ کی ڈرائیو کی اور ایک مکان کے سامنے جا کر رک گیا۔ مرکزی سڑک سے ایک ذیلی سڑک نکلی تھی جو آگے جا کر ایک بڑے سے خالی میدان پر ختم ہو رہی تھی۔ یہ مکان اسی سڑک پر تھا جو نیم پختہ تھا۔

اس نیم پختہ مکان کا دروازہ کھول کر اس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ معمولی فرنیچر سے سجا وہ کمرا ایسا تھا کہ گزارا کیا جا سکتا تھا۔ میں دوبارہ سے باہر آیا اور آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آیا۔ کافی دوری پر ایک میدان تھا۔ اس میں بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ادھر سے نظریں ہٹا کر میں نے مرتجس سے کہا ’’وسیم اور سفیر کے ساتھ مل کر ان دونوں کو اندر لاؤ۔‘‘

یہ ایک ایسا گھر تھا جس کے آس پاس کوئی دوسرا گھر نہیں تھا۔ اس معنوں میں یہ ایک مناسب گھر تھا۔ ایسے گھر میں کسی سے تفتیش کرنا۔ کوئی بات اگلوانی بہت آسان ہوتا ہے۔ میں نے اس بار بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری راہ آسان کی ہے۔ مرتجس اور وسیم نے مل کر امداد شاہ کو گاڑی سے باہر نکال لیا تھا اور اسے اٹھا کر اندر لے جا رہے تھے۔ سفیر ان کو دیکھ رہا تھا کہ میں نے کہا ’’چلو اب اس ناصر شاہ کو بھی اتار لیتے ہیں۔‘‘

’’ہاں ہاں کیوں نہیں۔‘‘ کہہ کر وہ دروازہ کھول کر گاڑی میں سوار ہو گیا پھر اس نے ناصر شاہ کے کندھے پر دونوں ہاتھ رکھ کر اسے باہر کی جانب دھکیلا۔ نیچے میں تھا میں نے اسے سنبھال لیا اور اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں سفیر باہر آ گیا اور اس نے ہاتھ لگا کر اسے باہر نکالا پھر ہم دونوں ہاتھوں پر اٹھائے اسے لے کر اندر کی طرف بڑھے۔ وسیم اور مرتجس امداد شاہ کو اندر والے کمرے میں لے جا چکے تھے۔ ہم بھی ادھر ہی بڑھے۔ دوسرا کمرے میں صرف ایک ڈبل بیڈ تھا۔ فرش کچا تھا۔ امداد شاہ مٹی پر پڑا تھا۔ اسی کے برابر میں ہم نے ناصر شاہ کو بھی لٹا دیا۔ پھر میں نے سفیر سے کہا۔ ’’اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں کو ہوش میں کیسے لایا جائے؟‘‘

’’بہت آسانی سے ہوش میں لایا جا سکتا ہے۔ اپنا دیسی نسخہ ہے نا... منہ پر پانی کے چھینٹے ماریں۔ پانچ دس منٹ میں ہوش میں آ جائے گا۔‘‘

’’تو پھر شروع ہو جاؤ۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔ صبح ہوتے ہی ہم راولپنڈی کے لیے نکل پڑیں گے۔‘‘ میں نے اپنا پروگرام بتایا۔

’’صبح تک اس سے بہت کچھ معلوم ہو جائے گا لیکن ایک بات کی جانب آپ نے توجہ نہیں دی ہے۔‘‘ سفیر بولا۔

’’پراڈو کے مسئلہ کے سلسلے میں تم کہنا چاہتے ہو؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’جی ہاں۔‘‘

’’مجھے احساس ہے کہ اب تک ناران تک کی پولیس جاگ چکی ہو گی اور کالے رنگ کی پراڈو کو ڈھونڈ رہی ہو گی۔ اسی لیے میں رکا ہوں کہ کوئی آسان سا طریقہ تلاش کیا جائے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’میرے ذہن میں ایک بات ہے۔‘‘ وسیم نے باہر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

’’کیا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’اتفاق ہے کہ ہم جس کے مکان میں اترے ہیں یہ مکان ایک پینٹر کا ہے تو کیوں نا اس کی مدد لی جائے۔‘‘

’’یعنی اس گاڑی کا رنگ بدل دیا جائے؟‘‘ مرتجس نے دخل دیا۔

’’ہاں۔‘‘

’’کلر کرنے میں پورا ایک ہفتہ لگ جائے گا۔‘‘ مرتجس نے کہا۔

’’کوئی اور راستہ؟‘‘ میں نے مرتجس کی طرف دیکھ کر کہا۔

’’میں ایسا کرتا ہوں کہ اس سلسلہ میں امجد یعنی اس پینٹر سے بات کرتا ہوں۔ شاید اس کے پاس کوئی حل ہو۔‘‘ مرتجس بولا۔

’’ایسا کرو کہ اسے یہیں بلا لو۔ یوں بھی اب وہ دکان بند ہی کر رہا ہوگا۔‘‘ میں نے مشورہ دیا۔

’’ٹھیک ہے میں اسے بلا لاتا ہوں۔‘‘ کہہ کر وہ باہر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

’’اس سے کہنا کہ آج کا کھانا ہمارے ساتھ کھائے بازار سے کچھ اچھا لے لینا۔‘‘

’’کھانے کے معاملے میں یہاں کے ہوٹل بہت مشہور ہیں۔ آپ فکر ہی نہ کریں۔ ہر قسم کے کھانے یہاں مل جاتے ہیں۔‘‘ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

وسیم ان دونوں کے چہروں پر پانی کے چھینٹے مسلسل مار رہا تھا لیکن اب تک انہیں ہوش نہیں آیا تھا۔ تنگ آ کر اس نے آواز لگائی ’’پتا نہیں کس قسم کی دوا ان سوئیوں پر لگی ہے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کہ یہ لوگ جاگ کر نہیں دیتے۔''

''یہ بھی تو سوچو دوسوئی کا نشہ ہے۔ اترنے میں کچھ دیر تو لگے گا ہی۔'' ابھی میرا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ دروازے سے مرجس داخل ہوا۔ اس کے ساتھ امجد بھی تھا۔ میں نے سفیر کو اشارہ کیا اور وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وسیم پھر کوئی ہانک نہ لگائے اور امجد ان دونوں قیدیوں کو دیکھ لے۔ سفیر کے اندر جاتے ہی وسیم باہر آ گیا۔ اس کا ہاتھ خشک ہو رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ باہر آنے سے پہلے ہی ہاتھ پونچھ چکا تھا۔ مرجس نے باہر نکلنے سے پہلے ہی زمین پر چٹائی بچھا دی تھی۔ میں اسی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ انہیں بھی بیٹھنے کا کہا۔

کچھ دیر تو اِدھر اُدھر کی باتیں کیں پھر میں مطلب کی بات پر آ گیا ''امجد صاحب آپ تو پینٹر ہیں۔ جلد سے جلد کتنی دیر میں ایک گاڑی کو پینٹ کر سکتے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''ایک ہفتہ تو لگے گا ہی۔'' وہ بولا۔

''دراصل ہماری گاڑی ایک چٹان سے رگڑ کھا گئی تھی۔ گو کہ رگڑ بہت ہلکا ہے پھر بھی صاحب کا خیال ہے کہ اس عیب کو چھپا لیا جائے۔ آپ اس کی پینٹنگ کے لیے کتنا ٹائم لیں گے؟''

''اگر صرف کلر ملانا ہے تو ایک دن لیکن فل باڈی کلر کرائیں گے تو ایک ہفتہ لگے گا اگر آپ کے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے تو میں ایک آسان حل بتا سکتا ہوں۔''

''تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ شروع ہو جائیے۔ اتنی دیر میں مرجس کھانا لے آتا ہے۔''

''کچھ دنوں پہلے ایک کار ریلی کے شرکا اِدھر سے گزرے تھے۔ ان میں سے ایک گاڑی کی سروس میں نے کی تھی۔ اس نے خوش ہو کر انعام کی جگہ مجھے کچھ اسٹیکر دیئے تھے۔ اگر اسے لگا دیا جائے تو وہ عیب چھپ جائے گا۔ ایک ایک اسٹیکر تین سے چار فٹ چوڑا اور اتنا ہی لمبا ہے۔ میں اسے آپ کی گاڑی کے اسکریچ کے علاوہ دائیں اور بائیں جانب بھی لگا دوں گا۔ اسٹیکر لگتے ہی گاڑی کا عیب بھی چھپ جائے گا اور گاڑی کی لک بھی بدل جائے گی۔ بالکل حلیہ بدل جائے گا۔ دونوں طرف کار ریلی کی تصاویر ہوں گی۔ ایشیا کا نقشہ ہوگا۔ گویا گاڑی بالکل نئے ماڈل جیسی بن جائے گی۔''

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ اب یہ بھی بتا دو کہ پیسے کتنے دینا ہوں گے؟'' میں زیادہ فیاضی دکھا کر اس پر آشکار کرنا نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے پاس بڑی رقم ہے۔

اس نے کچھ دیر سوچا پھر بولا۔ ''پانچ ہزار تو حق بنتا ہے۔ پینٹ کرائیں گے تو زیادہ ہی لگ سکتا ہے۔ اسٹیکر سے خوبصورتی بھی آجائے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ کھانا کھانے کے بعد شروع ہو جانا۔ بلکہ گاڑی کو گیراج میں لے جا کر اسٹیکر لگاؤ۔''

''جیسا آپ کہیں... ویسے بھی زیادہ دیر تو لگے گی نہیں۔ صرف ایک سے ڈیڑھ گھنٹے میں اسٹیکر لگ جائے گا۔''

''اس سلسلہ میں تم ہی بہتر جانتے ہو کہ یہاں اسٹیکر لگانا مناسب ہے یا اپنے گیراج میں۔''

''میرے خیال سے یہیں بہتر رہے گا۔'' امجد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''کام زیادہ الجھن کا ہے نہیں۔ ایک طرف میں رہوں گا دوسری طرف میرا شاگرد، ہم دونوں مل کر بہ آسانی لگا لیں گے۔''

''اگر شاگرد کو نہ بلا کر ہمارے بندے سے وہی کام لے لو؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا ''یہ وسیم صاحب بھی ایک بڑے گیراج کے مالک ہیں۔ کراچی میں ان کا گیراج ہے جہاں ڈینٹنگ پینٹنگ کے علاوہ بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔ ان سے کہہ دوں گا۔ یہ ہاتھ بٹا دیں گے۔''

''یہ تو اور بھی اچھا ہے.... اس طرح میرے کچھ پیسے بھی بچ جائیں گے۔ شاگرد کو بلاؤں گا تو اس کی دیہاڑی دینی ہوگی نا۔''

میں اس کی خباثت پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اگر وہ بچے کو بلاتا بھی تو اسے سو پچاس سے زیادہ نہ دیتا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا ''چلو اس بہانے تمہارے کچھ پیسے بچ جائیں گے۔''

اتنی دیر میں مرجس کڑھائی بنوا لایا تھا۔ ساتھ میں نان بھی تھے۔ کھانا دیکھتے ہی اس نے کہا ''بس کھانا کھا لوں تو گیراج سے اسٹیکر لے آتا ہوں۔''

ہم سب کھانے بیٹھ گئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر امجد اپنے گیراج چلا گیا۔ میں نے کمرے میں آ کر امداد شاہ اور ناصر شاہ پر نظر ڈالی۔ وہ اس وقت بھی بے ہوش پڑے تھے۔ وسیم اپنے ادھورے کام کو پورا کرنے کمرے میں آیا تھا کہ میں نے کہا ''ابھی نہیں۔ امجد شاہ کی واپسی کے بعد ہم اس کی طرف توجہ دیں گے۔ کیونکہ اگر انہیں ہوش آ گیا تو چیخ و پکار کریں گے جو ہمیں پھنسانے کے لیے کافی ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' سفیر نے سر ہلا کر کہا۔

''تو پھر ایسا کرو کہ باہر جا کر مرجس سے گپیں لڑاؤ تا

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کہ امجد کو ذرا بھی شک نہ ہو کہ ہم پانچ کے علاوہ چھٹا بھی کوئی ہے۔'' میری بات سنتے ہی وہ باہر نکل گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور وسیم کے پاس آ گیا۔

وسیم اور عبداللہ چٹائی پر آڑے ترچھے لیٹے ہوئے تھے۔ عبداللہ خاموش تھا۔ ویسے بھی وہ بہت کم بولتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے چہرے پر ایک خاص خوشی نظر آ رہی تھی۔ چہرہ کھلا پڑ رہا تھا۔ شاید کسی نے شازیہ کا ذکر چھیڑ دیا ہوگا۔ میں نے چٹائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ '' لگتا ہے سب گھر جانے، کسی سے ملنے' چاندنی راتوں میں خوش گپیاں کرنے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں۔'' میرا اندازہ وسیم جیسا تھا۔

'' بخدا آپ کشف کی منزل سر کرنے والے ہیں۔ آپ تو دلوں کے بھید بھی جان لیتے ہیں۔'' وسیم نے لیٹے لیٹے ہانک لگائی۔ اس کا لہجہ شرارتی تھا۔ اس وقت بھی اس کی نگاہیں عبداللہ پر ٹکی ہوئی تھیں۔

'' میری طرف دیکھ کر یہ کہنے سے شہباز صاحب تمہاری باتوں پر اعتبار نہیں کریں گے۔ میں خود بتاتا ہوں کہ تم اپنے کس منصوبے کا ذکر کر رہے تھے۔'' کہہ کر اس نے اپنا چہرہ میری طرف کر لیا اور بولا ''شہباز صاحب ان کا خیال ہے کہ یہ پرسوں کے بعد والے دن سادی باجی سے گپیں لڑانے پہنچ جائیں گے اور بندوق میرے کندھے پر رکھ رہے ہیں کہ میں گھر جانے کے لیے بے چین ہوں۔ مجھے چھیڑنے سے پہلے خود کیا کہہ رہے تھے یہ بھول گئے۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ جاہل را حافظہ نباشد۔''

وسیم پلٹ کر کچھ کہنا کہ امجد کی گاڑی آ کر رکی اور اس نے آواز دی '' بھائی صاحب۔''

میں نے وسیم کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے عبداللہ سے کہا '' میرے کندھے پر وزن ڈال کر باہر چلو۔ تمہیں سب کا ہیڈ بنا کر پیش کیا گیا ہے اس لیے گاڑی کا معائنہ کرنا ضروری ہے۔''

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ کرسی پر وزن ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور ہم باہر کی طرف بڑھے۔

باہر پہنچے تو دیکھا۔ ایک دروازہ مکمل ہو چکا ہے۔ بیک گراؤنڈ کالا تھا اس لیے اسٹیکر پر سفید اور سرخ رنگ سے بنا نقشہ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ اس وقت وہ سب سامنے کی طرف کھڑے بونٹ پر اسٹیکر چپکا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وسیم بولا۔ '' دوسری طرف والا نقشہ بھی دیکھیں۔ کیا لاجواب

مودودی، سید ابوالاعلیٰ

(1903ء۔1979ء)

جماعت اسلامی کے بانی اور امیر، روشن خیال عالم دین۔ آباؤ اجداد کا وطن دہلی تھا لیکن والد حیدر آباد دکن چلے گئے تھے اور وہاں کے ممتاز وکیلوں میں شمار ہوتے تھے۔ مولانا مودودی ریاضت حیدر آباد ہی کے ایک شہر اورنگ آباد میں 25 دسمبر کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی اسکول میں پائی۔ اس کے بعد والد صاحب دہلی چلے آئے تو انہوں نے ممتاز علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے دینی علوم سے بہرہ ور ہوئے۔ مولانا کی صحافتی زندگی کا آغاز جمعیت العلماء ہند کے اخبار ''الجمعیت'' کی مدیری سے ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ 1926ء میں ایک مسلمان نے مشہور آریہ سماجی سوامی شردھانند کو قتل کر دیا جس پر ہندوؤں نے اسلامی تعلیمات کو مورد الزام ٹھہرایا اس کی تردید میں مولانا نے ''الجہاد فی الاسلام'' کتاب لکھی اور اسی کتاب سے علمی دنیا میں آپ متعارف ہوئے۔ 1929ء میں آپ جمعیت سے الگ ہو کر حیدر آباد چلے گئے جہاں حکومت آصفیہ کی تاریخ لکھی پھر 1932ء میں آپ نے حیدر آباد سے ایک ماہوار مجلہ ''ترجمان القرآن'' جاری کیا جو اب لاہور سے شائع ہوتا ہے۔

مرسلہ: حیات محمد۔ پشاور

مورس سیموئیل

(1791ء۔1872ء)

امریکی سائنس دان اور تار برقی کا موجد۔ چارلس ٹاؤن میں پیدا ہوا۔ بارہ سال تک تار برقی کا تجربہ کرتا رہا۔ 1873ء میں اپنے تار برقی کے آلے کا مظاہرہ نیویارک یونیورسٹی میں کیا۔ پہلا کامیاب تجربہ 1844ء میں واشنگٹن سے بالٹی مور بذریعہ تار پیغام بھیج کر کیا گیا۔ تار گھروں میں تار رسانی کے لیے جو علامتیں استعمال ہوتی ہیں، وہ مورس سیموئیل ہی کی وضع کردہ ہیں۔

مرسلہ: عفان شیخ۔ لاہور

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

نقشہ تلاش کیا ہے۔ پیچھے کی طرف بھی عمدہ نقشہ لگایا گیا ہے۔ ''میں نے دو کی بجائے چار اسٹیکر استعمال کرائے ہیں۔ پیسا ڈبل لگ رہا ہے لیکن خوب صورتی بڑھ جائے گی۔

میں سہارا دے کر عبداللہ کو پیچھے کی طرف لے گیا۔ شاید وہ کار ریلی کا منظر تھا۔ آگے پیچھے کئی گاڑیاں بھاگتے ہوئے دکھائی گئی تھیں۔ پھر میں دوسری طرف کے دروازے پر پہنچا۔ ادھر بھی کسی کار ریلی کا منظر تھا۔ پھر ہم بونٹ کی طرف پہنچے۔ وہاں لگایا جانے والا اسٹیکر چسپاں ہو چکا تھا۔ بہ مشکل آدھا گھنٹا لگا ہوگا اور کام ختم ہو گیا تھا۔ امجد نے اپنی دانست میں فری کا اسٹیکر دس ہزار میں دے کر ہمیں ٹھگ لیا تھا لیکن ہم جان رہے تھے کہ اس نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ اب کوئی بھی پہچان نہیں سکتا تھا کہ یہ وہی گاڑی ہے جو کچھ دیر قبل پولیس کے ہتھے چڑھی تھی۔ اسٹیکر کی وجہ سے گاڑی کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ میں نے جیب سے ہزار ہزار کے دس نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''صاحب نے پانچ ہزار دینے کو کہا ہے اسی لیے پانچ ہزار ہی دے رہا ہوں۔''

اس نے نوٹ گنتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اس نے شکریہ کہہ کر نوٹ لے لیے۔ اور واپسی کے لیے اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں واپس مڑا اور عبداللہ کو لے کر کمرے میں آ گیا۔ وسیم اور سفیر بھی اندر آ گئے۔ سب سے آخر میں مرجس اندر آیا۔ اس نے اندر آتے ہی دروازہ بند کیا اور چٹخنی لگا دی۔ اسے دیکھ کر میں نے کہا ''مرجس ہم اندر والے کمرے میں جا رہے ہیں۔ کسی کی زبان کھلوانے کے لیے کبھی کبھی تشدد بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے تمہارا وہاں رہنا ضروری نہیں۔''

''جی بہتر ہے۔ میں اسی کمرے میں لیٹتا ہوں۔ اگر میری ضرورت سمجھیں تو آواز دے لیجیے گا۔'' کہہ کر وہ چٹائی پر لیٹ گیا۔

ہم سب اندر والے کمرے میں گئے اور امداد شاہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ وقت خاصہ گزر چکا تھا۔ بے ہوشی کی دوا کا اثر یقیناً کم ہو گیا ہوگا۔ اس اُمید پر ہم کوشش کر رہے تھے۔ وسیم ٹھہر ٹھہر کر اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ اب ہر بار پانی پڑتے ہی اس کے چہرے کے اعضلات تن جاتے تھے جو اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ اسے ہوش آ رہا ہے۔

بالآخر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ہمیں دیکھتے ہی اس کے چہرے پر لرزے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ میں نے اسے کھینچ کر بٹھا دیا۔ اس کے ہاتھ اب بھی بندھے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے بال پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا۔

''اب بولو تم کس کے لیے کام کر رہے ہو۔''

''میں تو بتا چکا ہوں کہ مجھے ناصر نے نوکری دی ہے۔ وہ جو کہتا ہے میں وہی کرتا ہوں۔ اسے رقم کون دیتا ہے مجھے پتا نہیں۔'' امداد شاہ نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

''اور اگر یہ بات جھوٹ نکلی؟''

''میں آپ کے سامنے ہوں آپ مجھے گولی مار دینا۔''

''ابھی پتا چل جائے گا۔ اب تک کیا کیا کر چکے ہو؟ کہیں دھماکا شماکا بھی کیا ہے؟''

''جی نہیں۔ یہ کام مجھ سے کسی نے کبھی نہیں لیا؟''

''تمہیں ناصر ہر ماہ کتنا دیا کرتا ہے۔ کتنی رقم دیتا ہے؟''

''بیس ہزار روپے ہر ماہ اور جب کوئی کام کرتا ہوں تو الگ سے بھی کچھ نہ کچھ دیتا ہے۔'' ''اب تک صرف دو بار مجھ سے کام لیا گیا ہے۔ ایک بار ایک سوٹ کیس یہاں آ کر ایک بندے سے لیا، دوسری بار پنڈی ہی کے ایک بندے کو راہ چلتے اغوا کیا اور اسے ناصر کے ڈیرے پر پہنچایا تھا۔ یہ تیسرا کام تھا جو ادھورا رہ گیا۔''

''ٹھیک ہے۔ اب تم خاموشی سے ایک جانب بیٹھ جاؤ۔'' کہہ کر میں نے سفیر کو اشارہ دیا۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس پہنچا۔ اس نے اس کے ہاتھ کے بندھن کو دیکھا' مضبوطی کو جانچا اور پھر اسے اٹھا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ کرسی پر بیٹھا تھا لیکن اس کے ہاتھ پیچھے ہی کی طرف تھے۔ اس لیے کہ سفیر نے کلائی کو رسی کے بندھن سے آزاد نہیں کیا تھا۔ میں نے وسیم کو اشارہ کیا کہ وہ اب ناصر شاہ پر کوشش کرے۔ اس بار جیسے ہی اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹیں پڑیں اس نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ میں نے سہارا دے کر اسے بٹھا دیا پھر بولا۔ ''ناصر شاہ' اپنی حالت سے تمہیں اندازہ ہو چکا ہوگا کہ تم اس وقت کہاں ہو۔''

اس نے پہلے اپنے بازو کو ہلایا اور جان لیا کہ اس کے دونوں ہاتھ موڑ کر پیٹھ پر باندھ دیئے گئے ہیں۔ اس نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا پھر کہا ''ہاں' سمجھ گیا ہوں کہ میں اس وقت تمہاری قید میں ہوں۔''

''دیکھو ناصر شاہ' ہم عوام کے دشمن نہیں ہیں۔ ہمارا کام وطن کو دشمنوں سے پاک رکھنا ہے۔ ہم چہرہ شناس بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety
پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1
پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

ہیں۔ تم جب باتیں کرتے تھے تو میں تمہارے چہرے کا مطالعہ کرتا تھا۔ میرا دعوا ہے کہ تم ویسے نہیں ہو جیسا پوز کراتے ہو۔''

اس نے جواب نہیں دیا تب میں نے اسے اپنے شکنجے کے مزید قریب کرنے کے لیے پوچھا ''پختون ہو؟''

اس نے سر ہلا دیا۔ اندازہ تو مجھے بھی تھا۔ اس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا صرف اسے اعتماد میں لینے کے لیے میں نے پوچھا تھا۔ میرا تجربہ کہہ رہا تھا کہ یہ بندہ بہت ڈھیٹ ہے۔ اسے پیار سے ہی شکار کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے میں نے کہا۔ ''دیکھو بھائی ایک بات میں پہلے ہی بتا دوں کہ میں پختونوں کا بہت احترام کرتا ہوں اس لیے کہ پختون محب وطن ہی نہیں ایماندار اور جفاکش بھی ہوتے ہیں۔'' میں نے رک کر اس کی طرف دیکھا پھر سلسلہ کلام کو جوڑا'' برصغیر میں مسلمانوں کی تعداد اسی لیے بڑھی کہ اندرون ہند پختونوں نے اپنی جگہ بنائی۔ روہیل کھنڈ ہو یا بندیل کھنڈ، رام پور ہو یا بلند شہر یا مظفر نگر، دس مسلمان سے پوچھیں تو ان میں آٹھ خود کو پٹھان کہیں گے اس لیے کہ ہر بادشاہ کی فوج میں پٹھانوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اور ان کی اولادیں علاقے علاقے میں پھیلتی چلی گئیں۔ بہار، بنگال، اڑیسہ، مدراس کہیں بھی چلے جاؤ۔ ہر جگہ پٹھان برادری ضرور ملے گی۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی زبان وقت کے دھارے میں بہہ کر الگ ہوگئی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پختون ایک بہادر قوم ہے اور بہادر ہمیشہ بہادری سے حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ ملک فروش نہیں ہوتے۔ یقیناً تم بھی ملک فروش نہیں محب وطن ہو۔ اگر حالات نے کچھ غلط کرا دیا تو یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی بندوں کو معاف کر دیتا ہے۔'' میں نے اپنی تقریر روک کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس لمبی گفتگو کا کچھ کچھ اثر نظر آنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلتی سوچ کی لکیریں یہ بتا رہی تھیں کہ اثر ہو رہا ہے۔ میں نے سلسلہ کلام کو جوڑا۔ ''تم خود بھی عقلمند ہو۔ سمجھ لو کہ اب تمہاری چمڑی اتاری جائے گی۔ کیسے اتاری جائے گی یہ ہم میں سے ہر ایک کو پتا ہے کیونکہ اس کام میں ہم چاروں مہارت رکھتے ہیں۔ تم نے چکن کی دکان پر دیکھا ہوگا کہ مرغی کو کس طرح لٹکاتے ہیں اور لٹکانے سے پہلے کس طرح اس کی کھال اتارتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں تمہارا یہ ساتھی جس نے اپنا تعارف امداد شاہ کے نام سے کرایا تھا، وہ دیکھے گا۔'' کہہ کر میں نے وسیم کو اشارہ دیا۔ وسیم نے بیگ سے ایک بلیڈ نکالا اور پھر اس کے ریپر کو کھول کر پھینک دیا اور ایک قدم آگے بڑھا۔ میں نے اس پر سے نظریں ہٹا کر ناصر کی طرف دیکھا پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میرا یہ دوست انسان کی جلد کو اتنی صفائی سے چھیلتا ہے کہ ڈاکٹر بھی انگلی نہیں اٹھا پاتے۔ اس کے ہاتھ میں جادو ہے۔ اب تم بھی اس کی مہارت کا نمونہ دیکھو لیکن سن لو۔ یہ مکان ایک ویرانے میں ہے اور یہاں تمہاری چیخیں سننے والا بھی کوئی نہیں ہے۔''

ناصر شاہ کے چہرے پر الجھن تیر رہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ اسے خاموش دیکھ کر میں نے کہا۔ ''ناصر شاہ، تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ میں کون ہوں اور کس لیے تم پر ہاتھ ڈالا ہے۔ بہت کچھ امداد شاہ نے بتا دیا ہے باقی کی معلومات تم دو گے۔ اگر تمہارے دل میں ذرا سی بھی وطن کی محبت ہے تو جواب ضرور دو گے۔''

ناصر شاہ نے نظریں اٹھا کر امداد شاہ کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ''پوچھیں۔ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔'' اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ ٹوٹ چکا ہے۔

امداد شاہ کے پیچھے وسیم کھڑا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ جھول رہا تھا جس میں اس نے بھی بلیڈ پکڑ رکھا تھا۔ امداد شاہ شاید اسی لیے خاموش تھا کہ اگر اس نے ایک لفظ بھی زبان سے ادا کیا تو وہ بلیڈ اس کی گردن پر چل پڑے گا۔ ناصر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ خاموش کیوں ہیں پوچھیں جو پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''مجھے ان لوگوں کے نام چاہیے جن سے تمہیں رقم ملتی ہے اور یہ بھی اگل دو کہ اب تک کیا کیا کر چکے ہو۔''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کا محکمہ ہم جیسے لوگوں کی پوری معلومات رکھتا ہوگا۔ ہم نے کیا کیا ہے یہ سن لیں۔ اب تک صرف کئی ایک کام کیے ہیں جو قابلِ ذکر ہیں۔ ہم یہاں سے صرف بندے کو گزارتے ہیں۔ یہی ہمارا کام ہے۔ ہمیں جس بندوں کا نام بتایا جاتا ہے وہ خود ہمارے پاس آتا ہے اور ہم اسے اسکردو کی راہداری سے کارگل کے راستے لداخ پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن اب تک صرف ایک آدمی کو پار کرایا ہے یا پھر ایک بار ایک بڑا سا سوٹ کیس وصول کر کے پنڈی پہنچایا ہے۔''

''تم کب سے ان لوگوں کے ساتھ ہو اور تمہاری ٹیم کا سربراہ کون ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہم تقریباً چھ ماہ سے ان لوگوں کے لیے کام کر رہے ہیں لیکن وہ کون لوگ ہیں اب تک میں نے انہیں دیکھا نہیں ہے۔''

''پھر تمہیں ہدایت کون دیتا ہے؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''ہدایت موبائل فون پر موصول ہوتی ہیں۔''
''تمہیں ان لوگوں سے ملاقات کس نے کرائی تھی؟''
''میں مرشد جی کا مرید تھا۔ وہیں رہتا تھا کہ ایک دن دربار سے نکلتے ہوئے ایک آدمی ملا۔ وہ مجھے جانتا تھا لیکن میں اسے پہچانتا نہیں تھا۔ اس نے دروازے سے نکلتے ہوئے مجھ سے کہا کہ مرشد سائیں کا ایک کام ہے اگر چاہو تو میرے ساتھ آ جاؤ، میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ وہ مجھے لے کر ایک کھلے میدان میں آیا۔ ابھی تک اس نے کچھ کہا نہیں تھا اس لیے میں الجھن میں تھا کہ وہ چاہتا کیا ہے اور مجھے کہاں لے جا رہا ہے لیکن جب وہ خانقاہ سے کافی دور پہنچ کر اس میدان میں رکا تو میں نے پوچھ ہی لیا کہ وہ کس کام سے نکلا ہے؟ اس پر وہ بولا کہ تم نوکری کے لیے پریشان ہو نا؟ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اس پر وہ بولا کہ تمہارا یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ جب سے خانقاہ پر حملہ ہوا ہے اور بہت سے لوگ مارے گئے ہیں تو مرشد سائیں خود پریشان ہیں۔ لیکن وہ اپنے مریدوں کو پریشان دیکھ نہیں سکتے۔ تم ان کے خاص آدمی ہو اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ تمہاری نوکری کا مسئلہ حل ہو جائے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تو مجھے یاد آ گیا ہے کہ میرے ایک جاننے والے نے ایک اعتماد کا آدمی مانگا ہے۔ اگر تم چاہو تو اس نمبر پر بات کر لو۔ یہ کہہ کر اس نے ایک موبائل فون کا نمبر دیا اور بولا کہ مجھے ایک ضروری کام سے رات کو دبئی جانا ہے۔ اس شخص سے جو باتیں ہوں وہ مجھے دبئی سے آنے پر بتا دینا لیکن اس دن کے بعد سے وہ آدمی پھر مجھے ملا نہیں لیکن موبائل نمبر پر جس شخص سے بات ہوئی اس نے فوراً مجھے رکھ لیا اور ایڈوانس میں کچھ رقم بھی دے دی۔''

''وہ رقم تمہیں کس ذریعہ سے ملی تھی؟''
''فون پر مجھے بتایا گیا کہ پنڈی کے راجا بازار میں چاند اسٹور کے سامنے ایک آدمی کھڑا ہے اس سے مل لو۔ میں راجا بازار پہنچا تو اسٹور کے سامنے ایک آدمی کھڑا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھتا کہ وہ خود ہی آگے چلا آیا۔ نزدیک پہنچ کر بولا ''آپ ناصر ہیں؟'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو اس نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ ''اگلے ماہ بھی اسی تاریخ' اسی وقت' اسی جگہ آئیں گے۔ آپ کی تنخواہ مل جائے گی۔'' اتنا کہہ کر وہ بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ ہر ماہ ایک نیا بندہ اس جگہ نظر آتا ہے لیکن رقم پوری ہوتی ہے۔ باقی باتیں فون پر ہو جاتی ہیں لیکن جب میں کال کرتا ہوں تو موبائل بند ملتا ہے۔''

''تم نے اس بارے میں کبھی تجسس محسوس نہیں کیا کہ جو فون صرف ہدایت دینے کے لیے کھلتا ہے وہ یقیناً صحیح لوگوں کا نہیں ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
''میں اتنا مجبور ہو گیا ہوں کہ کسی قسم کا سوال کر ہی نہیں سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں غلط کر رہا ہوں۔ اسمگلنگ میں مدد دے رہا ہوں لیکن کچھ کر ہی نہیں سکتا ہوں۔''
''کیوں؟'' میں نے نرم لہجے میں کہا ''اس طرح تو تم وطن کو بیچ رہے ہو۔''
''میں اسمگلنگ ضرور کراتا ہوں لیکن وطن سے غداری نہیں کر رہا۔'' اس کا لہجہ مضبوط تھا۔
''دیکھو میرے بھائی' میں سمجھ گیا ہوں کہ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم وطن دشمنوں کے ہاتھ کا کھلونا بن گئے ہو۔ اسمگلنگ نہیں وطن دشمنی میں تم ملوث ہو چکے ہو۔ وطن دشمن طاقتیں تمہیں گھیر چکی ہیں۔ وطن کے نام پر میں استدعا کروں گا کہ تم ہمارا ساتھ دو اور اصل مجرموں کو پکڑنے میں ہماری مدد کرو۔ اس لیے کہ وطن ہے تو ہم تم سب ہیں۔''
''یہ صحیح ہے کہ میں راہزنی' چوری' اسمگلنگ کرنے میں ہچکچاتا نہیں لیکن وطن سے غداری کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔''
''مگر تم نے غداری کی ہے۔ وطن کا سودا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن لوگوں کے لیے کام کر رہے ہو وہ وطن دشمن ہیں اور تمہارے اس گناہ کی سزا آنے والی نسل بھی معاف نہیں کرے گی۔''
''نہیں میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''
''ایسا سوچنا معصومیت ہے۔ تم وطن دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہو۔ تمہارا انداز بتا رہا ہے کہ تم سمجھ نہیں پائے ہو کہ تمہیں کس طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔ خیر... اب اصل بات بتاؤ کہ تم ان کے چنگل میں پھنسے کیسے تاکہ میں تمہارے نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کر سکوں۔''
میری بات پر اس نے سر جھکا لیا۔ ویسے مجھے اُمید تھی کہ وہ میرے ٹرانس میں آ جائے گا۔ وہ حقیقت اگل ہی دے گا۔ وہی ہوا۔ کافی دیر تک سر جھکائے وہ سوچتا رہا پھر اس نے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا ماضی ایک زخم ہے۔ جس پر میں نے پھاہا رکھا ہوا ہے۔ اگر اس پھاہے کو ہٹایا تو زخم تازہ ہو جائے گا۔ میں ہنستا ہوں' مسخروں جیسی حرکت کرتا ہوں۔ صرف اس لیے کہ میرے اندر کا ناصر شاہ مردہ رہے' زندہ نہ ہو جائے۔ میں جاہلوں جیسی

WWW.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

حرکتیں کرتا ہوں جب کہ میں بی ایس سی ہوں۔'' بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ٹوٹ رہا ہے۔

میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی اور پھر کہا ''میری ایک بات گراہ میں باندھ لو۔ انسان کی فطرت میں دو ہی چیزیں ہوتی ہیں' اچھائی یا برائی۔ برائی سے دور رہو۔ اس لیے برائی نہ کرو کہ دل کہتا ہے۔ برائی کا انجام ہر حال میں برا ہوتا ہے۔ اچھائی بھی اتنی نہ کرو کہ زندگی مذاق بن جائے۔ زندگی گزارنا ایک فن ہے اور فن اعتدال میں ہے۔ نادانی میں جو کچھ ہوا اسے بھلا دینا ہی بہتر ہے۔''

''میں ابتدا سے ایک ایک بات تفصیل سے بتاتا ہوں تا کہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ میں کس طرح پھنسا ہوا ہوں۔ مجھے خود بھی احساس ہوتا جا رہا تھا کہ میں کسی غلط راہ پر بڑھ رہا ہوں لیکن حالات ہی ایسے ہو جاتے کہ میں چاہ کر بھی کچھ کر نہیں پاتا۔'' اس نے رک کر مجھے دیکھا تھا کہ میں نے وسیم کو آواز دی۔

''وسیم ان دونوں کے ہاتھ کھول دو۔''

وسیم نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ کھول دیے۔ وہ کچھ دیر تک کلائی پر اس جگہ کو سہلاتا رہا جہاں رسی بندھی تھی۔ پھر اس نے کہا ''پانی مل جائے گا۔ گلا خشک ہو رہا ہے۔''

سفیر نے پاس رکھے جگ سے پانی نکال کر گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ تبھی میں نے پکار کر مرجس سے کہا کہ وہ چائے کا انتظام کروے۔ دروازہ کھلنے کی آواز سے اندازہ ہو گیا کہ مرجس حکم سنتے ہی باہر نکل گیا ہے۔

ناصر کو خاموش دیکھ کر میں نے کہا ''تم اگر چاہو تو اپنی کہانی جاری رکھ سکتے ہو تا کہ میں کوئی راستہ نکال سکوں۔ ویسے حکومت سے معافی کی قوی اُمید رکھو۔''

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا ''میرا تعلق کالا ڈھاکا سے ہے لیکن میرے والد پنڈی میں عرصہ دراز سے مقیم ہیں۔ والدہ کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ والد نے میری خاطر شادی نہیں کی۔ گھر کے کام نوکروں کے سہارے چل رہے تھے۔ اسکول سے کالج تک کا سفر میں نے نوکروں کے سہارے طے کیے تھے۔ پھر میں پشاور چلا گیا۔ وہاں کی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ اسی دوران ایک دن پنڈی سے فون آیا کہ آپ ناصر شاہ بول رہے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں تو ادھر سے بتایا گیا کہ میں سٹی تھانے سے بول رہا ہوں۔ آپ کے والد اسپتال میں ہیں۔ فوراً پنڈی آ جائیں۔ میں بھاگم بھاگ پنڈی پہنچا تو پتا چلا کہ والد اسپتال میں داخل نہیں ہیں، ان کا انتقال ہو چکا ہے اور انہوں نے خود کو گولی مار کر خودکشی کی ہے۔ انہوں نے میرے نام ایک رقعہ بھی لکھا تھا کہ وہ بہت شرمندہ ہیں۔ والد نے ایک مکان اور مارکیٹ میں ایک بڑی سی دکان لے رکھی تھی۔ یہ سب ان کی محنت کا ثمر تھا۔ والد کا سوئم ہوا تھا کہ مجھ پر افتاد کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ حیرت کی انتہا نہ تھی کہ والد نے وہ دکان جو مین مارکیٹ میں تھی اور کافی بڑی تھی اسے انہوں نے بیچ دیا تھا۔ دکان جس نے خریدی تھا اس کے پاس صرف ایک کاغذ تھا۔ والد صاحب نے نوٹ لکھا تھا کہ اگر میں نے ایک سال میں پندرہ لاکھ واپس نہ کیے تو وہ دکان اس شخص کی ہو جائے گی۔ بزنس میں ادھار چلتا رہتا ہے۔ بابا بھی لیتے تھے لیکن مال آتے ہی رقم واپس کر دیتے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ انہوں نے دو سال میں رقم کیوں ادا نہیں کی۔ ابھی اسی سوچ میں تھا لوگوں سے بھی پتا کر رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا۔ کئی لوگوں نے بتایا کہ بابا کا بزنس اچھا چل رہا تھا۔ انہیں بھی حیرت تھی کہ رقم واپس کیوں نہیں کی گئی۔ اسی دوران میری ملاقات چچا قاسم سے ہوئی۔ وہ بابا کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ لگتا ہے کہ عاقل نے جعل سازی کی ہے۔ وہ اسی فطرت کا مالک ہے۔ اس سے کبھی تمہارے بابا نے رقم لی ہو گی لیکن وہ ادا کر دی ہو گی۔ کیونکہ میں تمہارے بابا کی فطرت جانتا ہوں۔ وہ کسی کا ادھار نہیں رکھتے تھے۔ عاقل ایک بدفطرت بندہ ہے۔ سیاسی لوگوں سے مل ملا کر وہ اپنا قد بڑھاتا ہے اور جعلسازی غنڈاگردی کر کے پیسے بناتا ہے۔

یہ اطلاع میرے لیے بہت اہم تھی۔ اسے سبق سکھانا ضروری تھا اس لیے میں نے عاقل کا پتا ان سے لیا اور اس کے گھر جا پہنچا۔ اس کا گھر کیا تھا ایک حویلی تھی۔ اتنا بڑا بنگلا کہ دیکھتے رہو۔ میں جب اس کے پاس پہنچا تو وہاں اور بھی کچھ لوگ تھے۔ بابا کا نام سن کر اس نے سب لوگوں کو جانے کے لیے کہا اور پھر مجھ سے پوچھا۔ ہاں بتاؤ کس لیے آئے ہو؟ جواب میں میں نے کہا کہ مجھے حقیقت سننا ہے کہ میرے والد نے خودکشی کیوں کی؟ میری بات پر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ میرا دوست ضرور تھا لیکن اتنا قریبی نہیں کہ اپنی ہر بات مجھے بتاتا، عام طور پر لوگ خودکشی رقابت میں کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کو پسند کرتا ہو اور اسے کوئی دوسرا لے اڑا ہو اسی لیے اس نے خودکشی کر لی۔ اپنے بابا کے بارے میں ایسی واہیات بات سن کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اسے دھنک کر رکھ دیا۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اس کے منہ کو ہتھیلی سے ڈھک دیا تھا۔ گردن میں بازو پھنسا دیا تھا جس کی وجہ سے وہ بے بس ہو گیا تھا۔ بے بس ہو گئے شخص کو مارنے کا اپنا مزہ ہے۔ بائیں بازو میں اس کی گردن پھنسا کر میں نے دل کی بھڑاس نکالنا شروع کر دیا تھا۔

داہنے ہاتھ سے لگاتار مارتا رہا۔ کچھ ہی دیر میں وہ بے ہوش ہو گیا۔ تب میں اسے وہیں پٹخ کر باہر نکل آیا۔ میرے بال الجھے ہوئے تھے اور کپڑے مسلے ہوئے۔ مجھے اس حالت میں نکلتے دیکھ کر بیٹھے لوگ چونکے لیکن کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی اور میں باہر نکل گیا۔

سڑک پر پہنچنے کے بعد میں نے رکشا لیا اور اپنے گھر آ گیا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ خاموش نہیں بیٹھے گا۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لے گا۔ اس لیے میں نے فوراً اپنا اٹیچی کیس لیا اور باہر نکل آیا۔ میں واپس پشاور جانا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی کارروائی کرے گا۔ ابھی میں بس اسٹینڈ پر پہنچا ہی تھا کہ ایک موبائل آ کر رکی۔ اس میں سے ایک بندے نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی اس نے اشارے سے مجھے دکھایا۔ میں بھاگتا کہ پولیس والوں نے گھیر لیا۔ تھانے لا کر میری جو درگت بنی وہ میں ہی جانتا ہوں۔ کئی لوگ مجھ سے ملنے آئے لیکن تھانیدار نے کسی سے ملنے نہیں دیا۔ دو دن تک مار مار کر میرا حلیہ ہی بگاڑ دیا۔ اس درمیان دو بار عاقل آیا تھا اور اس نے سپاہیوں کو شاباشی دی تھی۔ میں نے لاکھ کہا کہ مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرو لیکن کسی نے میری نہ سنی۔ مجھے جیل بھیجنے سے پہلے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے میری حالت دیکھ کر سب کچھ سمجھ لیا تھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ صرف اتنا پوچھا کہ تمہارا کوئی وکیل ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں تو اس نے کہا کہ عدالت تمہیں وکیل کی سہولت دے گی۔ ایک گھنٹے بعد ایک شخص آیا اس نے مجھ سے کاغذات پر دستخط لیے کہ وہ میرا وکیل ہے۔ پھر مجھے جیل میں تین دن گزارنے پڑے۔ مجھ پر ایک شریف شہری پر گھر میں گھس کر قاتلانہ حملہ کرنے' بھتے کی رقم کے لیے دھمکی دینے کا الزام تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے مجھے بری طرح پھانسا ہے۔ تیسرے دن وکیل آیا اور مجھ سے وکالت نامے پر دستخط کرا کر چلا گیا۔ چوتھے دن آ کر اس نے ایک عجیب بات کہی۔ اس نے مشورہ دیا کہ اس کیس کو ختم کر دینا بہتر ہے

ورنہ عاقل ایک دوسری چال چلنے والا ہے۔ اس کے ایک نوکر کا کل قتل ہوا ہے۔ وہ اس قتل کا الزام تم پر ڈالنا چاہتا ہے۔ اس الزام سے بچنے کا محفوظ ترین راستہ یہ ہے کہ تم کہہ دو کہ اسے جانتے بھی نہیں ہو' تم اس کے گھر میں ڈاکا ڈالنے کی نیت سے داخل ہوئے تھے۔ اس نے روکا تو تم نے فرار ہونے کے لیے اس پر حملہ کر دیا۔ اس طرح یہ کیس ہلکا ہو جائے گا اور میں ضمانت کرا لوں گا۔ کیونکہ قتل کی نیت سے گھر میں داخل ہونے سے کم سزا چوری کی نیت سے کسی گھر میں داخل ہونا ہے۔ میں تین روز میں بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ پولیس کی مار نے دماغ معاوف کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے بغیر کچھ سوچے اس کے کہنے پر دستخط کر دیے۔'' وہ بولتے بولتے رکا تو میں نے کہا:

''اس کا مطلب ہے کہ وکیل بھی اس سے ملا ہوا تھا۔''

''جی ہاں' اس کے بعد عاقل کا ایک بندہ آیا کہ اگر تم اپنے گھر کے کاغذات عاقل صاحب کے نام کر دو ورنہ کیس واپس نہیں لیا جائے گا۔ تم نے جرم قبول کر ہی لیا ہے اس لیے اب سزا تمہارا مقدر ہے۔ مجھے اس طرح سے گھیر لیا گیا تھا کہ میں چاہ کر بھی پھندے سے نکل نہ پایا اور مزید دلدل میں اتر گیا۔ میں نے کوئی راہ نہ دیکھ کر گھر کے کاغذات بھی اس کے نام کر دیے لیکن اس نے پھر بھی کیس واپس نہ لیا اور مجھے سزا ہو گئی۔ میں جیل میں تھا کہ ایک بندے نے مجھ سے کہا اگر تم یہاں سے نکلنا چاہو تو میں ایک راستہ بتا سکتا ہوں۔ مجھے سزا ہو گئی تھی اس لیے میں ڈرا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا کیسے؟ تو اس نے جیب سے موبائل نکالا اور ایک بندے سے میری بات کرا دی۔ جیل میں موبائل ناممکن سی بات تھی لیکن اس کے پاس موبائل تھا۔ اس لیے میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی خاص بندہ ہے۔ اس نے جس بندے سے بات کرائی تھی۔ اس نے کہا کہ کل تمہیں کورٹ میں پیش ہونا ہے۔ وہاں میرا وکیل ہو گا۔ وہ تمہیں جیسا کہے ویسا بیان دینا۔ میری تاریخ ایک ہفتے بعد کی تھی لیکن دوسرے ہی روز مجھے عدالت میں طلب کر لیا گیا اور صرف ایک پیشی پر عدالت نے ریمارک میں لکھ دیا کہ بندہ بے قصور ہے اس لیے رہا کیا جاتا ہے کیونکہ جو ثبوت پیش کیے گئے ہیں وہ ناکافی ہیں۔ اور میں رہا ہو گیا۔ باہر آیا تو ایک بندہ منتظر تھا وہ مجھے لے کر مرشد کی خانقاہ میں پہنچا۔ اس خانقاہ میں مجھے ایک کمرا رہنے کے لیے دے دیا گیا۔ اب میں وہیں رہتا ہوں۔ جب کوئی کام ہوتا ہے تبھی باہر آتا ہوں۔ مجھے دھمکی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

دی گئی ہے کہ اگر میں نے ان کی بات نہیں مانی تو وہ عدالت کو ثبوت فراہم کردیں گے کہ میں نے جعلسازی سے ثبوت بنا کر عدالت کو گمراہ کیا ہے اور مجھے پچھلے کیس کے ساتھ نئے کیس بھی فیس کرنے ہوں گے۔ اسی ڈر سے میں کسی کتے کی طرح اس کے آگے دم ہلاتا رہتا ہوں۔'' بولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے جو اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ اندر سے دکھی ہے۔

''صاف ظاہر ہے کہ تمہیں گھیرا گیا اور جب تم پھنس گئے تو اپنے کام کے لیے تیار کرلیا۔''

''جی ہاں مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔''

''ایسا ہی ہوتا ہے۔ وطن دشمن تو تیس اپنی مطلب براری کے لیے مجبور و بے بس انسانوں کو ڈھونڈتے ہیں۔ اب فکر نہ کرو میں تمہیں دوبارہ سے معاشرے میں عزت دلواؤں گا۔ لیکن وعدہ کرنا ہوگا کہ پھر کوئی جرم نہیں کرو گے۔''

''آپ یقین کریں کہ اگر مجھے اطمینان ہو جائے کہ مجھ پر کوئی کیس نہیں رہا تو میں دوبارہ سے چھوڑی ہوئی پڑھائی پوری کرنے میں لگ جاؤں گا۔''

''اطمینان رکھو ایسا ہی ہوگا۔ میں کوشش کروں گا کہ تم پر سے سارے کیس ختم کرادوں۔''

''میں اور میرا یہ دوست امداد شاہ آپ کے لیے جان بھی قربان کردیں گے۔''

''تو پھر تیار ہو جاؤ ہم جلد پنڈی پہنچ کر مرشد کو ایسا سبق دیں گے کہ آئندہ وہ وطن دشمنوں سے کبھی ساز باز نہیں کرسکے گا۔''

''میں لاکھ برا سہی لیکن وطن دشمن نہیں ہوں۔ یقین کریں کہ اب تک جتنے بھی کام کیے وہ میرے خیال میں وطن دشمنی نہیں۔ اگر مجھے پہلے شک ہوتا تو شاید میں اس سے ٹکرا جانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ میں تو اسمگلنگ سمجھ کر اس کے کام میں معاونت کررہا تھا۔''

''غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے۔ معاف کرنے والی ذات اللہ کی ہے۔ بے فکر رہو۔ حکومت سے معافی میں میں بھرپور معاونت کروں گا۔ اب تیار ہو جاؤ۔ میرے وطن کے ان دیمک کو تباہ کرنے کے لیے۔ پہلے یہ مرشد صرف غنڈا گردی اور دوسرے جرائم کررہا تھا۔ سیاست کا سہارا لے کر خود کو بچائے ہوئے تھا لیکن جب اس کا مرکز یعنی اس کی خانقاہ تباہ ہوگئی تو اس نے اپنی تباہی کا نقصان پورا کرنے کے لیے ملک دشمن طاقتوں سے مدد لے لی۔ اب میں اسے کسی حال میں نہیں چھوڑوں گا۔ اپنا پرانا حساب تو لوں گا ہی۔ مادر وطن کی حرمت سے کھیلنے پر سزا بھی دوں گا۔''

''ہمیں آپ اپنے ساتھ پائیں گے۔'' اس نے بلند لہجے میں جواب دیا۔

اتنی دیر سے باقی سب خاموش تھے۔ سب اس کی باتیں سن رہے تھے۔ مرجس تو بار بار اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔ تبھی سفیر نے فرنچ میں کہا ''آپ کو اس کی کہانی پر یقین ہے؟ یہ ہمیں بے وقوف تو نہیں بنا رہا ہے؟''

میں نے بھی فرنچ میں جواب دیا ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کبھی کسی اجنبی پر مکمل بھروسا نہیں کرتا۔ مجھے یوں بھی مرشد سے نمٹنا ہے ہی اور اس کے لیے میں ان دونوں کو چارا بناؤں گا۔''

مرجس میری طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے خاموش ہوتے ہی پوچھا ''یہ آپ لوگ کس زبان میں باتیں کررہے تھے۔''

''بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا علم ہر ایک کو ہونا نہیں چاہیے اس لیے ہم ایسی زبان میں باتیں کرتے ہیں جو دوسروں کی سمجھ میں نہ آئے تاکہ راز، راز ہی رہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ہمارے ساتھ رہو گے تو ایسی کئی زبانیں سیکھ لو گے۔''

''مجھے تو بس ایک ہی زبان سیکھنا ہے وہ ہے انگلش۔ جب کبھی میری ٹیکسی میں انگریز بیٹھتے ہیں تو مجھے شرم آتی ہے۔''

''ایسا کرنا کہ جب تک وسیم ساتھ ہے روز اس سے دو چار انگریزی کے الفاظ سیکھتے رہو۔ جب ڈھیر سارے الفاظ یاد ہو جائیں تو انہیں جملوں میں استعمال کرنے کا طریقہ سیکھ لینا۔'' کہہ کر میں باہر نکل آیا تاکہ گاڑی چیک کرلوں اس لیے کہ پنڈی کے لیے نکلا جاسکے۔ میں گاڑی چیک کررہا تھا کہ سفیر آگیا اس نے کہا:

''شہباز مجھے ان دونوں پر شک ہے کہ یہ ہمارا ساتھ نہیں دیں گے۔''

''پہلے پنڈی پہنچ لوں پھر ان کو آزماؤں گا۔ اگر کام کے بندے نہیں ہوئے تو کوئی علاج سوچ لوں گا لیکن پہلے امتحان تو لینے دو۔''

میں نے سفیر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ جلد بازی میں کوئی قدم نہ اٹھالے لیکن اس کے سوچ کی سوئی تو ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔ اس نے کہا ''میرا مشورہ ہے کہ ان دونوں کو دن بھر کے لیے پھر سے بے ہوش کر دیا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

جائے۔ ایک ایک سوئی کافی ہوگی۔''

''سوچتا ہوں۔'' میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔ ''صبح سویرے نکلنا ہے اس لیے فی الحال تو جاکر سو جاؤ۔'' میں نے سفیر کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

اسے اندر بھیج کر میں پھر سے برآمدے میں بیٹھ گیا۔ میں کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ آیندہ کے لائحہ عمل پر غور کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اندر کی لائٹ بند کردی تھی اسی لیے وہ دونوں سمجھ نہ پائے کہ میں اندر بیٹھا ہوا ہوں۔ ناصر اور امداد شاہ باہر نکل آئے تھے۔ جہاں پر گاڑی کھڑی تھی اس سے کچھ دوری پر ایک سنگی بنچ بنا ہوا تھا۔ ایسے بنچ عام طور پر پارک وغیرہ میں رکھے جاتے ہیں۔ شاید مکان مالک اسے کسی پارک وغیرہ سے اٹھا لایا تھا۔ وہ دونوں جاکر اس پر بیٹھ گئے۔ امداد شاہ پشتو میں پوچھ رہا تھا کہ ایسی کیا بات تھی کہ وہ یکایک بڑے صاحب اپنے ساتھی سے ایک عجیب زبان میں باتیں کرنے لگے تھے۔

''وہ عجیب زبان نہیں فرنچ زبان تھی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں فرنچ نہیں جانتا۔ میں فرانس میں دو سال گزار چکا ہوں۔'' ناصر نے ہنس کر کہا تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ بندہ تو پرت در پرت کھل رہا ہے۔ سفیر کا شک مجھے بھی سچ لگنے لگا تھا مگر میں نے کچھ کہا نہیں۔ وہ کچھ اور بولتا کہ مرجس بھی باہر آگیا۔ انہیں وہاں بیٹھا دیکھ وہ ان کے قریب آگیا۔

''آپ لوگ یہاں بیٹھے ہوا کھا رہے ہیں اور میں سوچ رہا تھا کہ آپ لوگ کہیں فرار تو نہیں ہو گئے۔'' مرجس نے کہا اور قہقہہ لگایا۔

مرجس کی بات پر وہ دونوں اسے دیکھنے لگے۔ ان کی نظروں میں حیرت تھی، انہیں خاموش دیکھ مرجس بولا ''کہیں آپ لوگوں نے میرے مذاق کا برا تو نہیں منایا۔''

''نہیں نہیں برا کیوں مناؤں گا۔'' ناصر جلدی سے بولا اور کھڑا ہو گیا۔ ''چلو اندر چلتے ہیں۔'' کہہ کر وہ اندر کی طرف بڑھا تھا کہ مین روڈ پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ چمکی۔ روشنی کی وجہ سے میں بھی چونک گیا کیونکہ وہ گاڑی ہماری طرف ہی آرہی تھی۔

ناصر، امداد اور مرجس اندر جا چکے تھے۔ صرف میں گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہ گاڑی مرکزی شارع کے موڑ پر آکر رک گئی اور اس میں سے دو آدمی باہر نکلے۔ ان کا حلیہ کچھ ایسا تھا کہ میری نظریں ان پر جم کر رہ گئی تھیں۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ گاڑی کے قریب سے گزرتے ہوئے گھر کے قریب پہنچے اور پھر وہ اس طرح سے جائزہ لینے لگے جیسے ایک ایک گوشے کو دیکھ لینا چاہتے ہیں۔ پھر نیچی آواز میں چترالی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ مجھے چترالی کی بالکل سمجھ نہ تھی اس لیے میں سمجھ نہیں پایا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ ان کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ میں بغور ان کا جائزہ لے رہا تھا کہ وہ کب کوئی غلط حرکت کرتے ہیں۔ لیکن اب تک انہوں نے ایسی کوئی حرکت کی نہیں تھی کہ میں دخل دیتا۔ وہ دونوں سامنے سے جائزہ لے کر پیچھے کی طرف جانے لگے تھے کہ ان کے قدم رک گئے۔ اس لیے کہ باہر اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں کمرے کے کھلے دروازے سے آتی ہوئی روشنی کی لمبی لکیر بڑی واضح تھی۔ اس روشن لکیر میں کسی آدمی کی پرچھائی نظر آئی تھی جیسے کوئی دروازے کی سمت آرہا ہے۔ اسی وجہ سے وہ دونوں ٹھٹک گئے تھے۔ انہوں نے خود کو اندھیرے میں چھپا لیا تھا۔ جدھر وہ دونوں کھڑے تھے اس کے قریب ایک ٹوٹی ہوئی دیوار تھی جو کسی مقصد سے بنائی گئی ہوگی اور بعد میں اسے ڈھا دیا گیا ہوگا لیکن اب بھی چار فٹ کی دیوار باقی تھی۔ وہ دونوں اس دیوار کی آڑ میں بیٹھ گئے تھے۔ اس بات نے ان کے مشکوک ہونے پر مہر ثبت کردی تھی۔ وہ دونوں دبکے ہوئے اسی روشنی کو دیکھ رہے تھے۔ تبھی روشنی کو پار کرکے ناصر آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ دیر تک کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور سیٹی پر فلمی دھن بجانے لگا۔ عین اسی وقت دروازے سے سفیر نمودار ہوا۔ اس نے ناصر سے سوال کیا ''آپ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ آپ کو پتا ہے نا کہ ابھی آپ نگرانی میں ہیں۔ اگر بڑے صاحب نے آپ کو باہر دیکھ لیا تو سب کی شامت آ جائے گی۔''

سفیر کی بات سن کر اس نے کہا ''اندر گرمی ہے اسی لیے باہر آگیا۔''

میں نے غور کر لیا تھا کہ دیوار کے پیچھے بیٹھے وہ دونوں سیٹی سن کر چوکنا ہو گئے تھے۔ میں نے ان کی طرف سے نگاہیں ہٹا کر سفیر کی طرف دیکھا۔ وہ ناصر سے کہہ رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں لیکن اب تو اندر چلیں۔ صاحب واک پر گئے ہوں گے۔ اب وہ آتے ہی ہوں گے۔''

ان دونوں پر میری نگاہیں مرکوز تھیں اور میں سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر پستول تلاش کر رہا تھا کہ وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔

(باقی آیندہ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بیت بازی

قارئین

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

ہادیہ ایمان..........ڈاہرانوالہ

تڑپ کر سوز دل کو جلوہ ساماں کرلیا میں نے
بہت بے نور تھی دنیا چراغاں کرلیا میں نے

وحید نیازی..........لاہور

تمہارے عکس کو آنکھوں میں بھر لیا میں نے
میرے خیال کے ساگر کو جل پری تو ملی

عینی فہیم..........گوجرانوالہ

تیز بارش میں کبھی سرد ہواؤں میں رہا
اک تیرا ذکر تھا جو میری صداؤں میں رہا

(نازین ناز کوٹ ادو کا جواب)

رفیق احمد ناز..........ڈیرا غازی خان

یہ تخت و تاج اسی کی عنایت ہے
بیچا ہے جس کی خاطر ضمیر اپنا

عنایت تبسم..........مظفر گڑھ

یہ تو موسم ہی کچھ ایسا ہے یہاں کا ورنہ
دلِ درویش لگاتا نہیں آوازہ غم

شکیل تبسم..........روپیلا والی

یہ آنکھ مری پڑتی ہے تم پر ہی فقط کیوں
کیوں نیل کنول کھلتے ہیں ندیوں کے کنارے

(نوشین اختر کا جواب)

نجمی رحمٰن..........برٹ لیٹ یو ایس اے

مجھ سے مجھ تک ہی تھا کتنا فاصلہ
رہبروں کی گمراہی تھی میں نہ تھا

افضل حیات..........شیخوپورہ

میری باتوں میں میری یادوں میں
حساب کر کے بتاؤں تو بے حساب ہو تم

نیاز فتح..........چنیوٹ

مجھ سے کیا پوچھتے ہو میرے کاروبار کا دوست
اندھوں کے شہر میں آئینہ بیچتا ہوں

(نجمی رحمٰن، برٹ لیٹ یو ایس اے کا جواب)

عبدالجبار رومی..........لاہور

وہ مجھے چھوڑ کے خوش ہے تو شکایت کیسی
اب میں اسے خوش بھی نہ دیکھوں تو محبت کیسی

عباس اعوان..........رشید آباد

وقتِ رخصت دل نے اتنا ہی کہا رو کر کہ بس
اب پھر آنے کی مرے تو آرزو مت کیجیو

حسنین مصطفیٰ..........کامرہ

وہ سوز عشق سے بھرلاتا تھا اشک سرخ آنکھوں میں
اگر ہم جی کی بے چینی سے آہِ سرد بھرتے تھے

(انجم شاہین جھنگ کا جواب)

ماہا ایمان..........ڈاہرانوالہ

برق ان کا طواف کیوں نہ کرے
اک کشش بھی تو خار و خس میں ہے

نار جوکھیو..........لاڑکانہ

یہ عجب حادثہ ہو گیا نہ قدم رکے نہ قدم بڑھے
جو نظر اٹھائی تو کچھ نہ تھا نہ وہ منزلیں تھیں نہ قافلے

سندس علی..........کراچی

یہ عارض پرنور پہ زلفیں ہیں پریشان
تم بخت نکل گراہی شام و سحر سے

(اکرم جیلانی میر پور خاص کا جواب)

نزابت افشاں..........مہورہ

ہاتھوں پہ بہہ رہی ہے لکیروں کی آب جو
قسمت کا کھیت ہے پھر بھی بنجر پڑا ہوا

(احمد ذیشان کراچی کا جواب)

امجد علی عطاری..........کراچی

وہم بے چارگی ہے مختاری
زیست کا سارا سلسلہ مجبور

سارہ عتیق..........کراچی

وہی ہوا نا بدلتی رت میں، تم نے ہم کو بھلا ہی ڈالا
کوئی بھی رت ہو، نہ چاہتوں کا زوال ہو گا یہ طے ہوا تھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

عارف شہزاد.........ملیر

وہی تو آخری حد تھی مری تمنا کی
کہ جس کو تھام کے میں نے تجھے پکارا تھا
(ایم عمران جونانی کراچی کا جواب)

فلک شیر ملک.........شاہ گڑھ

ابھی مصروف ہوں کافی فرصت میں سوچوں گا
کہ تجھ کو یاد رکھنے میں، میں کیا کیا بھول جاتا ہوں

ہما اختر.........مظفر گڑھ

اے ابر کرم تشنہ دہن کٹتے ہیں دریا
یوں ٹوٹ کے صحراؤں پر برسا نہیں کرتے

طلعت احسن عثمانی.........اسلام آباد

اندھا ہے چلو ٹھیک ہے قانون ہمارا
اتنا بھی نہیں سستا مگر خون ہمارا

قندیل اثر.........فیصل آباد

اک ہجر جو ہم کو لاحق ہے تادیر اسے دہرائیں کیا
وہ زہر جو دل میں اتار لیا اب اس کے ناز اٹھائیں کیا

مظفر انصاری.........کراچی

آج ہمیں بارش کا پہلا قطرہ بننا ہے
تم کچھ دیر رک جاؤ ابر ہونے تک
(ناعمہ کریم کراچی کا جواب)

عبدالجبار رومی انصاری.........لاہور

نگاہیں تم سے جو مل گئی ہیں
شرم و حیا سے پھر جھکا دی آنکھیں

شجاع احمد.........العین، یو اے ای

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

اشفاق علی.........ڈسکہ

نو بہ نو بستیاں دکھاتا ہے
ایسے دیکھیں تو اک کرم ہے سفر
(فلک شیر ملک رحیم یار خان کا جواب)

امتیاز اسد.........پاک پتن

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ساجد فاروق.........سرگودھا

یہ زمانہ تو جلنے والا ہے
اتنا نازک نہیں یہ دل میرا

عنایت مسیح.........کراچی

یہ جو دیوار سیاہی کی نظر آتی ہے
اس کے پیچھے کہیں ہنگام سحر بھی ہو گا

فہد علی سید.........کوئٹہ

یوں ترک محبت کی قسم ہم نے نبھائی
یہ آنکھ مری تیرے تصور کو بھی ترسے
(راشد کنجاہی اسلام آباد کا جواب)

ارشاد حسین.........کوئٹہ

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گواہی وہ قیصری کیا ہے

سیف اللہ.........ملک وال

ناکام چلے جائیں اگر ہم ترے در سے
مایوس نہ ہو جائیں دعاؤں کے اثر سے

افسر علی افسر.........

نگاہِ شوق کو غیروں میں بانٹنے والے
زہے نصیب مجھے تیری بے رخی تو ملی

نسرین مشتاق.........حیدر آباد

نہ جانے کیوں مجھے رکھتا ہے فاصلوں پہ نسیم
مری بیاض جو اپنے سرہانے رکھتا ہے
(ماہین فاطمہ شاہین لیہ کا جواب)

سیف اللہ.........ملک وال

دفنانا دیکھ بھال کے حسرت زدہ کی لاش
لپٹی ہوئی کفن سے کوئی آرزو نہ ہو

(نوٹ: اشعار بھیجتے وقت جس کے شعر کا جواب ہے اس کا نام ضرور لکھیں۔ بے وزن اشعار تلف کر دیے جاتے ہیں۔ ایک کوپن پر صرف ایک شعر شامل کیا جاتا ہے)

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

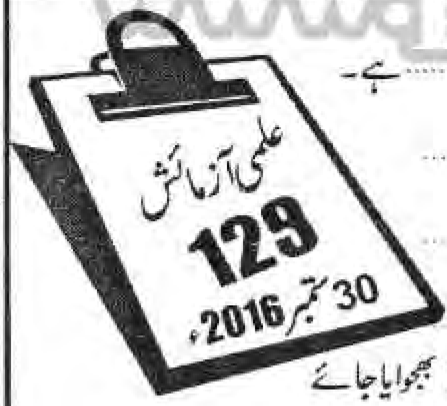

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 ستمبر 2016ء تک علمی آزمائش 129 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں (شعر الگ کاغذ پر ہے)

89

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ، ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں

ثمر عباس 0301-2454188

سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون 35895313 فیکس 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

علمی آزمائش۔ 129

ادارہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 ستمبر 2016ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

شمالی ہند کے علاقے الموڑہ میں پیدا ہوئیں۔ نینی تال اور لکھنؤ سے تعلیم حاصل کی۔ تحریک پاکستان کے ایک سرکردہ رہنما کی محبت میں مذہب تبدیل کیا اور جب پاکستان کا قیام عمل میں آگیا تو پاکستان آکر عورتوں میں تعلیمی شعور بیدار کرنے کے لیے تن من دھن سے جت گئیں۔ لڑکیوں کو نیم عسکری تربیت حاصل کرنے پر زور دیا۔ مصنوعات دیہہ نامی انجمن بنا کر گاؤں دیہات کی عورتوں میں دستکاری کا شوق پیدا کیا۔ گورنر بھی رہیں۔ 1990ء میں انتقال ہوا۔

علمی آزمائش 127 کا جواب

شہزادہ کریم کے والد کا نام شہزادہ علی تھا۔ 1957ء میں ملکہ الزبتھ، 1952ء میں شہنشاہ ایران نے خطاب عطا کیے۔ حکومتِ پاکستان نے 1970ء میں نشانِ امتیاز سے نوازہ۔ 1967ء میں پشاور یونیورسٹی اور 1970ء میں سندھ یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ 1969ء میں ایک برطانوی دوشیزہ سے شادی کی۔ ان کے مرید تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔

انعام یافتگان

1- نازش ممتاز۔ فیصل آباد 2- سرفراز علی۔ خوشاب 3- زرولی شاہ۔ پشاور

4- رخسانہ لیاقت۔ کوٹلی، آزاد کشمیر 5- فراز اطہر۔ تلہ گنگ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے وکیل الرحمن، امداد امام رضوی، مسز زبیدہ خاتون، نصرت جاوید، حسن افضال، سید خادم، فرزانہ پروین، آفتاب جعفری، توشین اختر، واحد علی صابری، احسن علی، کامران تقوی، احمد حسن پلیجو، ذیشان صدیقی، رسول بخش

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پلیجو، اسرار احمد، کلیم صدیقی، زاہد حیات، عنبرین احمد، یاسین خان، کاوش ارشد، انعام حیات، نعمت گل، عنایت گجر، مختار بٹ، صدف فاطمہ، نذر حسن، مولا بخش بٹ، نعمت گل، حکیم اختر، اکبر حسین، غلام حسن، نبیل احمد، عنبرین احمد، فرحت عباس نقوی، نیاز احسن، اشرف اللہ، طفیل احمد، الیاس محمد، توصیف انصاری، عنایت مسیح، صباحت مرزا۔ لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری، افضل احمد، نعمان مصطفی، تاثیر احسن، فہیم احمد، عباس علی سید، اشرف علی، رحیم بخش، ناہید اختر، فرقان احمد، نور احمد نور، خلیق حسن، انعام احمد، ملک سرفراز، قیصر ایاز، الطاف حسین۔ ملتان سے خواجہ محمد حسنین، نوید احسن، یاسین خان، اشرف خان، صنوبر عطاری، ظہیر الدین بابر، انیس احمد، مہوش نیازی، کاظم علی زیدی، مظہر حسین، نوازش صدیقی، نیاز الدین، فصیح الدین۔ راولپنڈی سے نوید الحق، محمد فیضان مصطفی، ابریز عالم، نوشین زاہد، استراج خان، ظفر اسماعیل، احمد جاوید، سراج حسن خان، کائنات حسن، اشعر حسین، اطہر علی سید، وفا جونپوری، نادر بیگ مرزا، کاشف عباس زیدی، نیابت خان، کلثوم پروین، احمد حمید چوہان، زاہد علی زاہد، فاروق محمود۔ اسلام آباد سے سید سلطان احمد، سیف الرحمن خان، انور یوسف زئی، نیلوفر شاہین۔ پشاور سے مظہر حسین، گل فراز منان۔ کوئٹہ سے انیس بٹ، کشمیر خان، زاہد بنگش، کاظم چنگیزی، محمد صالح، ارباز خان، شاہد اسلام، حیات محمد رند، غیاث الدین، فتح یاب سردار، نوشین فاطمہ کاظمی۔ حیدرآباد سے بابر خان، سرفراز احمد، ثناء، بتول، فرقان احمد، زاہد الاسلام شیخ، نعمت خان اچکزئی، نیہا فاطمہ، ظہیر حسن خان، اشرف صدیقی، کلثوم انصاری۔ سیالکوٹ سے اشرف علی، محمد ممتاز۔ ہارون آباد سے سلیم کامریڈ، احمد جاوید، سلمیٰ ممتاز۔ جھنگ سے کائنات فاطمہ، وقار علی، التماس عباس، نورین ملک۔ ہری پور سے خضر اسحاق نعیم اللہ ولد عبدالغفور۔ اسلام آباد سے افشاں زیاد، محمد ریاض، راحیل، عطا حسن، گلریز احمد توفیق، انیس احمد۔ کوٹری سے نازنین۔ ڈیرہ غازی خان سے نیاز علی وقار، رفیق احمد ناز، یونس احمد، نذر علی سید، نصیر علی۔ خیرپور میرس سے افروز مہدی، نورین اصغر، احمد علی زیدی، قیام الدین۔ گجرات سے محمد طاہر، خاقان بٹ، واثق علی، ارشاد زیدی، نعمان فاروق۔ خانیوال سے ارشاد علی، عباد سلطان، محمد فضیلت، عمر حیات خان۔ ڈی آئی خان سے زاہد علی، اللہ بخش، سلمان اشرفی۔ شجاع آباد سے غلام پنجتن۔ سرگودھا سے صادق بٹ، انعام حسین، محمد یامین، ارشد علی، نوید خان۔ بھکر سے صدف حسین۔ فیصل آباد سے عتیق احمد، نصرت جہاں، خاقان خان ڈرائیور، کاشف عرفان مروت، زیب علی، ملک محمد یاسین شازیہ احسن۔ رحیم یار خان سے زیبو، فلک شیر ملک (ترنڈہ سوائے خان)، انیس احمد، نصرت اسماعیل، امتیاز احمد، نثار یاسر، زیب النسائی، کیف سرہدی۔ بدین سے شاہد علی۔ قصور سے نیاز احمد، وردہ عباسی، شاہد احسن، سائیں شاہ۔ بہاولپور سے ادریس احمد، رحیم داد چوہدری، فیضان احمد توحید۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ، ڈی جی خان سے: فرحت اللہ شیرازی، نعمت خان، گل شیر میئو۔ ڈی آئی خان سے: نصیر الدین نصیر، فتح یاب خان، رانا وجدان، محمد سہیل انجم، سیماب عائشہ نواز۔ رحیم یار خان سے: آصف اقبال، محمد فیصل بخاری، فرحت اللہ لغاری، نسیم سلطان، کلیم اثر، زاہد طوری بنگش، اسلم توفیق، ساجد نسن، نثار علی، فرزانہ رفیق، قیصر ملک، انعم صدیق، نوید احمد، عثمان راہی۔ کھاناں سے: سلیم کامریڈ۔ بہاولپور سے: نازش کریم، شمیم وٹو، نعیم شیخ، میثم حسن، مسرت اسلم، حمیرا کوکب واسطی، ساغر تسنیم۔ بہاولنگر سے: نبیل احمد، نصیر جاوید، فرزند احمد، یعقوب افتخار، نزہت فردوس، بابا روفی۔ کمالیہ سے: فرحت شاہ، نواب شاہ، محمد الطاف فاروق، اصغر حسین خان، سلطنت خان۔ جہانیاں سے: زبیر خان، خضر خان، عبدالشکور اختر (غریب آباد) ممتاز وحید۔ کوٹ ادو سے: اطہر حسین سید، نبیل اشرف ملک۔ شہر سلطان سے: نوید انصاری، زبیر بٹ، سنجیدہ احمد۔ مظفر گڑھ سے: نوید تو تائی، عزیز حسن عزیز، جام اکبر علی، ماہڑہ، محمد امین۔ حسن ابدال سے: کرم الٰہی، سید محمد رضا، فردوس ستارہ، آصف شاہ، سید خالد حسین۔ پاک پتن سے: سدرہ شفیق، حافظ گل عمر، غازی شاہ، عبدالجبار، فتح محمد (منکیرہ) میاں والی سے: نوشین احمد، نعمان نیازی (گرین ٹاؤن) فرحت الاسلام، ممتاز سلیم، تانیہ نیازی، سلمان خورشید، کائنات۔ ٹنڈو آدم سے: شریف الرحمن، مکھن شاہ۔ مظفرآباد، آزاد کشمیر سے: حبیب الرحمن حبیب، جاوید قادری عطاری، اختر شیرازی، فرحت زیدی۔ گوجرانوالہ سے: سعدیہ شیریں عظیمی (قلعہ دیدار سنگھ) سہیل اشرف، ساجد اسلم، نینا ممتاز، فرحت عباسی۔ مسلم باغ سے: رحمت اللہ خان (قلعہ سیف اللہ) فرحت خورشید، سمعیہ اشرف، غلام بدر الدین، شبیر ملک۔ سیالکوٹ سے: نوید شہزاد خواجہ (خادم علی روڈ) ڈاکٹر عبدالغفار، کوکب سلمان، فریحہ سلطان۔ شیخوپورہ سے: قاسم نصیب (صفدرآباد) طاہر الدین، سلمیٰ مہر، ثاقب علی، خورشید حسن، طالب مولیٰ۔

بیرون پاکستان سے احمد علی (الینوائس یو ایس اے)، فرقان خان (ابوظہبی)، اشفاق مرچنٹ (ممباسا افریقا)، محمد توحید خان (العین)۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

جواب

قابلِ احترام مدیر سرگزشت
السلام علیکم
میں نے یہ نوکری مجبوری میں کی تھی۔ میرے شوہر کی شرافت، سادہ دلی کہ انہوں نے خود مجھے بھیڑیے کے بھٹ میں جانے پر مجبور کیا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتی تو یہ کہانی نہ بنتی۔ اسی لیے میں نے اپنے مکمل حالات قلمبند کردیے ہیں۔ وقت ملے تو اسے پہلی فرصت میں پڑھ لیں تاکہ سرگزشت کے قارئین تک میرا وہ جواب پہنچ جائے جو میں نے ظہیر کو دیا۔ میرا جواب صحیح ہے یا غلط فیصلہ آپ کریں۔

شاہانہ سعید
(لاہور)

زندگی اچھی بھلی گزر رہی تھی کہ ظہیر اچانک میری زندگی میں آگیا۔ وہ میرے شوہر سعید کے کالج کے زمانے کا دوست تھا۔ یونیورسٹی میں بھی دونوں ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں تھے۔ ماسٹرز کرنے کے بعد سعید نے ایک مقامی فرم میں ملازمت کرلی لیکن ظہیر چھوٹی موٹی ملازمت کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ بڑے باپ کا بیٹا تھا، ایک پرآسائش زندگی گزاری تھی اور مستقبل کے لیے بھی ایسے ہی خواب دیکھے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کرلے تو اسے پاکستان میں بھی اچھی ملازمت مل سکتی ہے۔ چنانچہ اس کے دماغ میں ملک سے باہر جانے کی دھن سوار ہوگئی۔ والدین اس کے حق میں نہیں تھے لیکن وہ ضد کر کے اپنے چچا کے پاس انگلینڈ چلا گیا۔ جانے سے پہلے ماں نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ کسی غیر مذہب کی لڑکی سے شادی نہیں کرے گا اور شراب کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ ظہیر نے یہ دونوں شرطیں مان لیں اور آنکھوں میں بہتر مستقبل کے خواب سجائے انگلینڈ روانہ ہوگیا۔

وہاں جاکر اسے دور کے ڈھول سہانے کے معنی معلوم ہوئے۔ پہلی مشکل تو یونیورسٹی میں داخلہ لینے میں ہوئی۔ اس نے اکنامکس میں ماسٹرز کیا تھا لیکن وہاں داخلہ لینے کے لیے یہ ڈگری ناکافی تھی۔ اس کے لیے اسے چھ مہینے کا کورس کرنے کے بعد داخلہ ٹیسٹ پاس کرنا ہوتا۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی کہ اس کی انگریزی بہت کمزور تھی۔ اس کے لیے بھی اسے لینگویج کورس کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس نے جیسے تیسے یہ مراحل سر کیے۔ داخلہ بھی مل گیا لیکن پہلے ہی سمسٹر میں اسے اندازہ ہوگیا کہ اس کے لیے غیر ملکی یونیورسٹی میں تعلیم جاری رکھنا بہت مشکل ہے۔ پاکستان میں تو امتحان پاس کرنے کے لیے رٹا، نوٹس اور نقل جیسی سہولتیں موجود ہیں لیکن انگریز صرف اسی طالب علم کو ڈگری دیتے ہیں جس کے پاس اپنے مضمون کے حوالے سے مطلوبہ نالج موجود ہو۔

چچا نے اس کی پریشانی بھانپ لی اور مشورہ دیا کہ وہ ڈگری کے چکر میں وقت ضائع کرنے کی بجائے عملی زندگی میں تجربہ حاصل کرے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اور وہ اکیلے ہی اپنے بہت بڑے اسٹور کو سنبھالے ہوئے تھے لیکن عمر کے اس حصے میں انہیں ایک سہارے کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے ان کی نظر ظہیر پر گئی۔ گھر کا فرد ہونے کی وجہ سے اس پر مکمل بھروسا کیا جاسکتا تھا۔ ظہیر کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اس نے پہلا سمسٹر مکمل کرنے کے بعد اپنا رجسٹریشن جزوقتی طالب علم کے طور پر کروالیا۔ اب وہ ہفتے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

وہ دن یونیورسٹی جاتا اور بقیہ وقت اسٹور پر بیٹھتا۔ چچا نے اس کی تنخواہ مقرر کردی تھی۔ اس کی کوئی خاص ذمّےداری نہیں تھی۔ ایک طرح سے وہ چچا کی معاونت کررہا تھا۔

اس طرح چار سال گزر گئے۔

اس دوران ظہیر نے ایم بی اے مکمل کیا اور پوری طرح اسٹور کا انتظام سنبھال لیا کیونکہ چچا اکثر بیمار رہنے لگے تھے اور بہت کم اسٹور پر آتے۔ ایک طرح سے ظہیر ہی سیاہ سفید کا مالک تھا۔ اس کے باوجود اس نے کبھی ایک پیسے کی ہیرا پھیری نہیں کی۔ اسے معقول تنخواہ مل رہی تھی۔ اس کے اپنے اخراجات بڑے محدود تھے اور نہ ہی اسے گھر پیسے بھیجنے کی ضرورت تھی۔ اس لیے تقریباً ساری تنخواہ بینک میں جمع ہورہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ٹھیک ٹھاک پیسے جمع ہو جائیں تو وہ پاکستان جاکر اپنا اسٹور کھول لے گا۔

اسے انگلینڈ گئے ہوئے پانچ سال ہوگئے تھے۔ اس دوران وہ صرف ایک مرتبہ پاکستان آیا۔ ماں کی خواہش تھی کہ وہ مستقل طور پر وطن واپس آجائے تاکہ وہ اس کی شادی کرسکیں لیکن ظہیر اپنا مقصد حاصل کیے بغیر نہیں آنا چاہتا تھا۔ دوسرے اسے چچا کی بھی فکر تھی۔ اس حالت میں وہ انہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ لہٰذا وہ مختلف حیلوں بہانوں سے ماں کو ٹالتا رہا۔

پھر وہی ہوا جس کا ظہیر کو ڈر تھا۔ ایک دن چچا رات کو سوئے تو انہیں دوسرے دن کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ انہوں نے انتقال سے پہلے اپنی وصیت تیار کرلی تھی جس کے مطابق ان کے تمام اثاثوں اور جائیداد کی مالک اب ان کی بیوہ یعنی ظہیر کی چچی تھیں۔ البتہ ان کے انتقال کے بعد یہ سب کچھ ظہیر کو منتقل ہوجاتا کیونکہ وہی ان کا قریب ترین وارث تھا۔ چچی کو ان تمام امور سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ عملاً گوشہ نشین ہوگئی تھیں۔ وہ صرف چیک پر دستخط کرتیں باقی سب ظہیر کے ہاتھ میں تھا۔

وہ پہلے سے زیادہ چچی کا خیال رکھنے لگا تھا۔ ویسے بھی وہ ٹھنڈا کرکے کھانے کا عادی تھا اور جانتا تھا کہ جلد یا بدیر سب کچھ اسی کو ملنے والا ہے۔ اس لیے اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔

ظہیر کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چچا کے انتقال کے دو سال بعد ہی چچی بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اس نے اسٹور، مکان، گاڑیاں اور دیگر اثاثے فروخت کیے۔ اپنی جمع پونجی سمیٹی اور سارا پیسا لے کر پاکستان آگیا۔ انگلینڈ جانا اس کے لیے بہت مبارک رہا۔ اس نے نہ صرف ایم بی اے کی ڈگری حاصل کی بلکہ چچا کا چھوڑا ہوا سارا ترکہ اسے مل گیا۔ اب وہ آسانی سے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔ پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے شہر کے پوش علاقے میں ایک بہت بڑا ڈیپارٹمنٹل اسٹور کھولا اور سکون کی زندگی بسر کرنے لگا۔

ظہیر کو کاروبار سے فرصت ملی تو اسے اپنے پرانے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

دوستوں کی یاد ستانے لگی۔ ان میں سعید اس کے سب سے قریبی دوست تھے جن سے اس کا رابطہ انگلینڈ میں قیام کے دوران بھی رہا تھا۔ سعید کے مالی حالات اتنے اچھے نہیں تھے کہ وہ اسے ٹیلی فون کرنے کی عیاشی افورڈ کر سکتے۔ البتہ وہ انہیں گاہے بگاہے ٹیلی فون کرتا رہتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس کے ٹیلی فون باقاعدگی سے آتے رہے لیکن جیسے جیسے اس کی مصروفیت بڑھتی گئی اس کے ٹیلی فون بھی کم ہوتے گئے۔ اس دوران سعید نے صرف ایک مرتبہ اپنی شادی میں شرکت کی دعوت دینے کے لیے اسے فون کیا تھا۔ وہ خود عملی انسان تھا۔ اس لیے اسے سعید کی جلد بازی اچھی نہیں لگی اور اس نے اپنی سوچ کے مطابق مشورہ دیا کہ سعید کو شادی کی بجائے پہلے اپنا مستقبل بنانے پر توجہ دینا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ سعید کو اس کی یہ صاف گوئی پسند نہیں آئی۔ لہٰذا انہیں غصہ آگیا اور انہوں نے دوبارہ اسے فون نہیں کیا۔

ظہیر نے فون کر کے سعید کو اپنی پاکستان آمد کی اطلاع دی تو وہ ملنے کے لیے اس کے گھر پہنچ گئے۔ پرانے دوست ایک عرصے بعد ملے تھے۔ لہٰذا دونوں جانب سے گرم جوشی کا مظاہرہ کیا گیا اور سعید نے اسے اگلے روز اپنے گھر کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ شام کو گھر آئے تو انہوں نے خوشی خوشی ظہیر کے بارے میں بتایا اور بولے۔ ''میں نے اسے کل شام کھانے پر بلایا ہے۔ دو چار اچھی چیزیں بنا لینا۔''

یہ سنتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''دعوت دینے سے پہلے کم از کم مجھ سے پوچھ تو لیا ہوتا۔ مہینے کے آخری دن ہیں اور گھر میں سب چیزیں ختم ہو رہی ہیں۔ میرے پاس تو سامان منگوانے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔ دعوت کا انتظام کیسے ہوگا۔''

''تم مجھے بتا دو، کیا چیزیں چاہئیں۔ میں حسیب صاحب کے یہاں سے لا دیتا ہوں۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ ملے گی تو ان کا ادھار نمٹا دیں گے۔''

یہ سن کر مجھے اور غصہ آگیا کیونکہ مجھے ادھار سے چڑ تھی اور چاہے کسی چیز کی کتنی ہی زیادہ ضرورت کیوں نہ ہو میں ادھار نہیں کرتی تھی۔ میں نے تلملاتے ہوئے کہا۔ ''جب جیب میں پیسے نہیں ہیں تو کیا ضرورت تھی اسے بلانے کی۔ میں نے آج تک حسیب صاحب کے یہاں سے ایک روپے کی چیز ادھار نہیں منگوائی۔ ویسے ہی تنخواہ کے پیسوں میں گزارا نہیں ہوتا۔ ادھر نمٹائیں گے تو مزید تنگی ہو جائے گی۔ میں تو کہتی ہوں کہ کوئی بہانہ کر کے اسے ٹال دیں۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔''

''یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔'' انہوں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''دعوت تو کل ہی ہوگی۔ تم بے شک زیادہ اہتمام مت کرنا۔ بس ایک دو ڈشیں ہی کافی ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ سامان لے آئیں لیکن ادھار نہیں۔ میں پیسے دے رہی ہوں۔ کسی کی امانت رکھے ہوئے ہیں۔''

''اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ کس کی امانت ہو سکتی ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔

سعید کا اندازہ درست تھا۔ یہ پیسے میرے اپنے ہی تھے جو میں نے گھر کے خرچ سے بچا کر کسی ہنگامی ضرورت کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے بچپن سے ہی تنگ دستی کا منہ دیکھا تھا۔ ابا کی محدود آمدنی تھی۔ اسی سے انہوں نے ہم لوگوں کو پالا پوسا، پڑھایا لکھایا اور ہماری شادیاں کیں۔ مجھے بچپن میں ہی امیر اور غریب کا فرق معلوم ہو گیا تھا۔ جس اسکول میں تعلیم حاصل کی، وہاں بھی سب مجھ جیسی ہی لڑکیاں تھیں۔ اس لیے کبھی کسی قسم کا احساسِ محرومی نہیں ہوا۔ البتہ کالج میں آنے کے بعد جب طرح طرح کی لڑکیوں سے واسطہ پڑا تو پتا چلا کہ معاشرے میں ہماری کیا حیثیت ہے۔ امیر اور متوسط طبقے کی لڑکیاں جب قیمتی کاروں میں آتیں۔ ان کے ہاتھوں میں انتہائی مہنگے موبائل ہوتے۔ وہ کالج کینٹین میں جا کر کھلا خرچ کرتیں، اپنے گھر ہونے والی تقاریب کا فخریہ انداز میں ذکر کرتیں تو میرا دل اندر سے کٹ کر رہ جاتا لیکن پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دیتی کہ اس دنیا میں نہ جانے کتنے ایسے لوگ ہیں جو ہم سے بھی برے حال میں زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ کیا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہماری تمام بنیادی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں۔ ویسے بھی ابا کہا کرتے تھے کہ ہمیشہ اوپر والوں کو نہیں بلکہ نیچے والوں کو دیکھنا چاہیے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ہم کتنے لوگوں سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔

میری پرورش جن حالات اور ماحول میں ہوئی اس کی وجہ سے میں حد درجہ قناعت پسند بن گئی۔ یہی حال دوسرے بہن بھائیوں کا بھی تھا۔ یہ ہمارے والدین کی تربیت تھی جس نے ہمیں صبر و شکر کا عادی بنا دیا۔ ہمارے ذہن میں شروع سے ہی یہ بات بٹھا دی گئی تھی کہ ہم ہزاروں لاکھوں لوگوں سے اچھے ہیں اسی وجہ سے ہمارے اندر کبھی احساس

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کمتری نہیں ہوا ہم سب اپنے حال میں خوش تھے۔

گریجویشن کے فوراً بعد میری شادی ہوگئی۔ یہاں بھی مجھ پر آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی مثال صادق آئی۔ سعید کا گھرانا ہم سے مختلف نہ تھا اور یہ لوگ بھی ہماری طرح نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ حالانکہ میرے لیے کئی اچھے گھروں کے رشتے آئے تھے لیکن ابا کا خیال تھا کہ شادی ہمیشہ ہم مرتبہ لوگوں میں کرنی چاہیے۔ اس طرح بہت سی الجھنوں اور پیچیدگیوں سے بچا جاسکتا ہے۔ ان کی یہ بات کسی حد تک صحیح تھی۔ اس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔ میری کچھ سہیلیوں کی شادی بڑے گھرانوں میں ہوگئی تھی۔ ان کے والدین نے لالچ میں آکر شادی تو کردی لیکن بعد میں پیش آنے والے حالات کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ ان لڑکیوں کو ہر وقت سسرال والوں کے طعنے سننے کو ملتے۔ کسی کو کم جہیز لانے، تو کسی کو امیر گھرانوں کے طور طریقوں سے ناواقف ہونے پر باتیں سننا پڑتیں لیکن میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ سسرال والے سیدھے سادے تھے۔ گھر میں صرف ساس اور ایک نند تھی۔ دو سال بعد نند کی شادی ہوگئی اور ساس بھی زیادہ عرصہ زندہ نہ رہیں۔ اس کے بعد گھر کی ساری ذمے داری مجھ پر آن پڑی۔ سعید بھی میری طرح قناعت پسند تھے۔ ان کا اپنا کوئی خرچ نہیں تھا۔ تھوڑے سے پیسے اپنے پاس رکھ کر وہ باقی پوری تنخواہ میرے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے۔

شروع شروع میں تو کچھ زیادہ پریشانی نہیں ہوئی لیکن ننھے عامر کی پیدائش کے بعد اخراجات بڑھ گئے اور سعید کی تنخواہ میں گھر چلانا مشکل ہوگیا۔ میں حتی الامکان کفایت شعاری سے کام لیتی لیکن اس کے باوجود مہینا پورا کرنا عذاب ہوجاتا۔ میں نے کئی مرتبہ ملازمت کرنے کے بارے میں سوچا لیکن سعید نے اس خیال کو سختی سے مسترد کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے نوکری کرکے بھی کچھ نہیں ملے گا۔ کیونکہ سب سے بڑا مسئلہ بچے کی دیکھ بھال کا تھا۔ اس کے لیے آیا رکھنی پڑے گی۔ میری آدھی تنخواہ اس کی نذر ہو جائے گا۔ پھر کام پر جانے کے لیے ہر مہینے مجھے کپڑے بھی بنانا ہوں گے۔ اس کے علاوہ ٹرانسپورٹ کا خرچ الگ۔ تمام اخراجات نکالنے کے بعد میرے پاس کچھ نہیں بچتا اس سے تو بہتر ہے کہ میں گھر پر بیٹھ کر ہی کوئی کام کروں۔

ان تمام تکالیف کے باوجود میں نے سعید سے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا۔ یہ بات میری فطرت میں شامل نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ پریشان ہیں اور اپنے حالات بہتر بنانے کی بھرپور کوشش کررہے ہیں۔ وہ کئی جگہ بہتر ملازمت کے لیے درخواست دے چکے تھے لیکن بات نہیں بن رہی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اپنے بیٹے عامر کی تھی۔ وہ پانچ سال کا ہوگیا تھا۔ فی الحال تو میں نے اسے گھر کے قریب ہی ایک اسکول میں داخل کروادیا تھا۔ میں خود ہی اسے چھوڑنے جاتی اور دوپہر کو اسکول سے لے کر آتی لیکن یہ ایک عارضی انتظام تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ تھوڑے سے حالات بہتر ہوں تو اپنے بیٹے کو کسی اچھے اسکول میں داخل کروادوں تاکہ اس کی بنیاد مضبوط ہوسکے۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ دعوت ایک فضول خرچی بلکہ عیاشی لگ رہی تھی لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور سعید اس معاملے میں اتنے جذباتی تھے کہ وہ حسیب صاحب کی دکان سے سامان ادھار لانے پر بھی تیار ہوگئے۔ بہرحال میں نے انہیں سامان کی فہرست اور پیسے پکڑائے اور دعوت کی تیاری شروع کردی۔ میں نے جو مینو بنایا اس میں چکن بریانی، قورمہ، شامی کباب اور کھیر شامل تھی۔ دوسرے دن سعید کے دفتر جانے کے بعد میں نے کام شروع کردیا اور شام تک میری تیاری مکمل ہوگئی۔ سعید نے جاتے وقت تاکید کی تھی کہ میں خود بھی مہمان کے آنے سے پہلے تیار ہوجاؤں کیونکہ ظہیر مجھے پہلی بار دیکھے گا اور وہ چاہتا ہے کہ اس پر میری شخصیت کا اچھا تاثر قائم ہو۔

میں نے اپنی پسندیدہ جامنی سلک کی ساڑی نکالی۔ یہ میں جہیز میں لے کر آئی تھی۔ اس کا بلاؤز خاصا تنگ ہوگیا تھا۔ اسے پہن کر مجھے خود اپنے آپ سے شرم آنے لگی لیکن سعید کو وہ ساڑی بہت پسند تھی اور وہ اکثر مجھ سے اس کے پہننے کی فرمائش کیا کرتے تھے اور سچی بات تو یہ کہ میرے پاس اور کوئی ڈھنگ کا لباس نہیں تھا جسے پہن کر ظہیر کے سامنے آتی۔ اس لیے میں نے اسی ساڑی کا انتخاب کیا۔

سعید نے کہا تھا کہ وہ سات بجے تک ظہیر کو لے کر آجائیں گے۔ ان کے آنے سے پہلے میں تیار ہوچکی تھی۔ ہلکا سا میک اپ کرنے کے بعد میں نے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا اور آئینے میں آخری بار اپنے سراپے کا جائزہ لیا تو خود ہی شرما گئی۔ میں نے سوچا کہ ظہیر بھی مجھے دیکھ کر سعید کی قسمت پر رشک کرے گا کہ اسے اتنی حسین بیوی کہاں سے مل گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ جو کچھ میں سوچ رہی ہوں وہ آنے والے دنوں میں حقیقت بن کر سامنے آجائے گا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

گھنٹی کی آواز سن کر میں نے دروازہ کھولا تو میرے سامنے سعید کے ساتھ سفید قمیص اور سیاہ پینٹ میں ملبوس ایک انتہائی اسمارٹ اور ہینڈسم شخص کھڑا ہوا تھا۔ لانبا قد، گورا رنگ، براؤن آنکھیں، سلیقے سے سنورے سیاہ بال اور ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ نے اس کی شخصیت کو بے حد پرکشش بنا دیا تھا گو کہ میں نے ظہیر کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن پہلی نظر میں ہی اسے پہچان گئی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت سعید کے ساتھ اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ حالانکہ وہ اور سعید کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ اس لحاظ سے ان دونوں کی عمر بھی تقریباً برابر ہی ہوگی لیکن وہ سعید کے مقابلے میں کافی کم عمر لگ رہا تھا۔ شاید حالات کا فرق ان دونوں کی شخصیت پر بھی اثر انداز ہوا تھا۔

میں نے اخلاقاً اسے سلام کرنے میں پہل کی تو وہ بولا۔ ”یہ فرض تو مجھے ادا کرنا چاہیے کیونکہ رشتے میں تو آپ مجھ سے بڑی ہی ہیں لیکن آپ کو دیکھ کر سدھ بدھ کھو بیٹھا۔ یار سعید! تجھے اتنی خوب صورت بیوی کہاں سے مل گئی۔“

انگلینڈ سے آتے ہوئے ایک دولت مند اور بے باک شخص سے ایسے ہی جملوں کی توقع کی جا سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس سے بھی زیادہ تیز اور چبھتے ہوئے لفظ استعمال کرے گا۔ لہٰذا میں اس کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار... کرنے لگی۔ سعید بے چارے سیدھے سادے انسان تھے۔ انہیں جواب دینا نہیں آتا تھا بس وہ اتنا ہی کہہ سکے۔ ”بھئی اندر تو چلو۔ باقی باتیں وہیں کر لینا۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔ اچانک اس کی نظر عامر پر گئی جو انگلی پکڑے میرے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ ظہیر نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچا اور بولا۔ ”ارے میرے ننھے شہزادے تم کہاں چھپے ہوئے تھے۔ بھئی ہم تمہارے انکل ہیں ہم سے نہیں ملو گے؟“

عامر نے شرماتے ہوئے کہا۔ ”ہاؤ آر یو انکل؟ آر یو فائن؟“

”ماشاء اللہ بہت پیارا بچہ ہے۔“ ظہیر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”بالکل ماں پر گیا ہے۔“

پانچ منٹ میں یہ دوسرا جملہ تھا جو اس نے میری تعریف میں کہا۔ میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ”اچھا اندر آ جائیں۔ میں کچھ پینے کے لیے لاتی ہوں۔“

انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کچن میں گئی اور ان کے لیے مینگو اسکواش بنا کر لائی۔ ساتھ میں کچھ ڈرائی فروٹ بھی تھے۔ میں یہ سارا اہتمام اس لیے کر رہی تھی کہ وہ سعید کو کسی بھی طرح اپنے سے کم تر نہ سمجھے اور اسے یہ خیال نہ آئے کہ ہم نے اس کی اچھی طرح خاطر تواضع نہیں کی۔ میں نے اس کے آگے مشروبات کی ٹرے رکھی اور واپس کچن میں جانے لگی تو وہ بولا۔ ”یہ نہیں چلے گا۔ آپ بھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر ڈرنک کریں۔“

اس نے ڈرنک کا لفظ جس انداز میں ادا کیا۔ اس سے مجھے اس کا مفہوم سمجھنے میں دیر نہیں لگی پھر بھی میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں یہاں بیٹھ گئی تو کھانا کون تیار کرے گا؟“

”اس کی فکر نہ کریں۔ ہم سب آپ کی مدد کریں گے۔ ویسے بھی میں بہت اچھا کک ہوں۔ انگلینڈ میں اپنا کھانا خود ہی بنایا کرتا تھا۔“

”آج تو آپ میرے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھا لیں۔ اگر کبھی موقع ملا تو آپ کو ضرور زحمت دیں گے۔“ میں نے شوخی سے کہا۔

”اسے میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”اور مجھے اس دن کا شدت سے انتظار رہے گا۔“

وہ بہت ہنس مکھ اور باتونی تھا۔ کھانے کے دوران بھی وہ مسلسل بولتا رہا جب کہ سعید ہمیشہ کی طرح ہونٹوں پر خاموشی کا قفل لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بہت کم گو ہیں اور انتہائی ضرورت کے تحت بولتے ہیں لیکن اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی گفتگو میں حصہ لیں کیونکہ مجھے ہی ظہیر کی باتوں کا جواب دینا پڑ رہا تھا۔ ویسے بھی وہ زیادہ تر مجھ سے ہی مخاطب تھا۔ جیسے اس نے سعید کی موجودگی کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہو۔ اس کی نظریں مسلسل میرے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ اسے ذو معنی باتیں کرنے کا ہنر آتا تھا۔ اس نے دوران گفتگو کچھ ایسے جملے بھی کہے جن کا مفہوم سمجھنے میں مجھے کوئی دقت نہیں آئی۔ ان جملوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ انتہائی بے باک شخص ہے اور صنف نازک سے بے تکلفانہ گفتگو کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ میں نے اس کی بے باکی کو اس لیے نظر انداز کر دیا کہ شاید یہ انگلینڈ میں رہنے اور وہاں کے ماحول کا اثر ہو لیکن اس کی چبھتی ہوئی نظروں سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا جو میرے جسم میں سوئی کی طرح گڑی جا رہی تھیں۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ اس نے میری

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بنائی ہوئی چیزوں کی دل کھول کر تعریف کی۔ جانے سے پہلے اس نے عامر کو ایک ہزار روپے اور مجھے پانچ ہزار دیے۔ مجھے وہ پیسے لیتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی میں نے سعید کی طرف دیکھا لیکن وہ بے تاثر چہرہ لیے کھڑے ہوئے تھے۔ ظہیر نے دیکھا تو بولا۔

''اس کی مجال ہے کہ کچھ بول سکے۔ ویسے بھی مجھ پر آپ کی شادی کا تحفہ قرض ہے۔ اسے تو آپ منہ دکھائی سمجھ کر رکھ لیں۔''

''بس یہی کافی ہے۔'' میں نے وہ پیسے لیتے ہوئے کہا۔ ''سمجھ لیں کہ آپ نے تحفہ دے دیا۔''

''میں نے آپ سے رائے نہیں مانگی۔'' وہ شوخ لہجے میں بولا۔ ''مجھے میرا کام کرنے دیں۔ آپ اپنا کام کریں۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے برتن سمیٹے اور بیڈ روم میں آکر عامر کو سلانے لگی۔ میں نے یہ سوچ کر لباس تبدیل نہیں کیا کہ سعید کو ساڑی بہت پسند ہے اور وہ اکثر مجھ سے ساڑی پہننے کی فرمائش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس وقت انہوں نے مجھ پر کوئی توجہ نہ دی تو مجھے بہت غصہ آیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھی اور لباس تبدیل کر کے کچن میں جا کر برتن دھونے لگی۔ میں نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ جب غصہ آئے تو بندہ اپنے آپ کو کسی کام میں مصروف کر لے۔ میری یہ تدبیر کارگر رہی اور آدھ گھنٹے بعد میں نارمل ہو چکی تھی لیکن بستر پر لیٹتے ہی دل میں الٹے سیدھے خیالات آنے لگے اور میں غیر ارادی طور پر سعید اور ظہیر کا موازنہ کرنے لگی۔ حالانکہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ان دونوں کا موازنہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ سعید جیسے بھی ہیں بہر حال وہ میرے شوہر ہیں اور میں کسی غیر مرد سے ان کا مقابلہ کیوں کروں۔ دونوں کی سماجی اور مالی حیثیت، شکل وصورت اور طرزِ زندگی میں بھی بہت بڑا فرق تھا۔ ظہیر کھاتے پیتے گھرانے کا فرد اور مالی طور پر مستحکم ہونے کے علاوہ خوش شکل، خوش لباس اور خوش مزاج شخص تھا۔ اس کے برعکس سعید ایک پرائیویٹ فرم میں معمولی درجے کے ملازم تھے اور ان کی تنخواہ میں گھر کا خرچ بمشکل پورا ہوتا تھا۔ معاشی تنگی کی وجہ سے ان کی شخصیت بھی متاثر ہو رہی تھی۔ ان کے پاس ڈھنگ کے کپڑے نہیں تھے۔ تین تین دن شیو نہیں بناتے تھے۔ کوئی ایمرجینسی ہو یا فالتو خرچ آجائے تو ان کے حواس گم ہو جاتے تھے اور ایسے موقعوں پر میری بچائی ہوئی چھوٹی چھوٹی رقمیں ہی کام آتی

تھیں تاہم ان تمام تلخ حقائق کے باوجود میرے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ کسی غیر مرد کو سعید پر ترجیح دیتی۔ میرے لیے شوہر ہی سب کچھ تھا۔

تین چار دن سکون سے گزر گئے۔ ایک روز سعید نے دفتر سے واپس آنے کے بعد بتایا کہ ظہیر نے ہمیں ہفتے کی شام ہوٹل میں کھانے کی دعوت دی ہے۔ میں ظہیر کا سامنا کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس لیے میں نے انکار کر دیا۔ اس پر سعید ناراض ہو گئے اور بولے۔ ''آخر تمہیں اس شخص سے اتنی چڑ کیوں ہے؟ پہلے جب وہ ہمارے گھر آرہا تھا تو تم نے مخالفت کی تھی اور اب اس نے بلایا ہے تو انکار کر رہی ہو۔ وہ میرا بہت پرانا دوست ہے۔ اسے کیسے منع کر سکتا ہوں۔''

''میں نے کب منع کیا ہے۔ آپ چلے جائیں لیکن میں نہیں جاؤں گی۔''

''نہ جانے کی کوئی وجہ بھی تو ہو؟''

''دیکھیں سعید۔'' میں نے انہیں سمجھانے کی غرض سے کہا۔ ''دوستی ہمیشہ ہم مرتبہ لوگوں سے کی جاتی ہے۔ اس کا اور ہمارا کوئی میل نہیں۔ اس روز بھی اس نے پانچ ہزار روپے دیے تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ اب اگر اس نے کوئی قیمتی تحفہ دے دیا تو مجھے بہت شرم آئے گی۔ آپ ہی سوچیں کہ ہم اس کے احسانات کا بدلہ کس طرح اتاریں گے۔ دوسری بات یہ کہ میرے پاس ہوٹل میں جانے کے لیے کوئی ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ہیں۔ اب میں ہر بار تو ایک ہی ساڑی نہیں پہن سکتی۔''

''کپڑوں کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔'' انہوں نے کہا۔ ''تمہارے پاس وہ پانچ ہزار روپے تو ہوں گے جو ظہیر نے دیے تھے انہی میں سے ایک سلا سلایا سوٹ خرید لو۔''

''گویا آپ نے تہیہ کر لیا ہے کہ اس کی دعوت میں ضرور جانا ہے۔''

''ہاں۔'' وہ قطعیت سے بولے۔ ''میں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔''

دوسرے دن میں بازار گئی۔ اپنے لیے ایک ایمبرائیڈری سوٹ، سعید کے لیے شرٹ اور عامر کے کپڑے خریدے۔ میرا خیال تھا کہ ظہیر کے دیے ہوئے پیسے اپنی بچت میں ڈال دوں گی لیکن اس کی دعوت نے میرا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ ہوٹل میں جانے کے لیے میں نے خاص طور پر تیاری کی۔ مجھے پارٹی میک اپ کا کوئی خاص تجربہ نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

تھا۔ اس کے لیے قریبی بیوٹی پارلر جانا پڑا۔ تیار ہو کر آئی تو سعید میری سج دھج دیکھ کر حیران رہ گئے۔ میں توقع کر رہی تھی کہ وہ کوئی تعریفی جملہ کہیں گے لیکن انہوں نے اس وقت بھی الفاظ کے استعمال میں بخل سے کام لیا البتہ آنکھوں آنکھوں میں داد دے دی۔

وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا۔ ظہیر نے ہمارے لیے ایک میز مخصوص کروا رکھی تھی۔ وہ بینکوئیٹ ہال کے دروازے پر کھڑا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ سیاہ سوٹ میں اس کی شخصیت اور بھی نکھر آئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکیڑے اور اس کی بے باک نگاہیں میرے سراپے پر جم گئیں۔ وہ ایمبرائیڈری سوٹ مجھ پر خوب جچ رہا تھا اور اس میں میرے جسم کے خدوخال پوری طرح نمایاں تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ظہیر کے علاوہ وہاں پر موجود اور بھی کئی لوگوں کی نگاہیں میری جانب اٹھ گئی تھیں۔ میں ہوٹل کے چکنے فرش پر دو مردوں کے درمیان شہزادیوں کی سی شان سے چل رہی تھی۔

میرے لیے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کرنے کا یہ پہلا موقع تھا اور شاید سعید کا بھی کیونکہ وہ خاصے نروس نظر آرہے تھے لیکن میں بڑے اعتماد سے بیٹھی ظہیر سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے اچھا خاصا اہتمام کیا تھا۔ ذرا سی دیر میں پوری میز انواع و اقسام کے کھانوں سے بھر گئی۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جن کا میں نے صرف نام سن رکھا تھا لیکن کبھی چکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ظہیر کی مہربانی سے یہ موقع بھی مل گیا۔ اس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ ایسی کئی مہربانیاں میرے راستے میں آنے والی ہیں۔

کھانے کے دوران ظہیر حسبِ معمول چہکتا رہا۔ پہلے کی طرح اس نے میری شان میں قصیدے پڑھے، وہ وقفے وقفے سے کوئی ایسی ذومعنی بات کہہ جاتا جسے سن کر مجھے شرم آنے لگتی لیکن اس روز مجھے اس کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔ شاید یہ ہوٹل کے رومان پرور ماحول کا اثر تھا۔ سعید حسبِ معمول لاتعلق بنے کھانا کھا رہے تھے۔ ظہیر اگر انہیں مخاطب کر کے کوئی بات کہتا تو وہ ہوں ہاں میں جواب دے دیتے۔ کھانے کے بعد آئس کریم اور پھر چائے کا دور چلا۔ جب ہم وہاں سے روانہ ہونے لگے تو ظہیر نے اپنی گاڑی میں ہمیں گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی جسے سعید نے فوراً قبول کرلیا جب کہ میں چاہ رہی تھی کہ جس طرح ہم ٹیکسی سے آئے تھے، اسی طرح واپس بھی جائیں گے لیکن ظہیر نے کہا کہ اس وقت ٹیکسی کا ملنا مشکل ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم اس کی گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ اسے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔

اس واقعے کے ایک ہفتے بعد سعید نے مجھے بتایا کہ ظہیر نے انہیں اپنے اسٹور میں کام کرنے کی پیشکش کی ہے لیکن انہوں نے انکار کردیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولے۔

''تم خود ہی سوچو، وہ میرا دوست ہے۔ اسے اپنے باس کے طور پر کیسے قبول کرسکتا ہوں۔ ایک بار ہمارے درمیان مالک اور ملازم کا تعلق بن گیا تو دوستی بیچ میں سے نکل جائے گی اور میں ایک اچھے دوست سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔''

''اچھا کیا۔'' میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''جس کام کے لیے آدمی کا دل نہ مانے وہ نہیں کرنا چاہیے۔''

''آگے بھی تو سنو۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''میرے انکار کرنے کے بعد اس نے ایک متبادل پیشکش کردی۔''

''وہ کیا؟'' میں چونکتے ہوئے بولی۔

''اس نے کہا کہ اگر میں اس کے اسٹور میں کام کرنا نہیں چاہتا تو تمہیں جاب کرنے کی اجازت دے دوں۔''

''کیا مطلب۔ یعنی میں اس کے اسٹور میں کام کروں گی۔ سوری میں سیلز گرل نہیں بن سکتی۔''

''یہ اس نے کب کہا۔ وہ تمہیں ایڈمنسٹریشن میں رکھنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تم گریجویٹ ہو اور انتظامی امور با آسانی سنبھال سکتی ہو۔''

''لیکن میں نے کبھی جاب نہیں کی۔ میں اتنی بڑی ذمے داری کیسے سنبھال سکتی ہوں۔ پھر عامر کا بھی مسئلہ اسے اسکول چھوڑنا اور واپس لانا ہوتا ہے۔''

''وہ آئے گا تم سے بات کرنے۔ اپنی پرابلم اسے بتا دینا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے ذہن میں کوئی حل ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں بات کرلوں گی۔'' میں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہم پر اتنا مہربان کیوں ہورہا ہے؟''

''سمجھنے کی کوشش کرو۔'' وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولے۔ ''دراصل وہ میرا بہت ہی پرانا اور مخلص دوست ہے۔ اسے ہمارے حالات کا اندازہ ہو چکا ہے اور وہ کسی بہانے ہماری مدد کرنا چاہتا ہے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ ہر مہینے دس پندرہ ہزار روپے میرے ہاتھ پر رکھ دے اور نہ ہی میں یہ گوارا کروں گا۔ اس لیے اس نے یہ طریقہ سوچا ہے تاکہ ہماری عزت نفس بھی مجروح نہ ہو اور کچھ مدد

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بھی ہو جائے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ مجھے یہ پیشکش قبول کر لینی چاہیے؟"

"اگر عامر کا مسئلہ حل ہو جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

میں سمجھ گئی کہ وہ حالات سے مجبور ہو کر یہ بات کہہ رہے ہیں۔ اس وقت وہ مجھے ایک شکست خوردہ انسان نظر آئے ورنہ عام حالات میں وہ مجھے کبھی ملازمت کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ حالانکہ فی زمانہ یہ عام بات ہے۔ بہت سے گھروں میں مرد اور عورت دونوں ملازمت کر کے گھر کی گاڑی چلا رہے ہیں۔ اگر میں جاب کر لوں تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہوگی۔

وہ دوسرے روز ہی آ گیا۔ سعید ابھی تک دفتر سے نہیں آئے تھے۔ شاید اس نے جان بوجھ کر ایسے وقت کا انتخاب کیا تھا تاکہ ان کی غیر موجودگی میں مجھ سے کھل کر بات کر سکے۔ میں نے اس کے لیے چائے بنائی۔ ساتھ میں شامی کباب اور چپس بھی تل دیے۔ وہ کھانے کا بہت شوقین تھا اور اسے میرے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اس نے کباب اور چپس پر ہاتھ صاف کیا اور چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔

"بھابی!" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا پھر بولا۔ "اگر برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں۔"

"جی فرمائیں۔"

"بھابی کہتے ہوئے میرے جبڑے دکھنے لگتے ہیں۔ کیا میں تمہارا نام لے سکتا ہوں؟"

میں نے سوچا کہ جب یہ آپ سے تم پر آ گیا ہے تو نام لینے میں کیا حرج ہے۔ لہٰذا میں نے کہا۔ "آپ شوق سے میرا نام لے سکتے ہیں۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "دیکھو شاہانہ، مجھے چند ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا ہے کہ کسی کاروبار کو چلانے میں اپنے لوگوں کا ساتھ بہت ضروری ہے اور اسے ملازمین کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ بدقسمتی سے میرے خاندان میں ایسا کوئی فرد نہیں جو میری مدد کر سکے۔ میں نے سعید سے کہا تھا کہ وہ میرا اسٹور جوائن کر لے لیکن اس نے صاف منع کر دیا۔ غالباً وہ میرے پاس ملازمت کرنا نہیں چاہتا پھر مجھے تمہارا خیال آیا۔ میں نے سعید سے کہا کہ اگر وہ نہیں آنا چاہتا تو تمہیں ملازمت کی اجازت دے دے۔ اس پر سعید نے کہا کہ میں خود تم سے بات کروں۔ اب بولو تم کیا کہتی ہو؟"

"لیکن میں نے تو کبھی جاب نہیں کی۔ مجھے اس کام کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"جب کام کرو گی تو تجربہ ہو گا اور ویسے بھی تمہاری کوئی لمبی چوڑی ڈیوٹی نہیں ہوگی۔ بس دوسرے ملازموں پر نظر رکھنا ہے کہ کہیں کوئی ہڈحرامی یا ہیرا پھیری تو نہیں کر رہا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میرے کچھ گھریلو مسائل بھی ہیں جن میں سرفہرست عامر کو اسکول چھوڑنا اور اسے واپس لانا ہے پھر گھر کے کام بھی کرنا ہوتے ہیں۔"

"گھر کے کاموں کے لیے تم ایک ملازمہ رکھ لو۔ عامر کو لانے اور چھوڑنے کے لیے تم اسٹاف کار استعمال کر سکتی ہو۔ پانچ بجے تمہاری چھٹی ہو جائے گی اور تم اسی گاڑی سے گھر آ جانا۔"

"اگر ملازمہ رکھ لی تو مجھے کیا بچے گا۔ آدھی تنخواہ تو وہ لے جائے گی۔"

"یہ تمہارا خیال ہے۔ میں تمہاری توقع سے زیادہ تنخواہ دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایک شرط پر یہ ملازمت کر سکتی ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"میں پانچ بجے کے بعد ایک منٹ بھی نہیں رکوں گی کیونکہ چھ بجے سعید آ جاتے ہیں اور مجھے ان سے پہلے گھر پہنچنا ہوگا۔"

"مجھے منظور ہے اگر ضرورت ہوئی تو تمہارے بجائے کسی اور کو روک لیا جائے گا۔ بس تم کل سے کام پر آ جاؤ۔ میں گاڑی بھیج دوں گا۔"

"اتنی جلدی کیسے آ سکتی ہوں۔ پہلے ملازمہ کا بندوبست تو ہو جائے۔"

"اوہ ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے تم اپنی سہولت سے آ جانا۔"

شام کو سعید گھر آئے تو میں نے انہیں ظہیر کی آمد اور اس سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا تو وہ ہنستے ہوئے بولے۔ "لگتا ہے اسے بہت جلدی ہے لیکن تم اپنا انتظام کرنے کے بعد ہی جانا ورنہ عامر پریشان ہو جائے گا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

www.paksociety.com

"ظاہر ہے کہ اس کے بغیر تو میں نہیں جاؤں گی۔"

میں نے ملازمہ رکھنے کے بارے میں سوچا تو اس میں کئی مسئلے سامنے آئے۔ پہلی بات تو یہ کہ کوئی بھی ملازمہ سات آٹھ ہزار سے کم میں تیار نہ ہوتی اور اس سے بھی زیادہ اہم مسئلہ یہ تھا کہ میں اپنے گھر اور بچے کو ایک اجنبی عورت کے حوالے کیسے کرسکتی تھی۔ خدانخواستہ اگر میری غیر موجودگی میں وہ بچے کو لے کر چلی گئی یا گھر کا صفایا کردیا تو میں کیا کروں گی۔ گو کہ میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ اس کے باوجود میں نے حجت تمام کرنے کے لیے دو چار عورتوں سے بات کی لیکن کوئی بھی دس ہزار سے کم میں تیار نہیں ہوئی۔ میری اتنی گنجائش نہیں تھی اس وقت تک یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ظہیر مجھے کیا تنخواہ دے گا۔ آیا اس میں سے ملازمہ کا حصہ نکالنے کے بعد مجھے ایک معقول رقم بچ سکے گی یا نہیں۔

اسی شش و پنج میں ایک ہفتہ گزر گیا اور میں ظہیر کا اسٹور جوائن نہ کرسکی۔ آٹھویں روز وہ خود آگیا اور اس نے تاخیر کی وجہ پوچھی تو میں نے اسے اپنے خدشات سے آگاہ کردیا۔ میری بات سن کر وہ بولا "واقعی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ آج کل کسی پر بھی بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ کیا تمہارے یا سعید کے خاندان میں کوئی ایسی بے سہارا خاتون نہیں جنہیں تم اپنے ساتھ رکھ سکو۔"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔ "اور اگر کوئی ہوتی تب بھی میں اسے نہ بلاتی۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ویسے تو ہم کسی کو پوچھتے نہیں اور اپنے مطلب کے لیے ان کے پاس پہنچ جائیں۔"

"تم واقعی بہت صاف اور کھری عورت ہو۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "خیر! میں کچھ سوچتا ہوں۔"

دوسرے دن اس نے اپنے ڈرائیور کی بیوی کو میرے پاس بھیج دیا۔ وہ بے چاری بھی حالات کی ستائی ہوئی تھی۔ اس کے شوہر بشیر کو جو تنخواہ ملتی اس سے گھر کا خرچ پورا نہیں ہوتا تھا۔ ظہیر نے ڈرائیور سے بات کی تو وہ اپنی بیوی کو میرے یہاں چھوڑنے پر تیار ہوگیا۔ مجھے بھی اسے رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ وہ ڈرائیور قابلِ اعتماد شخص تھا اور کئی سالوں سے ظہیر کے یہاں کام کررہا تھا۔ اس طرح یہ مسئلہ بھی حل ہوگیا اور میں ظہیر کے اسٹور جانے لگی۔

وہ بہت بڑا اسٹور تھا جہاں مختلف شعبوں میں بیس پچیس ملازمین کام کررہے تھے۔ سیلز مین اور سیلز گرلز کے علاوہ کیشیئر، اکاؤنٹنٹ، اسٹور کیپر، انونٹری مین، اسٹاک سپروائزر، کمپیوٹر آپریٹر، ڈور مین، سیکیورٹی گارڈز اور نہ جانے کون کون لوگ وہاں ملازمین تھے۔ مجھے اسسٹنٹ مینیجر کا عہدہ دیا گیا۔ مجھے ملازمین کی حاضری کا ریکارڈ دیکھنا، ان کی تنخواہوں اور اوور ٹائم کا حساب بنانا اور دیگر انتظامی امور پر نظر رکھنا تھی۔ ظہیر نے میرے لیے ایک علیحدہ کیبن کا بندوبست کردیا اور کمپیوٹر آپریٹر کی ڈیوٹی لگادی کہ وہ مجھے کمپیوٹر کا استعمال سکھادے۔ وہ خود بھی تقریباً سارا دن ہی اسٹور میں ہوتا تھا۔ اس لیے مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس نے کہہ رکھا تھا کہ اگر کام کے دوران کوئی مشکل پیش آئے تو بلاجھجک اس سے پوچھ سکتی ہوں۔

مہینا پورا ہونے پر تنخواہ ملی تو میں اپنا لفافہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس میں پورے تیس ہزار روپے تھے۔ مجھے یقین نہیں آیا اور میں سمجھی کہ شاید اکاؤنٹنٹ نے غلطی سے کسی اور کا لفافہ مجھے دے دیا ہے۔ میں فوراً ہی اس کے پاس گئی اور پوچھا کہ کہیں اس سے لفافہ دینے میں غلطی تو نہیں ہوئی۔ اس نے فوراً رجسٹر کھول کر دیکھا اور تصدیق کی کہ مجھے صحیح لفافہ ملا ہے۔ مجھے اس پر بھی اطمینان نہیں ہوا۔ میں سیدھی ظہیر کے پاس چلی گئی۔ وہ اس وقت کسی سے فون پر باتیں کررہا تھا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ باتوں میں مصروف ہوگیا۔ اس کی گفتگو کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ باتیں تو کسی اور سے فون پر کررہا تھا لیکن اس دوران اس کی نظریں مسلسل میرے چہرے پر گڑی رہیں۔ خدا خدا کرکے پندرہ منٹ بعد اس کی گفتگو ختم ہوئی تو وہ ایک شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "آج تو تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

"وہ تو میں ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہوں۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اس وقت میں اپنی تعریف سننے نہیں بلکہ ایک اہم معاملے پر بات کرنے آئی ہوں۔"

"ہاں بولو، کیا مسئلہ ہے؟" وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

میں نے تنخواہ والا لفافہ اس کے سامنے رکھا اور بولی۔ "آپ نے میری سیلری تیس ہزار روپے مقرر کی ہے؟"

"کیوں کیا کم ہے؟"

"جی نہیں میری توقع سے بہت زیادہ۔ میں اپنے آپ کو اس تنخواہ کا اہل نہیں سمجھتی۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

''تم اس کی اہل ہو یا نہیں یہ فیصلہ کرنا میرا کام ہے۔ جس پوسٹ پر تم کام کر رہی ہو، اس کی یہی تنخواہ ہے۔''

''کیا میں یقین کرلوں کہ دوست کی بیوی ہونے کی وجہ سے مجھ پر کوئی خصوصی عنایت نہیں ہو رہی۔''

''بالکل نہیں اگر تمہاری جگہ اس پوسٹ پر کسی اور کو رکھا جاتا تو اسے بھی یہی تنخواہ ملتی۔''

خدا جانے وہ سچ کہہ رہا تھا یا نہیں لیکن مجھے اس کا یقین کرنا ہی پڑا۔ میری تو لاٹری نکل آئی تھی۔ اگر پانچ چھ ہزار خادمہ کو دیتی تب بھی میرے پاس اچھی خاصی رقم بچ جاتی۔ آنے جانے کا بھی کوئی خرچ نہیں تھا۔ مجھے اسٹاف کار کی سہولت حاصل تھی۔ دوپہر کے کھانے کے لیے میں گھر سے سینڈوچ بنا کر لے جاتی، دن میں دو مرتبہ چائے کمپنی کی طرف سے ملتی تھی۔ البتہ کپڑوں کا خرچ بڑھ گیا تھا۔ مجھے روزانہ لباس تبدیل کر کے کام پر جانا ہوتا۔ اس لیے فوری طور پر پانچ چھ سوٹ بنوانے پڑ گئے تھے۔

کام کے سلسلے میں مجھے ظہیر سے دن میں دو تین مرتبہ ملنا ہوتا تھا۔ میں جب بھی اس کے کمرے میں جاتی۔ وہ سب سے پہلے میری ڈریسنگ، میک اپ اور جیولری کی تعریف کرتا، اکثر میرے ساتھ ہی چائے پیتا اور پانچ منٹ کی میٹنگ بعض اوقات ایک ایک گھنٹا طول پکڑ جاتی تھی۔ جلد ہی میں نے محسوس کرلیا کہ وہ بہانے بہانے سے روک کر مجھے دیر تک اپنے پاس بٹھانا چاہتا ہے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں تھی۔ اسٹور میں اور بھی لوگ کام کرتے تھے۔ ان کی نظروں سے میری اس کے کمرے میں آمدورفت اور طویل دورانیہ کی ملاقاتیں نہیں چھپ سکتی تھیں۔ اگر کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نکل گیا تو اسکینڈل بنتے دیر نہیں لگے گی۔ یہی سوچ کر میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب زیادہ دیر اس کے پاس نہیں بیٹھوں گی۔

اس روز بھی یہی ہوا۔ اس نے مجھے کسی کام سے اپنے کمرے میں بلایا۔ کام کی بات تو دس منٹ میں ختم ہوگئی۔ میں نے اٹھنا چاہا تو اس نے بے تکلفی سے کہا۔ ''تمہیں آئے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے جو جانے کی جلدی پڑ گئی۔ آرام سے بیٹھو۔ ابھی مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔''

''دیکھیں، اس طرح زیادہ دیر تک بیٹھنا مناسب نہیں۔ اسٹاف کے لوگ کیا سوچیں گے؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اسے میری بات اچھی نہیں لگی ہے۔ تاہم اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''لوگوں کی فکر چھوڑو اگر کسی نے تمہارے بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو اسے ایک منٹ میں کان سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔'' پھر وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''تم اپنی بات کرو کیا تمہیں میرے پاس بیٹھنا اچھا نہیں لگتا؟''

اس سوال کا جواب دینا میرے لیے بہت مشکل تھا اور اس کی ایک نہیں بلکہ کئی وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ میرا محسن تھا۔ اس نے ایسے وقت میں مجھے مالی سپورٹ دی جب میرے لیے گھر کی گاڑی چلانا مشکل ہو رہا تھا۔ عامر کو اسکول چھوڑنے اور واپس لانے کے لیے اسٹاف وین فراہم کی۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے قابلِ اعتماد ملازمہ کا

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ ''باتیں بہار و خزاں کی....'' پیش کیا جارہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کرسکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی ستمبر کا

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہاکر سے بک کروالیں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

بندوبست کیا اور مجھے ہر وہ سہولت دی جو عام حالات میں دوسرے ملازموں کو نہیں ملتی تھی پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ میرے شوہر کا جگری دوست تھا اور وہ اس پر بے حد بھروسا کرتے تھے۔ ایسے شخص سے کس طرح کہہ سکتی تھی کہ مجھے اس کے پاس بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔

اس کے علاوہ اس کی شخصیت میں ایسی کشش تھی جو مجھے اس کی جانب مائل ہونے پر مجبور کر رہی تھی۔ جیسا کہ پہلے بتا چکی ہوں کہ وہ انتہائی خوش شکل، خوش لباس اور خوش مزاج ہونے کے علاوہ بے حد مہذب اور شائستہ اطوار کا مالک تھا۔ اس کے ہر انداز سے رومانویت ٹپکتی تھی اور باتوں باتوں میں وہ ایسا رومانی جملہ کہہ جاتا جس کی مٹھاس مجھے اپنے اندر اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میرے حسن، لباس، میک اپ اور ہر انداز کی تعریف کرنا گویا اس کے فرائض منصبی میں شامل تھا اور یہ ایک فطری بات ہے کہ ہر عورت اپنی تعریف سن کر خوش ہوتی ہے۔ چاہے وہ کسی بھی جانب سے کی جائے اور اگر ظہیر جیسا اسمارٹ اور دولت مند شخص میری تعریف میں رطب اللسان ہو تو میں کیوں نہ اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے خود بھی اس کے پاس بیٹھنے اور اس کی باتیں سننے میں مزہ آنے لگا تھا کیونکہ میں ان لفظوں کے لیے ترسی ہوئی تھی۔ سعید کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی میں کبھی کوئی ایسا لمحہ نہیں آیا جب انہوں نے میرے حسن کی تعریف کی ہو یا کوئی رومانی مکالمہ بولا ہو۔ البتہ جب کبھی میں اپنی پسندیدہ جامنی سلک کی ساڑی پہنتی تو وہ بے اختیار تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ بصورت دیگر وہ انتہائی خشک اور بور قسم کے انسان تھے اور ازدواجی تعلق بھی ایک معمول کا فرض سمجھ کر نباہ رہے تھے۔

بہر حال مجھے اس کے سوال کا جواب تو دینا ہی تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ آپ کے پاس بیٹھنا اچھا نہیں لگتا لیکن یہ کچھ مناسب نہیں ہے۔ میں یہ بھی نہیں بھول سکتی کہ میرے اور آپ کے درمیان مالک اور ملازم کا تعلق ہے اور مجھے اس فرق کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔''

''تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ میرے اور تمہارے درمیان اس سے بھی زیادہ مضبوط تعلق ایک اور بھی ہے اور وہ یہ کہ تم میرے عزیز ترین دوست کی بیوی ہو اور اس حوالے سے مجھے بہت عزیز ہو۔ میں تمہیں ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا ہوں تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ اسی لیے تم سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ جب میں تمہارا اتنا خیال رکھتا ہوں تو کیا تم میری ایک چھوٹی سی خوشی پوری نہیں کر سکتیں؟''

مجھے لگا کہ اس نے مجھ پر جو احسانات کیے تھے۔ ان کی قیمت چکانے کا وقت آ گیا تھا اور یہ پہلی قسط تھی جو مجھے اس کے پاس بیٹھنے کی صورت میں ادا کرنا تھی۔ اس نے بڑے واضح الفاظ میں اشارہ دے دیا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے اور میری قربت کا خواہاں ہے۔ اب یہ فیصلہ مجھے کرنا تھا کہ اس کی حوصلہ افزائی کروں یا اس قصے کو یہیں ختم کر دوں۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ اس کی بات ماننے میں کیا فائدہ اور نہ ماننے میں کیا نقصان ہے تو مجھ پر بہت سی حقیقتیں واضح ہو گئیں۔ اس میں فائدے ہی فائدے تھے۔ نقصان کوئی نہیں۔ مثلاً میری ملازمت برقرار رہتی بلکہ اس میں تیز رفتار ترقی کے امکانات بڑھ جاتے۔ اس کی جانب سے ہونے والی نوازشوں اور عنایتوں میں تیزی آ جاتی اور میں اس کی چاہت بن کر ایک خوش حال زندگی کے مزے لوٹتی رہتی۔ اس کے برعکس اگر اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتی تو وہ ناراض ہو سکتا تھا اور شاید مجھے نوکری سے بھی جواب مل جاتا۔ اس مرحلے پر میں یہ نقصان برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ملازمت میری مجبوری بن چکی تھی اور میں اس سے ہاتھ دھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ ظہیر کو خوش رکھنے میں ہی میرا فائدہ ہے۔ اگر اس کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر باتیں کر لوں گی تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا اور نہ ہی اس میں شوہر سے بے وفائی کا کوئی پہلو نکلتا ہے۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں مطمئن ہو گئی۔ اب میری ہر ممکن کوشش تھی کہ ظہیر کو خوش رکھوں اور اسے شکایت کا کوئی موقع نہ دوں۔ میں نے اپنے آپ پر بھرپور توجہ دینا شروع کر دی۔ اتنے عرصہ میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ظہیر میرے جسم پر کس قسم کا لباس پسند کرتا ہے۔ اسے کس طرح کا میک اپ اچھا لگتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ میں ہر روز اس کی پسند کے مطابق تیار ہو کر گھر سے نکلتی۔ میری تیاری دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی فیشن شو میں شرکت کرنے جا رہی ہوں۔ ظہیر کی دیوانگی بڑھتی جا رہی تھی۔ اب اس نے کبھی کبھی مجھے اپنے ساتھ لنچ پر لے جانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے ہلکا سا احتجاج کیا تو اس نے وہی روایتی جملہ دہرایا۔ ''کیا تم میری

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

چھوٹی سی خوشی بھی پوری نہیں کر سکتیں۔‘‘

ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ آج رات مجھے اس کے ساتھ ڈنر کرنا ہے۔ یہ فرمائش سن کر میں پریشان ہوگئی اور بولی۔ ’’یہ کیسے ممکن ہے۔ میں سعید سے کیا کہوں گی؟‘‘

’’کہہ دینا.... کہ سب لوگوں نے مل کر ایک گیٹ ٹو گیدر پارٹی کا اہتمام کیا ہے اور جب میں تمہیں لینے آؤں گا تو وہ کچھ نہیں کہے گا۔‘‘

’’یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے کبھی سعید سے جھوٹ نہیں بولا۔ آپ مجھے اس کے لیے مجبور نہ کریں۔‘‘

’’صرف ایک بار۔‘‘ وہ التجا آمیز لہجے میں بولا۔ ’’اس کے بعد کبھی ایسی بات نہیں کہوں گا۔‘‘

اس نے جس انداز اور لہجے میں بات کی تھی۔ اس کے بعد میرے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس روز میں نے زندگی میں پہلی بار سعید سے جھوٹ بولا۔ یوں لگا جیسے اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی ہوں حالانکہ سعید نے کچھ نہیں کہا لیکن میں خود اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہی تھی۔

ظہیر کے کہنے پر میں نے اس روز شاکنگ پنک کلر کی ساڑی پہنی جو اس نے چند روز قبل مجھے گفٹ کی تھی۔ ظہیر کی جانب سے تحفے دینے کا سلسلہ بہت پہلے شروع ہو چکا تھا اور وہ وقفے وقفے سے مجھے کچھ نہ کچھ دیتا رہتا تھا۔ کبھی قیمتی سوٹ، کبھی پرفیوم تو کبھی میک اپ کا سامان میں بظاہر اسے منع کرتی لیکن دل ہی دل میں خوش ہوتی رہتی کہ چلو اس طرح میرے پاس اچھی اور قیمتی چیزیں جمع ہو رہی ہیں اور مجھے کچھ بھی خرچ نہیں کرنا پڑ رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے اندر کی قناعت پسند عورت کب کی مر چکی تھی اور اس کی جگہ ایک لالچی خواہشات کی ماری عورت آ گئی تھی۔

ظہیر کی گاڑی کا ہارن سن کر میں باہر جانے لگی تو سعید بولے۔ ’’ذرا جلدی آ جانا۔ مجھے اکیلے گھر میں وحشت ہوتی ہے۔‘‘ ان کی یہ بات سن کر میرا دل جل کر خاک ہو گیا۔ انہیں اپنی وحشت کی تو بہت فکر تھی لیکن اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ میری تعریف میں ایک جملہ ہی کہہ دیتے لیکن یہ کسر ظہیر نے پوری کر دی۔ جیسے ہی میں اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی اس نے اندر کی لائٹ جلائی اور میرے سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ’’چشم بد دور، لگتا ہے کہ کوہ قاف سے کوئی پری زمین پر اتر آئی ہے۔‘‘

ظہیر کی بجائے کوئی اور مرد یہ بات کہتا تو میں اس کا منہ نوچ لیتی لیکن اس کی زبان سے یہ جملہ سن کر میں خوش ہو گئی اور شرماتے ہوئے بولی۔ ’’آپ میری اتنی تعریف نہ کیا کریں کہ میں آپے سے باہر ہو جاؤں۔‘‘

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ’’میں مذاق نہیں کر رہا۔ واقعی تم اس ساڑی میں بہت اچھی لگ رہی ہو۔‘‘

’’اچھا اب دھیان سے گاڑی چلائیں۔ اس سڑک پر کچھ زیادہ ہی ٹریفک ہے۔‘‘ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

اس نے گاڑی ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے پورچ میں روکی۔ جب وہ گاڑی سے باہر آیا تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ سیاہ سوٹ میں وہ بہت شاندار لگ رہا تھا۔ جب ہم دونوں ہوٹل کی لابی میں داخل ہوئے تو کئی نگاہیں ہماری جانب اٹھ گئیں۔ یقیناً لوگ ہمیں میاں بیوی سمجھ رہے ہوں گے۔ اس لمحے دل کے کسی چور خانے سے یہ خواہش ابھری کہ کاش یہ حقیقت ہوتی۔ میں نے فوراً سر جھٹک کر اس نامعقول سوچ کو نکالا اور اس میز کی جانب بڑھ گئی جو ظہیر نے اپنے لیے مخصوص کروائی تھی۔

کینڈل لائٹ کی روشنی میں ڈنر کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایسا رومان پرور ماحول میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ ظہیر کی نظریں مسلسل میرے چہرے اور جسم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مجھے اس کے تیور خطرناک لگ رہے تھے اور ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جسے سننے کا مجھ میں حوصلہ نہ ہو۔ اس لیے جلدی جلدی کھانا ختم کیا اور ظہیر سے کہا۔ ’’اب ہمیں چلنا چاہیے۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔‘‘

’’اتنی پریشانی کس بات کی ہے۔ ابھی تو تم نے آئس کریم بھی ختم نہیں کی۔‘‘

میں نے بادل نخواستہ آئس کریم کا پیالہ اپنی جانب کر لیا تو وہ بولا۔ ’’تم نے پوچھا نہیں کہ میں نے یہ دعوت کس خوشی میں دی ہے؟‘‘

’’مجھے کیا پتا؟‘‘ میں اتراتے ہوئے بولی۔ ’’آپ تو اکثر و بیشتر ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔‘‘

’’لیکن اس سے پہلے کبھی کینڈل لائٹ ڈنر پر نہیں بلایا۔‘‘ وہ شوخ لہجے میں بولا۔

’’چلیں، اب بتا دیں۔‘‘ میں نے ایک ادا سے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’تمہیں تو شاید یاد بھی نہ ہو لیکن میں نہیں بھولا۔ بھی آج تمہاری سالگرہ ہے۔‘‘

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

"اوہ تو۔" میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "لیکن آپ کو میری تاریخ پیدائش کیسے معلوم ہوئی؟"

"آفس ریکارڈ سے ایک دن میں اسٹاف کی پرسنل فائلیں چیک کررہا تھا۔ ان میں تمہاری فائل بھی تھی۔ میں نے غیر ارادی طور پر تمہاری تاریخ پیدائش اپنے پاس نوٹ کرلی اور اسی وقت سوچ لیا کہ سالگرہ پر تمہیں سرپرائز دوں گا۔"

"اوہ میرے خدا، آپ چھوٹی چھوٹی باتوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔"

"یہ چھوٹی بات نہیں ہے شاہانہ بیگم، ہر انسان کی زندگی میں سالگرہ کا دن خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تمہیں یا تمہارے شوہر کو یہ دن یاد نہیں۔"

میں اسے کیا بتاتی کہ ظہیر صاحب، یہ سب بڑے آدمیوں کے چونچلے ہیں۔ ہم لوگوں کو تو زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے سے ہی اتنی مہلت نہیں ملتی کہ اپنی سالگرہ کا دن یاد رکھ سکیں۔ بہرحال میں نے اظہار ممنونیت کے طور پر کہا۔ "بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میری سالگرہ کو اتنی اہمیت دی۔"

"اب یہ رسمی باتیں چھوڑو اور میری طرف سے سالگرہ کی مبارک باد قبول کرو۔" یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا مستطیل نما ڈبہ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ میری طرف سے تمہاری سالگرہ کا تحفہ ہے۔"

میں نے وہ ڈبہ کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک انتہائی خوب صورت جڑاؤ سونے کا بریسلٹ رکھا ہوا تھا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اتنا قیمتی تحفہ وہ یوں دے رہا تھا جیسے کسی بچے کو ٹافی دی جاتی ہے۔ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "یہ...... یہ تو بہت قیمتی ہے۔"

"ہوگا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "لیکن میرے خلوص سے زیادہ قیمتی نہیں۔"

"آپ مجھے مسلسل زیر بار کررہے ہیں۔ میں کس طرح آپ کے احسانوں کا بدلہ چکا سکوں گی۔"

"میں نے کوئی احسان نہیں کیا جو کچھ کررہا ہوں اپنی خوشی کی خاطر اور تمہیں خوش دیکھنے کے لیے۔"

جب میں اپنے گھر کے دروازے پر گاڑی سے اترنے لگی تو اس نے گاڑی کی پچھلی نشست سے ایک بڑا سا شاپر مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔ "اس میں کچھ چیزیں اور بھی ہیں۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ یہ تھیلا اٹھا کر ہوٹل میں جاتا۔"

"یا اللہ! ابھی اور بھی کچھ دینا باقی ہے۔" میں نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ "ابھی یہ تھیلا اپنے پاس ہی رکھیں۔ کل لے لوں گی۔"

اگلے دن میں نے دفتر میں وہ تھیلا کھول کر دیکھا۔ اس میں دو انتہائی قیمتی سوٹ، پرفیوم، کاسمیٹکس کا سامان، ایک گھڑی اور نہ جانے کیا الم غلم بھرا ہوا تھا۔ دس بجے کی چائے پر اس نے حسب معمول مجھے اپنے کیبن میں بلایا تو وہ کچھ الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ "شاہانہ! آج میں تم سے ایک ذاتی مسئلہ شیئر کرنا چاہ رہا ہوں۔ اس امید پر کہ تم میری کچھ مدد کرسکو گی۔"

"بہت بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔" میں سنبھلتے ہوئے بولی۔ "آپ بتائیں کیا مسئلہ ہے۔"

"بات یہ ہے کہ امی بہت بری طرح میرے پیچھے پڑ گئی ہیں، ان کا خیال ہے کہ اب مجھے شادی کرلینا چاہیے۔ بلکہ انہوں نے تو لڑکیاں بھی دیکھنا شروع کردی ہیں اور مجھ سے کہا ہے کہ اگر میری کوئی پسند ہو تو انہیں بتادوں۔"

"پھر اس میں پریشانی والی کیا بات ہے۔ اگر آپ نے کوئی لڑکی پسند کرکھی ہے تو انہیں بتادیں۔"

"کاش یہ اتنا آسان ہوتا۔" وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟ اس میں کیا مشکل ہے؟"

"ایک لڑکی مجھے دل و جان سے زیادہ عزیز ہے۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ "اتنی زیادہ کہ جب بھی شادی کے بارے میں سوچتا ہوں اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا نام زبان پر نہیں لاسکتا اس میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔"

"جذبہ اگر سچا ہو تو تمام رکاوٹیں دور ہوجاتی ہیں۔ آپ ایک بار کوشش کرکے تو دیکھیں۔"

"یہ سب کتابی باتیں ہیں اگر حقیقت بتادی تو تم ابھی اپنے الفاظ واپس لینے پر مجبور ہوجاؤ گی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟"

"جانے دو، یہ بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اتنی آسانی سے حل نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا پھر چند لمحوں بعد

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ ''کاش تم مجھے پہلے مل گئی ہوتیں۔''

میں اپنی جگہ سے اچھل پڑی اور بولی۔ ''میں......! بات آپ کی شادی کی ہورہی ہے۔ میں بیچ میں کہاں سے آگئی؟''

''اس لیے کہ میرے دل اور دماغ میں تمہاری ہی صورت بسی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ میں کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

جس بات کا اندیشہ تھا وہ اس کی زبان پر آ ہی گئی۔ شک تو مجھے پہلے سے ہی تھا لیکن یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے دوست کے گھر میں ہی نقب لگا سکتا ہے۔ اس کی مہربانیاں بے سبب نہیں تھیں۔ وہ اپنی دولت کی جھلک دکھا کر مجھے سعید سے دور کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ میرے ہاتھ پیروں میں سنسنی ہونے لگی۔ جی چاہا کہ اسے کوئی سخت جواب دے کر خاموش کردوں لیکن مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ اس سے کسی دوسرے طریقے سے نمٹا جائے۔ چنانچہ میں بڑے رسان سے بولی۔ ''اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ظہیر صاحب۔ بہت دیر ہوچکی ہے۔ میں آپ کے دوست کی بیوی اور اس کے بچے کی ماں ہوں۔ اس لیے میرا خیال دل سے نکال دیں۔''

''تم اپنی جگہ حق بجانب ہو لیکن میرے مسئلے کا حل صرف تمہارے پاس ہے؟''

''میں بھلا کیا کرسکتی ہوں؟''

''دیکھو شاہانہ! اب میں بہت بڑی بات کہنے والا ہوں۔ ممکن ہے کہ اسے سننے کے بعد تم میرے سر پر پیپر ویٹ دے مارو لیکن زیادہ بہتر صورت یہ ہوگی کہ گھر جا کر میری کہی ہوئی بات پر اچھی طرح غور کرنا اس کے بعد تم جو فیصلہ کروگی وہ مجھے قبول ہوگا لیکن پلیز پہلے میری بات سن لو اور بیچ میں مت بولنا۔''

''کہیے۔'' میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

''اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ تم سعید سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کرلو۔''

''یہ...... یہ آ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' میں غصے میں آکر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''بیٹھ جاؤ، ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی ہے۔'' اس نے بارعب لہجے میں کہا۔

میں بیٹھ گئی تو وہ بولا۔ ''دیکھو شاہانہ، دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے میں نے جب تمہیں پہلی بار سعید کی بیوی کے روپ میں دیکھا تو بہت افسوس ہوا کہ اتنی خوب صورت اور حسین وجمیل لڑکی ایک نکمے اور مفلس شخص کے پلے باندھ دی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ مفلسی اور محرومی تمہارے حسن کو گھن کی طرح کھا رہی ہے اور تم قناعت پسندی کی آڑ میں اپنی خواہشات کا گلا گھونٹنے پر مجبور ہوگئی ہو۔ میرے دل میں تمہارے لیے ہمدردی کی لہر ابھری اور میں نے تمہیں مفلسی کے عذاب سے نکالنے کا فیصلہ کرلیا۔ تم مجھے پہلی ہی نظر میں اچھی لگیں۔ اسی لیے تمہیں اپنے سے قریب کرنے کے لیے ملازمت کی پیشکش کی۔ تمہیں دگنی تنخواہ اور وہ سب مراعات دیں جو کسی اور کو نہیں مل رہی تھیں پھر جیسے جیسے دن گزرتے گئے۔ تم میرے حواس پر چھاتی چلی گئیں اور جب امی نے میری شادی کی بات چھیڑی تو میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ وہاں صرف تم ہی نظر آئیں۔ اس کے علاوہ یہ دل کسی اور کو قبول کرنے پر تیار نہیں اسی لیے مجبور ہوکر اپنے دل کی بات تمہارے سامنے رکھ دی ہے۔''

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ کا دل کیا کہتا ہے۔ اس یک طرفہ محبت کی خاطر میں اپنے شوہر اور بچے کو نہیں چھوڑ سکتی۔''

''دیکھو شاہانہ جذباتی ہونے کی بجائے عقل سے کام لو۔ سعید نے تمہیں کیا دیا اور آئندہ بھی کیا دے سکتا ہے۔ اس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ تم ساری زندگی یونہی گھٹ گھٹ کر مفلسی اور محرومی کے سائے تلے زندگی گزارتی رہوگی۔ یہ ملازمت ایک عارضی سہارا ہے۔ یہ نہ رہی تو ایک بار پھر تمہارا تنگ دستی کا دور شروع ہو جائے گا۔ میری بات مان لو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ انگلینڈ لے جاؤں گا۔ دنیا بھر کا عیش وآرام تمہارے قدموں میں ڈال دوں گا۔ قدرت نے تمہیں ایک سنہری موقع دیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ صرف اپنے بارے میں سوچو شاہانہ، سعید کا کیا ہے اسے کوئی دوسری مل جائے گی۔''

اس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ واقعی یہ ملازمت ایک عارضی سہارا تھی۔ اگر ختم ہو جاتی تو مجھے ایک بار پھر تنگ دستی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ سعید کی محدود تنخواہ میں تو گھر کا خرچ ہی پورا نہیں ہوتا تھا جب کہ میں اس پُرآسائش زندگی کی عادی ہوتی جارہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی باتیں میرے دل میں جگہ بنارہی ہیں میں نے کچھ نرم پڑتے ہوئے کہا۔

''آپ کا کیا خیال ہے۔ سعید مجھے اتنی آسانی سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

طلاق دے دیں گے؟''

''بالکل! ایک بار مرد کو یقین ہو جائے کہ بیوی اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو وہ اس سے الگ ہونے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کرتا اور اگر وہ ٹال مٹول کرے تو تم خلع کا کیس کر دینا۔ مجھے یقین ہے کہ پہلی ہی پیشی پر تمہارے حق میں فیصلہ ہو جائے گا۔''

''اور میرا بیٹا؟'' میں بے چین ہوتے ہوئے بولی۔ ''وہ مجھ سے چھن جائے گا۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''وہ بھی تمہیں مل جائے گا اگر سعید نے شرافت سے نہ دیا تو تم عدالت کے ذریعے اسے اپنی تحویل میں لے سکتی ہو۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ ''ہم نے اس معاملے کے سبھی پہلوؤں پر اچھی طرح بات کر لی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی ابہام باقی نہیں رہا۔ سب کچھ واضح ہے۔ اب صرف تمہیں ہاں یا نہ میں جواب دینا ہے۔ ہاں کہنے میں صرف ایک نقصان ہے کہ تم سعید جیسے خشک، ناکارہ اور مفلس شخص کی رفاقت سے محروم ہو جاؤ گی لیکن اس کے بدلے تمہیں میری بے پناہ محبت اور آسائشوں بھری زندگی مل جائے گی جب کہ نہ کہنے میں سراسر نقصان ہے تمہارے انکار کے بعد میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ سب کچھ سمیٹ کر واپس انگلینڈ چلا جاؤں گا اور تم ساری زندگی دکھوں اور محرومیوں کے سمندر میں غوطے کھاتی رہنا۔''

میں دم بخود بیٹھی اس کی باتیں سن رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اس نے سب کچھ پہلے ہی طے کر لیا تھا اور اب اسے صرف میرا جواب چاہیے تھا۔ اصولاً تو مجھے اسی وقت انکار کر دینا چاہیے تھا۔ چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلتا لیکن میری زبان گنگ ہو گئی اور میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ شاید میرے یقین کی دیوار میں کوئی دراڑ پڑ گئی تھی۔

اس نے میری کیفیت بھانپ لی اور بولا۔ ''جانتا ہوں کہ یہ بہت ہی مشکل فیصلہ ہے اور تمہارے لیے اتنی جلد کسی نتیجے پر پہنچنا آسان نہ ہو گا اس لیے تم ابھی گھر چلی جاؤ۔ کل چھٹی کرنا۔ تمہارے پاس سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے دو دن ہیں۔ میں پرسوں آؤں گا امید ہے کہ تمہارا جواب ہاں میں ہو گا۔''

میں کوئی جواب دیے بغیر اٹھی۔ کیبن میں جا کر اپنا پرس اٹھایا اور گھر چلی آئی۔ خادم میرے جلد آنے پر حیران ہوئی تو میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا دیا۔ اس سے ایک پیالی چائے بنانے کے لیے کہا اور خود صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ ظہیر کی کہی ہوئی باتیں میرے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں۔ اس نے مجھے تصویر کا ایک رخ دکھایا تھا۔ اب مجھے اس کے دوسرے رخ کے بارے میں سوچنا تھا۔ میرے دل اور دماغ میں کشمکش شروع ہو گئی۔ دل کا فیصلہ ظہیر کے حق میں تھا۔ سعید کے ساتھ رہ کر میں نے صرف تکلیفیں اور پریشانیاں ہی اٹھائی تھیں جب کہ ظہیر سے شادی کرنے کے بعد میں ایک پُرآسائش زندگی گزار سکتی تھی۔ وہ سعید سے طلاق دلوانے اور بچے کی کسٹڈی لینے میں میری پوری مدد کرتا اور اپنے ساتھ انگلینڈ لے جاتا۔ اس کے بعد میرے لیے زندگی آسان ہو جاتی۔

لیکن دماغ مجھے دل کی بات ماننے سے روک رہا تھا۔ پہلی دلیل تو یہی تھی کہ شادی ایک ایسا معاہدہ ہے جس میں میاں بیوی ہر حال میں زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد کرتے ہیں۔ اگر اس طرح مفلسی اور غربت سے تنگ آ کر بیویاں طلاق لینے لگیں تو کسی غریب کا گھر باقی نہ رہے۔ دماغ کی دوسری دلیل یہ تھی کہ میں سعید کو کس جرم کی سزا دے رہی ہوں۔ اس لیے کہ وہ غریب ہے لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کل کو وہ امیر اور ظہیر قلاش ہو جائے۔ آپ نہیں جانتے کہ کتاب زندگی کے اگلے صفحے پر کیا لکھا ہوا ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ عامر کا تھا اگر مجھے اس کی کسٹڈی مل جاتی ہے تو کیا میں باپ کی شفقت سے محروم کر کے اس معصوم پر ظلم نہیں کروں گی۔ کیا ظہیر اسے باپ کا پیار دے سکے گا یا عامر اسے باپ کے روپ میں قبول کر پائے گا۔ میرے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

دو دن تک دل اور دماغ میں کشمکش چلتی رہی اور بالآخر میں ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔ ظہیر آیا تو میں نے بالکل نارمل انداز میں اس کا استقبال کیا۔ وہ کچھ بے چین اور مضطرب لگ رہا تھا۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور اس کے لیے چائے بناتے چلی گئی۔ عامر دوسرے کمرے میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں آئی اور بولی۔ ''بیٹا! ماموں کو سلام کرو۔''

یہ سنتے ہی ظہیر کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور چائے پیے بغیر ہی چلا گیا۔ ویسے بھی وہ رک کر کیا کرتا، اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

شیرو

محترم و مکرم مدیر اعلیٰ
سلام تہنیت
آپ کا بہت شکریہ کہ میری تحریروں کو پذیرائی بخشتے ہیں۔ گزشتہ روداد ''بیچ کا آدمی'' کی طرح یہ روداد بھی اپنے اندر سبق لیے ہوئے ہے۔ بقرعید کے حوالے سے یہ روداد زیادہ مزہ دے گی۔ اس لیے پلیز اسے جلد پڑھ کر فیصلہ کرلیں۔ جانور خاص کر قربانی کے جانوروں کے ساتھ کراچی کے شرپسند کیسا سلوک کر رہے ہیں یہی میں نے بیان کیا ہے۔

محمد ظفر حسین
(کراچی)

میں فیس بک پر اسٹیٹس چیک کر رہا تھا، دو دن بعد عیدالضحیٰ تھی تقریباً تمام ہی پوسٹ قربانی کے جانوروں کے متعلق تھیں، لوگوں نے خریدے گئے جانوروں کی دلچسپ تصاویر اور وڈیوز اپ لوڈ کی تھیں جس میں بھگوڑے بیل اور کچھ نٹ کھٹ بچھیا کی کلپ تھیں جس میں مالکان کو بھگا بھگا کر تگنی کا ناچ نچانے کے مناظر تھے۔ تو کسی میں کوئی شریر بکرا گھر کی چھت پر سے چھلانگ لگا کر دوسرے گھر کے چھجے میں لٹکا نظر آرہا تھا۔ صرف ایک اسٹیٹس ذرا الگ انداز کا نظر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

آیا جس میں پولیس کی وردی میں ملبوس ڈاکوؤں نے لوٹ مار کی تھی۔ اس چھینا جھپٹی میں چلائی گئی گولی سے دو افراد زخمی ہوئے تھے۔ اس اسٹیٹس نے مجھے ماضی میں دھکیل دیا۔

☆......☆

تقریباً چار سال پہلے کی بات ہے، ابھی بقرعید آنے میں ڈیڑھ مہینا باقی تھا، منڈی میں جانوروں کی آمد شروع ہونے میں بھی کچھ دن باقی تھے، ہم لوگ اندرونِ سندھ کے شہر سانگھڑ میں اپنے تایا زاد بھائی کی بیٹی کی شادی میں گئے ہوئے تھے۔ گاؤں دیہات میں ایک عام سا رواج ہے کہ گھروں میں مویشی پالتے ہیں جن سے دودھ دہی اور گھی حاصل کرنے کے علاوہ کھیتی باڑی کی ضروریات بھی پوری کرتے ہیں۔ ہم جس گاؤں میں گئے تھے وہاں بھی مختلف گھروں کے ساتھ احاطوں میں مویشی بندھے نظر آرہے تھے، ہمارے میزبان یعنی میرے تایا زاد بھائی جن کا اصل نام تو کچھ اور تھا لیکن ہم سب انہیں پیار سے چاند بھائی کہتے تھے ان کے پڑوس میں ہی ایک صاحب نے چند بکرے، گائے اور بچھڑے پال رکھے تھے، ہمیں پتا چلا کہ وہ صاحب کچھ مالی مشکلات کا شکار ہیں اور اب ان میں سے کچھ جانور فوری طور بیچنا چاہ رہے ہیں، عید کے موقع پر شہر میں جن جانوروں کی قیمت لاکھوں میں ہوتی ہے وہ عام دنوں میں گوشت کے وزن کے حساب سے ہزاروں میں بکتے ہیں، میں نے اپنے میزبان سے فرمائش کر کے ان جانوروں کو ایک نظر دیکھنے کا ارادہ کیا تاکہ اس عید پر جانور خریدتے وقت قیمت کا فرق ذہن میں رہے۔

وہ صاحب اپنے شوق سے مویشی پال رہے تھے، مکان کے پچھواڑے ایک وسیع وعریض احاطے میں انہوں نے وہ جانور رکھے ہوئے تھے، جو کہ بڑے سکون سے وہاں بغیر کسی کھونٹے کے آرام سے بیٹھے جگالی کررہے تھے، ان صاحب نے جیسے ہی انہیں کھڑا کیا تو میں ان جانوروں کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ان میں سے کوئی ایک جانور بھی پانچ ساڑھے پانچ من سے کم کا نہیں تھا، خاص طور پر تو ان میں سے ایک سفید رنگ کا بچھڑا تو اپنے قد کاٹھ اور وزن میں سب سے نمایاں لگ رہا تھا اور ایسی شان سے کھڑا تھا جیسے وہ اس باڑے کا شہنشاہ ہو۔ میرے دونوں لڑکے بارہ سالہ اسد اور دس سالہ فہد بھی میرے ساتھ تھے، اسد کو قربانی کے جانوروں سے اتنا پیار تھا کہ ہر سال اس کی ضد پر آٹھ سے دس دن پہلے ہی ہمیں جانور خرید کر لانا پڑتا تھا اور پورے محلے میں سب سے پہلے ہمارے یہاں ہی قربانی کا جانور آیا کرتا تھا۔ اسد نے جو اس سفید بچھڑے کو دیکھا تو دیکھتے ہی اس پر فدا ہوگیا، فوراً ہی ضد شروع کردی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ خود میرا دل بھی آگیا تھا۔ بس ایک ڈر سا تھا کہ ان کی قیمت ہماری گنجائش سے زیادہ نہ ہو اور پھر دوسرا یہ کہ ابھی عید میں ڈیڑھ مہینے سے زیادہ وقت باقی ہے اس کی دیکھ بھال کون کرے گا۔

دونوں بچے اتنے خوش تھے کہ اس بچھڑے کو منڈی میں آئے جانور کی طرح ٹہلانا چاہتے تھے، وہ بچھڑا وہاں بغیر کسی کھونٹے، رسی اور نکیل کے تھا، بچوں کی بے تابی پر ان صاحب نے بچھڑے کے قریب جا کر اسے پچکارا تو وہ ان کے قریب آکر اپنا سر ان کے کندھے سے رگڑنے لگا، وہ بھی بڑی محبت سے اس کی گردن اور پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہے تھے، بچے اسے ہاتھ لگانا چاہ رہے تھے، مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ وہ بالکل کھلا ہوا تھا کہیں بدک کر ٹکر نہ مار دے۔ میری پریشانی بھانپ کر وہ صاحب بولے۔ ”ارے اس کی فکر نہ کریں۔ یہ بالکل سیدھا سادہ اور معصوم، گھر کا پلا ہوا ہے۔ اسے ہم نے گھر سے باہر دوسرے ڈنگروں کے ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ یہ گھر والوں سے مانوس ہے اسی لیے ہم نے اسے کھلا چھوڑ رکھا ہے، یہ گھر کے بچوں کے ساتھ کھیل کر بڑا ہوا ہے۔ بڑا فرماں بردار ہے۔“

بچوں نے آگے بڑھ کر ڈرتے ڈرتے ہاتھ پھیرا تو وہ فوراً ہی اپنی زبان سے ان کو چاٹنے لگا۔ گویا وہ بھی پیار کا اظہار کررہا تھا۔ دوستانہ طریقے سے استقبال کررہا تھا۔

بچے تھوڑی ہی دیر میں اس سے ایسے فری ہوئے کہ اس کے ساتھ کھیلنا شروع کردیا، نزدیک ہی چارے والی کھرلی تھی اور وہاں پر کچھ ہری گھاس بھی پڑی تھی، انہوں نے گھاس کی لمبی ٹہنیاں لے کر بچھڑے کو کھلائیں، بچھڑا بھی ان کے ساتھ اٹکھیلیاں کررہا تھا، ان کے دائیں بائیں پھر کر ان کے ہاتھوں پیروں پر زبان پھیر رہا تھا، اپنا سر رگڑ رہا تھا۔

”دیکھا آپ نے کیسے بچوں کے ساتھ گھل مل گیا ہے۔“

”پالتو جانوروں میں بڑی حس ہوتی ہے۔“ وہ صاحب بتا رہے تھے۔ ”یہ اتنا حساس اور سمجھدار ہے کہ ایک دن گاؤں میں کہیں سے ایک آوارہ کتا آکر بچوں پر بھونک رہا تھا۔ یہ فوراً دروازے کے سامنے آکر گھر کے بچوں اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کتے کے درمیان آڑ بن گیا اور دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو کر ایسے زور سے ڈکرایا کہ جیسے ابھی اس کتے کو ٹکر رسید کر دے گا، کتے نے بھی جو اس کے ایسے جارحانہ عزائم دیکھے تو دم دبا کر بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔ میں یہ سن کر زیر لب مسکرایا، دل ہی دل میں سوچا کہ ان صاحب نے شاید اپنے بچھڑے کی شان میں کچھ زیادہ ہی قصیدہ گوئی کر دی ہے۔ بہر حال ہر بیوپاری اپنے جانور کی خوبیاں گنواتا ہے۔ ہم نے تو منڈی میں دیکھا ہے کہ نام نہاد مالکان جنہوں نے گھوم پھر کر کئی جگہوں سے مویشی اکٹھے کیے ہوتے ہیں وہ بھی انہیں اپنے گھر کا پلا ہوا کہہ کر اس کی مختلف اضافی خوبیاں بیان کر رہے ہوتے ہیں جو کہ خود انہیں بھی نہیں معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے کچھ بچھیا ایسی بھی ہوتی ہیں جو کچھ عرصہ ہی قبل گابھن ہو چکی ہوتی ہیں۔ پھر بھی وہ انہیں قسمیں کھا کر کلمہ پڑھ کر معصوم کہہ کر بیچ رہے ہوتے ہیں اور عجیب بات تو یہ ہے جن جانوروں کو منڈی میں بچے رسی پکڑ کر ٹہلا رہے ہوتے ہیں گھر پہنچ کر ان بچھیاؤں اور بچھڑوں کے رنگ ڈھنگ ہی بدل جاتے ہیں مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ عنقریب ہی وہ بچھڑا اپنے مالک کے بتائے ہوئے قول پر کیسے پورا اترنے والا ہے۔

کیا وزن ہوگا اس کا اندازاً میں نے آہستگی سے چاند بھائی سے پوچھا لیکن ان صاحب نے میرا سوال سن لیا اور جواباً بول پڑے۔

''یہ تقریباً پانچ من کے آس پاس ہوگا۔'' انہوں نے میرے اندازے سے کچھ کم کر کے بتایا۔ ''ابھی تو اس میں اور بھی وزن کی گنجائش ہے۔'' ان صاحب نے بچھڑے کی کھال پر ہاتھ پھیر کر توجہ دلائی۔ ''اگر اسے پانچ چھ مہینے اور مل جائیں تو یہ چھ ساڑھے چھ من سے کم کا نہیں ہوگا، ابھی دھندا (دو دانت) ہے، مجھے پیسوں کی ضرورت نہ ہوتی تو ابھی مزید اسے اپنے پاس رکھتا پھر چاہے چار دانت کا کر کے بیچنا پڑتا تو بھی منظور تھا۔ وہ محبت سے ہمیں بتا رہے تھے۔ میری خواہش پر ہمارے میزبان نے قیمتوں کے متعلق دریافت کیا تو وہ انتہائی مناسب پیسے لگا رہے تھے، کیونکہ ان صاحب کو پیسوں کی اشد ضرورت تھی یوں بھی گاؤں میں قیمتیں شہر کے حساب سے نہیں لگائی جاتیں، شہر میں آمدورفت کے اخراجات، رہائش، کھانا پینا اور دوسرے کئی مصارف قیمت میں شامل ہوتے ہیں۔

اگر آپ کو جانور پسند آگیا ہے تو قیمت میں مزید کمی بیشی ہو سکتی ہے۔'' میزبان نے مجھے بتایا۔

''ابو لے لیں...!!''

''ابو لے لیں نا...!!''

فہد اور اسد مجھے کہنیوں کے ٹھوکوں سے مسلسل اشارے کر کر کے اور میری قمیص کھینچ کھینچ کر یہی گردان کیے جا رہے تھے۔

''ارے بابا ابھی تو بہت دن باقی ہیں عید میں، پورا مہینا باقی ہے کون اس کو سنبھالے گا؟''

''نہیں ابو ہم سنبھال لیں گے۔'' فہد نے منت کی۔

اگر دیکھ بھال ہی کرتے رہے تو پھر اسکول کون جائے گا؟ میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔'' وہ بچھڑا مجھے بھی بھا گیا تھا، کیا شاندار اٹھان تھی اور کیسا ابھرا ابھرا تھا گول کمر اور بھری ہوئی گردن، بالکل سبی کے بیل کی طرح۔ کیسا لگے گا جب محلے میں اترے گا۔'' میں نے سوچا'' لوگ تو دنگ ہی رہ جائیں گے۔''

پچھلے کئی سالوں سے ایک مقابلہ سا چل نکلا تھا۔ پوری گلی میں ہمارے گھر آنے والے قربانی کے جانور کا سب کو انتظار رہتا تھا، ہماری بھی کوشش یہی ہوتی تھی کہ قربانی کے لیے لائے جانے والا جانور کسی سے کم نہ ہو۔ پچھلے سال کی بات ہے محلے میں ایک نئے صاحب شفٹ ہوئے تھے، افتخار صاحب۔ ماشاءاللہ سے کسی ایسے سرکاری ادارے میں ملازم تھے جہاں تنخواہ کے علاوہ اوپر نیچے، دائیں بائیں ہر طرف سے نوٹ ہی نوٹ برستے تھے، وہ اس عید پر ایسی بچھیا لائے کہ ہر طرف ان کی واہ وا...... ہوگئی، کافی مہنگی اس دودھیا بچھیا کے سامنے ہمارے لائے گئے کالے سفید بچھڑے کا رنگ کچھ ماند سا پڑ گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس دفعہ اگر یہ بچھڑا میں نے لے لیا تو ضرور پوری گلی میں اس کی ٹکر کا کوئی اور جانور نہ ہوگا۔

بظاہر میری یہ سوچ ایک غلط طرز فکر کی عکاسی کر رہی تھی کیونکہ قربانی کے جانور کو مقابلے کا جانور بنا دینا ایک غیر شرعی عمل ہے۔

کوئی بچوں کی خوشی اور اپنے شوق کے لیے قربانی کا اچھے سے اچھا جانور خریدتا ہے اور کوئی اپنی جیب دیکھتا ہے، کوئی دکھاوے کے لیے مہنگا جانور لاتا ہے، لیکن اصل قربانی تو اللہ کے نزدیک حق حلال کی کمائی سے خریدے گئے جانور کی ہوتی ہے۔ اللہ کی رضا کے لیے جس کا نہ تو خون اللہ کو پہنچتا ہے نہ کھال۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اس سے اگلے دن ہم نے کراچی واپس آنا تھا، ان صاحب کے گھر سے واپس آنے کے بعد میں نے چاند بھائی سے مشورہ کرنا مناسب سمجھا، انہیں بھی قیمت انتہائی مناسب لگی، بس وقت سے پہلے اس کی دیکھ بھال کا مرحلہ اٹک رہا تھا، وہ بھی مسئلہ یوں حل ہوا کہ چاند بھائی نے اپنے پڑوسی سے بات کر کے اس کا حل ڈھونڈ لیا۔

اگر یہ بچھڑا آپ کو پسند آگیا ہے تو کوئی بات نہیں، آپ عید سے کچھ دن پہلے اسے یہاں سے لے جائیں، جب تک یہ ہمارے پاس ہی رہے گا۔ ان صاحب نے کشادہ دلی سے ہمیں بتایا۔

''اس کے یہاں رہنے اور کھلائی پلائی سے بھی بے فکر رہیں کیونکہ انہیں ہم نے اپنے شوق سے پالا ہے، چند دن دوسرے جانوروں کے ساتھ اس کی بھی دیکھ بھال کر لیں گے، پھر ایک آسانی یہ بھی ہوگی کہ دس سے پندرہ دن کے بعد باقاعدہ طور پر پورے سندھ اور پنجاب سے جانور کراچی آنا شروع ہو جاتے ہیں لہٰذا کسی بھی آنے والے لوڈنگ ٹرک میں اس کی ٹرانسپورٹیشن بھی بچت کے ساتھ آسانی سے ہو جائے گی۔''

بات مناسب تھی اور یوں ستر ہزار میں اس شاندار بچھڑے کا سودا پکا کر لیا اور ہم خوشی خوشی واپس کراچی آ گئے۔

☆☆......☆☆

ابھی عید میں تقریباً بارہ پندرہ دن باقی تھے کہ بچوں نے بچھڑے کو لانے کی ضد شروع کر دی، میرا پلان تھا کہ کم از کم آٹھ سے دس دن پہلے اسے منگوا لیں گے مگر جب بھی چاند بھائی سے فون پر بات ہوتی تو وہ بچھڑے کی تعریفوں کے پل باندھ دیتے تھے کہ دل اسے دیکھنے کے لیے مچل اٹھتا تھا۔ آخری فون پر انہوں نے بتایا کہ اس ایک مہینے میں اس نے مزید وزن بڑھا لیا ہے۔ آپ لوگ بہت خوش قسمت ہو کہ اتنی مناسب قیمت میں اتنا اچھا جانور مل گیا۔ ان کی باتیں ہمارا اشتیاق بڑھا رہی تھیں پھر بچے بھی ناک میں دم کیے دے رہے تھے کہ اسے جلد لے آئیں، ویسے سچی بات تو یہ تھی کہ مجھے خود بھی یہ احساس تفاخر بڑا بھلا محسوس ہو رہا تھا کہ اس دفعہ گلی میں آنے والا سب سے خوبصورت جانور ہمارا ہوگا۔

ان دنوں واٹس ایپ، فیس بک اور سیلفیز کا کریز اتنا عروج پر نہ تھا کہ جتنا آجکل ہے پھر بھی چاند بھائی کی وساطت سے بچھڑے کی تازہ ترین تصاویر ہم تک فیس بک کے ذریعے پہنچ رہی تھیں۔ واقعی ان کا کہنا سچ تھا، ہر تصویر اور ہر ایک زاویہ سے بچھڑا بہت شاندار لگ رہا تھا، بچوں نے محلے اور دوستوں میں ان تصاویر کی خوب پبلسٹی کر دی تھی بچھڑے کا نام بھی رکھ دیا گیا۔ شیرو اب تو ہر جاننے والا ہم سے اس کے بارے میں یہی پوچھتا رہتا تھا کہ ہاں بھئی کب لا رہے ہو شیرو کو؟

ابھی اسی عالم پس و پیش میں تھے کہ شیرو کو کب لائیں۔ ہوا یوں کہ ہماری گلی میں افتخار صاحب کے گھر منڈی سے رات گئے ایک عدد بچھیا آ گئی۔ یہ قربانی کا پہلا جانور تھا جو اس سال سب سے پہلے گلی میں برآمد ہوا تھا۔ دوسرے دن پوری گلی میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی، بقرعید کی آمد کا افتتاح ہو گیا تھا۔

حسب سابق اس دفعہ بھی انہوں نے اپنی روایت برقرار رکھی تھی اور ایک چھوٹی نسل کی سفید بچھیا لائے تھے جس کی قیمت اس کے وزن سے میچ نہیں ہو رہی تھی کیونکہ بقول افتخار صاحب وہ بچھیا کی گینڈی نسل کی کسی خاص شاخ سے تعلق رکھتی تھی۔ واللہ عالم پورے محلے کے بچے دیوانے ہوئے بچھیا کے اردگرد یوں جمع رہتے جیسے کہ وہ کوئی انوکھی چیز ہو اور اس سے پہلے انہوں نے کبھی اسے دیکھا نہ ہو۔ بچھیا کا آنا قیامت تھا۔ ہمارے بچوں نے بھوک ہڑتال سمیت سول نافرمانی کی تحاریک شروع کر دیں کہ مجھے ان کے سامنے ہتھیار ہی ڈالنے پڑے اور چاند بھائی نے اپنے کسی جاننے والے ٹرانسپورٹر سے جو ان دنوں اسی کام میں لگا ہوا تھا اس کے ٹرک میں ہمارے شیرو کو لوڈ کروا دیا اور ہم ان کی بتائی ہوئی جگہ جا کر اسے اپنے گھر لے آئے۔

ہمارے محلے میں تواتر کے ساتھ کئی سالوں سے یہ معاملہ چل رہا تھا کہ منڈی سے لائے گئے جانور کو پک اپ سے اتارتے ہوئے کوئی نہ کوئی بچھیا یا گائے بدک کر بھاگ کھڑی ہوتی اور پھر ہوتا یوں کہ کئی کئی گھنٹے اور سارا سارا دن پورے محلے کے بچے بڑے اس کا پیچھا کرتے اور وہ کراس کنٹری میراتھن ریس کی پریکٹس کرواتی پائی جاتی، کئی دفعہ تو اس پکڑم پکڑائی میں بچھیا بدک کر مین روڈ پر بہنے نالے میں جا گری، اور پھر اسے کرین کی مدد سے نکالا گیا، متعدد بار ہونے والے اس حادثے سے بچنے کے لیے محلہ کمیٹی نے طے کر لیا تھا کہ جب بھی کوئی جانور اتارا جائے گا اس سے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پہلے اپارٹمنٹس کے خارجی گیٹس کو احتیاطاً بند کرلیا جائے تاکہ اگر جانور بھاگا بھی تو وہ اپنی گلی کے اندر ہی رہے اور بعد میں اسے قابو کرنے کے لیے آسانی رہے۔

اس کے علاوہ اس سال سے ایک اور خرابی یہ سامنے آئی تھی۔ کئی علاقوں سے قربانی کے جانوروں کے چوری ہونے اور چھین کر لے جانے کے واقعات کی خبریں تواتر سے سننے کو مل رہی تھیں۔

ان دنوں یوں بھی امن و امان کی صورت حال کافی ابتر نظر آرہی تھی۔ انتظامیہ دعوے تو کر رہی تھی مگر صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی اور اس پر مستزاد کہ ابھی قربانی کا جانور آیا بھی نہیں کہ اس کی پرچیاں پہلے پہنچ رہی تھیں۔ مختلف علاقوں میں جرائم پیشہ افراد بڑی دیدہ دلیری سے وارداتیں تو کر ہی رہے تھے اس دفعہ ایک نئی علت شروع ہوئی کہ کھال تو الگ رہی اب تو قربانی کے جانور پر بھی بھتہ وصول کیا جانے لگا۔

کچھ جگہوں پر لوگوں نے اس کا یہ حل نکالا کہ اپنے علاقے میں محلّے کے تمام قربانی کے جانور اکٹھے ایک جگہ ٹینٹ لگا کر باندھ دیے جائیں اور رات کو محلے کے لڑکے وہاں پہرا دیں۔ جس کا جانور بندھتا وہ روزانہ کے حساب سے کچھ پیسے ادا کرتا اور بے فکر ہو جاتا، بس دن میں دو دفعہ آکر اپنے قربانی کے جانور کو چارا کھلانا پڑتا۔

☆......☆

جیسے ہی لوڈنگ پک اپ شیرو کو لے کر گلی میں داخل ہوئی، بیتابی سے انتظار کرتے بچوں نے زوردار آوازوں کے ساتھ شور مچا کر استقبال کیا۔ یہ ہماری گلی کے بچوں کا وہ مخصوص اسٹائل تھا جو کہ گلی میں آنے والے ہر قربانی کے جانور کی آمد پر نظر آتا تھا۔ بچے اتنا شور مچاتے تھے کہ بس اللہ کی پناہ ماضی میں بھی کئی جانور بچوں کے شور سے گھبرا کر بدک گئے تھے۔ بہرحال بچوں کا شور تھما تو ہم نے شیرو کو اتارا۔ فی الحال ابھی شیرو کو سامنے بجلی کے پول سے باندھا تھا۔ اس کے باندھتے ہی بچوں نے شیرو، شیرو، شیرو کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔

شیرو کچھ گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا مگر اس نے اب تک بڑی ہی فرماں برداری کا مظاہرہ کیا تھا اور بڑے آرام سے بغیر او دھم کے پہنچ گیا تھا مگر مجھے لگ رہا تھا کہ بچوں کے اس شور میں وہ جلد ہی گھبرا کر اپنی جبلت کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور تنگ کرے گا۔ وہ گھر کا پلا ہوا تو تھا مگر اپنے پرانے مالک سے ہلا ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ اسے کچھ دن کے بعد ہی سیٹ ہونا تھا۔

میں تو تھکا ہوا تھا، شیرو کو بچوں کے سپرد کر کے خود کچھ دیر آرام کرنے کی نیت سے گھر آ گیا۔ ویسے بھی مجھے پتا تھا کہ محلے کے بچے رضا کارانہ طور پر خود ہی شیرو کا خیال رکھیں گے، شیرو کے لیے آج دن میں ہی آفس سے آتے ہوئے مین روڈ پر عارضی بنی ہوئی چارے کی دکان سے مختلف اقسام کا چارا وافر مقدار میں لے آیا تھا جو کہ دو تین دن کے لیے کافی تھا۔ میں تھکا ہوا تو تھا کھانا کھا کر کمر سیدھی کرنے لیٹا تو بس نیند ہی آ گئی اور پھر گھر والوں نے بھی مجھے آرام کرنے دیا۔

تقریباً رات بارہ بجے میری آنکھ کھلی۔ میں نے ٹائم دیکھا، مجھے شیرو کا خیال آیا۔ ہماری گلی میں قربانی کے جانور آتے ہی بچوں کے ہاتھ ایک تفریح ہاتھ آجاتی ہے۔ وہ ان قربانی کے جانوروں کے گرد ایسے جمع رہتے ہیں جیسے شیرے کے گرد مکھیاں، دن رات کا فرق مٹ جاتا ہے، پاورفل ٹینگر لائٹس لگ جاتی ہیں اور پھر رات میں بھی دن کا سماں بنا رہتا ہے۔ یہاں شیرو تو نہیں فی الوقت شیرو گلی میں آچکا تھا اور اس وقت بھی بچے شیرو کے ارد گرد جمگھٹا بنا کر کھڑے تھے اور ہٹنے کا نام نہیں لے رہے تھے، ابھی تک شیرو کو آرام سے بیٹھنے نہیں دیا تھا، کوئی نہ کوئی آکر اسے زبردستی ہری گھاس کھلانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ کوئی اس کے آگے پانی کی بالٹی بھر بھر کر رکھے جا رہا تھا۔ شیرو مسلسل کھمبے کے گرد چکر کاٹ رہا تھا، وہ بے چین نظر آرہا تھا، کئی گھنٹے بیت چکے تھے، اسے بیٹھ کر آرام سے جگالی کرنے کا موقع نہیں مل پایا تھا، ویسے بھی نئی جگہ جا کر جانور فوراً ہی نہیں بیٹھتے ہیں، شیرو بھی کھمبے کے گرد گول گول گھومتے ہوئے اچانک رک کر زمین کو سونگھتا کچھ دیر دائیں بائیں دیکھتا اور پھر دوبارہ گھومنا شروع کر دیتا۔

آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی، شیرو ابھی تک بیٹھا نہیں تھا، محلے کے بچے ایک ایک کر کے کھسک گئے تھے، صبح اسکول کی چھٹی نہیں تھی۔ گھر والوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر انہیں واپس گھر بلوالیا تھا، میں نے کافی نیند پوری کر لی تھی اس لیے کرسی ڈال کر شیرو کے سامنے بیٹھ گیا۔ میری نظر چارے والی چھڑے کی ٹوکری پر گئی، اس میں مکس چارا ویسے کا ویسا ہی رکھا ہوا تھا، میں نے شیرو پر نظر ڈالی اس کا پیٹ اندر نہیں تھا، وہ ماشاء اللہ ویسے ہی بہت شاندار اٹھان کا فربہ جانور تھا، بظاہر اگر دو دن بھی چارا نہ ملے تو اس کی جسامت

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پر کوئی اثر پڑنے والا نہ تھا۔ جیسا کہ اکثر منڈی میں مویشیوں کو اتنا پانی پلادیا جاتا ہے کہ گھر آنے تک یا دوسرے دن ان کا پیٹ اندر ہوجانے سے قربانی کا جانور وزن میں کم لگنے لگتا ہے۔

مجھے تقریباً لگ بھگ گھنٹا بیت چکا تھا، شیرو کا ارادہ ابھی بیٹھنے کا نظر نہیں آرہا تھا، وہ اردگرد کی فضا کو گردن اٹھا کر سونگھتا، چارے والی ٹوکری کے پاس جا کر اپنی زبان اس پر پھیرتا اور پھر رک جاتا۔ وہ رک کر دائیں بائیں دیکھتا اور پھر کھڑا ہو جاتا اور مجھے دیکھنا شروع کر دیتا۔ کافی دیر سے میں اس کا یہ انداز نوٹ کر رہا تھا، مجھے اندازہ ہوا کہ ہوسکتا ہے یہ بھوکا ہے مگر کیا وجہ ہے کہ چارے کے پاس جا کر رک جاتا ہے، ابھی اسی مسئلے پر غور کر رہا تھا، گھر کا دروازے کھلنے کی آواز آئی اور اماں جی نے مجھے آواز دے کر پوچھا۔ بیٹا کیا صبح دفتر نہیں جاؤ گے، کب تک بیٹھے رہو گے، چلو اندر آکر آرام کرو، گلی میں چوکیدار ہے باقی اللہ مالک ہے۔

اماں جی بالکل اسی طرح مجھے بلا رہی تھیں جس طرح گلی کے بچوں کو ان کے والدین دیر تک باہر بیٹھنے پر آواز دے کر بلا لیتے ہیں۔

”اچھا اماں جی، بس آرہا ہوں، دراصل یہ شیرو ابھی تک بیٹھا نہیں ہے۔ یہ بیٹھ جائے تو میں اندر آتا ہوں۔“ میں نے سعادت مندی سے کہا۔

”ارے بیٹھے گا کیسے،، ابھی تک بھوکا جو ہے، جب تک کچھ پیٹ میں جائے گا نہیں یہ نہیں بیٹھے گا اور ویسے بھی یہ فرش یا سڑک پر بیٹھنے والے جانور نہیں ہیں، نرم زمین پر مٹی پر بیٹھنے کے عادی ہیں، فرش کی سختی سے مانوس نہیں۔“ اماں جی نے تجربے کی بات کہی۔

جانوروں میں بلا کی حس ہوتی ہے،، اماں جی کی آواز سن کر شیرو کے کان کھڑے ہوگئے، میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ گردن اٹھا کر باقاعدہ انہیں دیکھ رہا تھا، اس کے کان ان کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

”ارے اماں جی واہ، دیکھیں تو یہ آپ کی بات بڑے غور سے سن رہا ہے۔“ میں نے اماں جی کی توجہ اس طرف دلائی۔

اماں جی دروازے کی اوٹ سے باتیں کر رہی تھیں، میری توجہ دلانے پر وہ تھوڑا آگے کو نکل کر شیرو کے پاس آگئیں، شیرو نے انہیں اپنے پاس دیکھ کر ہنکارہ بھرا اور اپنا سر ان کے قدموں کے پاس لے آیا۔

میں جلدی سے اٹھ کر ان کے پاس آگیا کہ کہیں وہ ان کو نقصان نہ پہنچا دے اماں بولیں۔ ”ارے بیٹا یہ تو واقعی گھر کا پلا ہوا جانور ہے، بڑی محبت والا لگتا ہے، جس نے بھی اسے پالا ہے گھر والوں سے محبت بھی سکھا دی ہے۔ اسے یقیناً اپنے مالکوں کے ہاتھ سے کھانے کی عادت ہوگی۔ آؤ چلو اسے اپنے ہاتھ سے چارا کھلاتے ہیں،، اماں جی نے مجھے کہا تو میں نے چارے کی ٹوکری کھینچ کر اس کے سامنے رکھ دی۔

شیرو نے سر گھما کر چارے کی ٹوکری کو دیکھا، ٹوکری کو سونگھا پھر اپنی زبان پھیر کر چارے کو چاٹنے لگا، میں نے اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو اس بار اس نے چارا کھانا شروع کر دیا، کھاتے کھاتے وہ ایک لمحہ کو رک کر باری باری اماں جی کو اور مجھے دیکھا اور پھر ہم اسے پیار سے پچکار کر دوبارہ چارا کھانے پر آمادہ کر لیتے، وہ بہت بھوکا معلوم ہوتا تھا ہمارے وہاں ساتھ کھڑے رہنے اور پچکارنے پر منٹوں میں اس نے وہ چارے کی ٹوکری ختم کر ڈالی۔

میں نے ایک اور ٹوکری میں کٹی ہوئی ہری گھاس جسے کٹی بھی کہتے ہیں اسے ڈال کر دی اور وہ اسے بھی چٹ کر گیا، رات کافی ہو چلی تھی، اماں جی سونے کا کہہ چکی تھیں، شیرو کے سر پر ہاتھ پھیر کر جب اماں جی جا رہی تھیں شیرو ایک دم سے رک سا گیا۔ گردن اٹھا کر اس وقت تک اماں جی کو اندر جاتے دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوگئیں۔ میں نے اس کا دھیان اپنی طرف بٹایا تو اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رگڑنا شروع کر دیا، کچھ دیر بعد میں نے شیرو کو پانی پلایا اور تھوڑی دیر اس کے گردن اور کمر پر ہاتھ پھیرا تو اس نے میرے ہاتھ پیروں کو چاٹنا شروع کر دیا، وہ اپنا سر میرے کندھوں اور پیروں پر رگڑ کر اپنی اپنائیت کا اظہار کر رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ جب پہلی دفعہ ہم اسے دیکھنے گئے تھے تو وہ اسی طرح بچوں سے اپنی محبت کا اظہار کر رہا تھا،، وہ اپنے پرانے مالک سے جدا ہوا تھا، ایک تو اس کا غم تھا اور پھر سفر نے اسے تھکا دیا تھا اس لیے کچھ کھا پی نہیں رہا تھا، اور ویسے بھی ہم نے اسے لا کر ایک اجنبی جگہ پر باندھ دیا تھا، جیسے ہی اماں جی کی آواز سنی تو اسے اپنے مالکوں کی اپنائیت کا احساس محسوس ہوا اور پھر اس نے ہمارے ہاتھ سے چارا کھایا تو کچھ سکون آیا، پیٹ بھرا تو مجھے بھی کچھ محسوس ہوا کہ اب وہ بیٹھا کہ تب، اور واقعی پھر یہی ہوا، شیرو نے کھمبے کے گرد گھوم کر دو تین چکر لگائے اور رک

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کرز مین میں نجانے کیا سوگھتا رہا اور پھر ہچکچاتے ہوئے اپنے اگلے دونوں پیر کوز مین پر تین چار بار موڑ کر بیٹھنے کا ارادہ کیا مگر پھر ٹانگیں سیدھی کرلیں چند ایک دفعہ اسی طرح کرتے کرتے وہ جھجکا اور بالآخر اپنی ٹانگیں موڑ کر زمین پر بیٹھ ہی گیا۔

اس کے بیٹھتے ہی میں نے بھی ٹھنڈی سانس لی، جاتے جاتے شیرو کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا، گلی کے چوکیدار کو شیرو سے متعلق کچھ ہدایات دیں اور گھر آ گیا، گھر کے دروازے پر اندر جانے سے پہلے میں نے مڑ کر دیکھا، شیرو گردن اٹھائے مجھے اندر جاتا دیکھ رہا تھا، مجھے اس کی نگاہوں سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مجھے ہی دیکھ رہا ہے بالکل اسی طرح جس طرح وہ اماں جی کو جاتا ہوا دیکھ رہا تھا، مجھے واضح طور پر اس کی آنکھوں میں اپنے لیے اپنائیت نظر آ رہی تھی، انسان ہو یا جانور دونوں ہی قدرتی طور پر فطرت کے مختلف انداز یعنی ڈر، غصہ، خوف اور محبت کے احساس کو فوراً محسوس کر لیتے ہیں۔ پیار اور محبت بھی ایک فطری کنکشن ہوتا ہے، شیرو کی آنکھیں یہی پیغام دے رہی تھیں۔ مجھے لگا کہ شیرو نے نئے حالات کے مطابق بطور نیا مالک مجھے قبول کر لیا ہے۔ مجھ پر بھروسا کر لیا ہے۔ میں مطمئن ہو کر گھر کے اندر آ گیا، صبح دفتر بھی جانا تھا۔

☆......☆

شام کو دفتر سے لوٹا تو دیکھا کہ شیرو کو گھر کے عین سامنے ایک عدد کھونٹا گاڑ کر باندھ دیا گیا تھا، اماں جی نے بتایا کہ انہوں نے محلے میں پھول گملے بیچنے والے سے کہہ کر بالو مٹی منگوا کر ڈلوادی تھی، گھر میں ایک بڑی سے چادر تھی جسے اوپر باندھ کر چھپر سا بنا دیا تھا تاکہ دن کی گرمی اور سورج کی تمازت سے شیرو محفوظ رہے۔ شیرو آرام سے بیٹھا جگالی کر رہا تھا، محلے کے بچے اس کے اردگرد جمع تھے۔ وہ اس سے اتنے فری ہو گئے تھے کہ اس سے بالکل لگ کر بیٹھے ہوئے تھے جیسے کہ وہ کوئی بچھڑا نہیں چھوٹا سا بکری کا بچہ ہو۔ شیرو کی دوستی سب سے پکی ہو گئی تھی۔

اگلے دو دن بعد گلی میں مزید قربانی کے جانور آنے شروع ہو گئے تو عید کی تیاریوں کا باقاعدہ آغاز اور رونقوں کا سلسلہ چل نکلا۔

ایک کے بعد ایک قربانی کا جانور روزانہ اترتا، جانوروں کو سجانے، سنوارنے اور مقابلے کا ایک سلسلہ سا شروع ہو چکا تھا۔

افتخار صاحب کی بچھیا کے ناز نخرے سب سے الگ تھے، اسے سجانے سنوارنے میں انہوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، گھر میں بچوں نے بھی میری جان کھالی تھی کہ وہ بھی شیرو کے سجانے کے لیے آرائشی اشیاء خریدیں گے۔

ویسے تو ہمارے شیرو کو کسی نمائشی چیزوں کی ضرورت بھی نہیں تھی مگر پھر بھی آج کل ایسا ٹرینڈ بنتا جا رہا ہے کہ قربانی کا جذبہ اپنی جگہ مگر حد سے زیادہ نمود ونمائش بھی ضروری ہوتی جا رہی ہے، مجھے پتا تھا کہ اماں جی اس بات کو سخت ناپسند کریں گی کہ ہم نے قربانی کے معاملے میں کوئی فضول خرچی دکھائیں، وہ ہمیشہ سے ہم کو سادگی کا درس دیتی آئی تھیں، اور اس معاملے میں تو بہت زیادہ اصول پسندی کا مظاہرہ کرتی تھیں۔

میں نے کبھی جان بوجھ کر تو یہ نہیں سوچا تھا کہ قربانی کے معاملے میں شان وشوکت اور رتبے کا مظاہرہ کریں مگر حقیقت یہی ہے۔ پچھلے سال سے افتخار صاحب کی آنے والی بچھیا نے مقابلے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی، اور اس پر ان کی لن ترانیاں سننے کی ہوتی تھیں۔ بقول ان کے وہ جانور کے وزن سے زیادہ اس کے رنگ، خوبصورتی اور ظاہری شان وشوکت کے قائل نظر آ رہے تھے۔ خوبصورتی اور معیار پر قیمت کو اہمیت نہیں دیتے تھے، وہ اپنی لائی ہوئی اس بچھیا کی جو قیمت بتا رہے تھے اس میں درمیانے درجے کی دو بچھیا آسکتی تھیں۔ قربانی کے جانور میں صرف اس کی خوبصورتی ہی نہیں بلکہ اس کا وزن اور تندرستی بھی دیکھی جاتی ہے تاکہ اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ غریب اور مستحق لوگوں تک اس کا گوشت پہنچ جائے، وہ بیچارے جن کی رسائی پورا سال مہنگائی کی وجہ سے گوشت خریدنے کی نہیں ہوتی وہ بھی دل بھر کے اس موقع پر قربانی کا گوشت کھالیں تو اس قربانی کا مفہوم ادا ہوتا ہے۔

آج شام کو دفتر سے واپسی پر راستے میں شیرو کے لیے چارا لیتے ہوئے برابر والی دکان میں جانوروں کے آرائشی زیورات اور سجاوٹی اشیاء پر نظر پڑی، رنگین جھالریں، موتی پروئے جگمگاتے نگینوں سے سجے گلوبند، سنہرے روپہلے گھنٹیوں والے ہار، پاؤں میں پہننے والی جھانجریں اور زرق برق رنگ برنگی کلغی والا تاج دیکھا تو مجھے شیرو کا خیال آیا، شیرو جیسے خوبصورت اور فربہ قربانی کے جانور کے لیے اگر ان میں سے کچھ لے لیا جائے تو اس کی شان ہی دوبالا ہو جائے گی۔ افتخار صاحب کی وہ چھوٹی سی

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

www.paksociety.com

چھوٹی موٹی بچھیا کی چمک دمک تو بالکل ہی ماند پڑ جائے گی۔ میں نے دل ہی دل میں تقابل کیا، انسان فطرتاً بے صبرہ اور ناشکرا ہے۔ گو کہ ہمیں اس سال اللہ کی طرف سے اتنے اچھے قربانی کے جانور کا تحفہ ملا تھا، ورنہ ہماری تو ہمت ہی نہیں تھی کہ اتنی بھاری جسامت کا فربہ جانور خرید لاتے اور جس حساب سے اس دفعہ منڈی چڑھی تھی اس طرح کا بچھڑا پورے لاکھ اور سوا لاکھ سے کم کا نہیں تھا، بجائے اللہ کے شکر کرنے کے میں مقابلے کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔ نہ نہ کرتے کرتے بھی میں نے ایک تاج، گلوبند اور جھانجھریں خرید لیں۔

اماں جی نے ناراضگی کا اظہار تو نہیں کیا مگر منہ سے کچھ بولیں نہیں کیونکہ اب لے جو آیا تھا، بچوں کی خوشی کا عالم دیدنی تھا، طے یہ پایا کہ کل جمعہ کے دن شیرو کو نہلا دھلا کر سجا سنوار دیں گے۔ بچے بہت بے صبرے سے ہو رہے تھے۔ پوری رات بار بار ساری چیزوں کو نکال نکال کر دیکھ رہے تھے کہ کب صبح ہو اور وہ شیرو کو تیار کر سکیں۔

اگلی صبح ہم نے اسے شیمپو لگا کر نہلایا، شیرو بڑے مزے سے نہایا، وہ بہت خوش لگ رہا تھا، اسے برش سے رگڑا تو اسے بہت مزا آیا۔ نہانے کے بعد گلی کے کونے میں نیم کے درخت کے سائے میں ہلکی سی دھوپ میں خشک ہونے کے لیے کچھ دیر کھڑا کر دیا، تھوڑی دیر میں جب پانی خشک ہوا تو میرا دل چاہا کہ اس کی فوراً نظر اتار لوں، نہلانے کے بعد اس کی چمک دار کھال، خوب بھرا ہوا جسم اور ابھرے ہوئے پٹھے یوں نمایاں ہو گئے تھے جیسے کوئی باڈی بلڈر پہلوان اپنے بدن پر تیل کی مالش کر کے اکھاڑے میں کسرت کے لیے آیا ہو۔ اس کی جسمانی ساخت کسی ہیوی ویٹ پہلوان کے ہم پلہ ہی تھی۔ وہ واقعی بہت شاندار بچھڑا تھا، اب تک لائے گئے ہمارے سارے قربانی کے جانوروں میں سب سے بہترین اور عمدہ۔

اور پھر رہی سہی کسر ان زیورات اور سجاوٹی اشیاء نے پوری کر دیں، پوری گلی میں اور کوئی قربانی کا جانور اس کے مقابلے کا نہیں تھا، شیرو نام کا ہی نہیں حقیقت میں شیر جیسا شاندار نظر آ رہا تھا۔ اس دن شام اور رات بھر شیرو کا ہی تذکرہ پورے محلے میں چلتا رہا، اور جب شام کو بچے محلے کے تمام جانور لے کر انہیں ٹہلانے کے لیے نکلے تو آس پاس اور نزدیک کی گلی محلے میں بھی اس کا چرچا ہو گیا۔ دیکھنے والے اسے دیکھنے آتے رہے، سارا دن بچے بڑے اپنے موبائل میں بڑے شوق سے شیرو کی پکچر لیتے رہے اور وڈیو بناتے رہے۔

شیرو پورے محلے کے بچوں کی آنکھ کا تارا بن چکا تھا، بچے بلا جھجک اس کے آس پاس بلا خوف جمع رہتے، شیرو کے پاس یوں بیٹھے ہوتے جیسے وہ ان کا کوئی دوست ہے، کوئی اس کی گردن پر ہاتھ پھیر رہا ہوتا، تو کوئی اس کی کمر سہلا رہا ہوتا، شیرو ایک عجیب حرکت کرتا، وہ اپنی چاروں ٹانگیں سیدھی کر کے آرام سے لیٹ جاتا، اور بچے اس کے اوپر لدے ہوئے ہوتے۔ مجال ہے کہ اس نے کبھی کسی کو نقصان پہنچایا، میرے دل سے اس کے مالک کے لیے دعا نکلتی، اس نے شیرو کو بالکل گھر کے فرد کی طرح محبت سے پالا تھا، شیرو صحیح معنوں میں ایک پالتو گھریلو بے ضرر بچھڑا تھا۔

☆......☆

عید سے دو دن قبل کی بات ہے۔ مجھے بازار میں کچھ ضروری کام تھے، ان کاموں کو نمٹاتے نمٹاتے شام ہو گئی۔ راستے میں مغرب کی نماز ادا کی اور جب گھر پہنچا تو گلی میں سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ شام کے وقت گلی کے بچے قربانی کے جانوروں کو گھمانے لے جاتے تھے، شیرو بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا، آج گھر میں بڑی آپا آئی ہوئی تھیں ان کے بچے زین اور حارث میرے دونوں لڑکوں فہد اور اسد کے ہم عمر تھے۔ پتا چلا کہ وہ سب مل کر شیرو کو گھمانے لے گئے ہیں۔ میں عشاء کی نماز پڑھ کر آیا تو گلی میں قربانی کے تمام جانوروں کی اکثریت واپس آ چکی تھی، میں نے دیکھا کہ شیرو اپنی جگہ نہیں تھا، گویا بچے ابھی تک واپس نہیں لوٹے تھے، اماں جی دروازے پر کھڑی فکر مندی سے ان کا انتظار کر رہی تھیں، میں نے گلی کے بچوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ اسد اور فہد شیرو کو لے کر چورنگی والے روڈ کی طرف نکل گئے ہیں۔ اصل میں بچوں کا ایک روزانہ کا مخصوص روٹ تھا۔ گلی سے نکل کر کھیل کے گراؤنڈ اور پھر وہاں سے مارکیٹ اور مختلف فلیٹوں کے درمیان ہوتے ہوئے واپس اپنے محلے میں آ جایا کرتے، یہ جو چورنگی سے آگے والا روڈ تھا یہ کافی کشادہ مگر نسبتاً ویران علاقہ تھا، ابھی کچھ زیر تعمیر پلازہ اور نزدیک ہی ایک کچی آبادی تھی، ہم لوگ ایک دفعہ دن میں شیرو کو لے کر یہاں آ چکے تھے، یہاں پر خودرو جھاڑیوں اور درختوں کے بیچ ٹوٹی ہوئی پانی کی پائپ لائن سے رسنے والے پانی کے نتیجے میں بڑی بڑی گھاس اور خودرو بوٹیوں کی بہتات ہو گئی تھی، شیرو یہاں آ کر بہت خوش نظر آیا تھا، اسے یہاں پر

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اپنے گاؤں کا ماحول نظر آیا تھا۔ اس نے بڑے مزے سے ہری بھری گھاس چری تھی اور درختوں سے اپنی کمر، کھر اور سینگ رگڑ تا رہا تھا، چورنگی سے آگے گندے نالے پر بنی پلیا تھی وہاں سے یہ روڈ آگے نکل کر شہر کے مختلف دور دراز علاقوں سے بذریعہ ایکسپریس وے اور مختلف بائی پاس کے ذریعے مل جاتا تھا اور مویشی منڈی کو بھی یہاں سے ایک راستہ جاتا تھا۔ مگر رات کا سناٹا چھا جاتے ہی اس علاقے میں اکثر و بیشتر وارداتیں ہوا کرتی تھیں اور لوگ بلا وجہ اس طرف آنے سے گریز کیا کرتے تھے۔

میں نے فوراً اپنی بائیک نکالی اور انہیں ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا، میں اِدھر اُدھر جانے کے بجائے ٹھیک اسی راستے کی طرف تھا جہاں محلے کے بچوں نے مجھے بتایا تھا، عید نزدیک تھی اور چورنگی سے پہلے روڈ کراس کرتے مجھے کئی لوڈنگ پک اپس نظر آئیں جن میں قربانی کے جانور لائے جارہے تھے مگر چورنگی کراس کرتے ہی متعلقہ سڑک پر اچانک فضا بدل سی گئی، اِکا دُکا جلتی ہوئی اسٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی میں ماحول میں عجیب سی یاسیت سی رچی ہوئی تھی تھوڑی اور دور بائیک چلی ہوگی کہ پلیا کراس کرتے ہی سامنے سے ہنستے بولتے شور مچاتے بچوں کے ساتھ شیرو کو آتے دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ میں نے بائیک ان کے سامنے جا کر روکی تو وہ سب ہی رک گئے، شیرو نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور میرے پچکارنے پر فوراً ہی میرے قریب آگیا، میں نے جوں ہی اس کی گردن سہلائی تو اس نے مجھے اپنی زبان سے چاٹنا شروع کردیا۔ شیرو کا موڈ بہت اچھا نظر آرہا تھا، میں بچوں کو ڈانٹنے کے ارادے سے آیا تھا مگر اب شیرو کو خوش دیکھ کر میرا غصہ ٹھنڈا ہوگیا تھا۔

''ماموں جان شیرو نے خوب مزے سے گھاس کھائی اور درختوں کے پتے بھی چبائے۔'' میرے بھانجے زین نے پُرجوش لہجے میں بتایا۔

''یہ ابھی یہاں اور رکنا چاہ رہا تھا مگر دیر ہورہی تھی اور اسی لیے ہم اسے لے کر بس واپس ہی آرہے تھے۔'' اسد نے میرا موڈ بھانپتے ہوئے صفائی پیش کرنی چاہی۔

''مگر بیٹا اس طرح رات کے وقت اس ویرانے میں نہیں آنا چاہیے، پتا بھی ہے کہ حالات اچھے نہیں ہیں۔ بہرحال اب جلدی سے واپس چلو۔'' میں نے انہیں تنبیہ کی۔

ہم لوگ اس وقت پلیا کراس کر ہی رہے تھے کہ کچی آبادی کی طرف اندھیرے سے ایک موٹر سائیکل نکل کر تیزی سے ہمارے سامنے آکھڑی ہوئی، دو نوجوان اس پر سوار تھے۔ ان میں سے ایک اسلحہ بردار نوجوان پھرتی سے اتر کر ہمارے قریب آپہنچا، اس نے آتے ہی مجھ سے بائیک کی چابی چھینی اور میری جامہ تلاشی لینے لگا اور دوسری موٹر سائیکل سوار نے بچوں کو ڈرا کر ایک طرف کردیا۔ شیرو کی رسی اسد کے ہاتھ میں تھی، شیرو سر اٹھا کر آسمان کی طرف فضا میں کچھ سونگھ رہا تھا، وہ کچھ چوکنا نظر آرہا تھا، میری جیبوں سے موبائل، اور پرس نکال کر اس نوجوان نے جلدی جلدی نقدی نکال کر پرس خالی کرکے میرے سامنے نیچے پھینک دیا، اس اثنا میں دوسری موٹر سائیکل پر سوار وہ نوجوان جو اپنے موبائل فون پر مسلسل کسی سے رابطے پر تھا اس نے دوسری طرف کسی کو گاڑی لانے کی ہدایت کی اور اسد کو ڈانٹ کر کہا کہ وہ شیرو کی رسی ان کے حوالے کردے، عین اس وقت کچی آبادی کی طرف سے کسی گاڑی کے انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آرہی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرے سے نکل کر ایک پک اپ ٹرک ہمارے سامنے نمودار ہوا اور پیچھے ہی رک گیا، ہم نے دیکھا اس پر پہلے ہی ایک عدد بچھڑا لدا ہوا تھا۔

''چلو رسی چھوڑو۔'' وہ اسلحہ بردار نوجوان جو میری جیبیں خالی کرچکا تھا اسد پر غرّایا۔

''نہیں انکل نہیں، پلیز شیرو کو نہ لے جائیں۔'' اسد روہانسا سا ہوگیا اور رسی پر اس کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔

''رسی چھوڑتا ہے یا دوں ایک تھپڑ کان کے نیچے۔ اسلحہ بردار نے ٹی ٹی لہراتے ہوئے اسد کو ڈرایا۔

''نہیں انکل یہ ہمارا ہے۔ ہم شیرو کو نہیں دیں گے۔'' اسد کو حالات کی سنگینی کا احساس ہی نہیں تھا، وہ شیرو کی رسی نہیں چھوڑ رہا تھا۔

''رسی دیتے ہو یا ماروں گولی؟'' اسلحہ بردار جھنجلا کر غرّایا۔ اس دفعہ اس نے براہِ راست اپنی ٹی ٹی کا رخ اسد کے سر کی طرف کرلیا تھا۔

''ارے بھائی کیا کررہے ہو، گولی چل جائے گی۔ بچے کو نقصان نہ پہنچانا۔'' میرا دل دھک سے رہ گیا جب اس نے اپنی پستول اسد پر تانی۔

''اسد بیٹا دے دو رسی انہیں، دے دو بیٹا۔'' صورتِ حال کی سنگینی کا ادراک کرتے ہوئے میں بجھے دل کے ساتھ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اسد نے اس بار رسی اور مضبوطی سے پکڑ لی۔ ''نہیں ابو میں نہیں دوں گا۔'' اسد بھی شیرو کی رسی چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ مجھے پتا تھا اسے شیرو سے کتنی محبت ہو گئی تھی۔ وہ بہت ضدی تھا لیکن میرا دل ہول رہا تھا کہ ڈاکوؤں کا کیا بھروسا، وہ تو نہ بوڑھا دیکھتے ہیں نہ بچہ اور نہ ان کے دل میں کسی عورت یا مرد کے لیے تمیز اور رحم ہوتا ہے۔ وہ تو بس پتھر دل ہوتے ہیں گولی چلانے میں دیر نہیں کرتے۔

اسلحہ بردار نے طیش میں آ کر ایک زوردار طمانچہ اسد کے منہ پر دے مارا اور شیرو کی رسی چھیننے لگا۔ اس ساری زور آزمائی میں شیرو جو پہلے پُرسکون تھا اب یکدم الرٹ ہو گیا تھا، وہ فضا میں سونگھتے ہوئے مسلسل پھنکاریں مار رہا تھا۔ اپنی گردن گھماتے ہوئے اپنے اگلے دونوں پاؤں باری باری اٹھا کر زمیں پر مار رہا تھا، مجھے تو یہ ڈر تھا کہ کہیں وہ اس چھینا جھپٹی میں گھبرا کر بدک کر بھاگ نہ کھڑا ہو مگر وہ بھاگنے والا نہیں تھا، مجھے وہ قصہ یاد تھا کہ ایک دفعہ گاؤں میں ایک آوارہ کتا ان کے گھر کے نزدیک آیا تو شیرو نے اسے ڈرا کر بھگا دیا تھا۔

وہ ڈاکو جلدی میں تھے اور اسد کی وجہ سے دیر ہو رہی تھی، موٹر سائیکل پر سوار دوسرا نوجوان بھی اس اسلحہ بردار کی مدد کے لیے آ گیا۔ اس کی مدد سے اس ڈاکو نے اس دفعہ بہت زور لگا کر شیرو کی رسی اسد کے ہاتھ سے چھین لی تھی، موٹر سائیکل سوار نے اسد کی ضد سے بھڑکتے ہوئے غصے سے ایک طمانچہ اسد کے منہ پر رسید کر دیا تھا۔ زوردار دھکے سے اسد بھی کافی زور سے زمیں پر گرا تھا۔ شیرو کی رسی اسلحہ بردار ڈاکو کے ہاتھ میں جیسے ہی آئی شیرو بپھر سا گیا، وہ ڈاکو اسے قابو نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ موٹر سائیکل پر اپنے ساتھی کے ساتھ پیچھے بیٹھ کر شیرو کو ہنکا کر پک اپ کی طرف کچے میں لے جانا چاہ رہا تھا، پھر اچانک ایک عجیب سی بات ہوئی شیرو یکدم اپنی اگلی دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو کر زور سے ڈکرایا اور اس نے ایک زوردار ٹکر موٹر سائیکل پر رسید کر ڈالی۔ وہ موٹر سائیکل اچھل کر کافی دور اپنے سواروں کو لے کر گری تھی، وہ نوجوان جس نے شیرو کی رسی تھامی تھی وہ بھی اچھل کر کافی دور جا پڑا تھا اور شیرو کی رسی اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی،، اس پر ہی بس نہیں ہوا، شیرو ڈکراتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے ایک اور زوردار ٹکر ان نوجوانوں کو رسید کر ڈالی جو ابھی موٹر سائیکل سے گر کر خاک چاٹ رہے تھے۔ وہ ٹکر اس قدر شدید تھی کہ وہ دونوں لڑھکنیاں کھاتے ہوئے کافی دور جا گرے۔

اسد زمیں پر پڑا ہوا تھا، میں پھرتی سے اس کے پاس آیا اور سہارا دے کر اسے بٹھایا۔ شیرو نے ان ڈاکوؤں کی بہت بری درگت بنائی تھی اور ابھی تک ان کے حواس بحال نہیں ہوئے تھے۔ اس اسلحہ بردار کی ٹی ٹی بھی کہیں نیچے اندھیرے میں گر گئی تھی، شیرو پلٹ کر اسد کے پاس آیا اور اسے اپنی زبان سے چاٹنا شروع کر دیا۔ یہ ایک بے زبان کی محبت کا اظہار تھا، اچانک ہونے والی اس افتاد پر مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا، نہ میں اور نہ ہی بچے ان ڈاکوؤں کا کچھ بگاڑ سکتے تھے اور نہ اسلحہ کے آگے کچھ مزاحمت کی جا سکتی تھی۔ یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ حواس مختل ہو گئے تھے، اس پورے واقعے میں مجھے بس یہی ڈر تھا کہ کہیں غلطی سے گولی نہ چل جائے اور اسد سمیت کسی بچے کو نقصان نہ پہنچ جائے۔

دور کہیں بائی پاس والے روڈ پر چند گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نظر آ رہی تھیں، شاید وہ اسی راستے کی طرف آ رہی تھیں اور شاید کچھ دیر بعد ہی وہ یہاں پہنچنے والی تھیں۔

وہ لٹیرے ابھی تک خود کو سنبھال ہی رہے تھے اور میں بھی اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ ان خبیثوں سے بچوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا تھا اور امکان یہی غالب تھا کہ ایکسپریس وے سے آنے والی گاڑیوں کے آ جانے پر یہ ڈاکو اب یہاں سے بھاگنے والے تھے۔ میں حالات کا اندازہ لگا ہی رہا تھا کہ فضا کسی فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ ہم سب ہی نے چونک کر فائر کی آواز والی سمت دیکھا۔ ڈاکوؤں نے اپنی پک اپ کچے میں روکی ہوئی تھی، صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ہوتے ہی پک اپ ڈرائیور نے اسلحہ نکال لیا۔ وہ فائر اسی نے کیا تھا۔ ہم سب اسے بھولے ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے اپنی پک اپ ہماری جانب لے آیا۔ فائر کی آوازوں نے سناٹے میں ہلچل سی مچا دی تھی، دور سے آنے والی گاڑیوں کی لائٹس اب بالکل نزدیک آ چکی تھیں، وہ لٹیرے گرتے پڑتے اٹھے۔ انہوں نے اپنی موٹر سائیکل وہیں چھوڑی اور پک اپ میں بیٹھ کر اسٹریٹ فائر کیے۔ شیرو ہمارے پاس کھڑا اسد کو محبت سے چاٹ رہا تھا، اپنا کندھا اور سر اس کے کندھے سے آرام سے رگڑ رہا تھا، ہم لوگ اس کی آڑ میں تھے۔ سامنے سے ہم پر جو فائر ہوئے تھے اس وقت شیرو عین ہمارے سامنے تھا۔ وہ پانچ چھ فائر شیرو کو جا لگے تھے۔ جب تھوڑے حواس بحال ہوئے تو میں نے دیکھا سب بچے محفوظ تھے۔ سب نے ہی شیرو کی آڑ لی ہوئی تھی، شیرو ابھی تک بہت بہادری سے کھڑا ہوا تھا، اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔ ہائی وے سے آنے والی گاڑیاں ہمارے نزدیک آرکی تھیں۔ ان کے سوالوں کا شور سا مچا ہوا تھا۔ اسد اور فہد مسلسل روتے ہوئے چلا رہے تھے۔

''ابو دیکھیں شیرو کے خون نکل رہا ہے۔''

''دیکھیں ابو انہوں نے شیرو کو گولی ماری ہے۔''

''چلیں ابو شیرو کو ہسپتال لے چلیں۔''

بچے مسلسل رو رہے تھے وہ بھرائی ہوئی آواز میں التجا کر رہے تھے اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہوگیا ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی موت کو بالکل قریب سے دیکھا تھا، اسی اثناء میں کسی نے 15 پر اطلاع دے دی تھی۔۔ شیرو بڑی استقامت سے کھڑا تھا اصل میں وہ گولیاں ہمیں لگنے والی تھیں مگر وہ ہمارے سامنے قدرتی طور پر دیوار بن کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آڑ میں ہم بالکل محفوظ رہے تھے۔

شیرو کا خون کافی بہنا شروع ہوگیا تھا، اس کے پاؤں میں اب لرزش شروع ہو چکی تھی، وہ باری باری اپنی چاروں ٹانگوں کو اٹھا کر اپنا وزن سہارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خون بہت بہہ چکا تھا مجھے لگا کہ وہ اب گرا تب گرا۔ میری نظروں میں وہ پہلا دن گھومنے لگا جب شیرو پہلی رات ہمارے گھر میں آیا تھا اور ایک نئی جگہ پر بیٹھنے سے کترا رہا تھا، ہم سب آدھی رات تک اس کے بیٹھنے کا انتظار کرتے رہے تھے اور جب تک وہ بیٹھا نہیں تھا میں گھر نہیں گیا تھا۔

اب وہاں کافی مجمع جمع ہو چکا تھا نزدیکی کچی آبادی اور قریبی علاقے کے مکین فائرنگ کا شور سن کر وہاں پہنچ چکے تھے۔ اتنی دیر میں ہمارے محلے کے بھی کچھ نوجوان وہاں پہنچ چکے تھے۔ ابھی میں اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے ان کی ہمدردی اور سوالوں کا جواب دے ہی رہا تھا کہ ایک دم دھم سے شیرو اپنے پورے وزن کے ساتھ زمین پر ڈھے گیا۔

''ابو! دیکھیں شیرو نیچے گر گیا۔ اسد اور فہد زور سے چلائے۔''

''ارے بیٹا اسے ذبح کروادو۔'' ایک صاحب نے مشورہ دیا۔

''ہاں بیٹا اسے ذبح ہی کروادو تو ٹھیک ہے یہ حلال جانور ہے اسے ایسے ہی چھوڑنا ٹھیک نہیں۔ ایک معمر شخص نے تائید کی۔

میری زبان خاموش تھی مگر آنسو بہہ رہے تھے۔ دل چیخ چیخ کر رونے کا چاہ رہا تھا اس معصوم بے زبان قربانی کے جانور نے ان کا کیا بگاڑا تھا، ان کی اس سے کیا دشمنی تھی، کیا ان لٹیروں کا بھی کوئی دین مذہب تھا، کوئی اخلاقیات بھی تھیں، یا ان کے نزدیک صرف اور صرف مال و دولت ہی سب کچھ تھا۔ ہوسکتا تھا وہ ڈاکو شیرو کو اپنے ساتھ لے جاتے مگر جب ان ڈاکوؤں نے اسد کو دھکا دے کر گرایا تو شیرو جیسے حساس جانور کا ردعمل سامنے آیا۔ وہ منحوس ڈاکو اپنے مقصد میں تو کامیاب نہ ہوئے تھے مگر فرار ہونے میں تو کامیاب ہو گئے تھے اور جاتے جاتے قربانی جیسی عظیم آزمائش اور مقصد کے لیے لائے گئے ایک معصوم جانور پر گولیاں برسا کر اپنی عاقبت اور دین و دنیا دونوں خراب کر گئے تھے۔

بہرحال میں نے اپنے دل کو سنبھالا۔ بچوں کا رو رو کر برا حال تھا، محلے کی چند بڑے لڑکوں کے ساتھ میں نے ان کو گھر بھجوادیا، ایک پولیس کی موبائل آ پہنچی تھی، میں نے FIR درج کرانے سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے معمول کی کاروائی کی اور چلتے بنے، ڈوبتے دل کے ساتھ میں نے شیرو کو ذبح کرنے کی اجازت دی، کچی آبادی سے ہی ایک قسائی آگیا تھا، شیرو بڑے آرام سے ذبح ہوا، میں یہ سب کچھ دیکھنا نہیں چاہتا تھا مگر شیرو مجھے ہی دیکھے جا رہا تھا، میں دل پر ضبط کیے وہیں اس کے پاس بیٹھا رہا۔ نظریں نہ ملانا چاہتا تھا مگر نظریں چرا بھی نہ سکا، گھر سے اماں جی نے پیغام بھجوادیا تھا اور ان کی ہدایت کے مطابق شیرو کے گوشت کو کچی آبادی میں ہی تقسیم کروادیا گیا۔

☆......☆

اس رات دیر سے گھر پہنچا تو بچے روتے ہوئے سو چکے تھے، اماں جی کی گود میں سر رکھ کر میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور میں دیر تک روتا رہا۔

وہ قربانی کا جانور تھا اور ہماری جان کے صدقے قربان ہوگیا تھا۔ اماں جی نے کچھ پیسے بچا کر رکھے ہوئے تھے اور اگلے دن ہم ایک اور نیا بچھڑا خرید لائے۔

قربانی کی رسم پوری کی مگر سچی بات ہے کہ کئی دنوں تک ہم شیرو کی یاد دلوں سے فراموش نہ کر سکے، اسد اور فہد نے ہفتوں گوشت کو ہاتھ تک نہ لگایا، خدا ان ظالموں کو ہدایت نصیب فرمائے جن کی مذموم حرکت نے قربانی جیسی عظیم اور مذہبی رسم کو بھی اپنے نفس اور دنیاوی حرص و طمع کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L - 5 / 79 ڈاکخانہ 5.L / 78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر:03225494228

ای میل ایڈریس ہےabbasnadeem283@gmail.com

www.paksociety.com

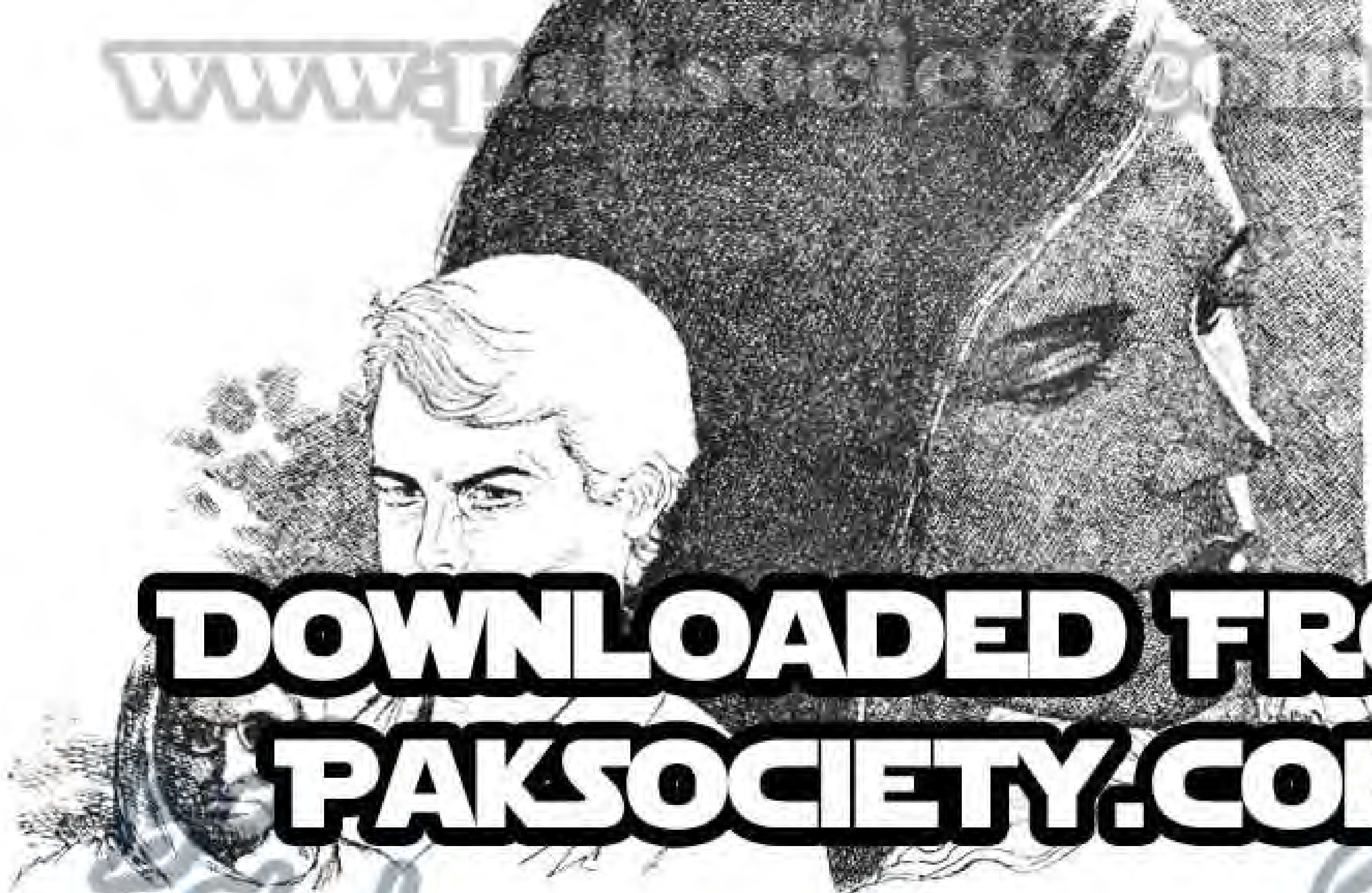

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دیوانگی

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
محبت دیوانگی کا نام ہے لیکن اس محبت میں اگر مفاد در آئے تو پھر محبت، محبت نہیں رہتی۔ میرے لیے دو دلوں میں محبت تھی لیکن ان میں سے ایک کے دل میں مفاد بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایسی اوچھی حرکت پر مجبور ہو گیا لیکن وہ بھول گیا تھا کہ قدرت مفاد پرستی کو پسند نہیں کرتی۔

شازیہ ناصر
(کراچی)

ناصر میرا خالہ زاد بھائی تھا۔ بچپن سے ہی ہم ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے۔ حالانکہ ہمارا بھرا پُرا خاندان ہے اور میرے کئی کزن ہیں جن میں ماموں زاد، چچا زاد اور پھوپی زاد بھی شامل ہیں۔ ان میں کچھ میرے ہم عمر اور کچھ مجھ سے ایک دو سال چھوٹے بڑے ہیں لیکن ان میں کوئی بھی ناصر جیسا بے تکلف اور قریبی نہیں۔ اس کی ایک وجہ میری امی اور خالہ یعنی ناصر کی ماں کی بے انتہا قربت بھی ہو سکتی ہے۔ اور سگے کی بہنیں ہونے کے سبب ان کی آپس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety
پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1
پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

میں بہت محبت تھی۔ انہوں نے ایک ہی اسکول اور کالج میں تعلیم حاصل کی اور ان کی شادیاں بھی قریباً ایک ساتھ ہی ہوئیں۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی جب کہ ناصر میرا ہم عمر اور اس کی بہن ثمینہ مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ ابو پولیس میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ اس کے علاوہ انہیں ورثے میں اچھی خاصی جایداد ملی تھی جس میں انہوں نے دورانِ ملازمت مزید اضافہ کرلیا تھا۔ ہمارا شمار کھاتے پیتے گھرانوں میں ہوتا تھا لیکن ابو نے کبھی اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ سرکاری مکانوں میں رہے حالانکہ ڈیفنس میں ان کا ذاتی بنگلا تھا جو کرائے پر دے رکھا تھا۔

ناصر کے والد اور میرے خالو شکیل احمد کا کپڑے کا کاروبار تھا اور ان کا شمار بھی خوش حال لوگوں میں ہوتا تھا لیکن وہ بہت شاہ خرچ اور دریا دل انسان تھے اور ان کا طرزِ زندگی ہم سے بہت مختلف تھا۔ بچے شہر کے بہترین اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ گھر میں آئے دن کوئی نہ کوئی تقریب یا دعوت ہوتی رہتی جس کے لیے کھانا باہر سے پک کر آتا اور ایک کی جگہ چار خرچ ہوتے لیکن خالو کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی وہ اکثر یہی کہا کرتے کہ آدمی کماتا کس لیے ہے؟ خرچ کرنے کے لیے۔ اس کے برعکس ابو میانہ روی کے قائل تھے گو کہ ہمارے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن وہ بے جا خرچ کرنے کے قائل نہ تھے۔

میری دونوں پھوپیاں، چچا اور ماموں بھی صاحب حیثیت تھے۔ ہم سب کزنز ایک دوسرے سے اچھی طرح ملتے تھے اور آپس میں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ البتہ چچا کا بیٹا عارف مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ انتہائی بدتمیز، منہ پھٹ اور جاہل انسان تھا۔ وہ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہونے کی وجہ سے چچی اس کے کچھ زیادہ ہی ناز نخرے اٹھاتی تھیں۔ ماں باپ اور بہنوں کے لاڈ پیار کی وجہ سے اس کی عادتیں بگڑتی چلی گئیں اور وہ اپنے آپ کو کسی ریاست کا شہزادہ سمجھنے لگا۔ پڑھائی سے اسے برائے نام دلچسپی تھی۔ اسی لیے وہ انٹر سے آگے نہ پڑھ سکا اور اس نے اپنے والدین سے صاف کہہ دیا کہ پڑھائی اس کے بس کا روگ نہیں۔ اس لیے وہ اپنا کوئی کاروبار کرے گا۔ چچا کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی۔ اس لیے گھر میں روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ تعلیمی سلسلہ منقطع ہونے کے بعد عارف بالکل آزاد ہوگیا۔ اس کا سارا وقت دوستوں کے درمیان گزرنے لگا تھا۔ اس کے دوست بھی ایک سے بڑھ کر ایک نکمے، آوارہ اور بدمعاش تھے۔ ان کا کام سگریٹ پینا، تاش کھیلنا، فلمیں دیکھنا اور لڑکیوں کا پیچھا کرنا تھا۔ عارف نے جس کاروبار کی خاطر پڑھائی ترک کی تھی اس کے شروع ہونے کے دور دور تک کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ چچی سے اس بہانے کئی مرتبہ بڑی بڑی رقمیں لے چکا تھا جو سب دوستوں میں بیٹھ کر اڑا دیں۔

اس کے برعکس ہمارے گھر میں پڑھائی اور ڈسپلن پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ اس حوالے سے ابو پولیس والے کم اور فوجی زیادہ لگتے تھے۔ حالانکہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی اور مجھے اپنے گھر میں ہر طرح کی آسائش میسر تھی۔ اس کے باوجود مجھ پر کئی پابندیاں تھیں۔ ان میں سے کچھ والدین کی تربیت اور روک ٹوک کے سبب مجھ پر لاگو ہوگئی تھیں اور کچھ میں نے خود اپنے اوپر عائد کرلی تھیں۔ مثلاً مجھ سے کہا گیا کہ عبایا پہن کر اور چہرہ نقاب سے ڈھانپ کر گھر سے باہر نکلا کرو میں نے وہی کیا لیکن کالج میں داخلہ لیتے ہی میں نے محسوس کیا کہ عبایا اور حجاب لڑکیوں کے لیے بہترین ڈھال ہیں۔ اس طرح کم از کم وہ آوارہ لڑکوں کی فقرے بازی اور غیر ضروری تعاقب سے محفوظ رہتی ہیں۔

ابو میری پڑھائی کے معاملے میں بہت سنجیدہ تھے۔ میں نے میٹرک میں بہت اچھے نمبر حاصل کیے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ انٹر سائنس میں بھی اتنے نمبر آجائیں کہ مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ مل جائے۔ میں اپنے طور پر پوری محنت کررہی تھی لیکن تعلیمی سال شروع ہونے کے چند ماہ بعد ہی اندازہ ہوگیا کہ کچھ مضامین میں مجھے کوچنگ کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ کسی کوچنگ سینٹر میں داخلہ لیا جائے لیکن ہمارے گھر کے قریب ایسی کوئی سہولت موجود نہیں تھی اور نزدیک ترین کوچنگ سینٹر بھی کافی فاصلے پر تھا جہاں جانے کے لیے کوئی ٹرانسپورٹ دستیاب نہیں تھی۔ اس لیے وہاں جانے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔

ایک دن خالہ رضیہ ہمارے گھر آئیں تو باتوں باتوں میں امی نے یہ مسئلہ بھی ان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ فوراً بولیں۔ ”اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ میں ناصر سے کہوں گی۔ وہ شازیہ کو پڑھا دے گا۔“

ناصر مجھ سے پڑھائی میں دو سال آگے تھا۔ میں فرسٹ ایئر میں تھی اور وہ انجینئرنگ کے پہلے سال میں تھا۔ امی نے ابو سے ذکر کیا تو وہ تیار ہوگئے جب کہ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں انکار نہ کردیں کیونکہ وہ تھوڑے سے قدامت

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پسند تھے اور لڑکے لڑکیوں کا آزادانہ میل جول انہیں پسند نہیں تھا لیکن میری پڑھائی کی وجہ سے انہیں اپنے رویے میں لچک پیدا کرنا پڑی۔ بہر حال امی نے خالہ سے فون کر کے کہہ دیا کہ وہ ناصر سے پوچھ لیں۔ آیا وہ مجھے انگریزی پڑھانے کے لیے کچھ وقت نکال سکتا ہے۔ اس نے رضا مندی ظاہر کردی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ جن دنوں اس کے اپنے امتحان ہو رہے ہوں گے تو وہ چند روز نہیں آسکے گا۔

اس طرح ناصر مجھے پڑھانے آنے لگا۔ وہ ہفتے میں تین دن شام پانچ بجے آتا اور ایک ڈیڑھ گھنٹا پڑھا کر واپس چلا جاتا۔ شروع شروع میں، میں نے کزن سمجھ کر اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی لیکن وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''دیکھو شازیہ! میں نے صرف تمہاری خاطر بڑی مشکل سے یہ وقت نکالا ہے۔ اس لیے اسے اِدھر اُدھر کی باتوں میں ضائع کرنا مناسب نہیں ہے تمہیں بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہے باتیں تو ہم بعد میں بھی کر سکتے ہیں۔''

میں اس کی سنجیدگی اور متانت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ مجھے لگا جیسے وہ اچانک ہی بہت بڑا ہو گیا ہے اور اپنی عمر کے مقابلے میں زیادہ گہری باتیں کرنے لگا ہے۔ تاہم مجھے اس کا یہ خشک رویہ پسند نہیں آیا اور میں منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ اگلے پندرہ منٹ تک میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی اور اس کی باتوں پر صرف سر ہلاتی رہی۔ وہ سمجھ گیا کہ مجھے اس کی بات اچھی نہیں لگی۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شازیہ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ ہم دونوں کے لیے چیلنج ہے۔ اگر خدانخواستہ مضامین میں نمبر کم آئے تو تمہارے ساتھ میری پوزیشن بھی خراب ہو گی۔ خاندان والے ویسے ہی اعتراض کر رہے ہیں۔ اس طرح تو انہیں باتیں بنانے کا موقع ہاتھ آجائے گا۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ خاندان بالخصوص میرے ددھیال والوں کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی تھی کہ ناصر مجھے پڑھائے۔ ان کے خیال میں، میں جوان ہو چکی تھی اور اس طرح ناصر سے میرا بے حجابانہ میل جول مناسب نہیں تھا۔ بڑی پھوپی زبیدہ نے تو کھل کر ابو سے کہہ دیا لیکن وہ بھی اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے پھوپی کو صاف جواب دے دیا اور کہا۔ ''ناصر کوئی غیر نہیں۔ اپنا ہی بچہ ہے اگر خاندان میں کوئی اور لڑکا اس قابل ہوتا تو وہ اس سے بھی شازیہ کو پڑھانے کے لیے کہہ سکتے تھے۔''

ان کا اشارہ میرے پھوپی زاد اور چچازاد بھائیوں کی طرف تھا۔ عارف کے بارے میں تو میں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ دونوں پھوپیوں کے بیٹے بھی پڑھائی میں یوں ہی تھے۔ بڑی پھوپی زبیدہ کا بیٹا عظیم انٹر میں بی گریڈ لانے کے بعد یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا جب کہ پھوپی راشدہ کے بیٹے اجمل نے انٹر کے بعد سائنس چھوڑ کر بی کام میں داخلہ لے لیا تھا۔ اس طرح ان سے کوئی بھی میرا استاد بننے کے قابل نہ تھا اور یہ اعزاز صرف ناصر کے حصے میں ہی آیا۔

اس روز ناصر کے جانے کے بعد میں اپنی کتابیں سمیٹ ہی رہی تھی کہ عارف آگیا۔ اس کی آمد ہمیشہ اچانک اور غیر متوقع ہوا کرتی تھی۔ ویسے بھی ہمارے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ امی کی ناپسندیدگی کی وجہ یہ تھی کہ ان کی کبھی بھی اپنی دیورانی سے نہیں بنی۔ کیونکہ چچی انتہائی حاسد اور خود غرض قسم کی عورت تھیں اور انہیں ہمارے گھر کی خوش حالی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ نہ جانے کس نے ان کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی تھی یا یہ ان کے اپنے ذہن کی اختراع تھی کہ دادا ورثہ میں جو کچھ چھوڑ گئے تھے اس کے بیشتر حصے پر ابو نے دھاندلی کے ذریعے قبضہ جما لیا اور چچا کے حصے میں بہت کم آیا۔ وہ اس کا اظہار مختلف مواقع پر کر چکی تھیں لیکن کبھی ابو کے سامنے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ورنہ وہ ان کی طبیعت صاف کر دیتے، جب کہ حقیقت یہ تھی کہ دادا کی جائیداد اور اثاثے تمام وارثوں میں شرعی اور قانونی اعتبار سے تقسیم ہوئے تھے۔ ابو اور چچا دونوں کو برابر کا حصہ ملا۔ ابو کو ہمیشہ سے ہی بچت کرنے کی عادت تھی۔ انہوں نے ان اثاثوں سے حاصل ہونے والی آمدنی خرچ کرنے کی بجائے اس سے مزید سرمایہ کاری کی اور چند سالوں میں یہ اثاثے دوگنا چوگنا ہو گئے۔ اس کے برعکس چچا کا لائف اسٹائل کچھ ایسا تھا کہ ان کی ساری آمدنی اس کی نذر ہو جاتی۔ بچت کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انہیں جوا کھیلنے کی بھی عادت تھی جس کے نتیجے میں ان کے اثاثے گھٹتے چلے گئے اور ایک وقت ایسا آیا کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہا اور وہ اپنی گزر اوقات کے لیے فیکٹری کی آمدنی تک محدود ہو گئے۔ یہ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ جس مکان میں رہ رہے تھے اور جس فیکٹری کی کمائی پر ان کا خاندان پل رہا تھا وہ دونوں چیزیں بھی ان کی نہیں تھیں۔

شاید یہی وجہ تھی کہ چچی شدید قسم کے احساسِ کمتری

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں مبتلا ہوگئی تھیں اور انہیں ہماری خوش حالی سے جلن ہونے لگی تھی۔ حالانکہ ابو نے بے حد سادہ طرز زندگی اختیار کر رکھا تھا اور وہ کسی بھی طرح اپنی امارت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود چچی جلی کٹی باتیں کرنے سے باز نہ آتیں۔ جب بھی ہمارے گھر میں کوئی نئی چیز آتی تو وہ ایک ہی بات سوچتیں کہ ضرور یہ حرام کے پیسے سے آئی ہوگی۔ وہ ایک دو مرتبہ یہ بات کہہ چکی تھیں کہ ابو کی اوپر کی کمائی ہے ورنہ سوکھی تنخواہ میں یہ گلچھرے کیسے اڑائے جاسکتے ہیں۔

چچی کی انہی حرکتوں کی وجہ سے امی نے ان سے فاصلہ اختیار کیا ہوا تھا اور وہ انتہائی مجبوری کے عالم میں ان کے ہاں جایا کرتی تھیں لیکن چچی اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھیں۔ وہ ہفتے دو ہفتے بعد اپنی پوری فیملی کے ساتھ ہمارے یہاں دھاوا بول دیتیں اور ہمارے گھر کا سکون غارت ہو جاتا۔ وہ عام طور پر صبح گیارہ بارہ بجے آجاتیں اور پھر دوپہر کا کھانا، شام کی چائے اور رات کے کھانے کے بعد ہی ان کی روانگی ہوتی۔ عارف کبھی ساتھ ہوتا کبھی نہیں۔ اسے اپنے دوستوں سے ہی فرصت نہیں تھی البتہ وہ کبھی کبھار اکیلا آجاتا تھا اور اسے دیکھ کر میری جان جل جاتی تھی۔

اس وقت بھی عارف کو دیکھ کر میرے دماغ کا فیوز بھک سے اڑ گیا اور میں سوچ میں پڑ گئی کہ اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ ابو دفتر سے نہیں آئے تھے اور امی اپنے کمرے میں تھیں اس لیے لامحالہ مجھے ہی اس سے نمٹنا تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے چلتا ہوا آیا اور دھم سے صوفے پر گرتے ہوئے بولا۔ ”اور سناؤ کیا حال ہیں، لگتا ہے پڑھائی زوروں پر ہورہی ہے۔“

میں کتابیں سمیٹ کر کھڑی ہو چکی تھی اور میرا ارادہ تھا کہ غسل کرکے فریش ہو جاؤں پھر چائے پی کر کچھ دیر آرام کروں گی لیکن عارف کے آنے سے سارا پروگرام چوپٹ ہوگیا۔ مجبوراً مجھے بھی بیٹھنا پڑا۔ میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ”آج آپ کیسے راستہ بھول پڑے۔ گھر میں تو سب خیریت ہے نا؟“

”ہاں، سب خیریت ہے اور اس میں راستہ بھولنے والی کیا بات ہے۔ یہ میرے تایا کا گھر ہے جب چاہوں آسکتا ہوں۔ ویسے بھی تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پینے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس لیے چلا آیا۔“

”لیکن مجھے تو چائے بنانا نہیں آتی۔“ میں نے معصومیت سے کہا۔

وہ حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کمال ہے اتنی بڑی ہوگئی ہو اور تمہیں چائے بنانا نہیں آتی۔“

”میں گھر کا کوئی کام نہیں کرتی۔ امی کرنے ہی نہیں دیتیں۔ کہتی ہیں کہ میری پڑھائی کا حرج ہوگا۔“

”گولی مارو پڑھائی کو، کیا کروگی اتنا پڑھ کر۔ شادی کے بعد تو ویسے بھی تمہیں روٹیاں ہی تو پنا ہیں۔“

”شادی تو بہت دور کی بات ہے ابھی تو مجھے ڈاکٹر بننا ہے۔ اس کے بعد ہوسکتا ہے کہ میں اسپیشلائزیشن کے لیے باہر چلی جاؤں۔“

”یہ تو تم نے بڑا لمبا چوڑا پروگرام بتا دیا۔ اس میں دس بارہ سال تو لگ ہی جائیں گے۔“

”شاید اس سے بھی زیادہ۔“ میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔ ”لیکن وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلتا۔ یہ عرصہ بھی پلک جھپکتے گزر جائے گا۔“

”لیکن میں اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔“ وہ بے ساختہ بول اٹھا۔

میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا اور بولی۔ ”آپ کے انتظار کا میری پڑھائی سے کیا تعلق؟“

”اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔“ اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”پتا نہیں۔ مجھے تم سے یہ بات کہنا چاہیے یا نہیں۔“

”آپ جو کہنا چاہ رہے ہیں۔ کھل کر کہیں۔“ میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کی بات کا بالکل بھی برا نہیں مناؤں گی۔“

”دراصل امی کا خیال ہے کہ ہم دونوں کی شادی کردی جائے اور وہ جلد ہی اس سلسلے میں تمہارے ابو سے بات کرنے والی ہیں۔“

”صرف ابو سے؟“ میں نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

”اور امی سے نہیں۔“

”ان کی رائے تمہارے ابو سے الگ تو نہیں ہوسکتی اگر وہ مان گئے تو تمہاری امی اس کے خلاف کیسے جاسکتی ہیں۔“

”اور میں؟“ میں نے بھنویں چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میری رائے کی کوئی اہمیت نہیں۔“

”ہمارے معاشرے میں لڑکیاں بڑوں کے فیصلے پر سر جھکا دیتی ہیں اگر بڑوں نے فیصلہ کردیا تو تم اس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

خلاف نہیں بول سکتیں۔''

''تو کیوں نہ پہلے میں اپنا فیصلہ سنا دوں۔'' میں اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔'' اور میرا فیصلہ یہ ہے کہ میں اپنا کیریئر بنانے سے پہلے شادی نہیں کروں گی اور آپ بھی سن لیں کہ اگر مجھ پر زبردستی کوئی فیصلہ کیا گیا تو اسے ہرگز قبول نہیں کروں گی، زندگی مجھے گزارنی ہے، میرے بڑوں کو نہیں۔''

وہ بھی صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔'' تم شادی کے بعد بھی اپنی پڑھائی جاری رکھ سکتی ہو۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہوگی۔''

''بہتر ہوگا کہ آپ مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔'' فی الحال میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی اگر چائے پینے کا موڈ ہے تو تشریف رکھیں میں لے کر آتی ہوں۔''

''رہنے دو۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔'' تمہارے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے۔ لگتا ہے کہ مجھے امی کو جلد ہی بھیجنا پڑے گا۔''

''کوئی فائدہ نہیں۔'' میں نے اسے چڑانے کے لیے کہا۔'' انہیں مایوسی ہوگی۔''

''تمہاری باتیں سن کر مجھے شک ہونے لگا ہے۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا پھر معنی خیز انداز میں بولا۔'' کہیں تم پر ناصر کا جادو تو نہیں چل گیا۔ یہ ٹیوشن تو ایک بہانہ ہے۔ اس کے پیچھے کوئی اور ہی کہانی چل رہی ہے۔''

''جسٹ شٹ اپ۔'' میں نے شدید غصے کے عالم میں کہا۔'' آپ کو اتنی بڑی بات کہنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ یہاں سے فوراً چلے جائیں۔ اب میں آپ کو ایک سیکنڈ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔''

''سچی بات ہمیشہ کڑوی لگتی ہے۔'' وہ طنز کرتے ہوئے بولا۔

''گیٹ لاسٹ۔'' میں اتنے زور سے چلائی کہ امی بھی کمرے سے باہر آگئیں۔ انہیں دیکھ کر عارف فوراً ہی وہاں سے کھسک گیا۔ میں امی کے گلے لگ کر رونے لگی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے چپ کرایا اور بولیں۔'' تمہیں اس سے الجھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مجھے بلا لیتیں۔ میں خود ہی دو چار باتیں کر کے اسے چلتا کر دیتی۔''

''اس نے مجھے اتنی مہلت ہی نہیں دی۔ آتے ہی الٹی سیدھی باتیں کرنے بیٹھ گیا۔''

''خیر، اب یہ رونا دھونا بند کرو اور مجھے بتاؤ کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔''

میں نے امی کو پوری بات بتائی تو وہ بھی پریشان ہو گئیں اور بولیں۔'' یہ تمہاری چچی کی نئی چال ہے۔ وہ جانتی ہے کہ تم اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے اپنے باپ کی دولت اور جائیداد کی اکلوتی وارث ہو، اگر عارف کے ساتھ تمہاری شادی ہو جاتی ہے تو سب کچھ اس کے قبضے میں چلا جائے گا لیکن میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ اوّل تو تمہارے ابو کبھی بھی ایک جاہل اور نکمے شخص کے ہاتھ میں تمہارا ہاتھ دینا پسند نہیں کریں گے اور اگر بالفرض محال بھائی کی محبت میں آ کر انہوں نے کوئی ایسا فیصلہ کیا تو میں اس کی بھرپور مزاحمت کروں گی۔ تمہیں فکر کرنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں صاف صاف کہے دے رہی ہوں اور آپ ابو تک بھی یہ بات پہنچا دیں کہ میں عارف سے شادی نہیں کروں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' امی نے پیار سے میرے گال پر چپت مارتے ہوئے کہا۔'' اب تم جا کر منہ ہاتھ دھو لو۔ میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔''

اس رات میں دیر تک بستر پر لیٹی عارف کی باتوں پر غور کرتی رہی۔ چچی انتہائی شاطر اور مکار عورت تھیں اور ان کا شمار ایسے لوگوں میں کیا جا سکتا ہے جو وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں اگر انہوں نے میری اور عارف کی شادی کرنے کا منصوبہ بنالیا ہے تو وہ اسے عملی جامہ پہنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گی۔ انہیں ابو کے آگے ہاتھ جوڑنا پڑتے۔ ان کے قدموں میں سر رکھنا پڑتا تو شاید وہ یہ بھی کر گزریں اور اس بات کا بھی تھوڑا بہت امکان تھا کہ ان کی گریہ زاری سے ابو کا دل پسیج جائے اور وہ عارف کو گھر کا بچہ سمجھ کر اپنی فرزندی میں قبول کر لیں۔ اس آنے والے سیلاب کو روکنے کے لیے مجھے ایک حفاظتی بند باندھنا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میری سوچ اسی نکتے پر مرکوز ہو گئی۔

اس سے پہلے میں نے ناصر کے بارے میں کسی دوسرے انداز سے نہیں سوچا تھا۔ اسے اپنا خالہ زاد اور قریبی دوست ہی سمجھتی تھی اور جب سے اس نے مجھے پڑھانا شروع کیا تھا۔ میں دل سے اس کی قابلیت کی معترف ہو گئی تھی۔ گو کہ ابھی وہ خود طالب علم تھا لیکن کسی ماہر استاد کی طرح مشکل

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

سے مشکل سوال اس طرح حل کر دیتا کہ وہ میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ جاتا۔ میرے ذہن میں عارف کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔ یہ ٹیوشن تو ایک بہانہ ہے۔ اس کے پیچھے کوئی اور ہی کہانی چل رہی ہے۔ گو کہ یہ سچ نہیں تھا لیکن اسے سچ بننے میں کیا دیر لگتی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میرے ذہن میں ایک نیا منصوبہ پروان چڑھنے لگا۔

ناصر کا مستقبل روشن تھا۔ چند سال بعد وہ انجینئر بن جاتا۔ اسے اپنے ملک یا دبئی وغیرہ میں کوئی اچھی ملازمت مل جاتی اور ابو کو اسے اپنا داماد بنانے میں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ کم از کم وہ عارف سے بدرجہ بہتر تھا اور اس کے نمبر عارف سے کہیں زیادہ تھے لیکن ضروری تو نہیں کہ جو میں سوچ رہی تھی۔ وہ بھی وہی سوچ رہا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے دل میں پہلے سے کسی اور نے قبضہ جما رکھا ہو۔ یہ جاننے کے لیے اسے ٹٹولنا ضروری تھا، اگر اس کے دل کا خانہ ابھی تک خالی تھا تو میں اسے بآسانی اپنی جانب مائل کر سکتی تھی۔ جب وہ پوری طرح میرے عشق میں ڈوب جاتا تو میں اسے مجبور کرتی کہ خالہ کو رشتہ مانگنے ہمارے گھر بھیجے۔ ممکن ہے کہ وہ یہ اعتراض کرتا کہ ابھی تو اس کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی ہے اور جب تک وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو جاتا۔ ایسی بات کرنا قبل از وقت ہوگا۔ تب میں اسے عارف کے خطرے سے آگاہ کرتی اور کہتی کہ وہ اپنی ماں کو اس پر قائل کرلے کہ فی الحال منگنی کرلیں۔ شادی اس وقت ہوگی جب ہم دونوں اپنی تعلیم مکمل کرلیں گے۔ ایک بار ہماری منگنی ہوگئی تو چچی کے عزائم خاک میں مل جائیں گے اور عارف کا خطرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹل جائے گا۔

میں نے دوسرے دن سے ہی اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ ناصر کے آنے سے پہلے میں نہانے چلی گئی۔ فٹنگ والی گلابی قمیص اور سفید گھیر دار شلوار پہنی۔ اس لباس میں میرے جسم کے خدوخال خاصے نمایاں ہوگئے تھے۔ گلے میں رسی نما لہریا دوپٹا ڈالا جس کا ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔ گیلے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا اور ناصر کے انتظار میں کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگی۔ وہ حسبِ معمول مقررہ وقت پر آ گیا اور جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر گئی، وہ حیران نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے اس نے میرا یہ روپ نہیں دیکھا تھا اس لیے اس کی حیرت بجا تھی۔ میں نے اسے اپنی جانب متوجہ پایا تو شرمانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولی۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

''آں... کچھ نہیں۔'' وہ گڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''آج تم کچھ مختلف لگ رہی ہو۔''

''تم نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔'' میں اتراتے ہوئے بولی۔ ''میں ہمیشہ ہی مختلف نظر آتی ہوں۔ ویسے تم نے یہ بات کیوں کہی؟''

''کیونکہ تم اس لباس میں اچھی لگ رہی ہو۔'' وہ تھوڑا سا بے تکلف ہوتے ہوئے بولا۔

''شکر ہے کہ تمہیں میری کوئی بات تو پسند آئی۔ ورنہ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تمہیں پڑھائی کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا۔''

''تم صحیح سمجھ رہی ہو۔ ہم ابھی طالب علم ہیں اور ہمیں اپنی پوری توجہ پڑھائی پر رکھنی چاہیے۔ دوسری باتوں کے لیے تو پوری عمر پڑی ہے۔''

''اوہ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔ اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا۔ چلو پڑھائی شروع کرتے ہیں۔'' میں طنزیہ انداز میں بولی۔

''شاید تمہیں میری بات بری لگی۔'' وہ نرم لہجے میں بولا۔ ''لیکن اگر ہم نے باتوں میں وقت ضائع کر دیا تو میرے یہاں آنے کا مقصد فوت ہو جائے گا اور ہم ملنے سے بھی محروم ہو جائیں گے۔''

اس کے آخری الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔ گویا اس کے دل کے کسی گوشے میں یہ خواہش موجود تھی کہ وہ پڑھانے کے بہانے مجھ سے ملنے آتا رہے۔ میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ واقعی ہمیں پڑھائی پر توجہ دینا چاہیے۔''

میرا تیر نشانے پر بیٹھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس روز ناصر کا رویہ عام دنوں کی نسبت کافی مختلف تھا۔ پہلے وہ پڑھانے کے دوران میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا لیکن اس روز بار بار اس کی نگاہیں میری جانب اٹھ رہی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں بالکل دیر نہیں لگی کہ بظاہر شریف، نیک اور پارسا نظر آنے والا ناصر بھی عام مردوں جیسا ہی ہے۔ جو کسی بھی لڑکی کی جانب سے تھوڑی سی توجہ ملنے پر اپنی جگہ سے ہل جاتا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پوری طرح گھائل ہو گیا تھا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ میں اس کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

اگلے روز میں نے اس کے انداز میں نمایاں تبدیلی دیکھی۔ عام طور پر وہ سادہ لباس یعنی شلوار قمیص یا ٹی شرٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اور جینز میں آیا کرتا تھا لیکن اس روز اس نے لباس کے معاملے میں خاصا اہتمام کیا تھا۔ سفید بے داغ شرٹ، سیاہ پینٹ اور پیروں میں چم چم کرتے سیاہ چمکدار جوتے۔ لگتا تھا کہ مجھے پڑھانے نہیں بلکہ کسی لڑکی کے ساتھ ڈیٹ پر جانے کے لیے تیار ہو کر آیا ہے۔ اس ڈریسنگ میں وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ میں اس کی سج دھج سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور بولی۔ ''لگتا ہے کہ آج پڑھانے کا موڈ نہیں۔ کیا کسی پارٹی میں جا رہے ہو؟''

''ارے نہیں۔'' وہ جھینپتے ہوئے بولا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو وہی اپنے روایتی لباس یعنی جینز اور ٹی شرٹ میں آ رہا تھا کہ امی نے ٹوک دیا اور بولیں کہ یہ کیا بے ہودہ حلیہ بنا رکھا ہے۔ ڈھنگ کے کپڑے پہن کر باہر جایا کرو۔''

''ٹھیک ہی کہا انہوں نے۔'' میں شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''ویسے بھی تم پر یہ لباس خوب جچ رہا ہے۔ ایسے ہی بنے سنورے رہا کرو۔''

''واہ! یہ خوب رہی۔ کل میں نے تمہاری تعریف کی تھی۔ آج تم نے کردی۔ حساب برابر ہو گیا۔ اسی بات پر اچھی سی چائے پلا دو۔ آج بہت تھک گیا ہوں۔ سر میں بھی ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے تم بیٹھو۔ میں ابھی تمہارے لیے چائے اور سر درد کی گولی لے کر آتی ہوں۔''

میں نے عارف سے جھوٹ بولا تھا کہ مجھے چائے بنانا نہیں آتی جب کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے کی سب لوگ تعریف کرتے تھے۔ ناصر نے پہلی بار مجھ سے چائے کی فرمائش کی تھی۔ اس لیے مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی۔ میں اس کے لیے ایک ٹرے میں چائے، سادہ پانی اور سر درد کی گولیاں لے کر آئی تو وہ بولا۔

''تم چائے نہیں پیو گی؟''

''نہیں، میں شام کو پیتی ہوں اور ابھی تو تین ہی بجے ہیں۔''

''یہ نہیں ہو سکتا، تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔ اکیلے چائے پینے میں کیا خاک مزہ آئے گا۔''

''اچھا بھئی ناراض مت ہو۔ میں اپنے لیے بھی لے کر آتی ہوں۔''

چائے پینے کے دوران میں نے اس سے کہا کہ اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو پڑھائی کا ناغہ کر لیتے ہیں لیکن وہ نہیں مانا اور بولا۔ ''اب اتنی بھی خراب نہیں کہ چھٹی کر لوں۔ سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ وہ تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پینے کے بعد ٹھیک ہو گیا۔ ویسے بھی تمہارے امتحان شروع ہونے میں بہت کم دن رہ گئے ہیں۔ اس لیے پڑھائی کا ناغہ تو بالکل نہیں ہو سکتا۔''

جو بات میں کہنا چاہ رہی تھی۔ وہ اس نے کہہ دی اور مجھے اپنے منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے معصوم صورت بناتے ہوئے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو ناصر۔ ابھی بہت سے ٹاپک باقی ہیں اور مجھے انگریزی میں بھی تمہاری مدد کی ضرورت پیش آئے گی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم تین کی بجائے پانچ دن پڑھایا کرو۔''

''دیکھوں گا اگر ضرورت ہوئی تو یہ بھی کر لیں گے۔''

میرا یہ داؤ بھی کامیاب رہا۔ اس طرح مجھے اس کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملتا اور وہ کسی بھی لمحے میری محبت کی گرفت میں آ سکتا تھا۔ اس کے لیے مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دوسرے دن ہی اس نے رضامندی کا اظہار کر دیا اور کہا کہ واقعی میرا خیال درست تھا۔ مجھے مزید کوچنگ کی ضرورت تھی اس لیے اب وہ ہفتے میں پانچ دن آئے گا۔

اس بات سے مجھے یوں لگا کہ جیسے وہ بھی مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور میرے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا خواہاں ہے۔ اسی لیے اتنی آسانی سے اس نے میری بات مان لی۔ اس کے بعد ہمارے درمیان بے تکلفی بڑھنے لگی اور اب ہم پڑھائی کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی باتیں کرنے لگے۔ اس کی معلومات بہت وسیع تھیں اور وہ ہر موضوع پر بے تکان بول سکتا تھا۔ سیاست، اسپورٹس اور شوبز اس کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ اسے مطالعہ سے بھی دلچسپی تھی اور وہ دنیا کے نامور مصنفین کو پڑھ چکا تھا۔ جب کہ میں فلموں اور ڈراموں کی شوقین تھی اور ہم زیادہ تر اداکاروں کے اسکینڈلز، ان کی نئی فلموں اور شوبز میں پیش آنے والے تازہ ترین واقعات پر باتیں کیا کرتے تھے۔ اب وہ مجھ سے بلا تکلف چائے کی فرمائش کیا کرتا اور میرے لیے اکثر سموسے، پیٹیس یا چاکلیٹ وغیرہ لے کر آتا۔ رفتہ رفتہ ہمارے تعلقات اس موڑ پر آ گئے جس میں زبان سے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی آنکھوں کی زبانی سب کچھ کہہ دیا جاتا ہے۔

وہ بھی ایسا ہی ایک خوب صورت دن تھا۔ آسمان پر

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

گھرے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ میں نے موسم کی مناسبت سے سفید کرتہ، گلابی شلوار اور اسی رنگ کا دوپٹا پہنا اور پکوڑوں کے لیے بیسن گھولنے بیٹھ گئی۔ ابو کو برسات کے موسم میں شام کی چائے کے ساتھ پکوڑے بہت پسند تھے اور وہ اکثر ان کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ بیسن گھول کر رکھ دوں جیسے ہی ابو آئیں گے تو ان کے لیے گرم گرم پکوڑے تل دوں گی۔

ابھی میں اس کام سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ ناصر آگیا۔ اس نے مجھے کرتہ شلوار میں دیکھا تو تعریفی انداز میں اس طرح ہونٹ سکیڑے جیسے واؤ کہہ رہا ہو۔ میں نے جلدی سے دوپٹا اپنے سر پر لپیٹا اور بولی۔ ”پکوڑے کھاؤ گے؟“

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم نے میرے دل کی بات کیسے جان لی۔ سچ پوچھو تو میں راستے میں یہی سوچتا ہوا آرہا تھا کہ آج اگر چائے کے ساتھ پکوڑے مل جائیں تو مزہ آجائے۔“

”وہ کہتے ہیں نا کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے اسی لیے میں نے تمہارے دل کا کہا مان لیا۔“

اسی وقت امی بھی آگئیں اور بولیں۔ ”اگر تم نے بیسن گھول لیا ہو تو تھوڑے سے پکوڑے ناصر کے لیے بھی تل دو۔“

”آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں پہلے ہی فرمائش ہو چکی ہے۔“ ناصر نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں کچن میں چلی گئی۔

ناصر نے امی کو بھی اصرار کرکے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ میں چائے اور پکوڑے لے کر آئی تو اس نے پہلا پکوڑا منہ میں رکھتے ہی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ زندگی میں پہلی بار پکوڑے کھا رہا ہے۔ مجھے اس کی تعریف سن کر خوشی کے ساتھ شرم بھی محسوس ہو رہی تھی کہ امی کیا سوچیں گی لیکن وہ بھی بھانجے کی وارفتگی دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے مزید پکوڑے لانے کے لیے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی جگہ سے اٹھتی، دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے عارف کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ میرا خیال تھا کہ اس دن اچھی خاصی بے عزتی ہو جانے کے بعد وہ اتنی جلدی ہمارے گھر کا رخ نہیں کرے گا لیکن وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ نکلا۔ اسے اپنی عزت کی پروا تھی اور نہ کسی دوسرے کی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ عارف کو کس طرح ٹالوں۔ اندر ناصر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر تو اس کے تن بدن میں آگ ہی لگ جاتی اور وہ کچھ بھی الٹا سیدھا بول سکتا تھا۔

اس نے مجھے غصے سے دیکھا اور بولا۔ ”کیا اندر آنے کو بھی نہیں کہو گی؟“

”جی...... وہ...... وہ...... امی......“

”کیا وہ وہ لگا رکھی ہے۔ راستہ چھوڑو اور مجھے اندر آنے دو۔“

میں ایک طرف ہوگئی اور وہ دندناتا ہوا ٹی وی لاؤنج میں چلا گیا۔ وہاں امی اور ناصر چائے اور پکوڑوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ناصر کو دیکھتے ہی عارف کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ غصے سے بولا۔ ”اوہو، یہاں تو پارٹی چل رہی ہے۔ شاید میں غلط وقت پر آگیا۔“

امی نرمی سے بولیں۔ ”آؤ عارف بیٹھو۔ بہت دنوں بعد آئے۔ گھر میں سب خیریت تو ہے۔“

”آپ کو اپنے میکے والوں سے فرصت ملے تو سسرالیوں کی فکر کریں۔ اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ فون کرکے ہی کبھی خیریت معلوم کرلیا کریں۔“

امی کو بھی غصہ آگیا اور وہ بولیں۔ ”یہ تم کس لہجے میں بول رہے ہو۔ بڑوں سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔“

”آپ کو تو سارے عیب ہم لوگوں میں ہی نظر آتے ہیں۔ اپنے گھر کی بھی خبر ہے کہ یہاں کیا گل کھلایا جارہا ہے۔“

اب امی سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور پوری قوت سے چلاتے ہوئے بولیں۔ ”اس سے پہلے کہ میں کچھ بولوں۔ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ اور آئندہ اس گھر میں قدم رکھنے کی کوشش مت کرنا۔“

”مجھے یہاں آنے سے کون روک سکتا ہے۔ یہ میرے تایا کا گھر ہے۔“ وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔

ناصر کو بھی اس کی گستاخی پر غصہ آگیا اور وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”تم سیدھی طرح یہاں سے جاتے ہو یا دھکے دے کر باہر نکال دوں۔“

میں ڈر گئی کہ کہیں یہ دونوں آپس میں نہ الجھ پڑیں۔ میں نے ناصر کا ہاتھ پکڑا اور اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی۔ ”ناصر تم بیچ میں مت آؤ۔ یہ ہمارا معاملہ ہے۔ ہم خود ہی نمٹ لیں گے۔“

”اسے اپنا شوق پورا کرنے دو شازیہ۔“ عارف انتہائی بدتمیزی سے بولا۔ ”بے چارہ اپنے نمبر بنانے کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کوشش کر رہا ہے۔ تم نے اسے بتایا نہیں کہ یہ کوشش فضول ہے۔ اس گھر کا داماد تو مجھے ہی بننا ہے۔''

''زبان کو لگام دو عارف۔'' امی کو ایک بار پھر غصہ آ گیا۔ ''تمہاری ہمت کیسے ہوئی۔ ایسی فضول بات کہنے کی۔ تم فوراً اپنی منحوس شکل لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔''

''وہ تو میں چلا ہی جاؤں گا۔'' وہ چہرے پر شیطانی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جو کچھ کہا وہ سو فی صد سچ ہے۔ اس اتوار کو امی آ رہی ہیں شازیہ کا رشتہ مانگنے۔ ان کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ہم تینوں سکتے کے عالم میں کھڑے رہے۔ میرا تو یہ حال تھا جیسے کسی نے بدن میں سے پورا خون نچوڑ لیا ہو۔ ناصر بھی دم بخود تھا۔ پھر اسی نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ ''خالہ جان! میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے شازیہ کے لیے کوئی مسئلہ ہو اس لیے اب میں اسے پڑھانے نہیں آؤں گا۔''

اس سے پہلے کہ امی کوئی جواب دیتیں۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں امی کے گلے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔ میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''امی یہ عارف کیا کہہ رہا تھا۔ اگر چچی واقعی رشتہ لے کر آ گئیں تو......''

''تو کیا؟'' امی پیار سے میرے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔ ''ان کے آنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ وہ رشتہ مانگیں گی اور ہم فوراً ہی ہاں کر دیں گے۔ تم بالکل فکر مت کرو۔ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔''

شام کو ابو گھر آئے تو امی نے انہیں سارا قصہ سنایا اور کہا کہ وہ چچا کو فون کر کے آنے سے منع کر دیں لیکن ابو نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور بولے کہ وہ بھائی اور بھاوج کو اپنے گھر آنے سے منع نہیں کر سکتے۔ اگر انہوں نے رشتہ کی بات چھیڑی تو وہ کسی مناسب طریقے سے اسے ٹال دیں گے۔ البتہ ابو کو ناصر کے انکار پر تشویش تھی۔ وہ میری پڑھائی کے معاملے میں بہت حساس تھے اور جانتے تھے کہ اس مرحلے پر ناصر کا نہ آنا میرے لیے کتنا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے خود اسے فون کر کے اس سے معذرت کی اور کہا کہ وہ عارف کی باتوں کو دل پر نہ لے اور جو ذمے داری اسے سونپی گئی ہے اسے احسن طریقے سے پورا کرنے کی کوشش کرے۔ ناصر نے ایک بار پھر فرماں برداری کا ثبوت دیا اور ابو کے کہنے پر دوبارہ مجھے پڑھانے لگا۔

عارف نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اتوار کے دن چچا اور چچی اطلاع کیے بغیر ہمارے گھر چلے آئے۔ انہوں نے فون کرنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ امی پہلے ہی کہہ چکی تھیں کہ وہ ان لوگوں کے لیے کوئی خاص اہتمام نہیں کریں گی بلکہ جو گھر میں ہوا وہی سامنے رکھ دیا جائے گا۔ وہ لوگ پانچ بجے کے قریب آئے تھے چنانچہ امی نے ان کی چائے اور بسکٹوں سے تواضع کی جب کہ چچی سمجھ رہی ہوں گی کہ ان کے لیے مکمل ریفریشمنٹ یعنی چھولے، دہی بڑے، سموسے اور مٹھائی وغیرہ کا بندوبست کیا جائے گا۔ چائے پینے کے بعد چچی نے مطلب کی بات چھیڑی اور ابو کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں۔ ''بھائی صاحب! آپ نے شازیہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''اس کے بارے میں کیا سوچنا ہے۔'' ابو انجان بنتے ہوئے بولے۔

''میرا مطلب ہے اس کی شادی کے بارے میں ماشاءاللہ جوان ہو گئی ہے۔''

''ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے۔ پہلے تعلیم مکمل کر لے پھر شادی بھی ہو جائے گی۔''

''پڑھنے کے لیے تو ساری زندگی پڑی ہے۔'' چچی پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ ''لیکن شادی کی یہی عمر ہوتی ہے اگر یہ وقت نکل گیا تو اچھے رشتے ملنا مشکل ہو جائیں گے۔''

''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ شادی کے بعد گھر داری کے اتنے جھمیلے ہوتے ہیں کہ پڑھائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک شازیہ کی تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی۔ ہم اس کی شادی نہیں کریں گے۔''

''چلو شادی نہیں لیکن منگنی تو کی جا سکتی ہے۔'' چچا بولے۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگوں کو اچانک شازیہ کی شادی کی فکر کیوں ستانے لگی۔''

''اچانک نہیں بلکہ بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔'' چچی بولیں۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ گھر کی لڑکی گھر میں ہی رہے اس لیے ہماری خواہش ہے کہ عارف اور شازیہ کا رشتہ طے کر دیا جائے۔''

ابو کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔ ''کیا آپ لوگ یہ بتانا پسند کریں گے کہ عارف کا ذریعہ معاش کیا ہے؟''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اس سوال پر چچی سٹپٹا کر رہ گئیں اور بولیں۔ ''اے ہے، اسے کیا ضرورت ہے نوکری کرنے کی۔ ماشاء اللہ اپنی فیکٹری ہے۔ ذاتی مکان ہے اور تمہیں کیا چاہیے۔''

''فیکٹری اور مکان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی میں اس کی ملازمت کی بات کر رہا ہوں میں نے تو صرف اس کے ذریعہ معاش کی بات کی ہے۔ یعنی وہ کیا کام کرتا ہے اور کیا کماتا ہے۔''

''وہ اپنا کاروبار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی کوئی سلسلہ بن جائے گا۔'' چچا کمزور سی آواز میں بولے۔

''جب تک آپ لوگ مجھے اس کی معاشی پوزیشن کے بارے میں مطمئن نہیں کر دیتے۔ میں اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی یہ فیصلہ شازیہ کو کرنا ہے کہ وہ کس سے شادی کرنا چاہے گی۔ میں اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتا۔''

یہ سنتے ہی چچی تھے سے اکھڑ گئیں اور بولیں۔ ''اے ہے لڑکی نے چار جماعتیں کیا پڑھ لیں۔ تم لوگوں کے تو دماغ ہی آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے دماغ میں یہ زہر کس نے بھرا ہے، تمہاری بیوی نے کبھی ہمیں اپنا ہی نہیں سمجھا۔ ان کا جھکاؤ ہمیشہ میکے والوں کی طرف رہا اور اس معاملے میں بھی یہ......''

''میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا بے کار ہے۔ مجھے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا۔ اب آپ لوگ کوئی اور بات کریں۔'' ابو نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''اب کہنے کے لیے باقی کیا رہ گیا۔'' چچی تڑخ کر بولیں۔ ''ہم تو بڑی امید لے کر آئے تھے لیکن تم نے تو سگے بھائی کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ البتہ میں اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں ہوں جس چیز کے پیچھے پڑ جاؤں وہ حاصل کر کے ہی چھوڑتی ہوں۔ تم دیکھ لینا، ایک دن شازیہ ہی میرے عارف کی دلہن بنے گی۔''

وہ تو یہ کہہ کر چلی گئیں لیکن میرا دل انجانے اندیشوں اور وسوسوں سے بھر گیا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ چچی انتہائی شاطر اور عیار عورت تھیں اور وہ کسی بھی وقت کوئی خطرناک چال چل کر اپنے حق میں بازی پلٹ سکتی تھیں۔ ابھی یہ واضح نہیں تھا کہ ان کا اگلا قدم کیا ہوگا لیکن مجھے اس کا توڑ تلاش کرنے کے لیے ابھی سے سوچنے کی ضرورت تھی۔ میری کوئی ایسی سہیلی بھی نہیں تھی جس سے میں اپنا مسئلہ بیان کر کے کوئی مشورہ لے سکتی۔ لے دے کر ایک ناصر ہی تھا جس سے میں اپنے دل کی بات کہہ سکتی اور وہ شاید مجھے کوئی مناسب مشورہ بھی دے دیتا چنانچہ میں نے بہت سوچنے سمجھنے کے بعد اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرے روز وہ مجھے پڑھانے آیا تو میں نے اسے چچی کی آمد ان کے عزائم اور دھمکیوں سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی اپنی سوچ بھی بتائی کہ ان دھمکیوں کو بے اثر بنانے کے لیے مجھے بھی کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔ میری بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو شازیہ۔ وہ واقعی بہت خطرناک عورت ہیں اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ اس کا کوئی توڑ سوچنا ہو گا۔''

''لیکن کیا؟'' میں نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں تو سوچ سوچ کر ہلکان ہو چکی ہوں۔ کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔ بشرطیکہ تمہارے والدین اس پر رضامند ہو جائیں۔''

''وہ کیا... جلدی سے بتاؤ؟''

''وہ یہ کہ کوئی مناسب لڑکا دیکھ کر اس سے تمہاری منگنی کر دی جائے۔ اس کے بعد تمہاری چچی ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں گی۔''

''تجویز تو معقول ہے لیکن اس پر عمل کرنا بظاہر بہت مشکل لگ رہا ہے۔ دیکھو نا اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ کسی راہ چلتے شخص کو پکڑ کر اس سے میری منگنی کر دی جائے۔ اس کے لیے کسی مناسب رشتے کا انتظار کرنا ہوگا جو مختصر ہو سکتا ہے اور طویل بھی۔ نہیں بھئی یہ قابلِ عمل نہیں کچھ اور سوچو۔''

''فی الحال تو میرے ذہن میں یہی ایک بات آتی ہے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''ایک منٹ۔'' اچانک میرے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اس نے جو ترکیب بتائی تھی وہ بالکل وہی تھی جو میں نے سوچ رکھی تھی لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس پر عمل کرنے کا وقت اتنی جلدی آ جائے گا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''یہ بتاؤ تم کسی لڑکی کو پسند کرتے ہو؟''

وہ میرے اس بے تکے سوال پر بوکھلا گیا اور بولا۔ ''بات تمہاری ہو رہی تھی۔ میرا ذکر بیچ میں کہاں سے آ گیا؟''

''بات سے بات نکلنا اسی کو کہتے ہیں۔ میں نے جو

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

سوال کیا ہے اس کا جواب دو۔''
''ابھی تک تو میں نے کسی لڑکی کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔'' وہ کچھ شرماتے ہوئے بولا۔
''مستقبل قریب میں ایسا کوئی ارادہ ہے۔''
''ابھی میں بہت چھوٹا ہوں۔ میری پڑھائی چل رہی ہے۔ جب تک کسی قابل نہ ہو جاؤں ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔''
''گویا تم کسی کو پسند کرتے ہو یا تمہارے دل میں ایسی کوئی خواہش ہے لیکن مجبوری کی وجہ سے اس کا اظہار نہیں کر رہے۔''
''افوہ، تم تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی ہو۔'' وہ جھنجلاتے ہوئے بولا۔ ''آخر تم مجھ سے کیا کہلوانا چاہتی ہو؟''
''سچ۔ میں چاہتی ہوں کہ تم سچ بولو۔''
''کیا میرے سچ بولنے سے تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا؟''
''شاید ہاں! شاید نہیں۔'' میں نے الجھتے ہوئے کہا۔
''اچھا چھوڑو، یہ بتاؤ میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟''
''آج تم مجھ سے اتنے عجیب و غریب سوال کیوں کر رہی ہو جن کا میں آسانی سے جواب نہیں دے سکتا۔''
''اس لیے کہ تم میرے سب سے اچھے دوست ہو اور اس وقت مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے کسی جواب سے مجھے امید کی کرن نظر آ جائے۔''
''کاش میں تمہاری مدد کر سکتا۔'' وہ جذباتی انداز میں بولا۔ ''لیکن ابھی اس قابل نہیں ہوں کہ تمہارے لیے کچھ کر سکوں۔''
''یہ میں بعد میں بتاؤں گی کہ تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو لیکن پہلے میرے سوال کا جواب دو کہ میں تمہیں کیسی لگتی ہوں۔''
''شازیہ! میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔'' اس کا جذباتی پن اب بھی برقرار تھا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو اور تمہیں اپنے سے بہت قریب سمجھتا ہوں۔''
''مجھ سے شادی کرو گے؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔
''یہ کیسے ممکن ہے۔ تمہاری چچی تو مجھے کچا چبا جائیں گی۔''
''اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے پسند کرتے ہو۔ مجھ

موسم

کسی مقام کے خاص وقت یا مدت میں درجۂ حرارت، ہواؤں کے رخ اور بارش کے اثر سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، موسم کہلاتی ہے۔ موسم کو رُت اور فصل بھی کہتے ہیں۔ موسم کسی خاص مدت کی موسمی کیفیات کا نام ہے اور آب و ہوا اس علاقے کے موسموں کی مجموعی سالانہ اوسط کو کہتے ہیں۔

عام طور پر دنیا میں چار قسم کے موسم پائے جاتے ہیں۔ بہار، گرما، خزاں اور سرما۔ یہ موسم سورج کی تپش کی مختلف صورتوں سے، زمین کی دوری و گردش سے پیدا ہوتے ہیں۔ 21 مارچ کو جب سورج خطِ استوا پر عموداً چمکتا ہے تو شمالی کرّے میں بہار کا موسم شروع ہوتا ہے۔ 21 جون کو جب سورج خطِ سرطان پر عموداً چمکتا ہے تو اس کرّے میں گرمیوں کا موسم شباب پر ہوتا ہے۔ 23 ستمبر سے موسم خزاں شروع ہوتا ہے اور 22 دسمبر کو سردیوں کا موسم۔ ہمارے ملک میں ایک موسم زائد ہے جسے برسات کا موسم کہتے ہیں۔ یہ جون، جولائی اور اگست کے مہینے ہوتے ہیں۔ شمالی نصف کرّے کے موسم جنوبی نصف کرّے کے موسموں سے مختلف ہوتے ہیں یعنی جب شمالی حصے میں گرمیوں کا موسم ہوتا ہے تو اس وقت جنوبی کرّے میں سردیوں کا موسم ہوتا ہے۔

مرسلہ: ریحانہ منیر۔ کراچی

سے شادی کرنا چاہتے ہو لیکن ظالم سماج کے ڈر سے دل کی بات زبان پر نہیں لا سکتے۔''
''یونہی سمجھ لو۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''اس کے علاوہ ایک مسئلہ اور بھی ہے۔ جب تک میری تعلیم مکمل نہ ہو جائے برسر روزگار نہ ہو جاؤں۔ اس وقت تک شادی کی بات بھی منہ سے نہیں نکال سکتا۔''
''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں تو بچوں کی پیدائش پر ہی ان کے رشتے طے کر دیے جاتے ہیں۔'' پھر میں نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''دیکھو ناصر، پتھر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ پہلا پتھر چچی پھینک گئی ہیں۔ مزید پتھر بھی آ سکتے ہیں۔ اس دوران اگر کوئی مناسب رشتہ آ گیا تو تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔''
''پھر میں کیا کروں؟'' وہ بے بسی سے بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

''خالہ سے کہو کہ امی ابو سے میرے رشتے کی بات کریں۔ انہیں بتادو کہ عارف اور چچی میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی گھناؤنی سازش کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔ اس مسئلے کا واحد حل یہی ہے کہ ہماری منگنی کردی جائے۔ شادی بعد میں ہوتی رہے گی۔ مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔''

''تمہارے ابو راضی ہو جائیں گے؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ ایک بار میں نے امی کو قائل کرلیا تو وہ ابو کو بھی راضی کرلیں گی۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' وہ جذباتی ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم نے میری بہت بڑی مشکل آسان کردی۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں، تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ جب سے میں نے تمہیں پڑھانا شروع کیا ہے تبھی سے میرے دل میں تمہارے لیے پسندیدگی کے جذبات ابھرنے لگے ہیں۔ کئی بار سوچا کہ تمہارے سامنے حالِ دل بیان کروں لیکن ڈرتا تھا کہ کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ اور میں تمہارے دیدار سے بھی محروم ہو جاؤں۔ اس روز جب عارف نے تمہارے ساتھ بدتمیزی کی تو میرا خون کھول اٹھا۔ عین ممکن تھا کہ میں کوئی سخت قدم اٹھا لیتا لیکن میں نے بڑی مشکل سے خود کو روکا پھر جب معلوم ہوا کہ خالو نے عارف کی ماں کو ٹال دیا ہے تو مجھے دلی مسرت ہوئی لیکن اس کے باوجود تمہیں پرپوز کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ آج کی گفتگو سے مجھے بہت حوصلہ ملا ہے اور میں تمہیں پانے کے لیے وہ سب کچھ کروں گا جو میرے بس میں ہے۔''

''اوہ۔'' میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ ''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی'' پھر میں شرماتے ہوئے بولی۔ ''بس تو پھر ٹھیک ہے تم اپنی کارروائی شروع کردو۔ اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔''

اس سے پہلے کہ میں یا ناصر اس سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھاتے۔ چچی نے ایک اور شوشا چھوڑ دیا۔ انہوں نے خاندان بھر میں یہ خبر پھیلادی کہ عارف کا رشتہ مجھ سے طے ہو گیا ہے اور عنقریب منگنی کی رسم ادا کردی جائے گی۔ خاندان کے باقی لوگوں نے تو اس خبر کو زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن میری دونوں پھوپیوں کا ردِعمل بہت شدید تھا۔ بڑی پھوپی زبیدہ غصے کی بہت تیز اور منہ پھٹ تھیں اور لگی لپٹی رکھے بغیر جو دل میں ہوتا وہ زبان پر لے آتیں۔ اس کے برعکس راشدہ پھوپی سیاست سے کام لیتی تھیں اور باتوں باتوں میں دل کی بات کہہ دیتی تھیں۔ پہلے تو ان دونوں نے فرداً فرداً فون کر کے امی سے شکوہ کیا کہ اتنی بڑی خبر ان سے چھپائی گئی اور مشورہ کرنا تو درکنار، انہیں اطلاع دینا بھی ضروری نہ سمجھا۔ امی نے انہیں یقین دلانے کی بہت کوشش کی کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ چچی رشتہ لے کر آئی ضرور تھیں لیکن انہیں ٹال دیا گیا لیکن دونوں پھوپیاں یہ ماننے کو تیار نہیں تھیں اور وہ یہی سمجھتی رہیں کہ ان سے اصل بات چھپائی جارہی ہے۔

بالآخر پھوپی زبیدہ سے نہ رہا گیا اور وہ خود ابو سے دو دو ہاتھ کرنے چلی آئیں۔ پہلے تو انہوں نے مجھے گلے لگا کر خوب پیار کیا اور پھر مجھ پر آنسو بہاتے ہوئے ابو سے بولیں۔ ''اے بھیا! میری بھولی سی بچی نے ایسا کیا قصور کیا تھا جو تم نے اسے عارف جیسے نکمے کے پلے باندھ دیا۔ کم از کم کسی سے مشورہ تو کر لیتے۔ میں تو خود اپنے عظیم کے لیے سوچ رہی تھی لیکن اس لیے چپ رہی کہ پہلے بچوں کی تعلیم مکمل ہو جائے پھر بات کروں گی۔''

ابو یہ سن کر غصے میں آگئے اور بولے۔ ''کوئی رشتہ وشتہ نہیں ہوا۔ میں نے انہیں صاف انکار کردیا تھا۔ پتا نہیں وہ یہ جھوٹ بول کر کیا مقصد حاصل کرنا چاہ رہے ہیں۔''

امی بولیں۔ ''مقصد تو بالکل واضح اور صاف ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی کے دل میں ہماری بیٹی کے لیے کوئی خیال ہے تو وہ یہ خبر سننے کے بعد اپنا ارادہ ترک کردے۔ اس طرح عارف ہی واحد امیدوار رہ جائے گا اور ہم لامحالہ اسے اپنا داماد بنانے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

''یہ ان کی خام خیالی ہے۔'' ابو بولے۔ ''ضروری نہیں کہ میں خاندان والوں کا انتظار کروں۔ شازیہ کی شادی خاندان سے باہر بھی ہوسکتی ہے۔''

''اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' پھوپی جلدی سے بولیں۔ ''اگر تم نے واقعی عارف اور شازیہ کا رشتہ طے نہیں کیا تو میرے عظیم میں کیا کمی ہے۔ عارف سے تو لاکھ درجے بہتر ہے۔''

''ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' ابو نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ''اس کا فیصلہ وقت آنے پر کیا جائے گا۔''

یہ سن کر بڑی پھوپی کا موڈ آف ہو گیا اور وہ غصے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پیر پٹختی ہوئی چلی گئیں۔ ان کے جانے کے چند روز بعد چھوٹی پھوپی تشریف لائیں۔ انہوں نے بھی کم و بیش بڑی پھوپی والی زبان ہی استعمال کی وہ بھی مجھے اپنی بہو بنانے کا خواب دیکھ رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک ہی میں خاندان والوں کو اتنی عزیز کیسے ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ فکر بھی لاحق ہوئی کہ کہیں ابو اپنی بہنوں کے دباؤ میں آ کر عظیم یا اجمل میں سے کسی ایک کا رشتہ قبول نہ کر لیں۔ میں نے ناصر سے کہا کہ میرے اُمیدواروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی الٹی سیدھی بات ہو جائے اسے چاہیے کہ وہ ثمینہ کے ذریعے خالہ تک اپنی بات پہنچا دے۔

ادھر میں نے بھی امی کو اعتماد میں لے کر اپنے اور ناصر کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ یہ سن کر ان کے چہرے پر خوشی کے رنگ بکھر گئے۔ مجھے لگا کہ وہ بھی یہی چاہتی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ ابو کو اس بارے میں قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گی تاکہ خالہ رضیہ سوالی بن کر آئیں تو انہیں خالی ہاتھ واپس نہ جانا پڑے۔

ثمینہ نے جب خالہ رضیہ کو ناصر کی خواہش کے بارے میں بتایا تو وہ شش و پنج میں پڑ گئیں۔ ایک جانب ان کے سامنے ناصر کا مستقبل تھا تو دوسری طرف وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ میری وجہ سے عارف ان کے بیٹے کا دشمن بن جائے۔ ناصر کو انجینئرنگ کی ڈگری ملنے میں دو سال باقی تھے۔ اس کے بعد اس کا ارادہ مزید آگے بڑھنے کا تھا اگر اس مرحلے پر اس کی منگنی کر دی جاتی تو دو چار سال بعد شادی کا وقت بھی آ جاتا اور اس طرح ناصر کو آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیش آ سکتی تھی لیکن ناصر نے ثمینہ کے ذریعے کہلوا دیا کہ جب تک شازیہ اپنی تعلیم مکمل نہیں کر لیتی وہ شادی کے لیے اصرار نہیں کرے گا۔

خالہ رضیہ نے پہلے امی سے بات کی، وہ پہلے ہی ابو کو اس رشتے کے لیے رضامند کر چکی تھیں چنانچہ امی نے خالہ کو گرین سگنل دے دیا۔ ویسے بھی ابو کے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اب تک میرے جتنے بھی اُمیدوار سامنے آئے ان میں ناصر ہی سب سے زیادہ موزوں تھا۔ اس میں خوبیاں ہی خوبیاں تھیں۔ اگر کوئی خامیاں ڈھونڈنے بیٹھتا تو اسے بڑی مشکل پیش آتی۔ ابو کی نظر میں اس کی سب سے بڑی کوالیفکیشن یہ تھی کہ انجینئرنگ کا طالب علم ہونے کی وجہ سے اس کا مستقبل روشن تھا اور اس کے پاس ترقی کرنے کے مواقع تھے۔ چنانچہ جب خالہ رضیہ اس کا رشتہ لے کر آئیں تو ابو نے چوں چراں کیے بغیر اسے قبول کر لیا لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کر دی کہ فی الحال اس رشتے کا اعلان نہیں کیا جائے گا اور بات دونوں گھروں تک محدود رہے گی ورنہ چچی اور دونوں پھوپیاں ہنگامہ کھڑا کر دیں گی۔

مجھے ایک ساتھ دو خوشیاں ملیں۔ ایک تو میرا رشتہ ناصر کے ساتھ ہو گیا اور دوسرے میں انٹر سائنس کے امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گئی۔ اب مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ مل سکتا تھا۔ ناصر کی محنت رنگ لائی اور ابو بھی اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اب اس کے ہمارے گھر آنے کا کوئی جواز باقی نہ رہا تھا۔ ویسے بھی رشتہ ہو جانے کے بعد ہمارے درمیان ایک فطری حجاب حائل ہو گیا تھا۔ اب وہ خاص خاص مواقع پر ہی آیا کرتا تھا۔ البتہ فون پر روزانہ ہی بات ہو جاتی تھی۔

میری میڈیکل کی پڑھائی شروع ہو گئی تھی اور میں خوب محنت کر رہی تھی۔ اس طرح پہلا سال بخیر و خوبی گزر گیا پھر اچانک ہی وہ حادثہ رونما ہو گیا جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایک روز شام کو ابو دفتر سے آئے تو انہوں نے سینے میں درد کی شکایت کی۔ میں نے ان کا بلڈ پریشر چیک کیا تو وہ خطرناک حد تک بڑھا ہوا تھا۔ وہ بلڈ پریشر کے مریض تھے اور باقاعدگی سے دوائیں استعمال کرتے تھے۔ میں نے فوراً انہیں زبان کے نیچے رکھنے والی گولی دی تاکہ بلڈ پریشر نیچے آ جائے۔ پھر میں انہیں اسپتال لے گئی جہاں ڈاکٹروں نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے اور آیندہ چوبیس گھنٹے ان کی زندگی کے لیے اہم ہیں انہیں آئی سی یو میں رکھا گیا لیکن صبح ہونے سے پہلے دوسرا دورہ پڑا اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔

ہماری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ابو اس طرح ہمیں بیچ منجدھار میں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ تین دن تک تو مجھے اور امی کو کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ اس کے بعد جب دماغ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ گھر پر عملاً چچی اور پھوپیوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ باقی رشتے دار تو جا چکے تھے۔ صرف خالہ رضیہ ہی امی کی دل جوئی کے لیے رک گئی تھیں۔ چچی اور پھوپیاں اپنے خاندان سمیت براجمان تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی میت پر نہیں بلکہ پکنک منانے آئی ہوئی ہوں۔ صبح دوپہر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

شام لمبا چوڑا دستر خوان لگتا اور من پسند کھانے کھائے جاتے۔ پورا گھر الٹ پلٹ ہوگیا تھا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ اگر یہی حال رہا تو مہینے بھر کا راشن ایک مہینے میں ختم ہو جائے گا۔

میں نے موقع دیکھ کر امی کے کان میں سرگوشی کی۔ ''اپنے آپ کو سنبھالیں۔ ورنہ یہ لوگ ہمیں سڑک پر کھڑا کردیں گے۔''

خالہ رضیہ نے بھی امی کی ہمت بندھائی اور وہ آہستہ آہستہ زندگی کی طرف واپس آنے لگیں اور بہت جلد انہوں نے گھر کے معاملات دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ ابو کے انتقال کے چوتھے یا پانچویں روز چچا جان نے بتایا کہ وکیل یزدانی صاحب شام میں کسی وقت آئیں گے۔ ابو نے زندگی ہی میں وصیت نامہ ان کے پاس رکھوا دیا تھا۔ لہٰذا وہ سب لوگوں کی موجودگی میں وصیت پڑھ کر سنائیں گے۔

چچی تڑخ کر بولیں۔ ''اے ہے وصیت کی کیا ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ تمہارے بھائی کا کوئی لڑکا تو ہے نہیں۔ اب تم ہی ان کے حقیقی وارث ہو۔''

چچا نے کہا۔ ''اگر مرحوم نے وصیت نہ کی ہوتی تو شرعی احکام کے تحت وارثوں کے حصے کا تعین کیا جاتا لیکن جب وصیت کردی جائے تو اسی پر عمل کیا جاتا ہے۔''

چچی کچھ اور کہنا چاہ رہی تھیں کہ پھوپی زبیدہ نے انہیں روک دیا اور بولیں۔ ''بھابی! تمہیں اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں۔ ہم وہی کریں گے جو وصیت میں لکھا ہوگا۔''

شام کو وکیل صاحب آئے۔ انہوں نے سب لوگوں کی موجودگی میں وصیت پڑھ کر سنائی۔ جسے سن کر سب کے منہ لٹک گئے۔ اس وصیت کے مطابق ابو کی تمام جایداد، اثاثوں اور بینک اکاؤنٹس کی مالک اب امی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد یہ سب کچھ مجھے مل جاتا۔ البتہ انہیں اختیار تھا کہ وہ اس کا کچھ حصہ یا تمام اثاثے اپنی زندگی میں ہی مجھے منتقل کردیتیں۔ اسی وصیت سے یہ بھی انکشاف ہوا کہ جس فیکٹری اور مکان پر چچا قبضہ جمائے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی ابو کی ملکیت تھے اور وصیت کی رو سے اب امی ہی ان کی مالک تھیں۔ ابو سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے فیکٹری نہیں چلا سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک معاہدہ کے تحت اسے چچا کے حوالے کردیا تھا کہ وہ اسے چلائیں اور اس کا آدھا منافع ابو کو دیتے رہیں۔

امی کی جگہ کوئی اور ہوتا تو چچا کو اس فیکٹری اور مکان سے بے دخل کرنے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہ کرتا لیکن انہوں نے بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس معاہدے کو جاری رکھیں گی اور چچا پہلے کی طرح اس فیکٹری کو چلاتے رہیں گے لیکن چچی اس پر بھی مطمئن نہ ہوئیں۔ انہیں ابو کی وصیت سن کر بڑی مایوسی ہوئی وکیل کے جاتے ہی وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور چچا کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں۔ ''اب یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ تمہارا بھائی تو سب کچھ اپنی چہیتی کو دے گیا۔''

چچا کو بھی غصہ آگیا۔ وہ انہیں گھورتے ہوئے بولے۔ ''کبھی تو سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔ جانتی ہو کس کے بارے میں کیا کہہ رہی ہو؟''

''ہاں ہاں سب جانتی ہوں۔'' وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولیں۔ ''تم سے زیادہ عقل ہے میرے پاس اب چلو یہاں سے۔''

مجھے لگا کہ پھوپیاں بھی ابو کی وصیت سے مطمئن نہیں تھیں لیکن انہوں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ شاید وہ کسی اور طرح ابو کی دولت و جایداد میں سے اپنا حصہ وصول کرنا چاہ رہی تھیں۔ سب لوگوں کے جانے کے بعد اتنے بڑے گھر میں ہم ماں بیٹی ہی رہ گئے۔ ہمارا تنہا رہنا مناسب نہیں تھا اور گھر میں ایک مرد کا ہونا ضروری تھا۔ امی نے اس کا حل یہ نکالا کہ گھر میں کام کرنے والی بوا کو مستقل طور پر اپنے ساتھ رکھ لیا۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ رہا کرتی تھیں لیکن بہو نے ان کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اس لیے وہ بخوشی ہمارے ساتھ رہنے پر رضا مند ہوگئیں۔ ابو کی زندگی میں بھی ہمارے یہاں ڈرائیور ہوتا تھا۔ اب امی نے رات کی ڈیوٹی کے لیے ایک گارڈ بھی رکھ لیا۔

ان تمام انتظامات کے باوجود میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ میں چچی اور عارف کی وجہ سے ہر وقت خوف زدہ رہا کرتی تھی۔ چچی کو دو محاذوں پر شکست ہوئی تھی۔ ایک تو یہ کہ ابو نے انہیں میرا رشتہ دینے سے انکار کردیا اور دوسرے وہ سمجھ رہی تھیں کہ ابو کے انتقال کے بعد چچا ہی ان کے وارث ہوں گے اور سب کچھ ان کے حصے میں آجائے گا لیکن ابو کی وصیت نے ان کے خوابوں کو چکنا چور کردیا۔ میں جانتی تھی کہ وہ اس شکست کا بدلہ ضرور لیں گی لیکن کس طرح؟ اس کا مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا۔

وہ بھی ایک عام سا دن تھا۔ اس روز پریکٹیکل کی وجہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

سے مجھے دیر تک کالج میں رکنا پڑا۔ میں تین بجے کے قریب اپنے گھر سے قریب ترین اسٹاپ پر اتری جو ہمارے گھر سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور وہ ذیلی سڑک عموماً سنسان رہا کرتی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتی گھر کی طرف جارہی تھی کہ ایک سیاہ رنگ کی کار میرے بالکل قریب آکر رکی اور اس میں سے دو آدمی باہر آئے۔ انہوں نے مجھے دبوچ کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالا اور کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کر دیا۔ جب ہوش آیا تو میں ایک چھوٹے سے کمرے میں بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ برابر والی میز پر میرا بیگ رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا اس میں سب چیزیں محفوظ تھیں۔ موبائل، تھوڑی سی نقدی، ٹشو پیپر اور لپ اسٹک وغیرہ۔ میں نے جلدی سے موبائل نکال کر اپنے جسم میں ایسی جگہ رکھا جہاں کسی مرد کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر میں نے بیگ کو اسی جگہ رکھا اور واپس پلنگ پر آکر بیٹھ گئی۔ اتنا تو سمجھ گئی تھی کہ مجھے اغوا کیا گیا ہے لیکن یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے میرے ذہن میں فوراً ہی عارف کا نام آیا اور تھوڑی دیر بعد ہی اس کی تصدیق ہو گئی جب وہ اپنی منحوس صورت لے کر میرے سامنے آیا اور چہرے پر خبیث مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

''تم کیا سمجھتی تھیں کہ میں سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو اتنی آسانی سے چھوڑ دوں گا۔ تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی۔ شاید تم نہیں جانتیں کہ میں جس بات کا تہیہ کر لوں اسے پورا کر کے ہی چھوڑتا ہوں۔''

''میں تمہاری دھمکیوں سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔'' میں نے قدرے غصے سے کہا۔ ''مجھے اغوا کر کے تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اپنی من مانی کر سکو گے۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں اپنی جان دے دوں گی لیکن......''

''تم غلط سمجھ رہی ہو'' وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں کسی بری نیت سے یہاں لے کر نہیں آیا۔ بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ ہمارا نکاح ہو جائے پھر میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا۔ رخصتی کی تاریخ ہم بعد میں طے کر لیں گے۔''

''تم سے نکاح کرنے سے بہتر ہے کہ میں اپنی جان دے دوں۔ میں کبھی بھی ہاں نہیں کروں گی۔''

''تمہاری ہاں یا نہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس وقت تم میری قید میں ہو اور یہاں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔''

''اگر تم نے زبردستی کی تو میں شور مچا دوں گی۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس ویرانے میں تمہاری آواز کوئی نہیں سنے گا۔'' پھر اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ عصر اور مغرب کے درمیان نکاح ہونا ہے۔ میں قاضی اور گواہوں کو لینے جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے گھر بھی جاؤں گا۔ میں نے تمہارے لیے نکاح کا جوڑا اور کچھ دوسری چیزیں خرید کر رکھی ہیں۔ وہ بھی لیتا آؤں گا۔ میرے دو آدمی یہاں نگرانی پر ہیں یہ تمہارے لیے کھانے کا بندوبست کر دیں گے۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور جاتے جاتے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی۔ اسے اپنی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ اس نے کسی طرح کی بھی احتیاط نہیں کی۔ اس نے صرف یہ کہ میرے بیگ کی تلاشی نہیں لی بلکہ اپنا پورا پروگرام بھی مجھے بتا دیا کہ وہ قاضی اور گواہوں کو لینے جا رہا ہے اور عروسی جوڑا لینے کے لیے گھر بھی جائے گا۔ بس یہیں سے مجھے ایک اشارہ مل گیا۔ اس کمرے میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا جہاں سے باہر نکلنے کا سوچا جا سکتا۔ ویسے بھی یہاں سے بھاگ کر کہاں جاتی۔ مجھے تو اس جگہ کے محل وقوع کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا چنانچہ میں نے ایک دوسری ترکیب آزمانے کا فیصلہ کیا۔

عارف کے جانے کے پانچ منٹ بعد میں نے اپنے منصوبے کے مطابق زور زور سے دروازہ بجانا شروع کر دیا۔ چند لمحوں بعد نگرانی کرنے والوں میں سے ایک نے دروازہ کھولا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''کیا بات ہے۔ کیوں شور مچا رکھا ہے۔''

میں نے رونی صورت بناتے ہوئے کہا۔ ''باتھ روم جانا ہے۔''

''اوہ! اچھا آؤ میرے ساتھ۔''

میں کمرے سے باہر آئی تو اس نے لاؤنج کے کونے میں ایک دروازہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں چلی جاؤ اور دیکھو کوئی چالاکی مت کرنا ورنہ بہت بری طرح پیش آؤں گا۔''

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کا دوسرا ساتھی لاؤنج کے بیرونی دروازے پر اسٹول ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بھی اس کے پاس ہی چلا گیا۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ بند کر کے گریبان سے اپنا موبائل نکالا اور ناصر کا نمبر ڈائل کر کے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کہا۔ ''میں فون پر بات نہیں کر سکتی۔ ایس ایم ایس کر رہی ہوں۔ اسے پڑھ کر اپنی سمجھ کے مطابق کارروائی کرو۔ مجھے فون مت کرنا۔ ایک گھنٹے بعد دوبارہ ایس ایم ایس کروں گی۔''

پھر میں نے اسے پیغام کے ذریعے پوری صورت حال بتائی اور یہ بھی بتایا کہ عارف نکاح کا جوڑا لینے اپنے گھر بھی جائے گا اگر وہ فوری طور پر پولیس کی مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو عارف کو گھر پر ہی گھیرا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد جو واقعات پیش آئے۔ ان کا علم مجھے ناصر کی زبانی ہوا۔ میرا پیغام ملتے ہی وہ سیدھا اپنے ایک دوست کے پاس گیا۔ اس کے والد پولیس میں ایس ایس پی تھے۔ انہوں نے فوراً متعلقہ ایس ایچ او کو کارروائی کی ہدایت کی اور ناصر سے کہا کہ وہ پولیس سے رابطہ میں رہے۔ ایس ایچ او نے سادہ لباس میں پولیس اہل کار عارف کے گھر کے آس پاس تعینات کر دیے لیکن ناصر کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوا۔ اس نے لینڈ لائن پر عارف کے گھر فون کر کے تصدیق کرنا چاہی کہ وہ گھر پہنچا یا نہیں۔ عارف کی بہن نے فون اٹھایا اور کہا کہ وہ صبح سے نکلا ہوا ہے۔ البتہ تھوڑی دیر پہلے اس کا فون آیا تھا کہ وہ گھر آ رہا ہے۔ اس کا ایک جوڑا استری کر دیا جائے۔

یہ سن کر ناصر کو اطمینان ہو گیا اور وہ عارف کے گھر کے سامنے ایک درخت کی آڑ میں اس طرح کھڑا ہو گیا کہ عارف گھر میں داخل ہوتے وقت اسے نہ دیکھ سکے۔ تقریباً دس منٹ بعد عارف کی کار گیٹ کے سامنے آکر رکی اور وہ گاڑی سے اتر کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔ اسے دیکھ کر ناصر نے فوراً ہی ایس ایچ او کو اطلاع دی اور آناً فاناً پولیس پارٹی نے اس کے گھر کو گھیرے میں لے لیا۔ ایس ایچ او نے پولیس والوں کے مخصوص انداز میں دروازے پر دستک دی۔ چچی باہر آئیں اور پولیس کو دیکھ کر ان کا چہرہ سفید ہو گیا۔

ایس ایچ او نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''عارف گھر میں ہے؟''

''ہاں، لیکن تمہیں اس سے کیا کام ہے؟''

''بی بی سوال جواب مت کرو اور اسے باہر بلاؤ۔ کوئی کام ہے تبھی تو ہم یہاں آئے ہیں۔''

چچی نے وہیں سے آواز لگائی۔ ''دیکھ عارف، یہ انسپکٹر صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟''

انسپکٹر کا نام سنتے ہی عارف نے عقبی گلی کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف دوڑ لگائی لیکن وہاں بھی دو پولیس والے کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے عارف کو گردن سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے ایس ایچ او کے پاس لے آئے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ عارف پر لاتوں اور گھونسوں کی برسات شروع کر دی چچی ہائے ہائے کرتی رہ گئیں لیکن اس نے عارف کو پولیس موبائل میں ڈالا اور تھانے لے گیا۔ عارف دس منٹ بھی تشدد برداشت نہ کر سکا اور اس نے میرے اغوا کا اعتراف کر لیا۔ اس کی نشاندہی پر پولیس نے اس مکان پر چھاپا مار کر مجھے بازیاب کرایا۔ یہ مکان سپر ہائی وے پر واقع افغان بستی کے عقب ایک ویران جگہ پر واقع تھا۔ نگرانی کرنے والے پولیس موبائل کو دیکھتے ہی فرار ہو گئے تھے۔ ایس ایچ او نے بحفاظت مجھے گھر پہنچایا اور عارف کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

اس نے اپنے بیان میں اعتراف کیا کہ وہ ہمیشہ سے ہی مجھ سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا کیونکہ اس کی نظر میری دولت اور جائیداد پر تھی اور چچی نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھادی تھی کہ مجھ پر پہلا حق اس کا ہے لیکن جب ابو نے انکار کر دیا تو وہ مایوس ہو گیا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ ہر قیمت پر مجھ سے شادی کرے گا۔ ابو کے انتقال کے بعد اس کی آتش شوق اور بھڑک اٹھی کیونکہ اب میں کروڑوں کی مالک ہو چکی تھی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر میری شادی کسی اور سے ہو گئی تو چچا کو فیکٹری اور مکان سے بھی محروم ہونا پڑے گا۔ اُدھر چچی بھی اسے مسلسل اکسا رہی تھیں۔ چنانچہ اس کی خواہش جنون کی شکل اختیار کر گئی اور اس نے عالم دیوانگی میں مجھے اغوا کرنے اور زبردستی نکاح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ایک مرتبہ نکاح ہو گیا تو پھر کوئی بھی کچھ نہیں کر سکے گا اور اس طرح میری ساری دولت اس کے قبضے میں آجائے گی لیکن وہ یہ بھول گیا تھا کہ مارنے والے سے بچانے والا بہت بڑا ہے۔ اس کی ناقص منصوبہ بندی نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ اگر وہ میرے سامنے اپنے پروگرام کا اظہار نہ کرتا تو میں کبھی اس کے چنگل سے نہیں نکل سکتی تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ موبائل فون کتنے کام کی چیز ہے بشرطیکہ اس کا صحیح استعمال کیا جائے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

فائیو پرسنٹ

محترم مدیر
سلام مسنون
ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اسے دانستہ تباہ کیا جارہا ہے۔ اپنے مفاد کے لیے زور آور وہ سب کچھ کرنے پر تیار ہیں جو عام لوگوں کی زندگی میں زہر گھول دے۔ ان کی زندگی کو دشوار بنا دے۔ عاقل کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ اس کی زندگی کس طرح گرداب میں آئی یہی کچھ میں سنا رہا ہوں۔

اختر شہاب
(کراچی)

میں نے پچیس ہزار کا پرائز بانڈ خریدنے کا سوچا بھی نہ تھا۔ یہ تو اس دن میں اسٹیٹ بینک نہ گیا ہوتا تو بانڈ نہ خریدتا۔ ہوا دراصل یوں تھا کہ میں نے اچھے وقتوں میں ایک صاحب کو پچیس ہزار روپے ادھار دیے تھے۔ بار بار کی یاد دہانی کے باوجود وہ اس کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ اس دن میں اتفاقاً اپنے دفتر کے کیشیر کے ساتھ اسٹیٹ بینک چلا گیا تو وہاں ان صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اسٹیٹ بینک کے کیشیر سے دو لاکھ روپے وصول

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

کر رہے تھے۔ میں وہیں ان کے سر ہو گیا کہ میری رقم ابھی ادا کر دیں۔ ان صاحب نے لاکھ آنا کانی کی مگر اس دن مجھ جیسے شریف آدمی کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ میں نے ان صاحب کی اچھی خاصی بے عزتی کر دی۔ انہیں خوب شرمندہ کیا۔ شرمندگی سے بچنے اور لوگوں کے کہنے پر بالآخر وہ صاحب ادائیگی پر مجبور ہو گئے۔

میں اسی وقت ان روپوں سے ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ خریدنا چاہتا تھا کیوں کہ مجھے علم تھا کہ یہ پیسے گھر گئے تو سو ضرورتوں میں ختم ہو جائیں گے مگر سرٹیفکیٹ کی صورت میں یہ بیٹی کی شادی کے کام آ سکتے تھے۔ ابھی میں اپنے کیشیئر سے یہ کہنے ہی والا تھا کہ یہاں سے واپسی پر جی پی او ہوتے ہوئے جائیں گے کہ کیشیئر بولا۔ ''عاقل صاحب! رقم جیب میں لے جانے سے بہتر ہے کہ اس کا پرائز بانڈ خرید لیں۔''

''کوئی فائدہ نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''پرائز بانڈ کے معاملے میں میری قسمت ہمیشہ خراب رہی ہے۔ ہزاروں بانڈ خرید کر رکھے مگر حرام ہے جو ایک بھی نکلا ہو۔''

''پھر بھی قسمت آزمانے میں کیا حرج ہے؟''

''میں اس کے ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ خریدوں گا۔ تین ماہ میں کچھ تو منافع بن ہی جائے گا جب کہ پرائز بانڈ نہ نکلا تو اس فائدے سے بھی جاؤں گا۔''

''فرض کریں کہ یہ پیسے ابھی آپ کو نہیں ملے۔ تین ماہ بعد ملیں گے۔'' کیشیئر نے دلیل دی تو میں لاجواب ہو گیا۔

''جاؤ پھر اپنے مبارک ہاتھوں سے خود ہی بانڈ خرید لاؤ۔'' میں نے کہا کیوں کہ مجھے علم تھا کہ کیشیئر بڑا لکی ہے اس کے بانڈ اکثر نکلتے رہتے ہیں۔

کیشیئر نے مجھ سے پیسے لیے اور تھوڑی دیر بعد بانڈ لا کر دے دیا۔

واپسی پر میں نے کیشیئر کو سختی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ اس معاملے کا کسی سے ذکر نہ کرے کیوں کہ ایک تو بانڈ کی خریداری پر میرا مذاق اڑے گا اور دوسرے دفتر کے ساتھی جب پیسوں کی واپسی کے بارے میں سنیں گے تو ٹریٹ الگ لیں گے۔ لیکن آج تین سال بعد نمبر نکل آیا وہ بھی پہلا انعام۔

☆......☆

خلاف معمول جلد گھر پہنچنے پر بیوی پریشان ہو گئی۔

''خیریت تو ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے جو آپ اتنی جلدی گھر آ گئے؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے'' میں نے کہا۔

''خاک ٹھیک ہے۔ چہرے سے پریشان لگ رہے ہیں۔ رنگ بھی پیلا پیلا سا ہو رہا ہے۔'' وہ بولی۔

''کہہ دیا ناں، ٹھیک ہے۔'' میں چڑ گیا۔ کیونکہ میں آرام سے بیوی کو یہ خبر سنانا چاہتا تھا کہ پچیس ہزار کے بانڈ پر ڈھائی کروڑ کا انعام نکل آیا ہے۔

''پھر کیا بات ہے؟'' وہ اور پریشان ہو گئی۔ ''کیا کہیں سے کوئی خبر آئی ہے۔'' اس کی والدہ ان دنوں بیمار تھیں۔

''کچھ نہیں بھئی!''

''کچھ تو ہے۔ آپ پہلے کبھی ایسے گھر نہیں آئے۔ ضرور آپ کی طبیعت خراب ہے اور مجھے بتا نہیں رہے۔'' بیوی کچھ زیادہ ہی مزاج شناس تھی۔ ''آپ لیٹ جائیں۔ میں آپ کے لیے پانی لاتی ہوں۔ گرمی بھی تو کتنی ہو رہی ہے۔''

بیوی چلی گئی تو میں بستر پر لیٹ گیا۔

''بیوی کو یہ خبر سناؤں یا نہ سناؤں۔'' میں نے سوچا۔ عورتیں تو ویسے ہی پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں اور پھر جب یہ خبر مجھ سے ہضم نہیں ہو رہی ہے تو وہ کہاں برداشت کرے گی۔ ''مگر'' میں نے سوچا۔ ''اگر میں نے کسی کو اس بارے میں نہ بتایا تو لگتا ہے، میں پاگل ہو جاؤں گا۔ بہتر یہ ہے کہ میں بیوی کو بتا ہی دوں کیا پتا، وہ کوئی مفید مشورہ دے۔'' تبھی مجھے اپنے کولیگ آغا کی یاد آ گئی۔

ایک دن آفس سے چھٹی کے بعد میں اپنے ساتھی آغا کے ہمراہ موٹر سائیکل پر جا رہا تھا کہ اچانک میرے ساتھی نے سوال کیا۔ ''یار عاقل! تم نے جو پرائز بانڈ خریدا ہے۔ فرض کرو اس پر ڈھائی کروڑ کا انعام نکل آیا تو تم کیا کرو گے؟''

''کیوں مذاق کرتا ہے آغا؟'' میں بولا۔ ''اگر میرا انعام نکل بھی آیا تو کیا میں اسے لے سکوں گا اور کیا میں اسے اپنی مرضی سے خرچ کر سکوں گا؟''

''فرض کر۔'' آغا بولا۔ ''تیرا انعام نکلتا ہے۔ تو آرام سے اسٹیٹ بینک جاتا ہے۔ وہاں سے ڈھائی کروڑ کا پے آرڈر وصول کرتا ہے۔ اسے اپنے بینک میں جمع کراتا ہے۔ اب تو اپنے پیسے خرچ کرنے میں آزاد ہے اور تجھے کوئی خطرہ نہیں ہے کہ لوگ تجھ سے وصولی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

کرنے آجائیں گے تو پھر تو کیا کرے گا؟"

آغا کی بات سن کر میں زور سے ہنس پڑا۔

"سوچ یار آغا! یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ پاکستان میں جب بھی ہم روپے کی دستیابی کی بابت سوچتے ہیں تو سیدھی سوچ لٹنے یا ڈاکا زنی کی طرف جاتی ہے۔ سوچ یار! ہم لوگ کس طرف جا رہے ہیں۔"

"تمہارے سوچنے سے یہ معاشرہ بدل نہیں جائے گا۔" آغا بولا۔ "ہم لوگ تو اس قدر بے حس ہو گئے ہیں کہ اپنے جائز مفادات کے لیے بھی نہیں لڑ سکتے۔ ان کے لیے بھی رشوت پیش کرتے ہیں یا خاموشی سے اپنا حق چھوڑ دیتے ہیں اور اس وقت معاشرہ بدل بحث کے لیے ہمارے پاس فرصت نہیں ہے لہٰذا تو میرے سوال کی طرف لوٹ آ جو ابھی تک برقرار ہے۔"

"ٹھیک ہے میرے دوست!" میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا تھا۔ "اگر مجھے ڈھائی کروڑ روپے مل جائیں اور میں اسے خرچ کرنے میں آزاد ہوں تو سب سے پہلے ڈیفنس میں ایک شاندار بنگلا خریدوں گا تاکہ کورنگی سے اپنے اہل و عیال سمیت نکل آؤں جہاں ہر وقت جان و مال کا خوف رہتا ہے۔ اس کے بعد اپنی بیوی بچوں میں ہر ایک کے لیے ایک ایک گاڑی خریدوں گا۔ باقی رقم فکسڈ ڈیپازٹ کرا کر اس کے منافع سے عیش کروں گا۔"

"سب سے اہم بات جو میں تجھ سے سننا چاہ رہا تھا وہ تو تو نے کہی ہی نہیں۔" آغا بولا۔ "میں سب سے پہلے اس سرکاری نوکری کو چھوڑ دوں گا جس میں نہ تو گھر کا خرچ... پورا ہوتا ہے اور نہ کئی برسوں تک ترقی کا کوئی امکان ہے۔"

"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "تیری لاکھ ضمانتوں کے باوجود مجھے لٹنے کا خوف ستا تا رہے گا۔ پھر یہی تو میری حق حلال کی کمائی ہے۔ میرے بڑھاپے کا سہارا ہے۔ یہ تو میں ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ ان ڈھائی کروڑ کا کیا ہے کب کوئی گن سینے پر رکھ کر چھین لے جائے یا آسانی سے آئے ہوئے پیسوں سے اولاد خراب ہو جائے اور میں بڑھاپے میں خوار ہوتا پھروں۔"

آغا میری بات سن کر زور سے ہنسا اور میں بھی اس کے ساتھ ہنسنے میں شریک ہو گیا۔

بیوی پانی لے کر آئی تو میں انہی سوچوں میں گم تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ اسے پرائز بانڈ نکلنے سے خوشی کم ہوئی تھی اور بڑے خدشات نے زیادہ گھیر لیا تھا۔

"اٹھیں! یہ پی لیں۔" وہ بولی تو میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ ہاتھ میں گلاس لیے کھڑی تھی۔

"اس سے بہتر تھا تم چائے لے آتیں۔" میں نے کہا۔

"جی! ابھی لاتی ہوں۔"

"نہیں! بیٹھ جاؤ۔"

پانی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا ہوا میں بیوی کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ "یہ الجھے بالوں والی میک اپ سے بے نیاز عورت جس کے چہرے سے فکروں اور مالی پریشانیوں کی وجہ سے قبل از وقت بڑھاپا جھانکنے لگا ہے، کتنی صابر و شاکر ہے۔ وہ میری قلیل تنخواہ میں گزارہ کرتی ہے۔ اس نے اس وقت بھی کوئی شکوہ نہیں کیا تھا جب میں نے ایک صاحب کے بہکانے میں آ کر اپنی جمع پونجی امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس میں پھنسا دی تھی اور غلط کنسائنمنٹ بھیجنے پر عزت بچانے کے لیے تمام پونجی سے ہاتھ دھونے کے ساتھ ساتھ ذاتی مکان بھی بیچنا پڑا تھا کیوں کہ ان صاحب نے سارا کام میرے دستخطوں سے کرایا تھا اور موقع ملتے ہی غائب ہو گئے تھے۔ مجھے کورنگی کے اس خطرناک علاقے میں رہائش کے لیے آنا پڑا تھا جہاں مکان کے ڈپازٹ کے علاوہ کرایہ بھی نہیں دینا پڑتا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ یہ مکان میرے ایک رشتے دار کا تھا جو اس علاقے کے حالات کی وجہ سے مکان کی قیمت صحیح نہ ملنے کی وجہ سے اسے بیچنا بھی نہ چاہتے تھے اور اسے خالی بھی نہ چھوڑنا چاہتے تھے کہ خالی چھوڑا تو اس پر کسی نہ کسی گروپ کا قبضہ ہو جائے گا لہٰذا اس بچت کے خیال سے اس مکان میں آ گیا تھا۔"

"اس طرح کیا دیکھ رہے ہو۔" بیوی نے مجھے مسلسل اپنی طرف دیکھتے پا کر پوچھا۔

"سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم ایک بڑے سے بنگلے میں خوب بنی ٹھنی بیٹھی نوکروں پر حکم چلاتی کیسی لگو گی؟"

"اچھا مذاق ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔

"یہ مذاق نہیں، حقیقت ہے۔"

"آج آپ کچھ بہکی بہکی باتیں نہیں کر رہے؟"

"جو خبر میں تمہیں سنانا چاہ رہا ہوں۔" مسکراتے ہوئے میں بولا۔ "وہ سن کر تم بھی بہکی بہکی باتیں کرنے لگو..."

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

گی۔'' میں نے آخر بیوی کو رازدار بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ''ایسا کرو وہ پچیس ہزار روپے والا پرائز بانڈ لے آؤ۔'' جیب سے اخبار نکالتے ہوئے میں بولا۔ بانڈ سے نمبر ملا کر رزلٹ کو ایک بار پھر کنفرم کرنا چاہتا تھا۔

''کیا ڈھائی کروڑ کا انعام نکل آیا؟'' بیوی مذاقاً بولی۔

''یہی سمجھ لو۔'' میں نے گول مول سا جواب دیا۔

بیوی بانڈ لے کر آئی تو میں بانڈ لے کر اخبار پر جھک گیا اور اس کا نمبر دوبارہ ملانے لگا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ''ایسا نہ ہو کہ میں نے نمبر غلط پڑھ لیا ہو۔'' میں نے سوچا اور نمبر ملایا۔ نمبر وہی تھا۔ میرے منہ سے ایک گہری سانس نکل گئی۔

''کیا ہوا؟'' اس کی بیوی جو اسے بغور دیکھ رہی تھی اخبار پر جھکتے ہوئے بولی۔

''تم خود دیکھ لو۔'' میں نے اخبار بیوی کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ... یہ تو ڈھائی کروڑ۔'' مسرت اور خوشی کے مارے بیوی کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

''اسی لیے تو میری طبیعت خراب ہو رہی تھی۔'' میں بولا۔

''اب ہمارے دن پھر گئے اللہ تعالیٰ نے ہماری سن لی۔ ہم ڈیفنس میں ایک بڑا سا بنگلا بنائیں گے۔ میں اپنے بچوں کو اچھے اسکولوں میں پڑھاؤں گی۔ ہمارے پاس بھی اپنی گاڑی ہو گی۔ میں اپنے تمام ارمان پورے کروں گی۔ ہمیں غریبی کے عذاب سے نجات مل جائے گی۔'' بیوی خوشی کے عالم میں کہے جا رہی تھی۔ میں نے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔

''پھر اس کے بعد تمہاری آنکھ کھل جائے گی۔'' میں طنزیہ لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب؟'' میری بات پر بیوی نے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔ ''تم شاید ان ڈھائی کروڑ روپوں کو خواب سمجھ رہے ہو۔ تمہیں شاید اب تک یقین نہیں آیا ہے کہ ہم کروڑ پتی بن گئے ہیں۔ یا پھر تم دوسرے لوگوں کی طرح دولت آجاتے پر دوسری شادی کے خواب دیکھ رہے ہو؟'' عورت کا ازلی شک اس کے ذہن سے زبان تک آ گیا تھا۔

''اللہ کی بندی!'' میں نے کہا۔ ''کروڑ پتی ہم جب ہوں گے جب رقم ہمارے قبضے میں آجائے گی۔ ابھی تو کسی کے کان میں بھی انعام نکل آنے کی بھنک بھی پڑ گئی تو ہو سکتا ہے بانڈ کے ساتھ ہم جان سے بھی جائیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' وہ فکرمند ہو گئی۔ ''میں بھائی جان کو بلا لیتی ہوں آپ ان کے ساتھ انعام لینے چلے جائیے۔''

''تم ایسے احمقانہ مشورے دینے کی بجائے اپنا منہ بند ہی رکھو تو زیادہ بہتر ہے۔'' میں بولا۔ ''میں کہہ رہا ہوں کہ اس بات کی کسی کو بھنک نہیں پڑنی چاہیے اور تم بھائی جان کو بلانے کا مشورہ دے رہی ہو جو گاڑی کے بیک فائر کو بھی گولی کی آواز سمجھتے ہیں۔''

''تو میں کیا کروں؟''

''تم یہ کرو کہ اپنے ہونٹ سی لو کسی سے بھی انعام نکل آنے کا ذکر مت کرو یہاں تک کہ بچوں سے بھی نہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ انعام لینے کا محفوظ طریقہ کیا ہے؟''

''کیا عجب زمانہ آ گیا ہے۔'' بیوی اداسی سے بولی۔ ''ہم اپنی زندگی جی بھی نہیں سکتے۔ ہر وقت یہی سوچ رہتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے۔''

''بس بس زیادہ فکر مت کرو۔ ایسا کوئی طریقہ نکل ہی آئے گا۔ جس سے ہمیں کوئی نقصان نہیں ہو گا۔''

☆

رات گئے تک میں اپنی سوچوں اور خیالوں میں ڈوبا رہا۔ ذہن میں بہت سے خیالات آئے۔ میں نے بانڈ سے انعام لینے کے کئی طریقے سوچے مگر کوئی بھی طریقہ دل کو نہیں لگا۔ کسی خیال نے مطمئن نہیں کیا۔ وہ دن بھی بہت لمبا لگ رہا تھا۔ اک بے چینی اور بے قراری سی مسلط ہو گئی تھی۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ کھانا بھی بے دلی سے کھایا۔ تقریباً یہی حالت بیوی کی بھی تھی۔ وہ بھی بے چینی سے اِدھر اُدھر آ جا رہی تھی۔ لگ رہا تھا کہ اس کا جی بھی کسی کام میں نہیں لگ رہا ہے کبھی تو وہ ایک کام چھوڑ کر دوسرا کام شروع کر دیتی۔ اس کا معمول تھا کہ وہ دوپہر کو جا کر بچوں کو اسکول سے لاتی۔ ان کے کپڑے وغیرہ بدلوا کر انہیں کھانا کھلاتی اور ہوم ورک کروانے کے بعد انہیں سلا دیتی۔ شام کو میں دفتر سے آتا تو بچے اٹھ چکے ہوتے۔ ناشتا کر کے میں انہیں پارک میں لے جاتا۔ وہاں سے واپسی پر کھانا کھاتا اور پھر بچوں کا ہوم ورک چیک ہوتا مگر آج تو سارے معمول ہی غلط ہو گئے تھے۔ بیوی بچوں کو اسکول سے لانا بھول گئی تھی۔ وہ تو میرے کہنے پر اسے یاد

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

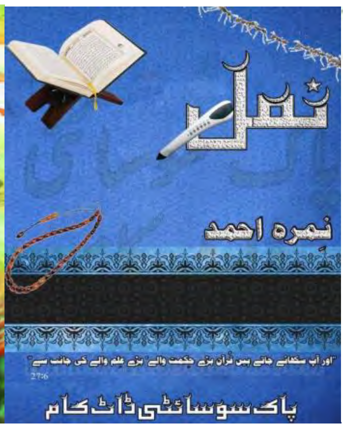

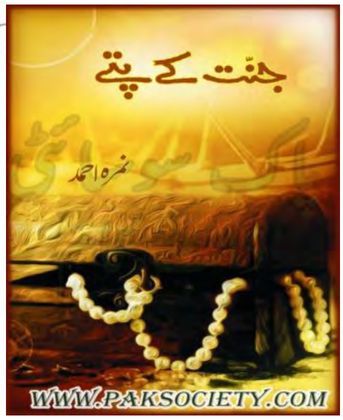

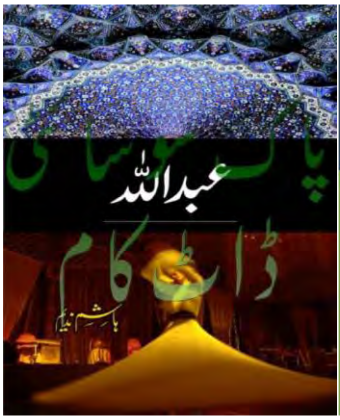

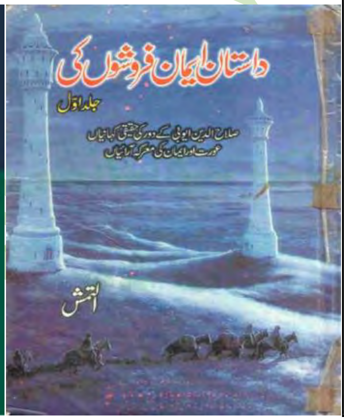

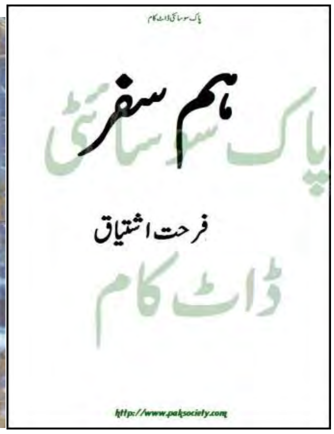

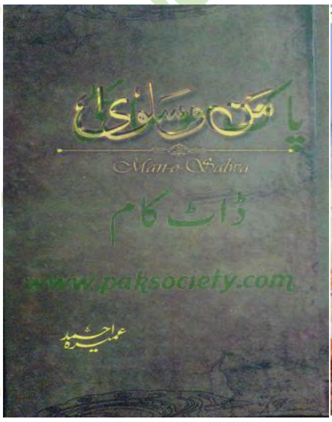

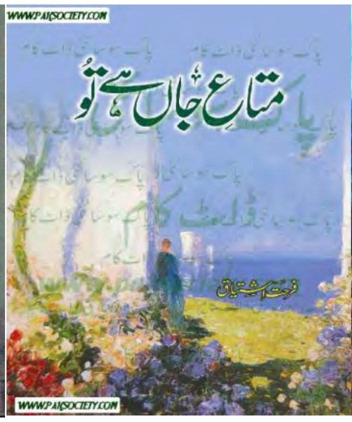

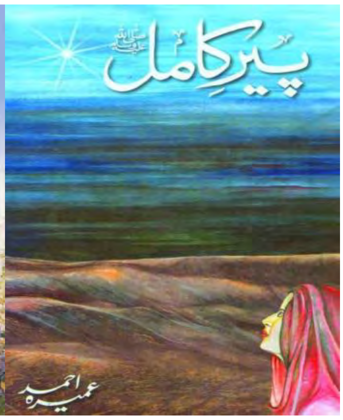

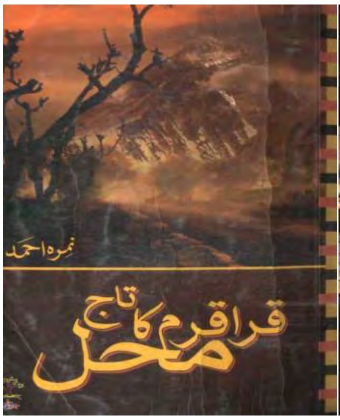

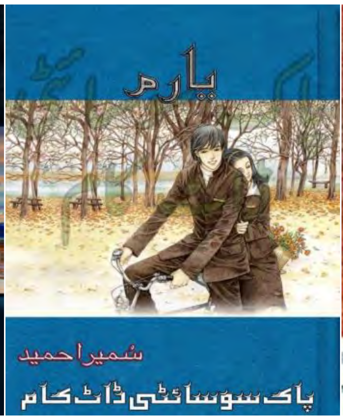

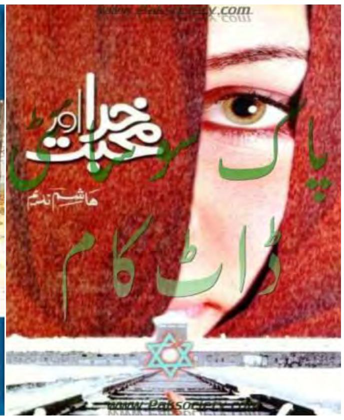

آیا تو وہ بچوں کو اسکول سے لائی۔ انہیں کھانا کھلایا اور پڑھنے بٹھا دیا اور خود اِدھر اُدھر پھرنے لگی۔ بچے بھی مجھے گھر میں دیکھ کر خوش ہو گئے لہٰذا پڑھنے کی بجائے شرارتیں کر رہے تھے کیوں کہ انہیں اس بات کی عادت ہو گئی تھی کہ ماں سر پر بیٹھ کر کام کروائے۔ مجھے اس وقت بچوں کا شور اور ان کی شرارتیں بری لگ رہی تھیں۔ میں انہیں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بیوی نے بچوں کو ڈانٹ کر سونے لٹا دیا تو مجھے کچھ سکون ملا۔

رات بھر میں خواب بھی الٹے سیدھے ہی دیکھتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ انعام وصول کرنے اسٹیٹ بینک گیا ہوں۔ بینک کے کیشیئر نے نوٹوں کی گڈیاں ڈھیر کر دی ہیں اور میں پریشان ہو رہا ہوں کہ انہیں کیسے لے کر جاؤں۔ بینک کا کیشیئر مجھے بڑا سا تھیلا دے دیتا ہے۔ میں گڈیاں اس میں ڈال لیتا ہوں اور جیسے ہی میں بینک سے باہر نکلتا ہوں تو ایک کار قریب آ کر رکتی ہے اور اس میں سے پھرتی سے دو آدمی اترتے ہیں اور مجھے گھسیٹ کے کار میں ڈالنے لگتے ہیں تو میں ان سے جان چھڑانے کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہوں۔ اسی کشمکش میں آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا بیوی بھی جاگ رہی ہے۔

''کیا ہوا؟ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا؟'' بیوی نے مجھے جاگتے دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں!'' میں بولا اور کروٹ بدل کر پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دفعہ نیند جلد آ گئی تو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے گھر میں ہوں۔ اچانک دروازے کی بیل بجتی ہے۔ میں اٹھ کر دروازہ کھولتا ہوں تو دو نقاب پوش ہاتھ میں پستول لیے دھکا دے کر اندر گھس آتے ہیں کہ وہ پرائز بانڈ ہمارے حوالے کر دو۔ میں مزاحمت کرتا ہوں تو ایک نقاب پوش میرے بیٹے کے سر سے پستول لگا دیتا ہے اور کہتا ہے اگر بانڈ نہیں دیا تو وہ اسے گولی مار دے گا۔ میں خاموشی سے بانڈ نکال کر ان کے حوالے کر دیتا ہوں۔ وہ جاتے جاتے میرے سر پر پستول کا دستہ رسید کر جاتے ہیں۔ درد سے آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میرا سر چارپائی کے پائے سے ٹکرا گیا ہے۔

☆

اس کے بعد سونے کی ہمت نہ ہو سکی۔ میں بستر میں لیٹا کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح کی روشنی پھیل چکی تھی جب بیوی ناشتا لائی۔ ناشتا کرنے کے بعد بھی میرا دل بستر سے اٹھنے

معرکۂ کارگل

کشمیر میں مجاہدینِ آزادی کی عسکری کارروائی۔ اس کے پس منظر میں مجاہدین آزادی کی وہ مسلح جدوجہد ہے، جو انہوں نے شروع کر رکھی ہے۔ ان کو اس امر کا بخوبی علم ہے کہ کشمیر کو صرف مسلح جدوجہد سے ہی آزاد کرایا جا سکتا ہے۔ 1999ء کا دن مقبوضہ کشمیر کی جدوجہد آزادی کے لیے ایک نیا موڑ ثابت ہوا اسی روز انہوں نے کشمیر میں کارگل سیکٹر میں کنٹرول لائن کی شمالی جانب دفاعی نوعیت کی پہاڑی چوٹیوں پر قبضہ کر لیا۔ بھارتی حکومت نے الزام عائد کیا کہ مجاہدین آزادی پاکستانی فوج کی مدد سے ایسا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ حکومتِ پاکستان نے بھارت کے اس الزام کی تردید کی لیکن حسبِ معمول بھارتی فوج نے پاکستانی کشمیر کے علاقے میں نہتے شہریوں کو اپنے ظلم و بربریت کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ نیز کنٹرول لائن کے ساتھ شیوک سیکٹر میں پاکستان کی ایک چوکی پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ پاک فوج نے اس حملے کو پسپا کر دیا۔ ازاں بعد بھارت نے کارگل کے علاقے میں اپنی دو ڈویژن فوج سے بھرپور حملہ کیا۔ حملے میں ہیلی کاپٹر گن شپس بھی استعمال کیے گئے۔ پاکستان نے بھارت کو متنبہ کیا کہ مجاہدین کے خلاف اس کی جنگی کارروائیاں لائن آف کنٹرول کے بالکل قریب ہو رہی ہیں اور پاکستان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ کسی بھی متوقع حملے پر لائن آف کنٹرول کی پاکستانی جانب سے جوابی کارروائی کرے، نیز پاکستان جنگ میں الجھنا نہیں چاہتا لیکن اس کے باوجود 1999ء میں دو بھارتی طیارے پاکستانی فضائی حدود کے 15 کلومیٹر اندر گھس آئے۔

پاک فوج نے مقبوضہ کشمیر میں فوجی ٹھکانوں کو تباہ کرنے اور بھارتی فوج کی جانب سے اس کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کی سزا دینے کے لیے پیش قدمی شروع کر دی، جس کے نتیجے میں پاک فوج نے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو کر دفاعی اہمیت کی شاہراہ سری نگر دراس پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح سیاچن جانے والی بھارتی فوجیوں کو خوراک اور اسلحہ کی بہم رسانی ناممکن ہو گئی۔ اب بھارتی فوج کے لیے دو ہی راستے تھے یا وہ سری نگر دراس شاہراہ پر دوبارہ قبضہ کر لے یا پھر وہاں قائم اپنی فوجی چوکیاں خالی کر دے۔ اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل نے دونوں ملکوں کے مابین مصالحت کی پیش کش کی لیکن بھارت نے انکار کر دیا اور پاکستان نے اس کا مثبت جواب دیا۔ پاکستان نے بھارتی حکومت سے بات چیت کرنے کے لیے اپنا وزیر خارجہ بھارت بھیجنے کی پیش کش کی۔ لامحالہ بھارت کو مذاکرات کی پیش کش کو تسلیم کرنا پڑا، کیوں کہ علاقے میں موجود 80 ہزار فوجیوں میں سے 17 ہزار فوجی سیاچن گلیشیئر پر پھنسے ہوئے تھے۔ نیز بھارت جارحانہ کارروائی کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا، تاہم 4 جولائی 1999ء کو امریکا کے صدر بل کلنٹن اور پاکستان کے وزیر اعظم نواز شریف نے اعلانِ واشنگٹن پر دستخط کر دیے، جس کے تحت مجاہدین کو مقبوضہ کشمیر سے واپس آنا پڑا۔

مرسلہ: ارباز خان، کوئٹہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

اور دفتر جانے کو نہ چاہا مگر یہ سوچ کر اٹھ گیا کہ دفتر چلتے ہیں وہاں اپنے قابلِ اعتماد دوست آغا سے مشورہ کروں گا کہ کیا کیا جائے۔

میں دفتر پہنچا تو ایک خوشگوار حیرت نے استقبال کیا۔ مجھے آتے دیکھ کر دفتر کے تمام لوگ دفتر سے باہر نکل آئے تھے۔ ان میں وہ سخت گیر باس بھی تھا جس نے کبھی سیدھے منہ بات نہ کی تھی۔

''مبارک ہو......''مبارک ہو!'' مجھے دیکھتے ہی دفتر کے ساتھیوں نے دور سے ہی نعرے لگانے شروع کر دیے۔ قریب آتے ہی لوگوں نے میرے گرد گھیرا ڈال دیا اور گلے لگانے لگے۔

''کیا ان لوگوں کو پتا چل گیا؟'' میں نے سخت سراسیمگی سے سوچا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

''اب تو آپ کروڑ پتی ہو گئے۔ اب ہم سے کیا بات کریں گے۔'' دفتر کا ایک ساتھی بولا۔

اس نے میرے خیالات کی تصدیق کر دی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ میں نے تو کسی کو اپنے عمل یا اپنی کسی بات سے اس چیز کا احساس نہیں ہونے دیا تھا تو پھر ان لوگوں کو کیسے علم ہو گیا۔ ''کیا میری بیوی نے ......'' میں نے سوچا۔ ''ضرور ہی ہوگی۔ بے وقوف عورت! اس کے پیٹ میں بات نہ سمائی ہوگی مگر اس نے یہ بات کس کی بیوی کو اور کب بتائی؟'' میں سوچ رہا تھا اور مجھے اپنی بیوی پر غصہ آ رہا تھا۔

''ابھی سے اتنے بدل گئے کہ کسی کو لفٹ ہی نہیں کرا رہے ہیں۔'' اصغر آ کر مجھ سے لپٹ گیا تھا۔

''یہ بات نہیں۔'' میں بولا۔ ''بلکہ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ تم لوگوں کو کس نے بتایا۔''

''میں نے ......'' کیشیئر دوسرے لوگوں کو ہٹا کر آگے آ گیا اور بولا۔ ''جب میں نے آپ کو پرائز بانڈ لا کر دیا تھا تو عادتاً اس کا نمبر اپنے پاس بھی نوٹ کر لیا تھا۔ کل جب نتیجہ آیا تو میں نے بھی نمبر ملایا۔ بہت بہت مبارک ہو عاقل صاحب! اب تو آپ کروڑ پتی ہو گئے۔''

''تم نے بہت بڑی بے وقوفی کی جو سب کو بتا دیا۔'' میں غصے سے بولا۔ ''اب تک یہ خبر نہ جانے کہاں کہاں پہنچ گئی ہوگی۔ اب انعام لینا تو درکنار میں گھر تک بھی پہنچ سکوں گا یا نہیں۔''

''کہتے تو تم سچ ہو۔'' اصغر بولا۔

''اب کیا کریں؟''

''کیا ساری باتیں یہیں کھڑے کھڑے ہوں گی۔ چلو اندر بلکہ اس مسئلے کا حل تلاش کرتے ہیں۔'' باس بولا اور پھر اسی کے کمرے میں محفل جم گئی۔

''ایسا کرتے ہیں کہ کسی کمپنی کے گارڈ بلوا لیتے ہیں۔''

''پاگل ہوئے ہو کیا۔ اگر ان کی نیت خراب ہو گئی تو......!'' دوسرے نے جواب دیا۔

''ایسا کرتے ہیں ہم سب جلوس کی شکل میں اسٹیٹ بینک چلتے ہیں۔ تم ہم سب کے درمیان رہنا وہاں سے پے آرڈر لے کر اسی طرح تمہارے بینک چلیں گے وہاں تم اسے جمع کر دینا۔''

''ماشاء اللہ کیا تجویز ہے۔'' اصغر طنزیہ بولا۔ ''یہ تو خود ہی اشتہار بنانے والی بات ہے اور پھر چلو تمہاری تجویز پر عمل کر کے یہ بینک میں پے آرڈر جمع بھی کرا دیتا ہے تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ گھر پہنچنے سے پہلے یا اس کے بعد اغوا نہیں ہوگا۔''

''تو پھر تم نے کیا سوچا ہے۔'' ایک صاحب نے ڈائریکٹ مجھ سے پوچھا۔

''یہی تو سمجھ نہیں آ رہا ہے۔'' میں بے بسی سے بولا۔ ''اور اب تو یہ خبر عام ہو گئی ہے۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا ہے بہت جلد کرنا ہے۔ خدا کے لیے کوئی قابلِ عمل تجویز بتاؤ۔''

مختلف لوگوں نے مختلف رائے دیں مگر میں نے جس تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا وہ یہ تھی کہ یہاں سے میں سیدھا گھر جاؤں۔ بال بچوں کو لوں اور امریکی سفارت خانے چلا جاؤں۔ وہاں پرائز بانڈ رکھ کر امریکا کا ویزا لگواؤں۔ بال بچوں کو وہیں چھوڑوں اور انہی کے گارڈز کے ساتھ اسٹیٹ بینک سے پے آرڈر لے کر واپس جاؤں اور انہی کی نگرانی میں امریکا نکل جاؤں۔ اس تجویز میں ایک قباحت تھی کہ پے آرڈر کے کیش ہونے اور اس کے بدلے بلیک مارکیٹ سے ڈالر خریدنے تک وہیں ٹھہرنا تھا۔ خیر اس مسئلے کا حل بھی تھا کہ کسی کرنسی ڈیلر کو وہیں بلوا لیا جاتا اور اس سے بلیک میں ڈالر خرید لیے جاتے۔ یہ بات اپنی جگہ تھی مگر میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ آیا امریکی سفارت خانے والے مجھے قبول کریں گے یا نہیں۔

میری بات سن کر سب نے فکر مندی سے مجھے دیکھا۔ میں نے آغا سے اس خیال کا اظہار کیا تو وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

بولا۔ ''کیوں نہیں کریں گے۔ تم کوئی خالی ہاتھ نہیں جا رہے ہو۔ بلیک سے بھی خریدو تو ڈھائی کروڑ کے لاکھوں ڈالر بنیں گے اور پیسے والوں کے لیے امریکی ویزا ہر وقت موجود رہتا ہے۔''

☆......☆

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں فوراً دفتر سے اٹھ گیا تھا۔ آغا نے ساتھ چلنے کی پیشکش کی تھی مگر میں نے اسے ٹال دیا تھا کیونکہ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ مجھے کسی پر بھروسا نہ تھا اور دوسرے یہ کہ وہ ابھی کسی کو اس معاملے میں ملوث کر کے اس کی بھی جان خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ میں اسٹاپ پر پہنچا تو دفتر کا ایک ساتھی افتخار پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ مجھے یہ شخص کبھی پسند نہیں آیا تھا۔ وہ ایک مفاد پرست اور مکار شخص تھا۔ جھوٹی خوشامد اور چاپلوسی کر کے اپنا فائدہ حاصل کرنا اس کا شیوہ تھا۔ چاہے اس میں کسی کا نقصان ہو جائے۔ اس شخص کو اس بات کی پروا نہ تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو خطرے کا احساس ہوا۔ میں اس سے نظر بچا کر گزرنا چاہتا تھا مگر وہ مجھ کو دیکھ کر تیر کی طرح میرے پاس آیا۔

''کیا حال ہے بھئی! جا رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں! تم یہاں کیسے کھڑے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ افتخار اچانک میٹنگ سے اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔

''میں سگریٹ خریدنے آیا تھا۔''

''تم کافی دیر سے باہر آئے ہو۔'' میں نے جرح کی۔

''وہ......وہ دراصل میں چائے پینے بیٹھ گیا تھا۔'' وہ بات بناتے ہوئے بولا۔ ''آؤ تمہیں بھی چائے پلاؤں۔''

میں نے محسوس کیا جیسے وہ میرے جلد آنے سے کچھ مضطرب سا ہے اور چائے کے بہانے مجھے روکنا چاہتا ہے۔ لہٰذا میں نے چائے پینے سے سختی سے انکار کر دیا اور افتخار کے روکنے کے باوجود جیسے ہی روٹ کی ویگن آ کر رکی میں اس میں سوار ہو گیا۔

ویگن میں سوار ہوتے وقت میں نے مڑ کر دیکھا تو نظر آیا کہ افتخار کے پاس آ کر ایک گاڑی رکی ہے اور اس میں سے دو افراد تیزی سے نکل کر افتخار کے پاس گئے ہیں۔ افتخار ان دونوں کو اشارہ کر کے میری صورت دکھا رہا تھا۔ ان میں ایک تیزی سے ویگن میں چڑھنے کے لیے آگے بڑھا مگر ویگن کی رفتار تیز ہو چکی تھی لہٰذا وہ پلٹ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دوسرا شخص پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا اور گاڑی ویگن کے پیچھے چلنے لگی۔

میں نے خوفزدہ نظروں سے یہ سارا منظر دیکھا اور سوچا۔ ''تو گویا کھیل شروع ہو گیا ہے۔ اب میں کیا کروں؟ میں جیسے ہی ویگن سے نیچے اتروں گا تو یہ مجھے چھاپ لیں گے اور یہ کھیل یہیں ختم ہو جائے گا۔''

میں زیادہ پریشان اس لیے بھی تھا کہ پچیس ہزار والا پرائز بانڈ جیب میں موجود تھا جو میں نے اس خیال سے جیب میں ڈال لیا تھا کہ اگر کوئی معقول طریقہ سمجھ میں آیا تو میں دفتر سے سیدھا اسٹیٹ بینک جا کر کلیم داخل کروں گا مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا تھا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اتنا انتظار نہ کریں اور رستے میں ہی ویگن رکوا کر مجھے اتار لیں۔'' اس خیال کے آتے ہی میں اور خوفزدہ ہو گیا۔ میرا ذہن تیزی سے اس صورتِ حال سے نجات حاصل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میری بقاء اسی میں تھی کہ میں انہیں پہل کرنے کی اجازت نہ دوں۔ میں نے مڑ کر دیکھا گاڑی ویگن کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ ان لوگوں کو شاید کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں اٹھ کر ڈرائیور کے پاس چلا گیا۔ ڈرائیور کے پاس جانے پر وہاں بیٹھی خواتین نے صدائے احتجاج بلند کی مگر میں نے ان کی پروا نہ کی۔ ''بھائی ڈرائیور!'' میں ڈرائیور سے بولا۔ ''تمہاری ویگن کے پیچھے جو سفید رنگ کی کار آ رہی ہے اس میں کچھ لوگ مجھے قتل کرنے کے لیے سوار ہیں۔ دشمنی تو انہیں مجھ سے ہے مگر وہ لوگ اتنے ظالم ہیں کہ مجھے قتل کرتے ہوئے دو چار اور لوگ بھی قتل کرنا پڑیں تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ ہو سکتا ہے اس ہنگامے میں تم بھی مارے جاؤ لہٰذا غور سے میری بات سنو۔ گاڑی کی رفتار تیز کر دو اور گاڑی سیدھی اس ایرانی ہوٹل کے سامنے لے جا کر روکنا جو تمہارے راستے میں آتا ہے۔'' میں نے ایک مشہور ایرانی ہوٹل کا نام لیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''رستے میں کہیں گاڑی مت روکنا چاہے اترنے والے مسافر کتنا ہی شور مچائیں۔ ان کے شور مچانے میں تمہاری اور میری بقا ہے کیوں کہ شور مچانے کی وجہ سے سڑک پر چلتے لوگ بھی.... ویگن کی طرف متوجہ ہو جائیں گے لہٰذا وہ لوگ حملہ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔''

''راستے میں گاڑی پولیس چوکی پر نہ لے جاؤں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ڈرائیور نے پوچھا۔

’’پاگل ہوئے ہو کیا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’کیوں کہ یہ تو کھائی سے بچ کر کنویں میں گرنے والی بات تھی۔ ’’اگر انہوں نے فائرنگ شروع کر دی تو سب سے پہلے پولیس والے ہی اپنی جانیں بچانے کو بھاگیں گے۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ وہ موقع واردات پر بھی اس وقت پہنچتے ہیں جب واردات کرنے کے بعد لوگ جا چکے ہوتے ہیں۔‘‘

’’اچھا ٹھیک ہے۔‘‘ ڈرائیور بولا۔

’’میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا میرے دوست!‘‘ میں نے کہا۔ ’’میں دروازے کے نزدیک جا رہا ہوں۔ تم بھی گاڑی ہوٹل کے بالکل سامنے روکنا۔‘‘

میں نے ایرانی ہوٹل پر اترنے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ میں اکثر اس ہوٹل کی مزیدار چائے پینے جاتا رہتا تھا اسی وجہ سے مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس ہوٹل کا ایک عقبی دروازہ بھی ہے جو عام لوگوں کے علم میں نہیں ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ میرے پیچھے آنے والے ایک تو رش میں مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں کریں گے اور دوسرے جب تک انہیں عقبی دروازے کا علم ہوگا میں ان کی پہنچ سے دور جا چکا ہوں گا۔

ویگن کے ایرانی ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے پبلک نے اس قدر شور مچایا تھا کہ ایک بار میں بھی بدحواس ہو گیا تھا کہ کہیں ڈرائیور رستے میں ہی گاڑی نہ روک لے مگر ڈرائیور نے گاڑی ایرانی ہوٹل پر ہی روکی تھی۔ یہ بھی میرے حق میں بہت اچھا ہوا کیوں کہ ایرانی ہوٹل پر میرے ساتھ بہت سے افراد اترے تھے۔ اترتے ہی میں نے مڑ کر دیکھا تو کار والے بھی ویگن کے عین پیچھے گاڑی روک چکے تھے اور اس کے دروازے کھل رہے تھے۔ میں نے تیزی سے ہوٹل کے اندر کی طرف دوڑ لگا دی اور عقبی دروازے سے نکل کر ایک گلی میں مڑ گیا اور وہاں سے مین روڈ پر آ گیا اور سامنے آتی ہوئی ویگن پر سوار ہو گیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟

’’ٹکٹ!‘‘ کنڈکٹر فوراً سر پر سوار ہو گیا۔

’’ویگن کہاں جا رہی ہے؟‘‘

’’کالونی۔‘‘

میں نے روپے جیب سے نکالے اور بولا۔ ’’آخری اسٹاپ۔‘‘

میں نے سوچا تھا ویگن میں مجھے اتنا وقت مل جائے گا کہ میں اپنا نیا لائحہ عمل طے کر لوں گا مگر مجھے اچانک خیال آیا کہ میں تو ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہوں مگر افتخار تو میرے گھر کا پتا بھی جانتا ہے لہٰذا وہ لوگ اس سے رابطہ کر کے سیدھے میرے گھر جائیں گے اور میرے بیوی بچوں کو یرغمال بنا کر مجھ سے پرائز بانڈ طلب کریں گے۔ اس وقت میں مجبور ہو جاؤں گا۔ میں نے سوچا کہ بیوی کو فون کر کے کہوں کہ وہ بچوں کو لے کر سالے کے گھر چلی جائے۔ میں وہاں پہنچوں گا۔ یہ خیال آتے ہی میں کھڑا ہو گیا اور ویگن کے رکتے ہی اتر گیا۔

دو تین دکانوں پر ٹرائی کرنے کے بعد آخر ایک دکاندار نے فون کرنے کی اجازت دے دی۔ میں نے اپنے پڑوسی کا نمبر ملایا کیوں کہ گھر میں فون نہیں تھا اور اس وقت تک موبائل فون عام نہیں ہوا تھا۔ پڑوسی اچھے تھے جو وقتاً فوقتاً فون کرنے پر میرا پیغام میری بیوی کو پہنچا دیتے تھے اگر کوئی ضروری بات ہوتی تو اسے بلا بھی دیتے تھے۔

فون پڑوسی کی بیوی نے اٹھایا۔

’’ہیلو! میں عاقل بول رہا ہوں فورا......‘‘ میں نے حسب عادت اپنا تعارف کرایا اور آگے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ پڑوسی کی بیوی نے بات کاٹ دی۔

’’عاقل بھائی!‘‘ وہ بولی۔ ’’آپ کہاں ہیں؟ آپ کے گھر دہشت گرد آ گئے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ بھابی اس وقت بچوں کو اسکول لینے گئی ہوئی تھیں۔ واپسی پر انہوں نے اپنے گھر کے سامنے ایک گاڑی کو رکتے دیکھا اور اس میں تیزی سے اتر کر دو افراد کو اپنے گھر کی طرف بڑھتے دیکھا تو گھر جانے کی بجائے یہاں آ گئیں۔‘‘

’’آسیہ کہاں ہے۔‘‘ میں بیچ میں بول پڑا۔

’’انہیں تو میں گاڑی میں بٹھا کر آپ کے سالے کے گھر چھوڑ آئی ہوں کیوں کہ انہیں اپنے گھر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ جاتے ہوئے بھابی نے مجھے دکھایا کہ ان میں سے ایک آدمی گلی کے نکڑ پر موجود ہے۔ میں واپس آئی تب بھی وہ وہاں موجود تھا۔‘‘

’’بہت شکریہ بھابی!‘‘ میں نے فون بند کرنا چاہا۔

’’عاقل بھائی! یہ سب کیا چکر ہے؟ آپ لوگ تو بہت شریف ہیں۔ کیا کسی سے دشمنی ہوگئی ہے یا پھر آپ نے غبن کر لیا ہے۔ میں نے بھابی سے بہت پوچھا مگر انہوں نے بھی کوئی بات نہیں بتائی۔‘‘

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

"یہ سب قسمت کا چکر ہے بھائی!" میں نے افسردگی سے کہا۔ "زندہ رہا تو بتاؤں گا۔" میں نے فون بند کردیا۔

دکان کے باہر میں ٹیکسی تلاش کرنے لگا کیونکہ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ جو لوگ اتنی جلدی میرے گھر پہنچ سکتے ہیں۔ جلد یا بہ دیر وہ میرے سالے کے گھر تک بھی پہنچ جائیں گے اور میں ان کے آنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا بلکہ میں اس شہر سے ہی نکل جانا چاہتا تھا کیوں کہ مجھے اندازہ تھا کہ یہ بات اب تک نہ جانے کن کن حلقوں تک پہنچ چکی ہوگی اور نہ جانے کون کون سے شکاری میری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ اور اس سے پہلے کہ میں شکار ہو جاؤں ... میں اپنا بچاؤ کرلینا چاہتا تھا۔

میں اپنے سالے کے گھر پہنچا تو میری بیوی بے چین و پریشان بیٹھی تھی۔ "جتنی جلدی ممکن ہوسکے یہاں سے نکل لو۔" میں چھوٹتے ہی بولا۔

"یہ سب کیا ہے۔"

"وہی بانڈ کا چکر، لوگوں کو علم ہوگیا ہے۔"

"مگر ہم کہاں جائیں گے؟"

"وہ کہیں بھی۔" میں نے کہا۔ "یہاں رہنا ان لوگوں کو بھی مصیبت میں ڈالنا ہے۔ ہمارے پاس ایک چانس ابھی باقی ہے اور میں وہ چانس لینا چاہتا ہوں۔ ٹیکسی باہر کھڑی ہے۔ تم فوراً اٹھ جاؤ۔ ہاں، اپنی بھابی سے کچھ پیسے اُدھار لے لینا۔"

ہم ٹیکسی میں گھر سے نکلے ہی تھے کہ ایک گاڑی آندھی طوفان کی طرح اس گلی میں داخل ہوئی۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی گاڑی تھی جو ویگن کا تعاقب کررہی تھی۔ "ہم بروقت نکل آئے۔" میں نے سوچا۔ "مگر یہ گھر والوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کریں۔ خدا کرے وہ بتادیں کہ ہم ٹیکسی میں نکل گئے ہیں، مزاحمت نہ کریں۔"

"اب کہاں چلوں صاحب!" ڈرائیور نے پوچھا۔ میں خیالوں سے باہر نکل آیا۔

"سیدھے امریکی سفارت خانے چلو۔" میں بولا۔

گاڑی سفارت خانے کی طرف جارہی تھی مگر میرے ذہن میں ایک بات چبھ رہی تھی۔ اچانک بات میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے ایک ٹیلی فون بوتھ دیکھ کر گاڑی رکوائی اور بوتھ کی طرف لپکا۔ بوتھ کے نزدیک پہنچ کر مجھے خیال آیا کہ جیب میں رکھا ہوا کارڈ تو بیکار ہے کیوں کہ گورنمنٹ نے کارڈ فون بند کردیے ہیں۔ میں پڑوس میں واقع دکان پر گیا اور خوش قسمتی سے دکاندار نے فون کرنے کی اجازت دے دی۔ میں نے دفتر فون کیا۔ فون باس نے ریسیو کیا تھا۔ "ہیلو! میں عاقل بول رہا ہوں۔" سلسلہ ملتے ہی میں بولا اور پوچھا۔ "کیا میرے جانے کے بعد افتخار دفتر آیا تھا۔"

"ہاں!" باس نے جواب دیا۔ "وہ کرید کرید کر تمہارے پروگرام کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"کیا آپ نے اسے بتادیا کہ میرا کیا ارادہ ہے۔" رئیس نے پوچھا۔

"اس میں چھپانے والی کیا بات تھی۔ آخر وہ دفتر کا قابلِ اعتماد شخص ہے۔"

میں نے مزید کچھ کہے بغیر فون بند کردیا اور واپس ٹیکسی میں سوار ہوتے ہوئے بولا۔ "اب سیدھے پنجاب کالونی چلو۔" کیوں کہ اب مجھے علم ہوگیا تھا کہ شکاریوں نے اپنا جال امریکی سفارت خانے کے گرد بھی پھیلا دیا ہوگا۔

پنجاب کالونی میں میرا ایک دوست ظفر رہتا تھا جب ہم پنجاب کالونی پہنچ گئے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ظفر ایک دفعہ صدر میں ملا تھا اس کی جیب کٹ گئی تھی۔ میں نے نہ صرف واپسی کا کرایہ دیا تھا بلکہ دوپہر کا کھانا بھی کھلایا تھا حالانکہ یہ سب کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنے پیسے ضائع کررہا ہوں کیوں کہ پیشہ ور مانگنے والوں نے ضرورت مندوں کا اعتبار بھی ختم کردیا ہے مگر پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی یہ ظفر کی شکل پر دکھائی دیتی شرافت تھی کہ میں نے اس کی مدد کردی تھی۔ ظفر میرا ممنون تھا اور بعد میں اس نے نہ صرف رقم دے دی تھی بلکہ جب بھی مجھ سے ملتا تو گھر آنے کی دعوت دیتا۔ اس نے یہ دعوت اتنی مرتبہ دی تھی کہ اب تو مجھے ظفر کا پتا زبانی یاد ہوگیا تھا۔

ظفر مجھے اچانک اپنے دروازے پر پاکر حیران ہوگیا اور بڑی گرم جوشی سے مجھے اندر لے گیا اور اپنے بال بچوں سے تعارف کروایا۔

"عاقل صاحب! آپ نے اچانک آکر مجھے حیران کردیا۔" رسمی سلام دعا سے جب فرصت ہوئی اور تنہائی ملی تو ظفر بولا۔ "مگر اس سے زیادہ حیرانی مجھے اس بات کی ہے کہ آپ لوگ بالکل گھر والے کپڑوں میں آئے ہیں، خیریت تو ہے ناں؟"

"خیریت ہی تو نہیں ہے۔" میں ایک گہری سانس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

لے کر بولا۔ ”کراچی کے حالات تو تم جانتے ہی ہو۔ بس اپنے محلے میں ایک گروپ سے بھتا دینے کے معاملے میں میری تلخ کلامی ہوگئی تو انہوں نے دوسرے دن گھر آ کر فائرنگ کردی۔ وہ تو مجھے جان سے مارنا چاہتے تھے مگر کسی طرح ہم وہاں سے جان بچا کر نکل آئے۔“ میری کہانی میں کئی جھول تھے مگر ظفر شاید سمجھ دار تھا لہٰذا اس نے بغیر کسی جرح کے یہ کہانی ہضم کرلی مگر اس کی بیوی کو یہ کہانی ہضم نہ ہوئی۔

اس رات مجھے نیند نہیں آرہی تھی لہٰذا میں تازہ ہوا کے لیے کمرے سے باہر نکل آیا مگر ظفر کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے ٹھٹک گیا۔

”فضول باتیں مت کرو۔“ مجھے ظفر کی آواز سنائی دی۔ ”وہ میرا دوست ہے۔ ایک دفعہ وہ مصیبت میں میرے کام آیا تھا۔ اب میرا فرض ہے کہ میں مصیبت میں اس کے کام آؤں۔ اس طرح کم از کم اس کا احسان تو اتر جائے گا۔“

”تمہیں احسان اتارنے کی پڑی ہے۔“ ظفر کی بیوی بولی۔ ”اور مجھے لگ رہا ہے جیسے ہم اس کی وجہ سے کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔“ ظفر بولا۔ ”وہ بہت شریف آدمی ہے۔“

”ہنہ شریف!“ اس کی بیوی نے کہا۔ ”وہ تو شکل سے ہی لوفر لگتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ دشمنی کا صرف بہانہ ہے۔ وہ کوئی غبن کرکے بھاگا ہے اور پولیس اس کے پیچھے ہے اور اگر پولیس یہاں تک آگئی تو تم بھی اسے پناہ دینے کے الزام میں دھر لیے جاؤ گے۔ اچھی خاصی بنائی عزت خاک میں مل جائے گی لہٰذا تم صبح ہی اسے چلتا کرو۔“

”یہ مجھ سے نہیں ہوگا؟“

”تو میں یہ کام خود کرلوں گی۔“

”میں تمہیں ہرگز اس کی اجازت نہیں دوں گا۔“ ظفر سختی سے بولا۔ ”اور اگر تم نے صبح ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو اچھا نہیں ہوگا۔“

میں اس سے زیادہ نہیں سن سکا اور اپنے کمرے میں آگیا۔ صبح ناشتے کے بعد میں نے ظفر سے کہا کہ ہم لوگ سی سائیڈ جارہے ہیں تو ظفر نے بھی ساتھ چلنے پر اصرار کیا مگر میں نے کہا ہم تنہا گھومنا چاہتے ہیں۔ میں اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر سی سائیڈ جانے کی بجائے بس اسٹاپ پر آیا اور سامنے نظر آنے والی پہلی بس پکڑی۔ ظفر کے گھر سے نکلتے ہوئے میں ایک رقعہ ضرور اس کے نام چھوڑ آیا تھا جس میں میں نے لکھا تھا کہ ہم سی سائیڈ نہیں تمہارے گھر سے کہیں اور جارہے ہیں لہٰذا ہماری واپسی کے لیے فکر مند مت ہونا اور مزید یہ کہ میں پولیس کے خوف سے نہیں تقدیر کے چکر میں بھاگ رہا ہوں۔

پنجاب کالونی سے ہم لوگ ناظم آباد جا اترے۔ ناظم آباد سے میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ بچپن اور جوانی یہیں گزرے تھے۔ یہاں کی ایک ایک گلی کو میں نے پیدل چل کر دیکھا تھا مگر میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں یہاں اس حال میں آؤں گا کہ جان کے لالے پڑے ہوں گے۔ یہاں ایک دو نزدیکی رشتے دار بھی رہتے تھے مگر ان کی طرف جانے کی بجائے میں نے اپنے بچپن کے ایک دوست کے دروازے پر جا کر دستک دی کیوں کہ میرا خیال تھا کہ شکاری کورنگی میں میری تلاش میں مایوس ہوکر شہر کے مختلف حصوں میں مجھے یا تو ہوٹلوں میں تلاش کریں گے یا پھر رشتہ داروں میں۔ دوستوں کی باری تو بعد میں آئے گی۔

آج بدھ کا دن تھا۔ میرا خیال تھا کہ میرا دوست انور ڈیوٹی پر گیا ہوگا مگر جب پہلی دستک کے جواب میں دروازہ کھولنے خود انور باہر آیا تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”آؤ! آؤ.....!“ وہ باہر نکل کر گلے لگتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔“

”کیوں؟“ اس کی بات سن کر میں ہونقا سا رہ گیا۔

”کیا وہ مجھ سے پہلے یہاں پہنچ گئے تھے؟“ میں نے سوچا۔

”اندر تو آؤ پھر بتاتا ہوں۔“ انور بولا۔

”پہلے بتاؤ پھر اندر آؤں گا۔“ وہ اندر جاتے ہوئے ڈر رہا تھا کیا پتا اندر شکاری گھات لگائے بیٹھے ہوں اور جیسے ہی میں اندر جاؤں وہ مجھے دبوچ لیں اور میری ساری محنت اور بھاگ دوڑ رائیگاں جائے۔

”ابے اندر آ۔“ انور نے ہاتھ پکڑ کر اندر کی طرف کھینچا تو میں ڈر گیا خوف سے رنگ سفید ہوگیا ہوگا۔ میں اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگنے ہی والا تھا کہ انور نے دروازے کی طرف منہ کرکے آواز لگائی۔ ”ارشد! عابد! نسرین!“ دیکھو کون آیا ہے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ اندر خیریت ہے۔

اتنی دیر میں اندر سے انور کے بچے اور بیوی نکل آئی۔ میں نے انہیں دیکھ کر سکون کا گہرا سانس لیا اور اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی خواتین اور بچے ایک دوسرے سے باتوں میں مشغول ہو گئے اور انور میرا ہاتھ پکڑ کر سیدھا اپنے کمرے میں لے گیا۔

''یہ دیکھ!'' انور نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر شام کا اخبار اٹھایا اور مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اشتہار تیرے بارے میں آج ہی چھپا ہے بمعہ تیری تصویر کے۔''

میں نے اخبار اس کے ہاتھ سے جیسے جھپٹ لیا اور اشتہار پر نظریں دوڑانے لگا۔

اشتہار میں اوپر ہی میری تصویر دی ہوئی تھی اور نیچے لکھا تھا۔ ''عاقل الدین ولد تنویر جن کی دماغی حالت صحیح نہیں ہے، پچھلے دو تین دنوں سے لاپتا ہیں جو صاحب بھی انہیں دیکھیں، نیچے دیے ہوئے فون پر اطلاع کریں یا اپنے پاس روک کر ہمیں اطلاع کریں۔ انہیں دیکھنے والے یا اپنے پاس روک کر اطلاع دینے والے کو ایک لاکھ روپے انعام دیا جائے گا۔'' نیچے فون نمبر دیا ہوا تھا۔

''تو شکاریوں نے میرے راستے میں پھندے لگانا شروع کر دیے ہیں۔'' میں نے اشتہار پڑھ کر ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے سوچا اور اپنے دوست کی طرف دیکھا۔

وہ بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''تمہاری تو لاٹری کھل گئی۔'' میں انور کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''فوراً انہیں اطلاع کرو۔ تمہیں تو ایک لاکھ ضرور مل جائیں گے۔''

''تم مجھے اتنا کمینہ سمجھتے ہو؟'' انور ناراض ہو گیا اور بولا۔ ''تو پھر میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟''

''میرا مطلب یہ نہیں تھا۔'' میں جلدی سے بولا۔ ''بس حالات کی گردش کی وجہ سے بلا ارادہ یہ بات منہ سے نکل گئی۔ آئی ایم سوری۔''

''تمہیں پتا ہے اس اشتہار سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم کسی مصیبت میں ہو اور میری چھٹی حس یہ کہہ رہی تھی کہ تم میرے پاس ضرور آؤ گے لہٰذا یہ اشتہار پڑھنے کے بعد میں آفس سے بھاگم بھاگ گھر آیا ہوں۔ تم بھول گئے کہ دروازے پر تمہاری شکل دیکھتے ہی میں نے کہا تھا کہ آؤ آؤ مجھے تمہارا ہی انتظار تھا اور تم نے اتنی بڑی بات کہہ دی۔'' وہ بدستور ناراض تھا۔

''یار میں نے سوری تو کر لیا ہے۔'' میں بولا۔ ''اب غصہ تھوک دو۔''

''تمہاری معافی اس وقت قبول کروں گا جب تم مجھے پورا قصہ سناؤ گے۔''

''سارا واقعہ سنا دوں گا مگر پہلے کچھ ناشتے پانی کا انتظام کرو ہم لوگ بھوکے ہیں۔ رستے میں کچھ پھل اور چائے پر ہی گزارہ کیا ہے۔''

''نسرین'' انور نے میری بات سننے کے بعد اپنی بیوی کو آواز دی۔

''جی! وہ دوڑی چلی آئی۔

''بھئی ان لوگوں کے لیے تگڑا سا ناشتا بناؤ اور بھابی بچوں کو باتھ روم دکھاؤ تاکہ وہ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو لیں۔'' وہ اپنی بیوی سے بولا اور پھر میری طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''اور تم سیدھے اس باتھ روم میں گھس جاؤ۔ تمہارے نہانے دھونے تک ناشتا تیار ہو جائے گا۔ ہاں تمہارا سامان کہاں ہے۔ تمہارے کپڑے نکلوا دوں۔''

''سامان!'' میں ہنسا۔ ''سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں ہے۔''

''اچھا اچھا میں سمجھ گیا میں تمہیں اپنے کپڑے نکال دیتا ہوں وہی پہن لینا۔''

☆

میں نہا دھو کر آیا تو بیوی بچے بھی تازہ دم لگ رہے تھے۔ انہوں نے انور کے بچوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بیوی نے البتہ وہی لباس پہنا ہوا تھا۔

''ایک دن میں ہی کتنا کچھ بدل گیا ہے۔'' میں نے انہیں دیکھ کر سوچا۔ ''بیوی کے چہرے کی رونق ختم ہو گئی ہے اور بچے بھی سہمے سہمے اور پریشان سے ہیں۔ آخر اپنے لالچ میں، میں انہیں کس بات کی سزا دے رہا ہوں۔ اس منحوس بانڈ سے جان کیوں نہیں چھڑا لیتا۔''

''نہیں! یہ میرا حق ہے۔ میں اس حق سے کیسے دستبردار ہو جاؤں۔ مجھے لڑنا ہے۔ مجھے اپنا حق حاصل کرنا ہے۔'' ایک دوسری سوچ میرے اندر سے ابھری۔

''ناشتا کرو بھائی! کہاں کھو گئے؟'' انور کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا ناشتا لگ چکا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''ہاں! اب بتاؤ۔'' ناشتے کے بعد جب ہم تنہا ہوئے تو انور نے پوچھا۔

میں نے سارا قصہ سنا دیا۔

''امریکی سفارت خانہ تو اسلام آباد میں بھی ہے۔ تم وہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟'' انور نے پوچھا۔

''کہتے تو تم سچ ہو۔'' میں چونک گیا اور بولا۔ ''حیرت ہے' یہ خیال میرے ذہن میں پہلے کیوں نہیں آیا بلکہ اب تو میں سوچ رہا ہوں امریکا نہ سہی' کسی اور مغربی ملک کے سفارت خانے چلا جاؤں۔''

''یہ تم نے دیر سے سوچا۔'' انور بولا۔ ''اب تو تمہارا گھر سے نکلنا ہی مشکل ہو جائے گا۔ شکاریوں نے تمہارے تمام رستوں میں پھندے لگا دیئے ہیں۔ اب گھر سے نکلتے ہوئے تمہیں کسی نے شناخت کرلیا تو تمہیں جان بچانا مشکل ہو جائے گی۔ ایک لاکھ روپیا بڑی چیز ہوتی ہے۔''

''یار! تو یہ ہے۔''

''خیر! اس مشکل کا بھی کوئی حل نکالتے ہیں۔ تم آرام کرو۔ میں باہر کا جائزہ لے کر واپس آتا ہوں تو پھر کوئی مشورہ کرتے ہیں۔''

انور کے جانے کے بعد میں نے بستر سے کمر ہی ٹکائی تھی کہ انور کا فون آ گیا۔ نسرین نے مجھے انور کے فون کی اطلاع دی تھی۔ میں اٹھ کر فون تک گیا۔

''ہیلو!'' میں ریسیور کان سے لگا کر بولا۔

''تم فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ۔'' انور چھوٹتے ہی بولا۔

''کیوں؟'' میں اس کی بات سن کر حیرت زدہ ہو گیا اور پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''ڈر گئے کمینے شخص! یہ بات تم میرے منہ پر بھی کہہ سکتے تھے۔ باہر جا کر فون پر کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنی اخلاقی جرأت تو تم میں ہونی چاہیے تھی۔''

''احمق آدمی!'' انور غصے سے بولا۔ ''پہلے میری بات تو سن لو۔''

''بولو!'' میں نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا ورنہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اگر انور سامنے ہوتا تو میں مار مار کر اس کا کچومر نکال دیتا۔

''میں نے ابھی ابھی فون کیا تھا تا کہ حالات کا جائزہ لے سکوں۔''

''کسے فون کیا تھا؟''

''تمہارے سالے کو اور کسے؟ وہی تو ایک فون نمبر میرے پاس تھا جس پر میں تم پر رابطہ کرتا ہوں یا کوئی پیغام دیتا ہوں۔''

''کیا کہا اس نے؟'' میں نے انور کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''وہی تو بتا رہا ہوں۔'' انور نے جواب دیا۔ ''اس نے کہا فی الحال اپنے گھر واپس آنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ تمہاری گلی میں مشتبہ آدمی ہر وقت موجود رہتے ہیں مگر سب سے اہم بات جو اس نے بتائی کہ انہوں نے اس کے گھر بھی چھاپا مارا تھا اور اس سے تمہارے تمام رشتے داروں اور دوستوں کے پتے پوچھے تھے۔ اس نے رشتے داروں کے علاوہ میرا پتا بھی بتا دیا ہے۔ وہ اس پر شرمندہ بھی تھا مگر تشدد اور بچوں کی جان کے خیال نے اسے سب کچھ بتانے پر مجبور کر دیا۔ وہ خود بھی مجھے فون کرنا چاہ رہا تھا مگر اس کے پاس میرا نمبر نہیں تھا۔ اسی لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ تم فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ کیوں کہ دیر نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ شکاریوں کا کوئی پتا نہیں کہ وہ کب میرے گھر تک پہنچ جائیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم....'' میں نے کچھ کہنا چاہا۔

''پوری بات تو سن لیا کرو جلد باز آدمی!'' انور بولا۔ ''تم ایسا کرو کہ آگے جانے کی بجائے واپسی کا سفر اختیار کرو اور بہتر ہوگا کہ تم بجائے بس کے ٹیکسی ہائر کر لو۔ پیسوں کی فکر نہ کرنا۔ اپنی بھابی سے لے لینا۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے۔ میں تمہیں واپس جانے کا یوں کہہ رہا ہوں کہ اگر وہ لوگ مجھ تک پہنچ جاتے ہیں تو میں انہیں اسلام آباد کا راستہ دکھا دوں گا۔''

''مگر میں واپس کہاں جاؤں گا؟ اپنے گھر؟'' میرا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔

''سہیل کے پاس' اسے بھول گئے تم؟''

سہیل کا نام سن کر میرے ذہن پر سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ سہیل میرا کلاس فیلو تھا۔ وہ بہت پُرخلوص اور سیدھا سادا سا تھا۔ وہ یقیناً میری مدد کرے گا۔ ویسے بھی شکاریوں کے ذہن میں نہیں آئے گا کہ میں اس دور دراز علاقے قصبہ کالونی میں چھپا ہوا ہوں۔ وہاں ٹھہرنے کے لیے کافی وقت مل جائے گا لہٰذا میں اس معاملے کو حل کرنے کے لیے بہتر طور پر سوچ سکتا ہوں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

مجھے سہیل کے پاس آئے ہوئے ایک گھنٹا ہو گیا تھا۔ میں نے انور کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے یہاں تک کا سفر ٹیکسی میں کیا تھا مگر عقلمندی یہ کی تھی کہ بجائے مسلسل سفر کرنے کے میں نے دو تین ٹیکسیاں بدلی تھیں۔ اس تمام عرصے میں اور سفر میں، میں نے خود کو بیمار ظاہر کرتے ہوئے اپنا چہرہ زیادہ تر چھپائے رکھا تھا۔ سہیل میری یوں اچانک بچوں سمیت آجانے پر پہلے تو حیران ہوا تھا اور پھر بہت خوش۔ وہ جی سے ہماری خدمت میں لگ گیا تھا۔ نہ صرف وہ بلکہ اس کے گھر والے بھی اس قدر خلوص اور اپنائیت سے پیش آرہے تھے جیسے میں سہیل کا دوست نہ ہوں بلکہ ان کا عزیز یا رشتے دار ہوں۔

''تم لوگ اس طرح اچانک آئے ہو۔ خیریت تو ہے نا؟'' سہیل نے پوچھا تھا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ تمہیں تو پتا ہے کہ میری طبیعت ذرا ایڈونچری ہے۔'' میں جو اسے اصل بات بتاتے بتاتے گول کر گیا تھا، اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''بہت عرصے سے تم سے ملنے کا پروگرام بنا رہا تھا مگر ہر دفعہ کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آجاتی تھی۔ میں نے سوچا اس طرح تو جانا نہیں ہوگا اچانک پروگرام بنا کے نکلنا ہوگا سو......''

''تم مجھے اصل بات نہیں بتانا چاہتے تو نہ سہی۔'' سہیل میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''میرے لیے یہی بہت ہے کہ تم نے مجھے اپنا سمجھ کر میرے در پر دستک دی ہے۔ تمہارا جب تک جی چاہے یہاں رہو تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

وہ تو اپنی بات کہہ کر نکل گیا تھا مگر میں اپنی جگہ پر شرمندہ سا ہو گیا اور میں نے سوچا کہ سہیل کو بلا کر ساری صورتِ حال سے آگاہ کردوں مگر مصلحت نے زبان پر تالے ڈال دیے تھے کیوں کہ میں چاہتا تھا کہ پہلے انور کی طرف سے کوئی خیر خبر آجائے تو پھر اس کے مطابق سہیل سے بات کی جائے۔

آج تیسرا دن تھا اور انور کا کوئی فون یا خبر نہیں آئی تھی۔ ان تین دنوں میں سہیل یا اس کے گھر والوں نے ہم سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ سہیل بھی جیسے وہ بات کر کے بھول گیا تھا اور ان تین دنوں میں میرا دماغ مختلف سوچوں اور اندیشوں سے اس قدر بھر گیا تھا کہ میں حواس باختہ سا ہو گیا تھا۔ مجھے اپنی بیوی سے بھی کھل کر بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

میں آج بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ آخر کب تک میں اس جگہ پر اپنے دوست کے لیے مصیبت بنا رہوں گا۔ کب تک اس کا زبردستی مہمان بنا رہوں گا۔ مجھے خود ہی کچھ کرنا چاہیے۔ آج میرا جی شدت سے چاہنے لگا تھا کہ میں کم از کم سہیل کو تمام بات بتادوں اور اپنے جی کا بوجھ ہلکا کرلوں اور کسی طرح یا تو رقم حاصل کرلوں یا پھر اس بوجھ سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنی نارمل لائف کی طرف لوٹ جاؤں۔

''عاقل! کس سوچ میں ڈوبے ہو؟'' سہیل اندر داخل ہوتے ہوئے بولا تو میں چونک گیا۔

''تم تو جب سے آئے ہو گھر سے نکلتے ہی نہیں مگر آج تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا کیوں کہ آج بہت اہم شخصیت ہمارے علاقے میں آرہی ہے۔'' سہیل مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر بولا۔

''کک...... کیا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔ ''کون شخصیت آرہی ہے۔''

موساد

اسرائیل کی پُراسرار اور دہشت گرد تنظیم (قیام 1944ء) اس تنظیم کو تربیت یافتہ عسکری مدد بھی حاصل ہے۔ اس کے ایجنٹوں نے متعدد عرب ممالک میں حکومتوں کے تختے الٹنے، وہاں خانہ جنگیوں میں پسندیدہ گروہوں کی مدد کر کے انہیں کامیاب کرادیا اور ناجائز ذرائع کے ذریعے اسرائیل کے لیے یورینیم کی فراہمی کا انتظام کیا۔ عراق اور فرانس میں متعدد مقامات پر بم دھماکے کروائے۔ موساد عرب ریاستوں کے باہمی نفاق کو مزید ہوا دینے اور ان کے رہنماؤں کے مابین غلط فہمیاں پیدا کرنے کے لیے خصوصی تربیت یافتہ ٹیموں سے کام لیتی ہے۔ یہ بڑی مضبوط تنظیم ہے اور اسے مقصد کے حصول کے لیے ہر جائز یا ناجائز طریقے اور زیادہ سے زیادہ رقم خرچ کرنے کی بھی اجازت ہے۔

مرسلہ: رہبر عثمانی۔ حیدرآباد

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

''ہے ایک اہم شخصیت۔'' سہیل نے اس کا نام بتایا تو میں چونک گیا۔
''کیا وہ اچانک آرہے ہیں؟'' میں نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔
''یہ پروگرام تو بہت دنوں سے طے تھا مگر ان کے پاس وقت نہ ہونے سے ٹلتا رہا۔''
''کیسا پروگرام؟''
''دراصل انہیں ایک سڑک کا افتتاح کرنا ہے۔ ویسے تو افتتاح کرنے کوئی بھی آسکتا تھا مگر یہ علاقہ کئی پارٹیوں کے ووٹرز میں بٹا ہوا ہے اس لیے اہمیت کا حامل ہے لہٰذا اس کا افتتاح وہ خود کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ مستقبل میں ان کی پارٹی کے کارناموں میں یہ بھی درج ہوگا۔''
''مگر تم نے پہلے کبھی ذکر نہیں کیا؟''
''تم اپنے حواس میں ہو تو تمہیں کچھ بتاؤں۔ یا پھر تم اگر گھر سے باہر نکل کر دیکھتے تو تمہیں خود اندازہ ہو جاتا کہ ان کی آمد کی وجہ سے علاقے میں کس قدر صفائی ستھرائی ہو رہی ہے اور خوشی منائی جا رہی ہے۔ بہرحال آج تو تمہیں میرے ساتھ چلنا ہی ہوگا تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ تمہارے بھائی کی کتنی عزت ہے۔''
''یار! ناراض نہ ہونا۔'' میں نے اس کی بات سن کر کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔''
''کیوں؟'' وہ میرے صاف انکار سے حیران رہ گیا تھا۔
''اس لیے کہ اس اہم شخصیت کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ آئیں گے اور مجھے خدشہ ہے کہ ان میں سے کوئی مجھے پہچان نہ لے اور اگر مجھے کسی نے پہچان لیا تو میرے ساتھ تمہارے لیے بھی مصیبتوں کے دروازے کھل جائیں گے جو میں نہیں چاہتا۔''
''اگر تم مجھے بتانا پسند کرو گے کہ تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے تو شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔''
''بیٹھ جاؤ۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''آج میں خود بھی یہی چاہ رہا تھا کہ تمہیں ساری بات بتا دوں۔''

☆

''مجھے پہلے ہی دن شک ہوا تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ضرور ہے مگر یہ مسئلہ اتنا بڑا ہوگا اس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔'' سہیل میری پوری بات سننے کے بعد بولا۔ ''بہرحال مسئلہ جتنا بڑا ہوتا ہے اس کا حل اتنا ہی آسان ہوتا ہے۔ تمہارے مسئلے کا بھی ایک آسان حل ہے۔''
پھر وہ مسئلے کا حل بتانے لگا۔ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ بولا۔ ''یہ آسان طریقے سے اس کا حل ہے۔ بہرحال پھر بھی تم شام تک سوچ لو۔ اس کے بعد جیسا تم کہو گے ہم ویسا ہی کرلیں گے۔''

☆

شام کو سہیل اور اس کے والد کے ہمراہ میں اس مقتدر شخصیت سے ملنے جا رہا تھا کیوں کہ میں نے شام تک سوچنے کے بعد یہی فیصلہ کیا تھا کہ سہیل کے بتائے ہوئے حل میں ہی نجات ہے۔
وہ اہم شخصیت اس وقت جس گھر میں موجود تھی۔ اس کے گرد سخت پہرہ تھا مگر چونکہ میں سہیل اور اس کے والد کے ہمراہ تھا لہٰذا ہمیں کسی نے نہیں روکا اور ہم آسانی سے اندر پہنچ گئے۔
''کیا بات ہے؟'' علاقے کا سرکردہ شخص جس کا وہ گھر تھا جہاں وہ شخصیت ٹھہری ہوئی تھی اس نے سہیل کے والد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے صاحب کو ٹھہرنے کو کیوں کہا ہے۔ تمہیں پتا نہیں ان کا وقت کتنا قیمتی ہے۔ اگر انہیں تمہاری بات سن کر کوئی فائدہ نہ ہوا تو پھر تمہاری خیر نہیں ہے۔''
''پتا ہے جی!'' سہیل کے والد بولے۔ ''اسی لیے تو اس بچے کو لایا ہوں۔'' انہوں نے میری طرف اشارہ کیا اور بولے۔ ''آپ اس کی بات سن لیں۔''
ان کا اشارہ پا کر میں آگے بڑھا۔ پھر اپنی جیب سے پرائز بانڈ نکالا اور اسے اپنے دونوں ہاتھوں پر رکھ کر نذرانہ پیش کرنے کے انداز میں اس بڑی شخصیت کے سامنے جھکتے ہوئے بولا۔ ''سر جی! یہ آپ کے لیے ہے۔ مجھے صرف ۱۰ پرسنٹ کمیشن دے دیں۔''
بڑے صاحب نے الٹ پلٹ کر بانڈ کو دیکھا پھر مسکرا کر بولے۔ ''مجھے تو کب سے اس بانڈ کا انتظار تھا۔ تمہاری خواہش ضرور پوری ہوگی مگر دس نہیں پانچ پرسنٹ۔''
میں نے خوش ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ تب سے میں مکمل آرام سے ہوں اور علاقے والے بھی عزت کرنے لگے ہیں کیونکہ وہ بڑی شخصیت ایک بار میرے گھر بھی آ چکی ہے مجھے پانچ پرسنٹ دینے کے لیے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

www.paksociety.com

سکورا

محترمہ عذرا رسول

سلام تہنیت

سکُورا کا درخت جاپان میں مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ کئی روایتوں میں ثابت کیا گیا ہے کہ یہ محبت کرنے والوں کا درخت ہے۔ اسی درخت کو مرکز بنا کر میں نے ایک کھو گئی محبت کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر شمیم احمد

(لندن)

اور آج میں دوبارہ اسی سکورا یعنی چیری بلازم کے درخت کے سایہ میں بیٹھا ہوں، جس جگہ آج سے تین سال قبل پہلی بار بیٹھا تھا۔ شاید یہ ماحول کا اثر تھا کہ میرا ذہن ماضی کی طرف چلا گیا۔

تین سال قبل میں جاپان کے شہر اوسا کا پہنچا تھا۔ میں نے کراچی یونیورسٹی سے فزکس میں ایم ایس سی کیا تھا اور جاپان کے اسکالرشپ پر پی ایچ ڈی کرنے آیا تھا۔ اس زمانے میں فزکس ایک اہم سبجیکٹ مانا جاتا تھا کیونکہ چند

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | PAKSOCIETY

www.paksociety.com

سال قبل امریکا نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر ان دونوں شہروں کو تباہ کردیا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر زخم زخم جاپان نے عالمی طاقتوں سے استدعا کی کہ نیوکلیائی علم کو صرف انسان کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا جائے۔ شاید اسی وجہ سے عام لوگوں کی دلچسپی فزکس میں بڑھ گئی تھی۔ ہم جیسے لوگ بھی انسانی فلاح کی خاطر اس سبجیکٹ میں ڈگری لینے کے لیے جاپان کا رخ کرنے لگے تھے۔

پاکستان سے جدائی کے وقت ابا جی نے مجھے گلے لگا کر الوداع کہا تھا اور سمجھا بجھا کر روانہ کیا تھا کہ میں دل لگا کر پڑھائی کروں۔ امی جان نے روتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دی تھیں۔ نم ناک آنکھوں سے بولی تھیں۔ ”بیٹا پڑھائی ختم کرنے کے فوراً بعد وطن واپس آجانا۔ یہ زمین اور یہاں کی مٹی تمہارا انتظار کرے گی۔ تمہیں واپس آکر اپنے ملک کی خدمت کرنی ہے۔“ اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ میری چھوٹی بہنا نکہت نے کانا پھوسی کی تھی۔ ”بھیا جاپان سے جاپانی بھابی مت لانا۔ البتہ میرے لیے ایک جاپانی گڑیا ضرور لانا۔“ پھر ڈھیر سارے دوستوں نے پھولوں کے ہار پہنا کر الوداعی سلام دیا تھا۔

جاپان آنے کے چند دن تک بڑی گھبراہٹ رہی۔ دن اور رات پریشانی میں گزرے۔ بار بار ابا، امی اور چھوٹی بہنا کی یادیں ستانے لگیں۔ بہنا کی یاد زیادہ ستاتی کہ وہ روتے ہوئے بولی تھی۔ ”بھیا کس طرح یہ تین سال بیت گے۔ آپ وہاں وقت کیسے گزاریں گے۔ کیا آپ کو ہم لوگوں کی یاد رلائے گی نہیں؟“

”ارے پگلی دیکھنا یہ تین سال کتنی آسانی سے اور جلد گزر جائیں گے۔“ میں نے تسلی دینے کی خاطر جواب دیا تھا۔

ابتداء میں تین سال تو کیا تین دن گزارنا مشکل نظر آرہے تھے۔

یوں تو جاپان کئی لحاظ سے بہت اچھا ملک ہے لیکن یہاں زندگی گزارنا خاص طور پر ہم پاکستانیوں کے لیے بڑی مشکل ہے۔ دن تو لیبارٹری میں کام کرتے گزر جاتا تھا لیکن راتیں تنہائی میں گھر کے اندر گزارنا پڑتی تھیں۔ دوسری مشکل یہاں کا کھانا تھا بغیر مرچ مسالوں کے، کچی پکی مچھلیاں اور چاول......! انہیں نگلنا بھی جوئے شیر لانا تھا۔ تیسرے یہاں کی زبان جس سے میں نابلد تھا۔ ان دنوں یہاں کی یونیورسٹی میں پاکستانی خال خال نظر آتے تھے۔ اس لیے زیادہ وقت گھر پر ہی گزارنا پڑتا تھا۔ گھر میں ٹی وی تھا لیکن اس پر بھی تمام پروگرام جاپانی زبان میں نشر ہوتے تھے۔ اس لیے وہ بھی بیکار رہتے تھے۔ البتہ گھر میں ایک وی سی آر موجود تھا جس پر میں کبھی کبھی لائبریری سے ویڈیو فلم لاکر دیکھ لیتا تھا۔ ایک دن اتنا اداس ہوا کہ میں سوچنے لگا کہ سب کچھ چھوڑ کر پاکستان واپس چلا جاؤں لیکن فون پر ابا جی نے ہمت بندھائی۔ امی کی دعاؤں نے دل پر اثر کیا اور بہنا نے پیاری پیاری باتوں سے دل بہلایا تو میں نے فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو میں ہمت نہیں ہاروں گا اور ہر مشکل کا مقابلہ کروں گا۔

شروع دنوں میں جاپانی کھانا مشکل سے حلق سے اترتا تھا پھر آہستہ آہستہ میں نے رغبت پیدا کرنے کی کوشش کی اور ایک دن یونیورسٹی کی کینٹین میں جاکر جاپانی کھانا کھانے کا ارادہ کیا۔ کھانے کی قیمت ادا کرنے کے بعد اپنی ٹرے اٹھائے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑانے لگا کہ بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نظر آجائے تو وہاں بیٹھ کر یہ بدمزہ کھانا حلق سے نیچے اتاروں۔

کینٹین میں اچھی خاصی بھیڑ تھی اور اس بھیڑ کے باوجود فضا خاموش تھی اور سب لوگ سر جھکائے کھانوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس وقت میری نظر ایک ٹیبل پر پڑی جہاں ایک جاپانی دوشیزہ سر جھکائے کھانے میں مصروف تھی۔ اس ٹیبل کی دوسری طرف ایک خالی کرسی تھی۔ فاصلہ خاصہ تھا اس لیے لڑکی کی شکل دیکھ نہیں پایا تاہم اس خالی کرسی پر جاکر بیٹھنے کا فیصلہ کرلیا۔

نزدیک پہنچ کر میں نے معذرت کے ساتھ پوچھا۔

”اگر اجازت ہو تو میں یہاں بیٹھ جاؤں؟“

”شوق سے۔“ ایک سریلی آواز نے کانوں میں رس گھول دیا ہے۔ ”شکریہ“ کہہ کر میں بیٹھا تو اس نے اچٹتی نگاہ مجھ پر ڈالی تھی پھر اپنا رخ چاپ اسٹک اور پلیٹ کی طرف کرلیا تھا۔

اس دبیز خاموشی نے میرے اندر کچھ بے چینی پیدا کردی اور میں نے خاموشی کو توڑنے کے لیے ہمت جمع کرنا شروع کردیا۔

”کیا آپ بھی اسی یونیورسٹی کی طالبہ ہیں۔“ میں نے اپنا سوال داغا۔

”جی نہیں۔ کسی اور کی۔“ جواب پھر بے حد مختصر تھا۔

”اس شہر میں۔“ خاموشی کو میں نے دوبارہ جھنجوڑا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''جی ہاں۔''

پتا نہیں یہ جاپانی لڑکیاں گفتگو میں اتنی کنجوسی کیوں کرتی ہیں۔ میں نے دل میں سوچا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ اس شہر میں ایک اور یونیورسٹی ہے۔'' میں نے ایک اور جملہ ادا کیا۔

''جی ہاں ایک اور یونیورسٹی ہے۔'' یا خدا پھر وہی کنجوسی، گرچہ انگریزی وہ اچھی بول رہی تھی۔ اب میں نے بھی اپنی بزدلی کو بالائے طاق رکھ لیا۔ ''کیا نام ہے اس کا۔''

''گائی دائی۔''

''انوکھا لیکن اچھا نام ہے، تو آپ گائی دائی میں کون سا سبجیکٹ پڑھ رہی ہیں؟''

''اردو۔'' اب میرے چونکنے کی باری تھی۔

''اردو۔'' نوالہ میرے منہ سے گرتے گرتے بچا۔

''اس کا مطلب ہے آپ اردو جانتی ہیں۔ پھر کیوں نہ ہم لوگ اسی زبان میں باتیں کریں۔''

اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔'' میں نے اردو میں جواب دیا۔

''آپ سے بھی مل کر۔'' اس کی میٹھی آواز کانوں میں رس گھول گئی۔ اس اتفاق پر مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ جاپان میں میری ملاقات ایک جاپانی دوشیزہ سے ہوگی جو اردو میں مجھ سے بات کرے گی۔

اب اس نے پوری طرح اپنے چہرے کو اوپر اٹھایا۔ اس کی ہلکی سی مسکراہٹ نے میرے دل پر ایک بجلی سی گرا دی۔ سامنے ایک جاپانی لڑکی بلکہ اسے جاپانی گڑیا کہا جائے تو بہتر ہوگا، موجود تھی۔ گورا رنگ، سیاہ بال جو شانوں تک لٹک رہے تھے۔ ستواں ناک، چھوٹی مگر خوب صورت آنکھیں، بوٹا سا قد۔ سچ پوچھیے تو پہلی نظر میں ہی مجھے ایسا لگا کہ میں اسے اپنا دل دے بیٹھا ہوں اور وہ تو بے شکن میرے سامنے ایک مورت بنی بیٹھی تھی۔ اس وقت میں نے ایک فیصلہ کیا۔ مجھے ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا ہے۔ پھر گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے میں نے اپنا تعارف کرایا۔

''میرا نام ارسلان ہے۔ ارسلان احمد اور میں پاکستان کے شہر کراچی کا ہوں۔ آج کل اوساکا میں پی ایچ ڈی کے لیے آیا ہوں۔ اُمید ہے تین سال یہاں رہنا ہوگا۔ اور آپ؟''

''میرا نام سومیکا ہے۔ سومیکا ہیاشی۔ میں آپ کے شہر کراچی میں ایک سال رہ چکی ہوں۔ میرے والد کو کمپنی والوں نے وہاں برانچ مینیجر بنا کر بھیجا تھا۔ اسی زمانے میں شوق نے سر اٹھایا تھا کہ اردو پڑھی جائے اور جب جاپان واپس آئی تو معلوم کیا کہ یہاں کس جگہ اردو پڑھائی جاتی ہے، پھر میں گائی دائی یونیورسٹی میں آگئی۔ میرا یہ آخری سال ہے۔ اس کے بعد میں ٹوکیو واپس چلی جاؤں گی۔''

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے میں نے دل میں سوچا۔ اس نے زبان تو کھولی۔ ''چلیں اچھی بات ہے کہ آج ہماری آپ سے ملاقات ہوگئی اور اگر اسی طرح ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں تو آپ فرفر اردو بولنے لگیں گی اور مجھے جاپانی سیکھنے کا موقع مل جائے گا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ممکن ہے ایسا ہو۔'' اس نے ذرا بے دلی سے جواب دیا تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس وقت تک وہ کھانا ختم کر چکی تھی اور پلیٹ سمیٹ کر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ میرے پاس وقت بہت تھوڑا تھا اور جو کچھ کرنا تھا وہ سیکنڈ کے اندر کرنا تھا۔

''دوبارہ آپ سے ملاقات کی اُمید کروں؟'' میں نے پوچھا۔

''آج تو میں اپنی ایک سہیلی سے ملنے آگئی تھی جو اسی یونیورسٹی میں پڑھتی ہے، اس لیے اتفاقاً اس کینٹین میں بھی آگئی۔ اب پتا نہیں دوبارہ کب آؤں گی۔''

''اتفاق نہیں۔ شاید میری قسمت سے۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ مسکرائی مگر خاموش رہی۔

''چلیں آپ کو معلوم نہیں آپ یہاں کب آئیں گی لیکن یہ تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم دوبارہ کب مل سکتے ہیں۔''

''کوشش کروں گی لیکن کچھ بتا نہیں سکتی۔'' اس نے دل شکن جواب سے نوازا۔ پھر ایک مختصر خاموشی کے بعد اپنے پرس سے کاغذ اور قلم نکالا۔ کاغذ پر کچھ لکھا اور اسے میری طرف بڑھایا۔ ''یہ میرا فون نمبر ہے۔ اس پر آپ سے رابطہ رہے گا۔''

کاغذ تھما کر وہ چلی گئی۔ اب وہ کاغذ کا ٹکڑا میرے لیے لاکھ کے نوٹ سے زیادہ اہم اور پیارا تھا۔

اس شام جب میں گھر واپس آیا تو میری دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ کچھ دنوں قبل جاپان میں قیام زہر لگ رہا تھا اب

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

وہی خیال ایک نعمت بن گیا تھا۔ سومیکا...... کتنا پیارا نام تھا اس جاپانی گڑیا کا۔ کبھی نہ کبھی تو اس کو میں اپنا بنالوں گا۔ یہ تصور ہی روح میں ٹھنڈک پہنچانے کے لیے کافی تھا۔ اسی سوچ میں میری آنکھ لگ گئی۔

صبح ناشتے سے فارغ ہوکر میں اپنی لیبارٹری میں گیا لیکن کام میں دل نہیں لگا۔ سومیکا کا پیارا چہرہ بار بار ذہن کے پردے پر آکر ریسرچ ورک کو درہم برہم کرتا رہا۔ شام میں جب گھر پہنچا تو اپنی تمام تر ہمت یکجا کرکے فون اٹھایا اور سومیکا کا نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی بجتی رہی لیکن دوسری طرف سے فون نہیں اٹھایا گیا۔ شاید جلدی میں ڈائل کرنے میں کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہو یہ سوچ کر دوبارہ ڈائل کیا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ پھر وہی خاموشی۔ میرے خوابوں کا شیش محل ایک جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔ شاید نمبر دینے میں غلطی ہوگئی ہو یا محض ٹالنے کے لیے کوئی اور نمبر دے دیا ہو۔

رات گیارہ بجے تک بار بار میں نمبر ڈائل کرتا رہا لیکن دوسری طرف خاموشی قائم رہی۔ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دی۔ شاید کہیں باہر گئی ہو اور میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ مایوسی کچھ امیدوں کے جھولے میں جھولتے بالآخر نیند آگئی۔

دوسری شام دھڑکتے دل کے ساتھ فون اٹھایا اور نمبر گھمایا۔ تیسری گھنٹی پر ادھر سے کلک کی آواز آئی اور میرے دل کی دھڑکن کسی دھونکنی کے مانند تیز ہوگئی۔

''ہیلو۔'' کی سریلی... آواز پر میں نے کہا۔ ''سومیکا میں ہوں ارسلان۔''

''ہائے ارسلان کیسے ہو تم؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ کل میں نے نمبر ملانے کی کافی کوشش کی لیکن محرومی رہی۔''

''ہاں کل میں اپنے ایک دوست کے ساتھ بازار کی طرف نکل گئی تھی۔''

دل میں آیا کہ پوچھوں کہ وہ مرد دوست ہے یا لڑکی لیکن ہمت نہیں ہوئی۔

''کیا بات ہے ارسلان خاموش کیوں ہوگئے؟''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے بہانہ بنایا۔ ''البتہ تم سے ایک سوال پوچھنے کے لیے ہمت جمع کررہا تھا۔''

''ہمت اگر جمع کرلی ہے تو پوچھو۔''

''تم سے دوبارہ کب اور کہاں ملاقات ہوسکتی ہے۔ میں ملاقات کے لیے بے چین ہورہا ہوں۔''

''بس اتنی چھوٹی سی بات کے لیے تم ہمت جمع کررہے تھے۔ تعجب ہے، بولو کب ملنا چاہتے ہو۔''

''آج اور ابھی۔'' ہمت جمع کرکے میں نے کہا۔

''بچوں والی باتیں چھوڑو۔ اچھا میں بتاتی ہوں آج منگل ہے میں اتوار کو تم سے ملاقات کے لیے وقت نکال سکتی ہوں۔ اچھا تم یوں کرنا کہ اپنے اسٹیشن کیتا سینجری سے ٹرین پکڑ کر امیدا اسٹیشن پر اتر جانا۔ وہاں پانچ بجے اسٹیشن کے باہر تمہارا انتظار کروں گی اور پھر ڈنر ہم لوگ ساتھ لیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔

منگل سے اتوار کا دن کانٹوں کی سیج پر گزرا۔ وقت کے ساتھ گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا رہا کہ کیا سوال کروں گا۔ کیا جواب ملے گا وغیرہ وغیرہ۔ شاید اسی کا نام محبت ہے۔

اتوار آیا اور پانچ بجے کے قریب میں نے امیدا کے پلیٹ فارم پر اتر کر ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ وہ وہاں نہیں تھی لیکن جونہی میں گیٹ تک آیا وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ نظر آئی۔

''ان سے ملو یہ ہیں میری عزیز دوست ماساکو۔ میں نے تمہیں فون پر بتایا تھا ناں کہ ایک دوست کے ساتھ گزشتہ شام بازار گئی تھی۔ یہی ہے وہ دوست۔''

یہ جان کر ایک گونہ سکون ملا کہ دوست ایک لڑکی ہے کوئی لڑکا نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ سومیکا کا کوئی مرد دوست نہیں۔ چلو ایک راستہ تو صاف ہوتا نظر آیا لیکن ماساکو کی موجودگی میں راز و نیاز کی باتوں سے محروم رہوں گا۔ یہ سوچ کر دل میں کانٹے چبھنے لگے اور دل سے خواہش ابھری کاش وہ سین سے ہٹ جائے۔

''پھر کیا سوچنے لگے۔'' سومیکا نے ٹوکا۔ ''ہاں یہ بھی بتادوں کہ ماساکو بھی اردو سیکھ رہی ہے۔''

''آں...... کچھ نہیں۔'' میں نے بے خیالی میں جملہ ادا کیا۔ ''ماساکو آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔''

''مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی اور میری سہیلی بتا رہی تھی کہ آپ نیوکلیئر فزکس میں پی ایچ ڈی کررہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے پڑھائی میں بہت تیز ہیں۔''

''ہاں البتہ صرف پڑھائی میں۔ باقی کے معاملات میں صفر ہوں۔''

''فکر نہ کرو۔ باقی معاملات میں سومیکا تمہیں زیرو سے ہیرو بنادے گی۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پھر وہ ہنسی اور بولی۔ ”میری دوست بڑی ریزرو رہتی ہے۔ نامعلوم کس طرح آج وہ تم سے ملاقات کے لیے تیار ہوگئی۔ ضرور اس نے تم میں کچھ دیکھا ہوگا۔“

گفتگو کرتے ہوئے ہم تینوں اسٹیشن سے باہر آئے۔ نزدیک ہی کافی سارے ریسٹورنٹ تھے۔ ان میں سے ایک میں داخل ہوگئے۔ ویٹر نے مینو لا کر دیا لیکن یہ میرے لیے بے کار تھا۔ سب کچھ جاپانی میں لکھا تھا۔ میں نے سومیکا کے ہاتھ میں اپنا مینو تھماتے ہوئے کہا۔ ”تم ہی کچھ میرے لیے منگوا لو۔ بس اتنا احتیاط رہے کہ اس میں خنزیر کا گوشت نہ ہو۔“

اس نے مسکرا کر کہا۔ ”کراچی میں رہ کر معلوم ہوگیا تھا کہ تم لوگ خنزیر نہیں کھاتے، کیونکہ وہ حرام ہے۔ البتہ شراب پی لیتے ہو۔“

اس طنز نے مجھے ہلا کر رکھ دیا مگر میں کچھ بولا نہیں۔

کھانے کے دوران ماسا کو مجھ سے بار بار مختلف سوالات کرتی رہی۔ کبھی لاہور کے بارے میں، کبھی پاکستان کے بارے میں، کبھی راولپنڈی کبھی اسلام آباد اور کبھی گلگت سے متعلق۔ یہ سب نام اس نے کتابوں میں پڑھ رکھے تھے اور سومیکا سے بھی پاکستان کے بارے میں کافی سارا سن رکھا تھا۔ اسی لیے مسلسل وہ سوالوں کی بوچھاڑ کیے جا رہی تھی۔ جب کہ سومیکا حسب عادت سر جھکا کر کھانے میں لگی رہی۔

”کیا بات ہے سومیکا، تم بہت خاموش ہو۔“ میں نے اس کی خاموشی کو توڑنا چاہا۔ بجائے اس کے کہ سومیکا میرے سوال کا جواب دیتی، اس چنچل لڑکی نے درمیان ہی میں میرے سوال کو اچک لیا۔

”میری یہ سہیلی خاموش مزاج ہے۔ بالکل میری طرح۔“ ساتھ ہی ایک شریر مسکراہٹ میری طرف اچھال دی۔

دل میں آیا کہ ماسا کو سے کہوں۔ ”اے شریر لڑکی اگر تم نے اب بھی اپنی زبان پر تالا نہ لگایا تو شاید آداب محفل کی پاسداری کو برطرف کر کے میں خود ہی اس میں تالا لگا دوں گا۔“ لیکن سومیکا کی دل شکنی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں ماسا کو کی سمع خراشی کو قبول کرتا رہا۔

کھانا ختم ہو کر جب بل آیا تو دونوں نے اپنے اپنے پرس کھول کر پیسے نکالے اور بل کا دو تہائی ٹرے میں ڈال کر اسے میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے خاموشی سے اپنی جیب

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون 021-35895313 فیکس 021-35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

سے جاپانی ین نکال کر پورے بل کے مطابق ٹرے میں پیسے ڈال دیے اور ان کے پیسے اٹھا کر ان کے آگے پیش کر دیے۔ تھوڑی نہیں نہیں اور جھجک کے بعد ان دونوں نے پیسے واپس لے لیے اور شکریہ کے طور پر دونوں ہاتھوں کو جوڑتے ہوئے انہوں نے تھوڑا سر کو جھکاتے ہوئے کہا۔

''آری گاتو۔''

پھر ہم لوگ اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گئے۔ وہاں سے ان دونوں نے اپنی ٹرین پکڑی اور میں نے اپنی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے سومیکا کو فون کیا۔ اس نے فوراً فون اٹھا لیا۔ وہ گھر پہنچ چکی تھی۔

''ہیلو سومیکا۔ میں ارسلان بول رہا ہوں تم ٹھیک تو ہونا۔''

''کیوں، تمہارا سوال کچھ عجیب نہیں؟''

''میں نے محسوس کیا تھا کہ کھانے کے دوران تم بہت خاموش خاموش تھیں، کیا بات تھی۔''

''کوئی بات نہیں ارسلان۔ آج ماساکو کے بات کرنے کی باری تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ تم میں کچھ ضرورت سے زیادہ دل چسپی لے رہی تھی۔ اس لیے میں نے موقع فراہم کیا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جان لو۔''

''لیکن سومیکا، ماساکو سے مجھے کوئی دل چسپی نہیں۔ میں تو کوشش کر رہا تھا کہ وہ ذرا چپ ہو اور تمہیں بات کرنے کا موقع دے لیکن وہ تو کسی ٹیپ ریکارڈر کی طرح مسلسل بجے جا رہی تھی۔ سچ پوچھو تو آج کی شام اس ملاقات میں ہم دونوں ہی بور ہوئے۔ پلیز سومیکا آئندہ اسے ساتھ مت لانا کیونکہ میری چاہت صرف تم میں ہے۔'' پھر تھوڑا وقفہ دے کر میں نے سوال کر دیا۔ ''اچھا بتاؤ دوبارہ کب مل رہی ہو۔''

''ایسا کرو کہ تم اپنا فون نمبر مجھے لکھوا دو۔ میں فون کر کے تمہیں بتا دوں گی کہ اگلی بار ہم کب مل سکتے ہیں۔''

میں نے اپنا فون نمبر لکھوا کر اسے شب بخیر کہا اور فون بند کرنے ہی والا تھا کہ اس کا جواب آیا۔ ''اچھا اب سو جاؤ اور زیادہ خواب مت دیکھنا۔'' سومیکا نے کسی بڑی بوڑھی کی طرح چپکارا۔

اب میری ذہنی کیفیت ایک چوراہے پر کھڑے شخص کی سی ہو گئی تھی۔ ایک طرف سومیکا کی کشش اور دوسری طرف انتظار کی تکلیف دہ گھڑیاں، ریسرچ کے کام میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ اسی انتظار میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں نے بھی سومیکا کو فون کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ ناراض نہ ہو جائے۔ کسی قیمت پر میں اسے ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اب ہمارے سامنے صبر تھا۔ صبر انتظار اور صبر۔ ہر شام گھر آ کر بیٹھ جایا کرتا۔ شاید سومیکا کا فون آ جائے۔ پورا ہفتہ گزر جانے کے بعد آخر کار اس کا فون آیا۔ ''ہیلو ارسلان کیسے ہو؟''

''مت پوچھو کیسا ہوں۔ مریض بن چکا ہوں۔''

''ارے کیا کہہ رہے ہو۔ کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟'' آواز میں کچھ گھبراہٹ شامل تھی۔

''نہیں سومیکا۔ یہ وہ بیماری نہیں جسے کوئی ڈاکٹر ٹھیک کر سکے میرا علاج تو اوساکا کی صرف ایک ڈاکٹرنی کر سکتی ہے اور تم جانتی ہو وہ کون ہے۔''

''ہاں ہاں جانتی ہوں لیکن میں نے تمہیں بتایا تھا۔ زیادہ خواب نہ دیکھا کرو۔'' اس نے شریر لہجے میں جواب دیا۔

''کیسے نہ دیکھوں۔ تم نے مجھ پر جادو جو کر دیا ہے۔''

''اچھا بند کرو یہ لیلیٰ مجنوں کا ڈراما۔ سنو کل چھٹی کا دن ہے میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔''

یہ سنتے ہی میری تمام بیماریاں دور ہو گئیں۔ ''کب اور کہاں۔'' بڑی بے چینی سے میں نے سوال کیا۔

''تمہارے گھر۔''

میرے دل کی دھڑکن جو پہلے ہی کم تیز نہ تھی اب اس کی رفتار اس قدر تیز ہو گئی کہ جیسے دل سینے سے نکل کر باہر آ جائے گا۔ ''اپنا پتا لکھواؤ اور میرا انتظار کرنا شام سات بجے۔''

''لیکن تم آؤ گی کس طرح۔ اس وقت تو کوئی بس یا ٹرین ادھر نہیں آتی۔''

''فکر نہ کرو۔ میرے پاس موٹر سائیکل ہے اسی سے۔''

''تم موٹر سائیکل چلا لیتی ہو؟''

''کیوں نہیں۔ تمہیں تعجب کیوں ہو رہا ہے۔ جاپان کی ستر اسی فیصد لڑکیاں موٹر سائیکل کا استعمال کر رہی ہیں۔''

دوسرا دن سارا وقت میں نے گھر کی صفائی اور کھانا پکانے میں لگا دیا۔ کھانا کیا پکاتا تھا او نے پونے مرچ مسالے ڈال کر ہانڈی میں سبزی بنا ڈالی اور تھوڑے سے چاول ابال لیے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ٹھیک شام سات بجے دروازے پر اطلاعی گھنٹی بجی۔
''کس قدر وقت کے پابند ہیں جاپانی۔'' میں نے سوچا۔

دروازہ کھولا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا بھرا ہوا تھیلا تھا۔ آنے کے لیے اس نے جاپانی رواج کے مطابق جوتا اتار کر گھریلو استعمال کے سلیپر کو پہنا، پھر مکان کے اندر آئی۔

''تمہارا باورچی خانہ کدھر ہے؟'' اِدھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

میں اسے باورچی خانے کی طرف لے گیا۔ وہاں اس نے اپنے تھیلے سے کئی اقسام کے پیکٹ نکال کر ٹیبل پر ڈال دیے اور بولی۔ ''دیکھو یہ سارے جاپانی کھانوں کے مسالے ہیں۔ تمہیں جاپانی کھانا پسند ہیں نا۔ کچھ ہم آج شام کھائیں گے باقی تم بعد میں کھالینا۔ وہ میں فریج میں چھوڑ جاؤں گی۔ اب ذرا ایک آدھ گھنٹے کے لیے تم مجھے یہاں چھوڑ جاؤ۔ جب کھانا تیار ہوگا میں آواز لگا دوں گی تو آجانا۔''

''کیا میں تمہارے ساتھ کچن میں ٹھہر سکتا ہوں؟''

''ہرگز نہیں۔'' اس نے ایک طرح سے احتجاجی جملہ کہا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ واقعی میری گھر والی ہے اور بڑی اپنائیت سے میرے لیے کھانا تیار کر رہی ہے۔

یہ خیال میرے لیے روح افزا تھا۔ وہ آئی تھی۔ میرے لیے کھانا خرید کر لائی تھی اور اسے پکا رہی تھی۔ پھر مجھے پیار سے بلا کر کھلائے گی۔ اتنی جلدی اور اتنی اپنائیت وہ مجھے ایک بار پھر حیرت میں ڈال رہی تھی۔ یہ لڑکی کیا ہے۔ شعلہ ہے یا شبنم۔ کبھی غائب ہو جاتی ہے پھر واپس آتی ہے اور جب آتی ہے تو ایسا احساس دلاتی ہے کہ جیسے اس کے ساتھ سالہا سال کی دوستی ہو۔ صرف دوستی نہیں، پیار کا ذخیرہ جو وہ اپنے دل میں بسائے ہے اسے بھرپور طریقے سے نچھاور کرنے میں بھی کسی کنجوسی سے کام نہیں لے رہی۔ اگرچہ اس کے اظہار کا طریقہ نایاب ہے۔

کھانا تیار تھا۔ گرچہ جاپانی کھانا پسند نہیں۔ سوشی، ٹوفو، ٹمپورا اور سی سوشور یہ اور نا معلوم اور کیا کیا تھا۔ ہم لوگ کھانا کھاتے رہے اور میں اس کا دل رکھنے کے لیے بار بار کھانے کی تعریف کرتا رہا۔ اس تعریف پر اس کا چہرہ مسرت سے تمتما جاتا تھا اور وہ پیار بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگتی۔

کھانے کے دوران اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ اپنے چاپ اسٹک سے ٹوفو کا ایک ٹکڑا اٹھا کر میرے منہ میں ڈال دیا اور بولی۔ ''دیکھو کھانا چاپ اسٹک سے اس طرح کھایا جاتا ہے۔''

کیا وہ بہانے بہانے سے اپنا پیار ظاہر کر رہی تھی یا مجھے چاپ اسٹک پکڑنے کا سلیقہ سکھا رہی تھی۔ میں اب تک سمجھ نہیں پایا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم لوگ ٹی وی کے کمرے میں آگئے۔ اس نے اپنے بیگ سے ایک ویڈیو فلم نکالی اور اسے پلیئر میں لگا کر چلا دیا۔ ٹی وی پر ہندی فلم کا ٹریلر چلنا شروع ہوگیا۔

''یہ تمہارے پاس انڈین فلم کہاں سے آئی؟'' میں نے حیرت سے بھرپور سوال کیا۔

''گائی ڈائی کالج کی لائبریری سے۔ وہاں چونکہ ہندی بھی پڑھائی جاتی ہے چنانچہ وہاں کافی ساری ہندی فلمیں پڑی ہیں جسے گھر لایا جاسکتا ہے۔ ہے نا مزے کی بات۔ میں جب بھی تم سے ملنے آؤں گی تمہارے لیے ایک اردو یا ہندی فلم لے آیا کروں گی اور ہم دونوں مل کر......''

اور اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور میری طرف پیار بھری دزدیدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

فلم ''ندیا کے پار'' ایک گاؤں کی رومانٹک فلم تھی اور ہم دونوں ایک ہی صوفے پر الگ الگ بیٹھ کر فلم دیکھنے لگے۔ درمیان میں کہانی پر ہلکا ہلکا تبصرہ ہوتا رہا۔ الفاظ سے ظاہر نہ ہو لیکن اس کے تمام اعمال سے ظاہر تھا کہ وہ مجھے پسند کرنے لگی ہے لیکن ایک اہم سوال اب تک میرے ذہن میں گونج رہا تھا کہ وہ مجھے محبوب سمجھ رہی ہے یا ایک اچھا دوست۔ بہرحال اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اور میں مطمئن تھا کہ اس کی قربت تو حاصل ہے گویا مستقبل درخشاں نظر آرہا تھا۔

فلم کے اختتام پر سومیکا نے اپنا بستہ اور ویڈیو فلم اٹھائی۔ سر پر ہیلمٹ چڑھائی اور بائی بائی کہتی ہوئی یہ جا وہ جا۔

اس رات میں بڑے سکون سے سویا۔ اُمید اور ناامیدی کے ترازو میں اُمید کا پلڑا بھاری محسوس ہونے لگا تھا۔

اب ہماری ملاقاتیں اکثر ہونے لگی تھیں اور اکثر و بیشتر وہ ہمارے مکان پر آجاتی۔ کبھی پکا پکایا کھانے لے کر، کبھی باورچی خانے میں جا کر بنا لیتی اور ہم کبھی جاپانی کبھی پاکستانی پکوان سے لطف اندوز ہوتے۔ فلمیں بھی کافی

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ساری دیکھ لی تھیں۔
ایک شام ایک عجیب بات ہوئی۔ ہم لوگ صوفے پر بیٹھ کر فلم دیکھ رہے تھے۔ اچانک اس کے ذہن میں کیا آیا کہنے لگی۔ ''میں آج ذرا تھکاوٹ محسوس کر رہی ہوں۔ پاؤں پسار کر اس صوفے پر آرام کرنا چاہتی ہوں کیا تم جگہ دے سکتے ہو؟''
''تم ایسا کرو میری گود میں اپنا پاؤں پھیلا لو۔'' میں نے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔
''کیا پاکستان میں ایسا ہوتا ہے کہ بیوی اپنے خاوند کے سامنے پاؤں پھیلائے۔ نہیں نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔ یہ مشرقی تہذیب کے خلاف ہے۔ البتہ اگر تم ہٹ کر تھوڑی جگہ دے دو تو میں صوفے پر ہی پاؤں پھیلا لوں۔''
کیا وہ سچ مچ مشرقی تہذیب کو اہمیت دے رہی تھی یا کہ مزید قریب نہ آنے کا ایک خوب صورت جواز ڈھونڈ نکالا تھا، میں کچھ نہیں پایا۔ بہرحال میں نے اس کی بات مان لی اور وہ آرام سے پاؤں پھیلا کر لیٹ گئی۔ فلم چلتی رہی۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ اس کو نیند آ گئی ہے۔
ایک جاپانی گڑیا میرے نزدیک سو رہی تھی اور میرے حواس پر طوفان برپا تھا۔ آج گویا پہلی بار اس کے قیامت خیز سراپا کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا حسین چہرہ، سیاہ زلفیں، سفید رنگت۔ کبھی کبھی میری نظر اس کے چہرے سے پھسل کر اس کے جسم کے نشیب و فراز کی طرف چلی جاتی تھی۔ آج اس نے ایک چست لباس پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کے جسم کے اتار... چڑھاؤ مزید نمایاں ہو گئے تھے۔
فلم کب ختم ہوئی مجھے پتا ہی نہ چلا۔ باقی کی کہانی کیا تھی مجھے کچھ ہوش نہیں۔ میرے حواس جب اس سحر سے بیدار ہوئے تو ایک اور مسئلہ درپیش تھا۔ کیا اسے جگا دوں یا سونے دوں؟ پھر میں نے یوں کیا کہ اپنے سونے کے کمرے سے ایک تکیہ اور کمبل لا کر تکیہ سر... کے نیچے سرکا دیا۔ اس پر وہ تھوڑا کسمسائی، آنکھیں کھول کر تھوڑا مسکرائی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اب میں نے کمبل بھی اس پر ڈال دیا۔
اس کمبل نے دو کمال دکھایا۔ ایک تو اس کو گرم رکھا۔ دوسرے باہر کی ٹھنڈک نے میرے اندر کی گرمی کو ٹھنڈا کر دیا۔ کافی انتظار کے بعد بھی جب وہ نہیں جاگی تو میں نے بھی سونے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ یہ سوچ کر کہ جب وہ خود جاگ جائے گی اور واپسی کا ارادہ کرے گی اسے رخصت کر دوں گا۔
کپڑے تبدیل کیے بغیر ہی میں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر پڑ گیا۔ نیند میری آنکھوں سے غائب تھی۔ سوتے جاگتے میں نے وہ رات گزاری اور وہ اللہ کی بندی وہیں ٹی وی والے کمرے میں ساری رات محو خواب رہی۔
صبح جب میری آنکھ کھلی تو باورچی خانے سے گرم گرم کافی کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں جلدی جلدی تیار ہو کر کھانے کی ٹیبل پر پہنچا۔ وہاں ناشتا بھی تیار تھا۔
''مجھے معاف کر دینا۔ کچھ مصروفیت کے باعث میں کئی راتوں سے سو نہ سکی تھی اور سچ بتاؤں اگر گزشتہ رات میں اپنے کمرے میں چلی جاتی تو یہ رات بھی بغیر نیند کے گزر جاتی۔ اچھا ہوا میں یہیں صوفے پر پڑ گئی اور ساری رات اچھی نیند کے ساتھ سوئی۔ تمہارا شکریہ کمبل اور تکیہ ڈالنے کا۔''
اس طرح ہم لوگوں کی ملاقاتیں قریب دو ماہ تک چلتی رہیں لیکن ہر ملاقات میں ہم نے کبھی شرافت کے دائرے سے قدم باہر نہیں نکالا اور پھر وہ دن آیا جب سکورا یعنی چیری کا پھول اپنے شباب پر آیا۔ یہ اپریل کا آغاز تھا۔ جاپان میں ان درختوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ جب سارا ملک ان گلابی اور سفید پھولوں کی چادر اوڑھ لیتا ہے تو اس کی خوب صورتی کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھنے کی چیز ہوتی ہے اور یہ حسن دو ہفتے تک رہتا ہے۔
جاپانی رواج کے مطابق ہم دونوں نے بھی سکورا درخت کے نیچے پکنک منانے کا پروگرام بنایا۔ چٹائی اور پکنک کا سامان اٹھائے اتوار کی اس دوپہر کو ہم ایک وسیع و عریض باغ کی جانب چل پڑے۔ راستے میں جابجا نظر آیا کہ جاپانی فیملیاں بچوں کے ساتھ سکورا کے نیچے پکنک منانے میں مشغول ہیں۔ چھوٹے بچے اِدھر اُدھر دوڑتے بھاگتے نظر آئے۔ اس وقت میرا ذہن بھی ایک خواب دیکھنے لگا کہ اگر سومیکا میری بیوی بن جاتی ہے تو پھر میرے بچے کیسے ہوں گے؟
کچھ دیر پیدل چلنے کے بعد ایک مناسب سکورا کا درخت مل گیا جہاں ہم دوسرے لوگوں کی نظروں میں آئے بغیر سکون سے بیٹھ سکتے تھے چنانچہ اپنی چٹائی کھول کر اور پکنک کا سامان نکال کر کھانا کھانے کی تیاری میں لگ گئے۔
ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی اس لیے ہم لوگوں نے ہلکے گرم کپڑوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

کا انتظام کر رکھا تھا۔ سومیکا نے سفید لیدر کوٹ کے اندر ایک سرخ جمپر پہن رکھا تھا جو بڑی خوب صورتی سے اس کے بھرے بھرے بدن پر چست آ رہا تھا۔

''سومیکا آج پہلی بار ہم لوگ سکورا کے نیچے بیٹھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے سائے میں بیٹھ کر عاشق و معشوق عہد و پیمان کرتے ہیں، کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

''یہی تو ایک بنیادی فرق ہے تم پاکستانیوں اور ہم جاپانیوں میں۔ ہم لوگ زندگی کو ایک مشین کی طرح دیکھتے ہیں۔'' ایک مختصر خاموشی کے بعد اپنی باتوں کو جاری رکھتے ہوئے سومیکا مغموم انداز میں بولی۔ ''اب ہمارے ہاں جذبات نام کی چیز ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔ ایک زمانہ تھا ہم لوگ بھی جذبات اور احساسات کی قدر کرتے تھے۔ اپنے بڑے اور بزرگوں کی بھرپور عزت کرتے تھے۔ ان کے کھانے پینے رہنے سہنے اور صحت کا خاص خیال رکھتے تھے لیکن پچھلی جنگ عظیم کے بعد دو شہروں پر ایٹم بم گرائے گئے۔ ان دھماکوں نے یہاں کے رہن سہن میں کافی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ بڑی بڑی کمپنیاں دولت کے پیچھے بھاگ رہی ہیں اور عام آدمی زیادہ سے زیادہ پیسا کمانے کی خاطر زیادہ وقت کام پر دیتا ہے اور اپنے خاندانوں کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں بچتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل رومانس بھی پھیکا پھیکا سا ہو کر رہ گیا ہے۔ بس خواہشات اور ضروریات باقی رہ گئی ہیں۔'' پھر ایک منٹ کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہوئی اور کہا۔ ''جانتے ہو ارسلان اکثر و بیشتر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنی ضروریات بھی شادی سے قبل حاصل کر لی جاتی ہیں۔ اب تو لڑکے اور لڑکیاں ایک سے زیادہ گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈ بھی رکھتے ہیں اور اسے فخر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جب میں پاکستان میں تھی اور وہاں کے رہن سہن اور رسم و رواج کو سمجھنے کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ ہم جاپانی ایک بڑی اہم چیز سے ناآشنا ہیں جس کا نام ہے جذبہ۔ تم لوگ کتنے خوش قسمت ہو کہ قدرت کی طرف سے دی گئی اس عطیے کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہو۔ سوہنی مہیوال، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد جیسی کہانی جاپان میں ناپید ہیں۔ البتہ مار دھاڑ والے سمورائی کی کہانیاں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس کی فلمیں دیکھی جاتی ہیں۔ بچے سائنس پڑھتے ہیں۔ حساب کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ پیسوں کا جوڑ گھٹاؤ یاد رکھتے ہیں لیکن جذبات جیسی خوب صورت قیمتی چیز سے ناآشنا ہیں۔ البتہ اسکول چھوڑتے وقت ایک رسمی تقریب منعقد کی جاتی ہے لیکن وہ مجھے مصنوعی لگتے ہیں کیونکہ یہ صرف چھوٹی عمروں کے بچوں کے لیے ہوتے ہیں۔ جب ذرا عمر آتی ہے تو سب بھول جاتے ہیں۔'' یہ بیان کرتے ہوئے سومیکا کے چہرے پر ایک کرب کے آثار نمودار ہوئے۔ ظاہر تھا وہ جذباتی ہو گئی تھی۔

پھر اچانک نہ جانے مجھے کیا ہوا۔ تھوڑا بے خود ہو کر میں نے سومیکا کا ہاتھ تھام لیا اس نے بھی چھڑانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور میں کچھ دیر اسی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بیٹھا رہا۔

اس دن سومیکا پر مجھے حد سے زیادہ پیار آ رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کا ہیجان خیز سراپا قیامت برپا کر رہا تھا کہ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ میری قوت برداشت جواب دے گئی اور میں نے بڑھ کر سومیکا کو بھینچ لیا۔ اس پر اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا البتہ شرم سے اس کے گال سرخ ہو گئے۔ شاید اسی وجہ سے میری ہمت میں اضافہ ہو گیا اور بجائے نادم ہونے کے میرے دونوں ہاتھوں نے جسارت دکھائی اور بھی میرا نشہ چور چور ہو گیا۔ سومیکا نے جھٹکے سے میرا ہاتھ اپنے جسم سے الگ کیا۔ پھر اس نے ایک گھائل ہرنی کی طرح میری طرف دیکھا۔ پھر بولی۔ ''تم بھی دوسروں جیسے نکلے۔''

وہ روتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ ہم نے سامان سمیٹا اور گھر کی طرف واپس آ گئے۔ راستہ بڑی خاموشی سے گزرا۔ گھر کے قریب آ کر میں نے سومیکا سے اپنے کیے کی معافی مانگی لیکن اندر آنے کے بجائے وہ باہر سے ہی اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر چلی گئی۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے اور میرے سپنے کا شیش محل منٹوں میں گر کر چکنا چور ہو گیا۔

اور آج پورے تین سال بعد میں اسی سکورا کے نیچے بیٹھا ہوں۔ یہ تین سال قبل کے وہ خواب جو ذہن کے کسی نہاں خانے میں دب کر رہ گئے تھے وہ آج سطح پر آ گئے ہیں۔ آج وہ یادیں ذہن کے پردے پر اس طرح چل رہی ہیں جیسے کل کی بات ہو۔ ان تین سالوں میں سومیکا کو میں نے بہت ڈھونڈا مگر وہ نہ ملی۔ ہمیشہ کے لیے گم ہو گئی۔ شاید کہیں اور سچے جذبات میں گندھی محبت ڈھونڈ رہی ہوگی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

www.paksociety.com

مسافر

جناب ایڈیٹر صاحب
آداب و نیاز
اُمید ہے بخیریت ہوں گے۔ ہم پردیسیوں کے لیے سرگزشت ایک نعمت سے کم نہیں۔ دبئی سے لانا پڑتا ہے۔ جیسے ہی سرگزشت آتا ہے ہم سب باری باری سے اسے پڑھتے ہیں پھر اسے برابر والے ڈیرے پر بھیج دیتے ہیں۔ یقین کریں کہ ایک پرچہ تین مہینے تک گردش کرتا ہے۔ ہمارے ہی ڈیرے پر واجد صاحب رہتے ہیں۔ زیرِ نظر کہانی ان کے بھائی کی ہے جسے میں نے الفاظ کا پیرہن دیا ہے۔ اگر پسند آجائے تو شاملِ اشاعت کرلیں۔

اشرف عباس
(العین۔ یو اے ای)

کچھ ایسی ہی پچویشن تھی جیسی کہانیوں میں ہوتی ہے۔
ہر طرف اندھیرا، بارش، ایک طویل کچی پکی سڑک اور اس پر چلتی ہوئی ایک گاڑی۔ پھر ویرانے میں بنا یہ پرانا مکان جس کے اندر سے روشنی آرہی تھی۔
پوری فلمی پچویشن تھی اور یہ پچویشن میرے ساتھ تھی۔
میں دواؤں کی ایک بڑی کمپنی کا ایجنٹ تھا۔ میرا کام ہی ایسا تھا کہ صبح ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک قصبے سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

دوسرے قصبے تک سفر کرنا پڑتا۔

یوں سمجھ لیں کہ میں ایک مستقل قسم کا مسافر تھا۔ شادی ابھی تک ہو نہ سکی تھی۔ اگر شادی ہو چکی ہوتی تو پھر نگری نگری پھرا مسافر والی کہانی ختم ہو چکی ہوتی۔

جس کمپنی میں کام کرتا تھا۔ انہوں نے مجھے ایک اچھی سی گاڑی دے رکھی تھی۔ پیٹرول کا خرچ الگ سے ملا کرتا تھا۔ تنخواہ بھی معقول تھی۔ اس لیے آرام سے گزر ہو رہی تھی۔

اس قسم کے کاموں کا اپنا الگ لطف ہوا کرتا ہے۔

طرح طرح کے لوگوں سے ملاقاتیں۔ ان کے طور طریقے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بزرگ صحیح کہتے ہیں کہ دس کتابوں کا علم ایک طرف اور ایک سفر کا تجربہ ایک طرف۔

تو میں اعظم پور سے مدینہ بستی کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں رات ہو گئی اور بارش بھی شروع ہو گئی۔

اعظم پور سے میری کمپنی کو اچھے خاصے آرڈر مل گئے تھے۔ کمپنی کے افسران کا یہ کہنا تھا کہ مارکیٹنگ میں میرا مستقبل بہت شاندار ہے کیونکہ مجھ میں اپنی بات منوانے کی صلاحیت موجود ہے۔

بہرحال راستے ہی میں رات اور بارش نے گھیر لیا۔ میرے لیے آگے سفر کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس لیے جب وہ مکان دکھائی دیا تو میں نے اپنی گاڑی اس مکان کے پاس روک دی۔

کچھ دیر کی دستک کے بعد اندر سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ ''کون ہے؟''

''بی بی میں ایک مسافر ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''اعظم پور سے مدینہ بستی کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں بارش ہو گئی، کچھ دیر کے لیے پناہ چاہتا ہوں۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا گیا۔ ''دیکھو اس وقت گھر میں کوئی نہیں ہے۔ ہم دروازہ نہیں کھول سکتے۔''

''محترمہ میں ایک شریف انسان ہوں۔ ایک بڑی کمپنی کا مارکیٹنگ آفیسر ہوں۔ اتفاق سے اس بارش میں پھنس گیا ہوں۔ اس لیے مجھ پر بھروسا کریں۔''

اور کچھ خاموشی، اس کے بعد آواز آئی۔ ''تم اپنی گاڑی لے کر پچھلی طرف چلے جاؤ۔ وہاں ایک شیڈ بنا ہوا ہے۔ تم اس کے نیچے اپنی گاڑی کھڑی کر سکتے ہو۔''

''چلیں شکریہ آپ کا۔ اتنا ہی بہت ہے۔'' میں تپ کر بولا۔

اس مکان کے ایک طرف زمین خالی پڑی ہوئی تھی۔ میں اپنی گاڑی کو اس راستے سے گھما کر اس مکان کے پیچھے آ گیا۔

وہاں آ کر پتا چلا کہ وہ مکان بالکل ہی ویرانے میں نہیں تھا بلکہ پچھلی طرف اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے مکانات تھے جو سامنے کی طرف سے دکھائی نہیں دیتے تھے۔

ان مکانوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ یہ بجلی کی روشنیاں ہی تھیں۔ یعنی یہاں تک بجلی آئی ہوئی تھی۔ اس عورت نے ٹھیک کہا تھا پچھلے حصے کی طرف ٹین کا ایک شیڈ بنا ہوا تھا۔ میری گاڑی بڑے آرام سے اس کے نیچے آ سکتی تھی۔

یہاں تک تو ہو گیا۔ بارش سے تو نجات مل گئی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ کیا مجھے رات بھر اس گاڑی میں رہنا ہو گا۔

ویسے بھی ہر طرف سناٹا تھا۔ مکانات تھے لیکن لوگوں کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ ظاہر ہے ان علاقوں میں تو رات جلدی ہو جاتی ہے۔

اس خاموشی میں ڈر بھی لگ رہا تھا۔ کون جانے کس طرف سے کون آ نکلے۔ بالآخر ایک آدمی اندھیرے سے نکل کر سامنے آ ہی گیا۔

اس نے اپنے ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اس نے بارش سے بچنے کے لیے ایک برساتی سی پہن رکھی تھی۔ وہ میری گاڑی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اشارہ کیا کہ میں وہ ٹرے لے لوں۔

اس پر بھروسا تو کرنا ہی تھا۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا۔ ''یہ لیں جی۔'' اس نے ٹرے آگے بڑھائی۔ ''بی بی نے آپ کے لیے کھانا بھیجا ہے۔''

اس ٹرے میں کھانے کے ساتھ ساتھ پانی کی بوتل بھی تھی اور گلاس بھی تھا۔ میں نے ٹرے اس سے لے کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

''جب کھانا ختم کر لیں تو آواز دے لینا میں برتن لینے آ جاؤں گا جی۔'' اس نے کہا۔ ''چائے بھی تیار ہو رہی ہے۔ وہ بھی لیتا آؤں گا۔''

''میری طرف سے اپنی بی بی جی کا بہت بہت شکریہ ادا کر دینا۔'' میں نے کہا۔

''اس تخت پر بیٹھ کر کھا لیں جی۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس شیڈ میں ایک طرف

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

دیوار کے ساتھ ایک تخت بھی تھا جس کو میں پہلے نہیں دیکھ سکا تھا۔

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے کہا۔

''لائیں ٹرے دے دیں۔ آپ باہر آجائیں۔'' اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔

اس نے ٹرے لے جا کر تخت پر رکھ دی۔ میں بھی گاڑی سے اتر کر تخت کی طرف آ گیا۔ بہت دیر بعد کمر سیدھی کرنے کا موقع ملا تھا۔

وہ بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔

''صاحب آپ اس طرف کیسے آ نکلے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے کھانا شروع کر دیا تھا۔ بہت ہی لذیذ کھانا تھا۔

''بھائی میں اعظم پور سے مدینہ بستی کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں بارش ہونے لگی۔ دواؤں کی کمپنی میں کام کرتا ہوں گھوم پھر کر آرڈر لیتا رہتا ہوں۔ ویسے نام کیا ہے تمہارا؟''

''میرا نام خادم حسین ہے جی۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ جو سامنے والا گھر دکھائی دے رہا ہے نا وہ میرا ہی ہے۔ رحیماں میرے پاس آئی تھی اس نے آپ کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا کہ ایک مسافر آیا ہوا ہے اسے کھانا پہنچا دو۔''

''یہ رحیماں کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بی بی جی کی ملازمہ ہے جی۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ کی اس سے بات ہوئی تھی۔''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''خادم حسین کیا تمہاری بی بی اکیلی رہتی ہیں؟''

''نہیں جی، پورا گھرانا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن وہ دوسرے مکان میں ہے۔ اس مکان میں بی بی جی اکیلی ہیں اور وہ رحیماں ساتھ ہی ہے۔ پھر ہم لوگ ہیں۔ ہم ان کے مزارع ہی ہیں بہت بڑی زمینداری ہے ان کی۔''

''تمہاری بی بی اس مکان میں اکیلی کیوں رہتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ بہت لمبی کہانی ہے جی۔'' اس نے کہا۔

''اگر مناسب سمجھو تو بتا دو۔'' میں اشتیاق بھرے لہجے میں بولا۔ ''اور ویسے بھی کسی نہ کسی طرح رات تو گزارنی ہے نا۔''

''ٹھیک ہے جی۔ میں ذرا تھرماس میں اور چائے لے کر آجاؤں۔ پھر اطمینان سے باتیں کریں گے اور ویسے بھی مجھے ذرا نیند دیر سے آتی ہے۔''

خادم حسین تھرماس لے کر چلا گیا۔ سناٹا اب اور بھی شدید ہو گیا تھا۔ بارش رک چکی تھی لیکن کبھی کبھی بجلی ضرور چمک اٹھتی تھی۔

میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسانی زندگی میں واقعات بھی کیسے کیسے ہوا کرتے ہیں۔ میرا اس جگہ سے اور ان لوگوں سے کیا تعلق تھا۔ کچھ بھی نہیں لیکن اتفاق ہے مجھے گھیر کر یہاں لے آیا تھا اور اب میں ایک کہانی سننے جا رہا تھا۔

خادم حسین اپنے وعدے کے مطابق کچھ دیر میں چائے سے بھرا ہوا تھرماس اور اپنے لیے بیڑی کا بنڈل لیے آ گیا تھا۔ اس نے میرے لیے چائے نکالی اور خود بیڑی کا کش لگانے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے بولنا شروع کیا۔

''صاحب جی وہ بھی ایسی ہی ایک رات تھی جب اشعر صاحب یہاں آئے تھے۔''

''یہ اشعر صاحب کون ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''آپ ہی کی طرح کے ایک مسافر۔'' اس نے بتایا۔ ''ایسی ہی رات تھی بارش والی جب اشعر صاحب مکان کے دروازے پر بے ہوش پڑے ملے تھے۔''

''کس مکان کے دروازے پر؟''

''یہیں بی بی جی کے مکان کے دروازے پر۔'' اس نے بتایا۔ ''اس وقت میں بھی اتفاق سے اسی مکان میں تھا۔ شاید کسی کام سے آیا تھا۔ جب ہم نے گولی چلنے کی آواز سنی اس کے بعد کسی کی چیخ سنائی دی۔ اس وقت گھر میں رحیماں تھی۔ بی بی جی اور میں تھا۔ ہم سب پریشان ہو کر رہ گئے تھے۔ خود سوچیں رات کا وقت، بارش ہو رہی ہو، گولی چلنے کی آواز آئے۔ اس کے ساتھ کسی کی چیخ سنائی دے تو کیسا لگے گا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ بی بی جی تو منع کر رہی تھیں لیکن میں کچھ دیر کے بعد دروازے کو لاک کر کے باہر آ گیا۔ آپ نے تو دیکھا تھا مکان تھوڑی اونچائی پر ہے اور چار پانچ سیڑھیوں کے بعد مکان کا دروازہ ہے تو ایک بندہ سیڑھیوں کے پاس گرا ہوا ملا۔''

میں نے اپنے لیے تھرماس سے ایک کپ چائے اور انڈیل لی۔ مجھے اس کہانی میں خادم حسین کے اندازِ بیان کی وجہ سے لطف آنے لگا تھا۔

بظاہر خادم حسین ایک بغیر پڑھا لکھا انسان تھا لیکن وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بہت سلیقے سے کہانی بیان کر رہا تھا۔

''پھر یہ ہوا صاحب کہ میں اس کو اٹھا کر اندر لے آیا۔'' اس نے آگے بتایا۔ ''وہ صرف زخمی ہوا تھا اور زخم بھی اتنا گہرا نہیں تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ کچھ ڈاکوؤں نے اسے لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ وہ جان بچا کر بھاگا تو انہوں نے اس پر گولی چلا دی۔ اسے گولی لگی۔ وہ زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ ڈاکو اسے مردہ سمجھ کر بھاگ لیے تھے۔''

''تو اس کا نام اشعر تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں صاحب وہی اشعر تھا۔ ایک مسافر جو بھٹکتا ہوا اس طرف آنکلا تھا اور قسمت اسے ہمارے مکان تک لے آئی تھی۔ ہم اسے اندر لائے۔ وہ ایک خوب صورت جوان تھا صاحب۔ اس کی حالت دیکھ کر افسوس ہو رہا تھا۔ بی بی کے فون کرنے پر قصبے سے ایک ڈاکٹر آ گیا تھا۔ اس نے معائنہ کر کے بتایا کہ مسافر کا زخم خطرناک نہیں ہے۔ صرف خون زیادہ بہہ گیا ہے۔ دو چار دنوں کے آرام کے بعد ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اور یہی دو چار دن قیامت کے ہو گئے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''کیا مطلب؟''

''بی بی صاحبہ دل ہی دل میں اس مسافر کو پسند کرنے لگیں۔ برسوں بعد ان کی زندگی میں خوشی کا کوئی موقع آیا تھا۔ ہم سب ان سے بہت محبت کرتے ہیں کیونکہ وہ اسی قابل ہیں۔''

''برسوں بعد کا مطلب میں نہیں سمجھ سکا۔''

''بی بی صاحبہ کی شادی ہو چکی تھی صاحب۔'' خادم حسین نے انکشاف کیا۔ ''یہ جو مکان ہے یہ ان کے مرحوم شوہر جمال صاحب کا ہے۔ وہ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے صاحب کسی کالج میں پڑھاتے تھے۔ بہت ہی شریف اور نفیس انسان۔ بی بی صاحبہ سے ان کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد بی بی صاحبہ اس مکان میں آ گئیں۔ کیا دن تھے صاحب، دونوں اتنے خوش تھے کہ بس کچھ نہ پوچھیں۔ پیار ہی پیار تھا صاحب۔ ہر وقت ہنستے بولتے رہتے۔ ہم سب ان دونوں کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتے۔ ایک سال گزر گیا، دونوں کی محبت کا ایک سال، پھر نادر جمال صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا۔''

''اوہ...... وہ کیسے!''

''بس صاحب۔ ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ کس کو معلوم کہ آنے والا وقت کیسا ہوتا ہے۔ ان کا دل رک گیا تھا۔ کیا کہتے ہیں اس کو ہارٹ فیل ہو جاتا۔ تو وہ ہو گیا اور ہماری بی بی بیوہ ہو گئیں۔ ان پر ایسی قیامت آئی کہ بس کچھ نہ پوچھیں۔ عدت کے دن انہوں نے اس مکان میں گزارے۔ عدت کے بعد بھی انہوں نے شوہر کا مکان نہیں چھوڑا۔''

''اب سمجھ میں آ گیا کہ تمہاری بی بی یہاں کیوں رہتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں صاحب۔ اس دن سے اب تک وہ اس مکان میں ہیں۔ رحیماں ان کے ساتھ ہے اور خدمت کرنے کے لیے ہم لوگ ہیں۔''

''کیا ان کے مرحوم شوہر کا کوئی نہیں تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں صاحب، جمال صاحب ایک ہی تھے۔'' خادم حسین نے بتایا۔ ''پھر یہ ہوا صاحب کہ ایک رات ایک مسافر بھٹکتا ہوا اس طرف آنکلا۔''

''تم اشعر کی بات کر رہے ہو نا؟''

''ہاں صاحب! اسی کی بات کر رہا ہوں۔'' خادم حسین نے بتایا۔ ''وہ دو چار دنوں میں بالکل تندرست ہو گیا تھا۔ بی بی صاحبہ نے اس کا بہت خیال رکھا تھا۔ ٹھیک ہونے کے بعد بھی وہ کئی دنوں تک یہیں رہا اور بی بی صاحبہ اسے پسند کرنے لگیں۔ انسان ہیں نا صاحب اسے کسی نہ کسی کا ساتھ تو چاہیے اور بی بی صاحبہ کی عمر کتنی ہے۔ زیادہ سے زیادہ پچیس چھبیس برس۔''

''اوہ، بہت کم سنی میں انہیں دکھ اٹھانا پڑا۔''

''ہاں جی اوپر والے کی مرضی۔'' خادم حسین نے کہا۔ ''تو صاحب دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اتنے دنوں کے بعد ہم نے بی بی صاحبہ کو ہنستے مسکراتے دیکھا تھا۔ اس لیے ہم بھی بہت خوش تھے، چلو کوئی تو ان کا دکھ بانٹنے کے لیے آ گیا ہے۔ ہم بھی اس مسافر کو پسند کرنے لگے تھے صاحب۔ بہت ہنس مکھ تھا۔ ہمیں ہنساتا رہتا۔ ہم سے کھل کر باتیں بھی کرتا۔ ہمارا دکھ درد بانٹتا۔ کیا بتاؤں صاحب وہ کتنا اچھا تھا۔''

''اور وہ رہتا کہاں تھا؟''

''شہر میں رہتا تھا صاحب۔'' خادم حسین نے بتایا۔ ''اس نے بتایا کہ اس کا بہت بڑا بزنس ہے۔ ہاں میں یہ بتانا تو بھول گیا کہ وہ بھی اپنی گاڑی میں تھا صاحب۔ اس کے پاس بھی ایک شاندار سی گاڑی تھی۔ ڈاکوؤں نے جس وقت

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اس پر گولی چلائی اس وقت وہ اپنی گاڑی میں تھا۔ گولی کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی اس کو لگی تھی صاحب۔ اس کے باوجود وہ گاڑی چلاتا ہوا ہمارے دروازے تک آ گیا تھا۔''

''سمجھ گیا۔ تو پھر کیا ہوا؟''

''بی بی اس کو پسند کرنے لگیں۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ اس کی شادی نہیں ہوئی ہے اور وہ بی بی کو اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتا ہے۔ یہ خبر ہم سب میں پھیل گئی۔ بی بی کے گھر والے بھی بہت خوش تھے کیونکہ سب ہی اشعر صاحب کو پسند کرنے لگے تھے۔ پھر اشعر صاحب ایک دن یہاں سے رخصت ہو گئے۔''

''وہ چلے گئے؟''

''ہاں صاحب وہ چلے گئے۔ یہ کہہ کر گئے کہ وہ اپنی ماں اور بہن کو لے کر آئیں گے۔ رشتے کی باقاعدہ بات ہو گی اور شادی کر کے بی بی کو اپنے ساتھ شہر لے جائیں گے۔''

''اور وہ واپس آئے؟''

''نہیں صاحب۔'' خادم حسین کے لہجے میں دکھ تھا۔ ''جانے والے مسافر کب لوٹ کر آتے ہیں صاحب۔ بس ذرا سی دیر کا جوش ہوتا ہے۔ وعدے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد سب غائب۔ ایک مہینے کا بول کر گئے تھے اب ایک سال ہو گیا۔''

''اوہ یہ تو بہت دکھ کی بات ہوئی۔''

''ہاں صاحب، بی بی کے زخموں پر نمک چھڑک دیا گیا۔ ان کی زندگی تو گزر ہی رہی تھی صاحب کیا ضرورت تھی کسی مسافر کے آنے کی۔ خوامخواہ ہماری بی بی کو ایک دکھ دے کر چلا گیا۔''

''کیا تم لوگوں نے شہر جا کر معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''میں گیا تھا صاحب، بی بی کو بتائے بغیر گیا تھا۔ اشعر صاحب اپنا پتا دے کر گئے تھے۔ میں اس پتے پر تلاش کرتا ہوا پہنچ گیا تھا۔ وہاں پتا چلا کہ وہ لوگ مکان بیچ کر کہیں اور جا چکے ہیں۔ کہاں گئے ہیں یہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔ ان کا موبائل بھی بند تھا۔ کچھ نہیں تھا صاحب، صرف سناٹا اور ایک دھوکا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن اگر کوئی مسافر اس طرف آ نکلتا ہے تو اسے اندر نہیں بلایا جاتا چاہے کچھ بھی ہو۔ اس کو اسی شیڈ میں ٹھہراتے ہیں۔''

''ہاں خادم اتنے دھوکے کے بعد ایسا تو ہونا ہی تھا۔''

جسٹس ناظم حسین صدیقی

عدالت عظمیٰ کے چیف جسٹس۔ ان کا تقرر آئین میں سترھویں ترمیم کی منظوری کے نتیجے میں 31 دسمبر 2003ء کو کیا گیا۔ وہ صوبہ سندھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے حیدرآباد یونیورسٹی سے بی اے، ایل ایل بی اور ایل ایل ایم کے امتحانات پاس کیے۔ قانونی تعلیم کی تکمیل کے بعد 1961ء سے 1967ء تک حیدرآباد میں کامیاب وکیل کی حیثیت سے پریکٹس کرتے رہے، بعد ازاں انہوں نے سول جج ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج اور سیشن جج کی حیثیت سے سکھر اور دادو میں خدمات انجام دیں۔ انہیں دو مرتبہ سندھ ہائی کورٹ کے رجسٹرار رہنے کا موقع ملا۔ پھر بطور اسپیشل جج بینکنگ کورٹ، چیئرمین کمرشل کورٹ، چیئرمین انسٹیٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن کراچی اور رکن بورڈ آف گورنر انڈس ویلی اسکول کراچی میں کام کیا۔ سپریم کورٹ کا چیف جسٹس بننے سے پہلے وہ مرکزی زکوٰۃ کونسل پاکستان کے چیئرمین تھے۔

مرسلہ: زاہد حمیدی صدیقی، حیدرآباد

میں نے کہا۔ ''تمہاری بی بی صاحبہ واقعی بہت دکھ اٹھا چکی ہیں۔''

''ہاں صاحب اور اب وہ کوئی نیا زخم نہیں کھانا چاہتیں۔''

خادم حسین کی کہانی ختم ہو چکی تھی اور میں سوچتا رہ گیا تھا کیسی دکھ بھری داستان تھی۔ اس بی بی کے پاس بظاہر سب کچھ تھا لیکن کچھ بھی تو نہیں تھا۔ خالی دامن خالی ہاتھ۔

خادم حسین کی باتوں میں اچھا خاصا وقت گزر چکا تھا۔ خادم حسین نے برتن سمیٹے اور جاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''صاحب صبح ناشتا کر کے جایئے گا۔ میں آپ کے لیے بستر لے آتا ہوں۔ اس تخت پر سو جانا۔''

''نہیں خادم، تمہارا شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''صبح تو ہونے والی ہے۔ میں جاگتا رہوں گا اور نماز پڑھ کر نکل جاؤں گا۔''

''چلیں ٹھیک ہے لیکن ناشتا تو کر لیجیے گا۔''

''ہاں لے آنا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

خادم چلا گیا۔ ایک بار پھر گہرا سناٹا۔ اس کے بعد سوچ کی وہی یلغار۔ کیسی زندگی ہوتی ہے لوگوں کی۔ کیسی کیسی کہانیاں ہوتی ہیں۔

اس مسافر اشعر نے اس بے چاری کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں کچھ لوگ اتنے بے رحم کیوں ہو جاتے ہیں۔

دور کی کسی مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی۔ کچھ دیر بعد صبح ہونے والی تھی۔ بارش بھی مکمل رک گئی تھی۔ کچھ دیر اور اس کے بعد اندھیرے چھٹنے لگے تھے۔

اچانک مکان کا پچھلا دروازہ کھلا اور دو عورتیں باہر آتی ہوئی دکھائی دیں۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔

دونوں میرے پاس آ کر رک گئیں۔ ان میں سے ایک یقیناً رحیماں ہو گی گھر کی نوکرانی ٹرے اس کے ہاتھ میں تھی اور دوسری وہی بی بی ہو گی۔

رحیماں نے ٹرے تخت پر رکھ دی اور پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

''صبح بخیر مسافر۔'' دوسری والی نے کہا۔

میں تو اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا تھا کیا چہرہ تھا کیا خوب صورتی تھی۔

''مسافر تم نے برا نہیں مانا ہو گا۔'' اس نے کہا۔ ''رات بھر تمہیں یہاں رہنا پڑا۔''

''نہیں...... نہیں میرے لیے یہی بہت بڑی بات تھی کہ مجھے بارش سے پناہ مل گئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''ہم تمہارا ناشتا لے کر آئے ہیں۔ تم ناشتا کر کے یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ اجالا پھیل چکا ہے۔''

''جی ہاں محترمہ آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

''رحیماں۔'' اس نے اپنی ملازمہ کی طرف دیکھا۔ ''جب صاحب ناشتا کر لیں تو پھر تم برتن لے کر اندر آ جانا۔''

وہ ایک شان .... کے ساتھ اندر جانے لگی اور اسی وقت میں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ ''ذرا ایک منٹ میری بات سنیں۔''

وہ رک گئی۔ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ رحیماں اپنی جگہ کھڑی رہی تھی۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ اف کیا آنکھیں تھیں اس کی۔ میں جیسے کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا۔

''جی فرمائیں۔'' اس نے پوچھا۔

''رات خادم حسین نے مجھے آپ کے حوالے سے ساری کہانی سنا دی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ شخص مجھے کیوں بدنام کرتا پھر رہا ہے۔'' وہ غصے میں کانپنے لگی تھی۔

''نہیں آپ اس پر ناراض نہ ہوں۔ وہ تو آپ سے اتنا مخلص ہے کہ آپ اندازہ نہیں کر سکتیں۔''

''پھر بھی یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ چلیں آپ بتائیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''محترمہ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ہر مسافر ایک طرح کا نہیں ہوتا۔ کچھ لوٹ کر بھی آ جاتے ہیں۔''

''اوہ۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

میں نے اپنی بات اس تک پہنچا دی تھی اور اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

''اچھا چلیں دیکھ لیتے ہیں۔''

وہ اتنا کہہ کر اندر چلی گئی اور میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ میں اس کے پاس ضرور واپس آؤں گا۔ وہ مجھے اتنی ہی اچھی لگی تھی۔

میں نے واپسی میں زیادہ دن نہیں لگائے تھے۔ صرف پندرہ دنوں میں واپس آ گیا تھا۔ مجھے اس رشتے کے لیے کس سے اجازت لینی تھی، کسی سے نہیں۔

ایک بار پھر وہی واقعہ اور اس کا خوب صورت تصور۔ اس دن شام نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اس مکان کے سامنے گاڑی روک دی تھی۔

آج اس مکان کے سامنے دو چار آدمی بھی کھڑے تھے۔ ان میں ایک خادم حسین بھی تھا۔ میری گاڑی کو دیکھ کر تقریباً دوڑتا ہوا میرے پاس آ گیا۔

''اچھا ہوا صاحب آپ بھی آ گئے۔ آپ بھی نکاح میں شریک ہو جائیں گے۔''

''کس کا نکاح؟''

''بی بی جی کا، مسافر لوٹ کر آ گیا ہے صاحب، اشعر صاحب اپنے گھر والوں کو لے آئے تھے۔ آج کچھ دیر بعد نکاح ہونے والا ہے۔''

میں دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ میں نے یہی کہا تھا نا کہ کچھ مسافر لوٹ کر بھی آ جاتے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

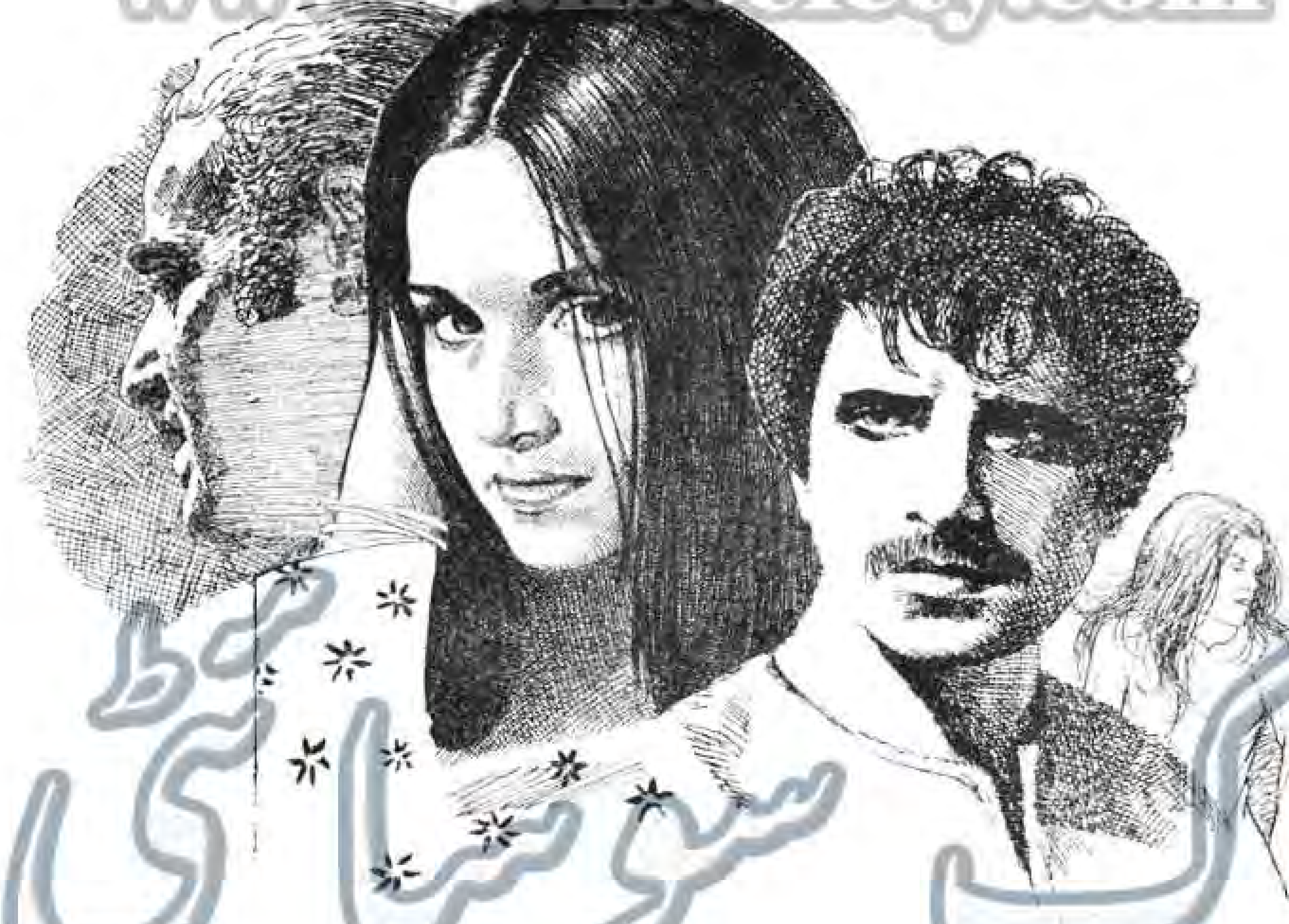

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

احساسِ برتری

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
بعض لوگوں کو خاندانی برتری کی نمائش کا خبط ہوتا ہے۔ وہ خود کو خاندانی طور پر ارفع و اعلیٰ ثابت کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتے۔ میرے پاپا بھی اسی مرض میں مبتلا تھے۔ انہوں نے خاندانی برتری کو قائم رکھنے کے لیے زندگی بھر کوششیں کیں لیکن...... میرے دکھ درد کی لفظی تصویر آپ بھی ملاحظہ کریں۔ اگر سرگزشت کے معیار کی ہے تو اسے قارئین کے سامنے بھی پیش کردیں۔

صوفیہ
(لاہور)

میری باجی شمائلہ بہت شوخ تھیں۔ ان کے برعکس میں کم گو اور سنجیدہ طبیعت کی تھی۔ مجھ سے چھوٹی صائمہ بھی شرارت اور طراری میں باجی کے نقش قدم پر چل رہی تھی اس لیے باجی سے اس کی خوب بنتی تھی۔

شمائلہ باجی کو اسکول کے ڈراموں میں حصہ لینے اور ڈانس کا شوق تھا۔ وہ یہ شوق ظاہر ہے پاپا سے چھپ کر پورا کرتی تھیں۔

پاپا ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں چیف انجینئر تھے۔ ان کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

فرم الیکٹرونک مصنوعات اور آلات بنانے میں ملک گیر شہرت رکھتی تھی۔ پاپا اکثر کمپنی کے کاموں سے کوریا، جاپان اور سنگاپور جاتے رہتے تھے۔ یوں شمائلہ باجی اور صائمہ کو من مانی کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

امی کو بیٹا نہ ہونے کا غم کھا گیا تھا۔ وہ کسی بات میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی تھیں۔ ویسے بھی بقول پاپا امی اللہ میاں کی گائے تھیں۔

پاپا کہتے تھے کہ صوفیہ میں میری عادتیں آئی ہیں اس لیے پاپا مجھ سے زیادہ قریب تھے۔ شمائلہ اور صائمہ ہلے گلے اور نمود و نمائش کی قائل تھیں۔ پاپا ان باتوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ شمائلہ باجی کبھی کالج سے ڈرامے کا ایوارڈ لے کر آتیں تو پاپا کو نہ دکھاتیں۔ ان کے برعکس میں تقریری مقابلوں میں انعام حاصل کرتی تو پاپا کی خوشی دیدنی ہوتی۔ وہ خاندان والوں کو فخر سے میری ذہانت اور قابلیت کے بارے میں بتاتے تھے۔ وہ مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ مجھ سے پہلے پاپا نے شمائلہ باجی کو ڈاکٹر بنانا چاہا تھا لیکن ان میں اتنی قابلیت بھی نہ تھی کہ وہ ڈاکٹر بن سکتیں۔ ان میں قابلیت ہوتی بھی کیسے سکتی تھی۔ وہ فلمی رسالوں، فلموں اور ٹی وی کی شوقین تھیں۔

ان دنوں میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ پاپا مجھ سے کہتے تھے۔ ''صوفیہ، میری عزت رکھ لینا بیٹا۔ مجھے تجھ سے بہت امیدیں ہیں۔''

''آپ فکر مت کریں پاپا۔'' میں جواب دیتی۔ ''میں اپنی طرف سے بھرپور کوشش کر رہی ہوں۔ آگے اللہ کی مرضی اور اللہ تعالیٰ کبھی کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔''

میرے امتحان میں ابھی تین مہینے باقی تھے لیکن میں نے اپنا کورس دو مرتبہ ختم کر لیا تھا۔

ایک دن میں پڑھائی میں مصروف تھی کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا پھر اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ میرا خیال تھا کہ پاپا ہوں گے۔ وہ رات کو اکثر میرے پاس آجاتے تھے اور مجھے مطالعے کے گُر سکھاتے رہتے تھے۔ خلافِ توقع دروازے پر شمائلہ باجی تھیں۔

دروازہ کھلتے ہی وہ اندر آگئیں اور میں نے سوچا کہ میرا کم سے کم ایک گھنٹا گیا۔ وہ مجھے اپنے کالج کا کوئی رنگین واقعہ سنائیں گی یا اپنے کسی بوائے فرینڈ کے بارے میں بتائیں گی۔ وہ آتے ہی میرے بیڈ پر نیم دراز ہو گئیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔

''کیا ہوا شمائلہ باجی، خیریت تو ہے نا؟'' میں نے انہیں کبھی اتنا پریشان نہیں دیکھا تھا۔

''صوفیہ میرا ایک کام کرو گی؟'' انہوں نے خلافِ معمول میرا نام لے کر مجھے مخاطب کیا ورنہ وہ مجھے فلاسفر، دانش ور اور بوڑھی روح کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔

''باجی، اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور کروں گی مگر یہ سوگ تو ختم کرو۔ مجھے تمہارے چہرے پر ہنسی ہی اچھی لگتی ہے۔''

''وہ کام تو ہی کر سکتی ہے کیونکہ تو پاپا کی لاڈلی ہے اور پاپا تیری مٹھی میں ہیں۔''

''باجی! تم نے کام ابھی تک نہیں بتایا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''صوفیہ! میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

''پاپا بھی یہ ہی چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی ہو جائے۔'' میں نے کہا۔

''میں اپنے ایک کلاس فیلو طاہر سے محبت کرتی ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

مجھے یاد آگیا۔ طاہر خاصا خوش شکل اور خوش لباس لڑکا تھا۔ اس کے والد کا لیدر گڈز کا بہت بڑا کاروبار تھا لیکن پاپا اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اس کی ماں فلم انڈسٹری سے تعلق رکھتی تھی۔ پاپا بھی اسے اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ اس کے باپ سے پاپا کے اچھے تعلقات تھے۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''باجی! تم طاہر بھائی سے کہو کہ وہ اپنے والدین کو رشتے کے لیے بھیجیں۔''

''وہ لوگ تو آنے کو تیار ہیں لیکن تم پاپا کو اچھی طرح جانتی ہو۔ وہ اس شادی سے انکار کر دیں گے۔ نہ صرف انکار کریں گے بلکہ اس کے والدین کو ذلیل کر کے گھر سے نکال دیں گے۔''

''اوہو باجی!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''پاپا اب اتنے بھی بداخلاق اور غیر مہذب نہیں ہیں، تم فکر مت کرو۔ میں کل ہی پاپا سے بات کروں گی۔''

''فلاسفر! تو تو یوں بھی مقرر ہے، ذرا اپنے ٹیلنٹ سے کام لینا، شعلہ بیانی کے جوہر دکھانا، پاپا راضی ہو جائیں گے۔''

مجھ سے بات کر کے شاید باجی کو اپنا مسئلہ حل ہونے کی امید پیدا ہو چلی تھی اس لیے اب وہ پھر چہکنے لگی تھیں۔

انہیں ہر طرح سے تسلی دے کر میں نے واپس بھیجا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ورنہ وہ مزید ایک گھنٹے تک میرا دماغ چاٹتیں۔

دوسرے دن میں نے موقع پاتے ہی پاپا سے بات کی۔ حسبِ توقع وہ بھتے سے اکھڑ گئے اور بولے۔ ''میں کبھی برداشت نہیں کروں گا کہ میری بیٹی کسی ناچنے گانے والی کی بہو بنے۔''

''پاپا پلیز، ان باتوں کو چھوڑ دیں۔ یہ بات کسی کو بھی قابلِ اعتراض نہیں لگے گی پھر آج کل تو لوگ صرف لڑکے کی دولت اور جایداد دیکھتے ہیں۔ طاہر کی تعلیم اور مردانہ وجاہت اس کے علاوہ ہیں۔ آپ پلیز اس رشتے کو قبول کرلیں۔ پاپا پلیز۔''

''بیٹا رشتہ کہاں ہے، کون لا رہا ہے؟ رشتہ آئے گا تو میں اقرار یا انکار کچھ کرسکوں گا۔''

میں سمجھ گئی کہ پاپا میری درخواست کو نہیں ٹھکرائیں گے۔

میں نے اسی شام شمائلہ کو بتا دیا کہ تم طاہر سے بات کرو کہ وہ اپنے والدین کو بھیجے۔

''تو کیا پاپا راضی ہوگئے؟'' شمائلہ نے پُرجوش لہجے میں پوچھا۔

''ہاں راضی ہوگئے ہیں بلکہ جلدی کرو دیر ہوئی تو پاپا کو سوچنے کا وقت مل جائے گا۔ پھر ان کا فیصلہ تو میں بھی نہیں بدلوا سکتی۔''

آنے والے اتوار کو طاہر کے والدین ہمارے گھر آگئے۔ لڑکے کی اداکارہ ماں واقعی ہیروئن لگتی تھیں۔ پھر ایک مہینے بعد ہی شمائلہ باجی کی شادی ہوگئی۔

میں نے انٹرمیڈیٹ میں بہترین نمبر لیے اس لیے مجھے میڈیکل میں بغیر کسی سفارش کے داخلہ مل گیا۔ میں دو ماہ بعد پھر اپنی پڑھائی میں لگ گئی۔

ان دنوں میں سیکنڈ ایئر ایم بی بی ایس کی تیاری کر رہی تھی اور رات گئے تک پڑھائی میں مصروف رہتی تھی۔

اچانک دروازہ کھلا اور مجھے صائمہ کی شکل دکھائی دی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''صومی تم ابھی تک سوئی نہیں؟''

''میری تو نیند اڑ گئی ہے آپی۔'' اس نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

''دیکھو صومی!'' میں نے کہا۔ ''میں اس وقت کوئی فضول بات سننے کو تیار نہیں ہوں۔ تم صبح بات کرنا۔''

''میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تم اسے فضول بکواس کہہ رہی ہو۔ میں نے تو ابھی کچھ کہا بھی نہیں ہے۔'' صائمہ کے چہرے پر فکر و تشویش کے آثار تھے۔ ''تم اگر میری مدد کرو تو تمہارا احسان ہوگا مجھ پر۔''

''اچھا چلو بتاؤ۔ کیا پرابلم ہے۔''

''آپی تم امجد کو تو جانتی ہو ناں؟'' صومی نے پوچھا۔

''وہ خالہ عشرت کا بیٹا امجد؟'' میں نے پوچھا۔ صومی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے الجھ کر کہا۔ ''لیکن صومی، تم شاید اپنا پرابلم ڈسکس کر رہی تھیں۔ اس میں یہ امجد کہاں سے آگیا؟''

''امجد ہی تو اس پرابلم کا مین کردار ہے۔'' صومی نے روتی صورت بنا کر کہا۔ ''میں امجد سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

''کچھ خدا کا خوف کرو صومی!'' میں نے کہا۔ ''خالہ اور امی کے تعلق تو برسوں سے کشیدہ ہیں۔ پاپا تو پہلے ہی ان لوگوں کو پسند نہیں کرتے تم اس سے شادی کرنا چاہ رہی ہو؟''

''آپی ان حالات ہی کی وجہ سے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے ورنہ میں تمہیں تکلیف نہ دیتی لیکن میری ایک بات سن لو آپی۔ اگر امی اور پاپا اس رشتے پر راضی نہ ہوئے تو پھر ہم کورٹ میرج کرلیں گے۔''

''تمہیں یہ دھمکی ہی دینا ہے تو براہِ راست پاپا کو کیوں نہیں دیتیں؟ مجھے کیوں بیچ میں ڈال رہی ہو۔''

''اسی لیے ڈال رہی ہوں کہ کورٹ میرج کی ضرورت نہ پڑے۔'' صومی نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ جاتے جاتے بولی۔ ''آپی کل پاپا سے بات کرلو۔''

''میری بات سنو صومی! پہلے تو امی کو سمجھا بجھا کر راضی کروں گی۔ پھر پاپا کے کانوں میں بات ڈالوں گی۔ اس پراسس میں کم سے کم ایک مہینا لگے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' صومی نے کہا۔ ''میں ایک مہینے بعد امجد کے والدین کو بلواؤں گی۔''

میں نے نہ جانے کیا کچھ جتن کر کے امی کو راضی کیا اور خالہ کے گھر لے گئی۔

اصل مسئلہ پاپا کو راضی کرنا تھا۔ ایک مرتبہ پھر پاپا سے میری بحث ہوئی لیکن شمائلہ باجی کے برعکس یہ مرحلہ زیادہ آسان تھا۔ امجد خاندان کا لڑکا تھا اور دیکھا بھالا تھا۔ پاپا صرف خالو کو پسند نہیں کرتے تھے۔ خالو غیر خاندان کے تھے ان کی تعلیم بھی واجبی تھی لیکن کاروبار میں وہ بہت کامیاب تھے۔ پاپا ان کی شیخی خوری اور غیر مہذب اطوار سے چڑتے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

میں نے پاپا سے کہا۔ ”پاپا آپ لاکھ منع کریں لیکن صائمہ کرے گی وہی جو اس کا دل چاہے گا۔ پھر آپ اپنا خون کیوں جلاتے ہیں۔ خالو کم تعلیم یافتہ اور غیر مہذب ہیں، امجد تو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا لڑکا ہے، اس نے اس سال ایم بی اے کیا ہے۔ اسے بہت اچھی ملازمت مل جائے گی اور ملازمت نہ بھی لے تو کیا ہوا؟ وہ خالو کا کاروبار سنبھال لے گا۔“

”بیٹا تو مجھے مجبور کر دیتی ہے۔“ پاپا نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

دو دن بعد ہی خالہ اور خالو امجد کا رشتہ لے آئے اور پاپا نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ پھر ایک ہی مہینے میں صائمہ اور امجد کی شادی ہوگئی۔ شادی کے فوراً بعد امجد کو سعودی عرب میں بہت معقول ملازمت مل گئی اور وہ صائمہ کو لے کر سعودی عرب چلا گیا۔

میں ایک مرتبہ پھر یکسو ہو کر پڑھائی میں مصروف ہوگئی۔ اب پاپا مجھ سے دنیا جہان کے موضوعات پر بحث کرنے لگے تھے۔

میں نے جس دن ایم بی بی ایس مکمل کیا۔ اس دن پاپا نے ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا۔

اس تقریب میں بابا کی عمر کا ایک سیلز آفیسر مسعود پیش پیش تھا۔ پاپا شاید اسے بہت پسند کرتے تھے اس لیے اس سے بے تکلف ہو کر بات کر رہے تھے ورنہ پاپا اپنے ماتحتوں سے عموماً فاصلہ رکھنے کے عادی تھے۔

تقریب کے بعد بھی پاپا مسعود ہی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ وہ اس کی ذہانت اور قابلیت سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے تھے۔ پاپا نے بتایا کہ مسعود ہماری لاہور والی برانچ میں ہوتا ہے۔ وہ کراچی آنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھ سے بھی کہا ہے کہ میری پوسٹنگ کے لیے جی ایم صاحب اور ڈائریکٹروں سے بات کریں۔

ایک ہفتے بعد مسعود اپنا سوٹ کیس لیے ہوئے ہمارے گھر آگیا۔ پاپا نے بتایا کہ کراچی میں فی الحال مسعود کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ کمپنی کی طرف سے اسے دو ماہ بعد اپارٹمنٹ ملے گا۔

”تو کیا اس وقت تک مسعود یہاں رہے گا؟“ امی نے کہا۔

”ہاں، تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟“ پاپا نے کہا۔

”وہ بہت شریف لڑکا ہے، پھر بے سہارا ہے [illegible] اعلیٰ خاندان کا لگتا ہے۔“

یوں مسعود ہمارے گھر میں رہنے لگا۔ وہ واقعی بہت بہترین کردار کا لڑکا تھا۔ اس نے کبھی مجھے یا امی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

ایک دن پاپا نے وہ بات کہہ دی جس کا میں خود انتظار کر رہی تھی۔ پاپا میری شادی مسعود کے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔

”پاپا جب آپ نے فیصلہ کر ہی لیا تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔“ میں نے سر جھکا کر کہا۔

”بیٹا! میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ فیصلہ تو تم کرو گی۔“ پاپا ہنس کر بولے۔

”مجھے بھی مسعود میں کوئی برائی نظر نہیں آئی۔“ امی نے کہا۔

میں اس وقت کراچی کے جناح اسپتال میں ہاؤس جاب کر رہی تھی کہ میری شادی مسعود سے ہوگئی۔

مسعود سیلف میڈ انسان تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ میں اپنے والدین کا اکلوتا ہوں، ٹریفک کے ایک ہولناک حادثے میں اماں اور ابو دونوں کا انتقال ہو گیا۔ مسعود کو اس کی خالہ نے پالا تھا۔ خالہ کے بچے مسعود کو پسند نہیں کرتے تھے اس لیے وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ وہ اس وقت تک میٹرک کر چکا تھا۔ اس نے ایک ورکشاپ میں نوکری کر لی لیکن اپنی تعلیم جاری رکھی۔ انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد اس نے کہیں معلومات کرنا چاہی لیکن اس کے نمبر اتنے اچھے تھے کہ جس کمپنی میں اس نے ملازمت کی اس کا مالک ایک بہت خدا ترس انسان تھا۔ اس نے مسعود کی ڈیوٹی نائٹ شفٹ میں لگا دی اور اسے مزید پڑھنے کا مشورہ دیا۔ یوں اس نے ایم بی اے بہت اعلیٰ نمبروں کے ساتھ کر لیا۔ اس کے بعد ایک سال تک وہ اس کمپنی میں سیلز ایگزیکٹو کے طور پر کام کرتا رہا۔ اس کی تنخواہ تو کم تھی لیکن کمپنی کے اس پر اتنے احسانات تھے کہ اس نے ملازمت چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔

مالک کے انتقال کے بعد مسعود نے وہ ملازمت چھوڑ دی اور ایک بڑی کمپنی میں ملازمت کر لی۔ وہاں سے وہ پاپا کی کمپنی میں آگیا۔

شادی کے بعد ہم لوگ ہنی مون منانے سوات، کاغان کی طرف نکل گئے۔

وہاں سے واپسی پر مسعود اپنے کام میں مصروف ہو

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

گیا۔ وہ چونکہ اکیلا تھا اس لیے پاپا نے اسے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا۔ یوں میں شادی کے بعد بھی پاپا کے ساتھ ہی رہی۔

میں ان دنوں جناح اسپتال کراچی میں جاب کر رہی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں شام کو اپنا ذاتی کلینک کر لوں گی۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ مسعود میں آہستہ آہستہ تبدیلی آ رہی تھی۔ وہ اب پہلے کی طرح مہذب نہیں لگتا تھا۔ سب کے سامنے تو وہ خوش اخلاق اور خوش گفتار بنا رہتا لیکن خلوت میں جاتے ہی اس کی شخصیت پر سے تہذیب اور اخلاق کا خول اتر جاتا اور وہ انتہائی جاہل اور گنوار لگنے لگتا۔

اس دن میں ڈیوٹی کے بعد گھر پہنچی تو صوی کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ وہ آج ہی سعودیہ سے آئی تھی اور شادی میں نہ آنے کی تاویلیں دے کر معذرت کے پہاڑ کھڑے کر رہی تھی۔ وہ پہلے سے کچھ موٹی ہوگئی تھی۔ اس وقت تک اس کے دو بچے ہو چکے تھے۔

میں نے ہنس کر کہا۔ ''یار صوی! تو نے بہت پھرتی دکھائی، تین سال میں دو بچے۔ ماشاء اللہ۔''

''اور آپی آپ تو بالکل ست چل رہی ہیں۔'' صوی شوخی سے ہنسی۔ ''بلکہ لگتا ہے آپ چل ہی نہیں رہی ہیں۔ شادی کو ایک سال گزر چکا ہے لیکن بچے کا کوئی نام و نشان نہیں۔''

مسعود اچانک کمرے میں داخل ہوا تو صوی چونک کر بولی۔ ''یہ مسعود بھائی ہیں؟''

''جی جناب میں ہی مسعود بھائی ہوں۔'' مسعود شوخی سے بولا۔ مجھے اس کی اسی دہری شخصیت سے نفرت تھی۔

''میں صائمہ ہوں، آپ کی سالی۔'' صوی ہنس کر بولی۔

''یعنی...... آدھی گھر والی۔'' مسعود ہنس کر بولا اور ہنستا ہوا بیڈروم کی طرف چلا گیا۔

''یہ ہیں مسعود۔'' میں نے صوی سے کہا۔ ''کیسے لگے تمہیں؟''

''ہاں، اچھے ہیں۔'' صوی نے گول مول جواب دیا۔

''یہ کیا بات ہوئی۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم مجھ سے

ڈاکٹر سید معین الرحمن

نقاد، محقق اور ماہر تعلیم۔ وہ بھٹندہ پٹیالہ بھارت میں حافظ سید امین الرحمن کے ہاں 1942ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات بہاول نگر سے، بی اے، ایم اے اور ایل ایل بی کے امتحانات کراچی سے پاس کیے۔ سندھ یونیورسٹی جام شورو سے 1972 میں غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ کے عنوان سے مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ 1963ء تا 1964ء ریسرچ اسکالر ترقی اردو بورڈ کراچی اور 1964ء تا 1965ء لیکچرار شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج بہاول نگر اور 1967ء تا 1983ء لیکچرار ایف سی کالج لاہور اور وائس پرنسپل گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں 1974ء تا 1981ء تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ ان کی آخری تعیناتی گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوئی اور وہاں انہوں نے صدر شعبۂ اردو اور پنجابی پروفیسر صوفی تبسم چیئر اور ریسرچ جرنل کے مدیر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیے۔ 1998ء میں انہیں حکومت پاکستان نے صدارتی ایوارڈ اور اعزاز فضیلت سے نوازا۔ اہم تصنیفات اور تالیفات کے نام یہ ہیں۔

(۱) اشاریہ غالب (۲) غالب اور انقلاب ستاون (۳) متداول دیوان غالب (اردو) (۴) تحقیق غالب (۵) غالب کا علمی سرمایہ (۶) تحقیق اور تلاش غالبیات (۷) جاگیر غالب (پرتھوی چند) (۸) غزل، غالب اور حسرت (رشید احمد صدیقی) (۹) مطالب غیبی (غالب) (۱۰) نقوش غالب (۱۱) وقار غالب سید وقار عظیم (۱۲) غالب پیمائی (۱۳) تین اہم غالب شناس

[illegible] اختر، لاہور

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

بھی ایسی باتیں کرو گی۔ کھل کر بتاؤ۔''

''کھلی کھلی بات کروں گی تو تمہیں برا لگے گا۔'' صومی نے کہا۔ ''مسعود بھائی مجھے وہ نہیں لگے جو ظاہر کرتے ہیں۔'' صومی نے کہا۔ میں حسرت سے اپنی اس چھوٹی بہن کا منہ تکنے لگی جو ایک ہی نظر میں مسعود کو بھانپ گئی تھی۔

مجھے چپ دیکھ کر اس نے کہا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ تم میری بات کا برا مانو گی۔ بھئی تم نے کھلی کھلی بات کرنے کو کہا تھا اس لیے میں نے کہہ دی۔''

''تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ ہی نقصان ہوتا ہے بوائے فرینڈ نہ رکھنے اور لڑکوں سے دور دور رہنے کا۔'' صومی ہنس کر بولی۔ ''مسعود بھائی کی آنکھوں میں عجیب سی بات ہے میں نے ایک ہی نظر میں ان کی بھٹکتی ہوئی نظروں کو بھانپ لیا۔ دیکھا نہیں تھا انہوں نے کیسے لہک کر'' آدھی گھر والی کہا تھا۔''

''صومی! میں واقعی برا مان گئی۔ تم مسلسل میرے شوہر کی توہین کر رہی ہو۔''

''سوری آپی۔'' صومی نے مسکرا کر میرے شانے پر سر رکھ دیا۔

ایک ہفتے بعد امجد بھی آ گیا۔ خالہ کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ امجد وہیں آ کے اترا تھا۔ وہ مسعود سے مل کر بہت خوش ہوا۔ مسعود بھی اس وقت تہذیب اور اخلاق کا پیکر نظر آ رہا تھا۔ دونوں کھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ دونوں نے ایم بی اے کیا تھا اس لیے دونوں میں خوب بن رہی تھی۔

ایک ہفتے تک گھر میں خوب ہنگامہ رہا۔ پھر صومی واپس سعودی عرب چلی گئی اور گھر ویران ہو گیا۔

اس دن میری ڈیوٹی وارڈ میں تھی۔ ایمرجینسی سے ایک عورت کو ہمارے وارڈ میں منتقل کیا گیا تھا۔ اس کے جسم میں خون کی بہت کمی تھی اور کھڑے کھڑے بے ہوش ہو کر گر گئی تھی۔ اس کی خالہ اسے جناح اسپتال لے آئی۔ مجھے وہ سیدھی سادی لڑکی بہت اچھی لگی۔ وہ بھی مجھے پسند کرنے لگی۔

ایک دن میری نائٹ ڈیوٹی تھی۔ میں وارڈ کا ایک راؤنڈ لگا کر اس کے پاس آ بیٹھی اس بھولی بھالی لڑکی کا نام ساجدہ تھا۔

''ساجدہ تم شادی کب کرو گی؟'' میں نے یوں ہی اسے چھیڑنے کو پوچھا۔

وہ ایک دم اداس ہو گئی اور بولی۔ ''ڈاکٹر صاحبہ میری شادی تو ہو چکی ہے۔''

''تمہاری شادی ہو چکی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ وہ تو مجھے خود بچی لگتی تھی۔

''میں اس وقت بارہ برس کی تھی۔'' ساجدہ نے جواب دیا۔ ''اس بات کو بھی بارہ سال ہو گئے۔''

''تمہارا شوہر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔''

''میں نے بھی اسے دس سال سے نہیں دیکھا۔'' اس نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

''تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو ساجدہ۔'' میں نے کہا۔

''میں تو صاف صاف بات کر رہی ہوں ڈاکٹر صاحبہ! آپ کو وہ بہکی بہکی کیوں نظر آ رہی ہیں؟''

''تم رہتی کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارا گاؤں تو رحیم یار خان میں ہے لیکن ہم کمانے کے لیے یہاں کراچی میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہم گا بجا کر پیسا کماتے ہیں۔ فیاض جب تک ہمارے ساتھ تھا اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ وہ جمناسٹک کے کچھ کرتب بھی سیکھ گیا تھا۔ وہ میرے چاچا کا بیٹا تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ میری شادی بچپن ہی سے طے تھی۔ بارہ سال کی عمر میں بابا نے میری شادی کر دی۔ میں بیاہ کر ایک جھونپڑی سے دوسری جھونپڑی میں چلی گئی۔ فیاض ایک سال تو میرے ساتھ رہا پھر اچانک اسے پڑھنے کا شوق چرایا۔ برادری کے سب لوگ اس پر ہنسنے لگے۔ اس کا مذاق اڑانے لگے مگر وہ پڑھ لکھ کر بابو بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔''

''فیاض ان کی باتوں کے جواب میں یہ ہی کہتا تھا کہ میں انہیں پڑھ کر دکھاؤں گا۔ میں جانتی تھی کہ فیاض اپنی بات کا پکا ہے، جو دل میں ٹھان لیتا ہے پھر کر کے رہتا ہے۔''

''وہ شہر سے کچھ کتابیں خرید لایا اور پڑھائی میں جت گیا۔

ابا (میرا سسر) کو اب دہری محنت کرنا پڑتی تھی کیوں کہ فیاض کو تو کھانے کمانے سے مطلب ہی نہیں تھا۔ وہ تو بس کتابوں سے چپک کر رہ گیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اس دن گھر میں کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ ابا نے مجھ سے کھانا مانگا تو میں نے انہیں صاف صاف بتا دیا۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔

ابا نہ جانے کب سے غصے میں بھرے بیٹھے تھے۔ انہوں نے پہلے تو فیاض کو خوب گالیاں دیں پھر اسے مارنے لگے۔ فیاض صرف یہ کہہ رہا تھا۔ ''دیکھو ابا! مجھے مت مارو ورنہ میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔''

ابا اسے مارتے مارتے بیدم ہو گئے تو ان کا ہاتھ رکا۔ فیاض یوں ہی فرش پر پڑا رہا۔ پھر اس کی حالت کچھ سنبھلی تو وہ اٹھ کر گھر سے باہر نکل گیا۔ بس ڈاکٹر صاحبہ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔

''اس دوران میں کوئی بچہ نہیں ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے دو بچے ہیں ڈاکٹر صاحبہ، اللہ انہیں سلامت رکھے۔'' ساجدہ نے کہا۔ ''ابا کا فیاض کے غم میں انتقال ہو گیا۔ پچھلے سال ہمارے گاؤں کا ایک آدمی کراچی آیا تھا اس نے فیاض کو دیکھا تھا۔ اب تو وہ بہت بڑا آدمی بن گیا ہے۔ اس کے پاس اپنی گاڑی بھی ہے۔ میں اس کو ڈھونڈنے کراچی آئی ہوں۔''

مجھے اس کی سادگی پر ترس آ گیا۔ وہ کس اطمینان سے کہہ رہی تھی کہ اپنے شوہر کو ڈھونڈنے کراچی آئی ہے۔ کروڑوں کی آبادی والے اس شہر میں کسی آدمی کو ڈھونڈنا ایسا ہی تھا جیسے بھوسے میں سوئی ڈھونڈنا۔ میں نے ساجدہ سے کہا۔ ''تم اتنے بڑے شہر میں فیاض کو کہاں تلاش کرو گی؟''

''میں تو اسے دس سال سے ڈھونڈ رہی ہوں۔ میری لگن سچی ہوئی تو وہ مجھے ضرور ملے گا ورنہ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہی مر جاؤں گی۔''

ساجدہ کی طبیعت اب ٹھیک ہو گئی تھی۔ میں زیادہ دن اسے اسپتال میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسپتال سے جاتے وقت وہ مجھ سے میرا پتا لے گئی۔

پھر کئی مہینے گزر گئے۔ مسعود ان دنوں کمپنی کے ایک کام سے سنگاپور گئے ہوئے تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ میں نائٹ شفٹ کر کے آئی تھی۔ میں چائے کا کپ لے کر دھوپ میں بیٹھ گئی۔

اچانک اطلاعی گھنٹی بجی تو میں نے قاسم سے کہا۔ جا کر دروازے پر دیکھو آج چوکیدار نہیں ہے۔

قاسم دروازے پر گیا۔ پھر واپس آ کر مجھ سے بولا۔ ''بیگم صاحبہ! کوئی عورت آپ سے ملنے آئی ہے۔ مجھے تو وہ کوئی مریضہ لگتی ہے۔ میں کتنی مرتبہ ان لوگوں کو سمجھا چکا ہوں کہ ڈاکٹر صاحبہ گھر پر مریضوں کو نہیں دیکھتیں۔''

''قاسم اسے برآمدے میں بٹھاؤ۔ ہو سکتا ہے کوئی ایمرجینسی ہو؟''

میں تھوڑی دیر بعد اپنی چپل گھسیٹتی ہوئی برآمدے میں پہنچی تو ساجدہ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یہ ساجدہ اس ساجدہ سے بہت مختلف تھی جسے میں نے اسپتال میں دیکھا تھا اس وقت وہ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ چہرہ بھی نکھرا نکھرا نظر آ رہا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''ساجدہ لگتا ہے تمہیں فیاض مل گیا ہے؟''

''میری ایسی قسمت کہاں، ڈاکٹر صاحبہ!'' وہ ایک دم افسردہ ہو گئی۔

''تم نے صبح ناشتا کیا تھا؟'' میں نے موضوع بدلنے کو کہا۔

''ناشتا تو بڑے لوگ کرتے ہیں ڈاکٹر صاحبہ، ہم لوگ ناشتے کی عیاشی نہیں کر سکتے۔''

میں نے اسے ناشتا کرایا اور دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی۔ گھوم پھر کے اس کی تان فیاض پر ٹوٹتی تھی۔ وہ کافی دیر بیٹھنے کے بعد واپسی کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ جاتے جاتے مجھ سے بولی۔ ''بیگم صاحبہ دعا کریں کہ آئندہ آؤں تو فیاض کو ساتھ لے کر آؤں۔''

اس کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر کافی عرصے تک ساجدہ کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔

''میں اس دن گھر میں داخل ہوئی تو برآمدے میں مجھے ساجدہ نظر آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہاں بیٹھنے کی بجائے تم میرے کمرے میں چلو، وہیں باتیں کریں گے۔'' میں نے قاسم سے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے دو کپ چائے بھجوا دے۔ اس دن شدید گرمی تھی میں نے ساجدہ کو شربت پلایا اور اس سے پوچھا۔ ''تمہارے بچے ٹھیک ہیں؟''

''ہاں جی، بچے ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہیں۔'' پھر وہ بری طرح چونک اٹھی۔ اس کی نظریں بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی مسعود کی تصویر پر تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھی اور مسعود کی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

تصویر والا فریم اٹھا لیا اور خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ڈاکٹر صاحبہ! میری لگن سچی تھی، مجھے میرا فیاض مل گیا۔ مجھے فیاض مل گیا۔''

''کہاں ہے فیاض؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی تو میرا فیاض ہے۔'' اس نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

''تم ہوش میں تو ہو؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''یہ میرے شوہر مسعود ہیں۔''

''نہیں جی، یہ میرا فیاض ہے۔''

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور مسعود اندر داخل ہوا۔

اس کی نظر ساجدہ پر پڑی تو وہ سکتے کی سی کیفیت میں رہ گیا۔ میں بہت غور سے اس کا مشاہدہ کر رہی تھی۔

اس وقت ساجدہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور چیختی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ''تو کہاں چلا گیا تھا۔ تو بہت ظالم ہے رے، تجھے اپنے بچوں کا خیال نہ آیا۔''

مسعود اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''ساجدہ میری بات سنو۔''

مجھے شدید صدمہ پہنچا وہ ساجدہ کو نام لے کر مخاطب کر رہا تھا۔ اسے بھلا ساجدہ کا نام کس نے بتایا؟ کیا ساجدہ سچ کہہ رہی ہے کیا مسعود ہی اس کا فیاض ہے؟ ساجدہ ابھی تک چیخ رہی تھی۔

میں نے مسعود سے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ فیاض۔''

''صوفیہ، میری بات سنو میں......''

''اب بھی کچھ کہنے کو باقی رہ گیا ہے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے سچ سچ بتاؤ مسعود تم نے ایسا کیوں کیا؟''

مسعود نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔

''اس عورت کو جانتے ہو مسٹر فیاض؟''

مسعود کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''م م...... میں اس عورت کو نہیں جانتا۔''

''اچھا پھر تم اس کا نام کیسے جانتے ہو؟'' میں نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

میرے اندر بہت ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ دل صدمے کے باعث پھٹا جا رہا تھا۔ اتنا بڑا دھوکا...... ایسا دھوکا؟ میرے اندر سے بار بار یہی صدا اٹھ رہی تھی۔

پاپا اس خبر کو سنتے تو مر ہی جاتے لیکن بعض اوقات زندگی بہت ڈھیٹ ثابت ہوتی ہے۔ میری چیخ پکار سن کر پاپا اچانک اندر آ گئے۔ انہیں دیکھ کر مسعود یا فیاض بالکل چور بن گیا۔ جب انہیں حقیقت کا علم ہوا تو وہ دل پکڑ کر بیٹھ گئے لیکن مجھے حیرت ہے کہ وہ اس اندوہناک حقیقت کو برداشت کر گئے۔

انہوں نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''صوفیہ بیٹا مجھے معاف کر دو۔ میں خود کو بہت ارفع و اعلیٰ سمجھتا تھا۔ ہر آدمی میرے نزدیک کم تر تھا۔ شاید اللہ تعالیٰ نے مجھے اس غرور کی سزا دی ہے۔ مجھ سے اچھی تو میری بچیاں ہیں۔ انہوں نے درست فیصلے کیے اور آج خوش و خرم زندگی گزار رہی ہیں۔ میں خود کو بہت فرض شناس اور تجربہ کار سمجھتا تھا۔ میں بھی دھوکا کھا گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کا ہاتھ گھٹیا درجے کے ایک بھانڈ کے ہاتھ میں دے دیا۔ پھر وہ مسعود سے مخاطب ہوئے۔ ''دل تو چاہ رہا ہے کہ تمہیں ابھی اور اسی وقت پولیس کے حوالے کر دوں لیکن اس میں میری بھی بڑی رسوائی ہے۔ بس مجھ پر ایک کرم کرو میری بیٹی کو طلاق دے دو۔''

''نہیں پاپا۔'' میں چیخ کر بولی۔ ''میں اپنے ماتھے پر مطلقہ کا داغ نہیں لگانا چاہتی۔ یہ اب جیسا بھی ہے میرا مقدر ہے۔''

''صوفیہ میں معافی کے قابل نہیں ہوں، اس کے باوجود تم سے معافی مانگ رہا ہوں اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ تم کہو تو میں اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دوں گا۔''

''نہیں۔'' میں پھر چیخ اٹھی۔ ''تمہارے گناہوں کی سزا اس مظلوم عورت اور معصوم بچوں کو کیوں ملے؟ تمہاری سزا یہ ہے کہ تم اس عورت کو اپنے گھر میں رکھو، دونوں بچوں کو تعلیم دلاؤ اور ان کی بہترین تربیت کرو۔'' یہ کہہ کر میں بلک بلک کر رونے لگی۔

میرے ساتھ پاپا اور ساجدہ بھی رونے لگے۔ پاپا کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے اور ساجدہ تشکر کے آنسو بہا رہی تھی۔

مسعود اب بالکل بدل گیا ہے۔ وہ جتنا میرا خیال رکھتا ہے اتنا ہی ساجدہ اور بچوں کا خیال رکھتا ہے۔

پاپا اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ان کے نسلی تفاخر نے مجھے ریزہ ریزہ کر دیا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

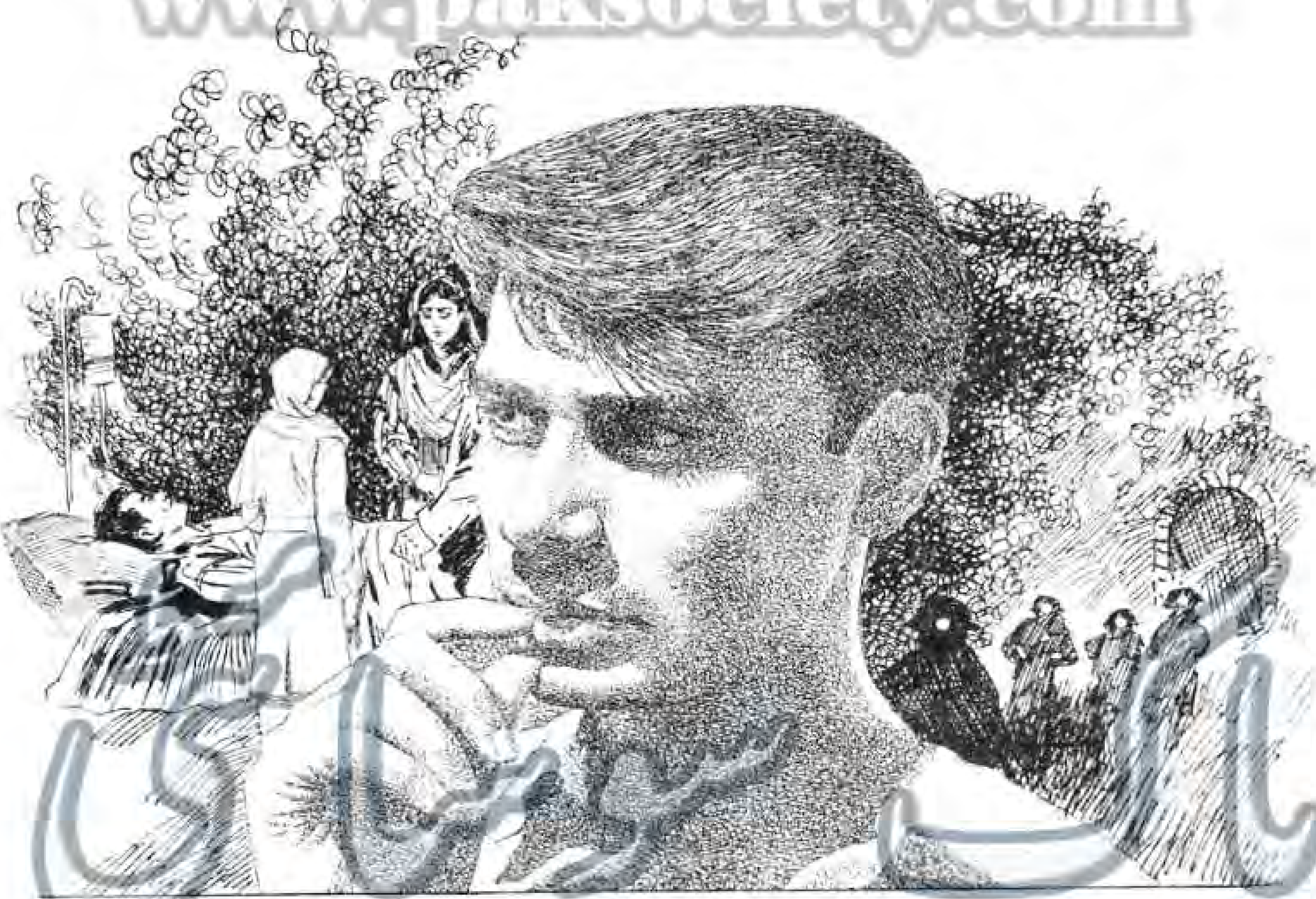

مہلت

محترم مدیر

السلام علیکم

علم رویا میں حضرت ابن سیرین لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ سے کسی نے سوال کیا کہ وحی الٰہی تو آپ کے بعد کسی پر نازل نہیں ہوگی پھر آپ کی امت کو کسی بات کی پیشگی اطلاع کیسے ہوگی تو آپؐ نے فرمایا۔ ”رویا“ یعنی خواب۔ میرے ایک جاننے والے نے بھی ایک عجیب و غریب خواب دیکھا جسے میں نے کہانی کی شکل میں لکھا ہے۔

دانیہ صدیقی

(کراچی)

آج جب اسپتال میں نیند سے جاگا تو خود کو چاق و چوبند محسوس کررہا تھا بلکہ یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ پچھلے پندرہ دنوں میں یہ پہلا موقع تھا جب مجھے صبح اٹھتے ہی کھانسی کا نہ ختم ہونے والا دورہ نہیں پڑا تھا۔ گزشتہ دو ہفتوں سے میں شدید بیمار تھا اسی وجہ سے میں کام پر بھی نہ جاسکا تھا مگر آج کی صبح مختلف تھی۔ میں چھلانگ لگا کر بستر سے نکلا اور آگے بڑھ کر کھڑکی سے پردہ ہٹا دیا۔ سورج ابھی پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا اور آس پاس ہلکا سا اندھیرا چھایا تھا۔ فضا میں خوشگوار

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

سی خنکی تھی، میں نے آنکھیں بند کر کے زوردار سانس لی اور کچھ دیر تک ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں بھر کر رفتہ رفتہ خارج کی۔ اس عمل کو میں نے تین چار مرتبہ دُہرایا تو خود کو پہلے سے زیادہ فریش محسوس کرنے لگا۔ اس کے بعد میں نے گنگناتے ہوئے غسل خانے کا رخ کیا اور وہاں سے فارغ ہو کر یونیفارم پہن کر کام پر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا گویا ابھی تک کوئی نہیں اٹھا تھا۔ اماں جب سو کر اٹھیں گی اور اسے پتا چلے گا کہ میں چپکے سے کام پر جا چکا ہوں تو وہ کتنی حیران ہوں گی۔ میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ اکلوتا بیٹا ہونے کے ناتے میں اپنے والدین کی اُمیدوں کا واحد مرکز تھا مگر پچھلے کچھ روز سے میری بیماری کی وجہ سے وہ لوگ سخت پریشان تھے۔ میرے کام کا بھی حرج ہوا تھا مگر بہر حال میں اب خود کو بالکل فٹ محسوس کر رہا تھا۔ سینے میں گزشتہ روز تک محسوس ہونے والی شدید چبھن کا بھی نام و نشان نہ تھا اور بخار بھی ٹوٹ چکا تھا۔

میں تیار ہو کر گھر سے نکلا تو باہر روشنی پھیل چکی تھی اور معمول کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ جلیل سبزی والا ہمیشہ کی طرح اپنا سبزی کا ٹھیلا سجا رہا تھا۔ میری اس سے اچھی سلام دعا تھی۔ بیماری کی وجہ سے کئی دنوں سے میری اس سے ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔ میں نے سوچا کہ آگے بڑھ کر اس سے ملوں یقیناً وہ بھی مجھے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ جائے گا۔ میں سیٹی بجاتا ہوا اس کی جانب بڑھا اور قریب پہنچ کر زوردار آواز میں سلام کیا مگر اس سے پہلے کہ وہ میری جانب دیکھتا یا سلام کا جواب دیتا۔ دو تین گاہک اس کے ٹھیلے پر آ گئے اور وہ ان کے ساتھ بھاؤ تاؤ میں الجھ گیا۔ اس نے مڑ کر ایک مرتبہ بھی میری جانب نہیں دیکھا تھا۔ میں نے کچھ دیر رک کر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کیا مگر جب دیکھا کہ اسے گاہکوں سے فارغ ہونے میں ٹائم لگ جائے گا تو میں وہاں سے چل پڑا۔

میں اسٹیشن کی جانب تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ جہاں سے ٹرین مجھے اور میرے ساتھی کان کنوں کو قصبے سے چند کلومیٹر دور کوئلے کی کان تک پہنچا دیتی۔ ہم لوگ اس کان میں پچھلے آٹھ سالوں سے کام کر رہے تھے۔ کوئلے کی دریافت سے پہلے ہمارا قصبہ کافی پسماندہ تھا اور جدید سہولیات تو ایک طرف بنیادی سہولیات کی بھی قلت تھی مگر بھلا ہو انگریز بابوؤں کا جنھوں نے بارہ سالوں کی انتھک محنت کے بعد بالآخر یہاں پر کوئلے کے ایک بڑے ذخیرے کا سراغ ڈھونڈ ہی نکالا تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس قصبے کی قسمت پلٹ گئی۔

یہاں پر ایک بوائز کالج کے علاوہ اب لڑکیوں کے لیے بھی سیکنڈری اسکول کھل گیا تھا۔ اس سے پہلے یہاں صرف لڑکوں کے لیے ایک ہی سرکاری اسکول تھا جہاں پر ماسٹر حنیف گزشتہ پچیس سالوں سے تن تنہا بچوں کے ساتھ سر پھوڑ رہے تھے۔ خود میں نے بھی میٹرک اسی اسکول سے کیا تھا۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا مگر قصبے میں کالج نہ تھا۔ سب سے قریبی کالج بھی وہاں سے چار گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔ بابا نے میرے شوق کو دیکھتے ہوئے بہت زور مارا کہ میں شہر میں جا کر رہ جاؤں اور اپنی تعلیم مکمل کروں مگر میں اتنا خود غرض نہ تھا کہ اپنے بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کر چلا جاتا۔ اور پھر یہاں زینب بھی تو تھی! میری بچپن کی محبت اور ٹھیکرے کی منگ! زینب میری تایا زاد تھی۔ عمر میں مجھ سے تین سال بڑی تھی مگر ذات برادری میں رشتے طے کرتے ہوئے ان باتوں کو اہمیت نہیں دی جاتی خود میری اماں بھی بابا سے عمر میں پوری آٹھ سال بڑی تھیں مگر دونوں میں مثالی محبت تھی۔ میں زینب کے ساتھ کھیل کود کر بڑا ہوا تھا اور ہمارے درمیان محبت کا رشتہ مضبوط ہو چکا تھا۔ میری بیماری کے دوران زینب نے میری خدمت میں کوئی کمی نہ چھوڑی تھی۔ میں نیم بیہوشی کے عالم میں اکثر اسے اپنا سر دباتے یا ماتھے پر پٹیاں رکھتے دیکھتا۔ ایک مرتبہ آدھی رات کو میری آنکھ کھلی تو وہ میرے چہرے پر جھکی ہوئی تھی اور اس کے آنسو میرا چہرہ بھگو رہے تھے مگر بخار کی شدت اور بے انتہا کمزوری کے باعث میرے اندر اتنی بھی سکت ... نہ تھی کہ اسے دلاسہ دیتا یا کچھ نہیں تو سینے سے ہی لگا لیتا۔

زینب کا خیال آتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پگلی! جب آج شام مجھے اپنے سامنے یوں ہنستا کھڑا دیکھے گی تو کتنی حیران ہو گی پھر میں آگے بڑھ کر اس کے گلابی ہاتھوں میں اس کے پسندیدہ موگرے کے گجرے تھماؤں گا تو وہ شرما کر دُہری ہوتی وہاں سے بھاگ جائے گی مگر رات کو چھت پر وہی موگرے کے گجرے بالوں میں لگائے، آنکھوں میں سپنے سجائے میرا انتظار کرے گی اور میں چپکے سے...... "کوووووووک"...... ٹرین کا مخصوص ہارن مجھے خیالوں کی دنیا سے باہر گھسیٹ لایا۔ یقیناً ٹرین جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ دراصل یہ ٹرین کان کنوں کو کان تک لے جانے کے لیے خصوصی طور پر صبح اور شام کے اوقات

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

میں چلائی جاتی تھی۔ صبح کو یہ ہمیں سات بجے لے کر یہاں سے روانہ ہوتی اور اور شام پانچ بجے یہ ہمیں واپس لے آتی۔ کوئلے کی کان کی دریافت سے مقامی آبادی کو مستقل روزگار مہیا ہو گیا تھا جو آج کل کے دور میں ایک خوش آیند بات تھی۔

میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا پلیٹ فارم پر پہنچا جہاں ٹرین دھیمے دھیمے چل رہی تھی۔ میں تقریباً بھاگتا ہوا ٹرین تک پہنچا ...اور ڈنڈا پکڑ کر لٹک گیا۔ میرے سامنے جمال موجود تھا جو وہیں دروازے پر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ میری اور جمال کی آپس میں کبھی نہیں بنی تھی۔ زمانۂ طالبعلمی سے ہی ہم دونوں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے آئے تھے۔ وجہ اس کی حد سے بڑھی دادا گیری اور بدمعاشی تھی۔ حالانکہ وہ بھی میری طرح ایک محنت کش باپ کا بیٹا تھا مگر اس کے مزاج میں خودسری تھی جو مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ مجھ سے کئی بار الجھ چکا تھا اور ہر بار منہ کی کھائی تھی۔ جب کان کنوں کی بھرتی ہو رہی تھی تو وہ بھی میری طرح نام لکھوا کر کان کن کی حیثیت سے بھرتی ہو گیا۔ گزشتہ سالوں میں کئی بار ایسا ہوا کہ ہم آمنے سامنے آئے مگر دوسروں کی بروقت مداخلت سے کوئی بڑا جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ویسے بھی اب میرا جمال سے کم ہی واسطہ پڑتا تھا۔ کیونکہ کوئلے کی کان کو مختلف حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا جہاں کان کن الگ الگ ٹولیوں میں کام کرتے۔ میرا گروپ چھ افراد پر مشتمل تھا اور ہم کان کی اندرونی سمت والے حصے میں کام کرتے تھے جبکہ جمال اور اس کے ساتھیوں کے ذمے کان کے نچلے حصے کی کھدائی کا کام تھا۔

جمال نے مجھے ان دیکھا کرتے ہوئے سگریٹ ختم کی اور اندر چلا گیا حالانکہ وہ چاہتا تو مجھے سہارا دے کر اندر کھینچ سکتا تھا مگر حسب توقع اس نے میری مدد کرنے کے بجائے مجھے نظرانداز کر دیا تھا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر میں اس سے بحث میں پڑ کر اپنا خوشگوار موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ٹرین میں داخل ہو کر میں ایک جانب بیٹھ گیا اور کھڑکی کے باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہونے لگا۔ گو میں اسی جگہ پلا بڑھا تھا اور پچھلے کئی برسوں سے کام پر آتے جاتے صبح شام پابندی سے یہی مناظر دیکھتا رہا تھا مگر نجانے کیا بات تھی کہ آج یہ منظر پہلے سے حسین محسوس ہو رہے تھے۔ سبزے کی ہریالی آج الگ ہی جھب دکھلا رہی تھی اور نیلگوں آسمان پہلے سے زیادہ روشن معلوم ہو رہا تھا۔ میں بھی خود کو گویا بادلوں میں اڑتا محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میرے پاس والی خالی سیٹ پر کریم آ کر بیٹھ گیا۔ وہ میرے ہی گروپ میں کام کرتا تھا اور فطرتاً خاموش طبع تھا۔ میں نے خوش مزاجی سے اسے سلام کیا اور اس کے حال احوال دریافت کیے مگر جواب دینا تو درکنار اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا تک نہیں۔ کریم کے والد ٹی بی کے مریض تھے اور ان کی طبیعت کو لے کر وہ اکثر پریشان اور کھویا کھویا رہتا۔ شاید آج بھی اسے کوئی ایسی ہی پریشانی لاحق تھی جب ہی وہ خاموشی سے سر نیہوڑائے بیٹھا تھا۔

ٹرین اپنی مخصوص رفتار سے سفر کرتی منزل کو پہنچ گئی تو ہم سب ایک ایک کر کے اس سے اترے اور کان کی جانب چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر سب کے ساتھ میں نے بھی اپنے اوزار اٹھائے اور کان کنوں کا مخصوص بلب والا ہیلمٹ سر پر رکھتے ہوئے کان میں اتر گیا جہاں کریم کے علاوہ آصف، راجو، اقبال، صابر اور چاچا غفور بھی پہنچ چکے تھے اور اب اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ڈرل کی زوردار آوازوں میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے گو سب کو سلام کیا تھا مگر شاید ڈرل کی آواز میں میری آواز دب گئی تھی اسی لیے کوئی میری جانب متوجہ نہ ہوا۔ میں صابر کے برابر والی جگہ پر چلا گیا اور وہاں جلدی جلدی بیلچہ چلانے لگا۔ آج میں اپنے بازوؤں میں بے پناہ توانائی محسوس کر رہا تھا۔ طویل بیماری کے دوران بستر پر پڑے رہنے کے بعد اب میرے جسم میں چستی سی آ گئی تھی اور مجھے اپنے وجود سے ایک انوکھی سی روشنی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔

جب سے میں نے کان میں نوکری کی تھی مجھے پہلے دن سے یہی اُمید تھی کہ کسی دن کھودتے کھودتے میں اچانک ہاتھ لگ جانے والے بڑے سے ہیرے کا مالک بن جاؤں گا۔ اس ہیرے کو بیچ کر میں اماں اور بابا کے لیے ایک بڑا سا مکان بنواؤں گا جس میں اماں کے لیے اے سی بھی لگواؤں گا۔ بیچاری گرمیوں میں کام کرتے کرتے پسینے کی زیادتی سے کیسی ہلدی کی طرح زرد ہو جاتی ہیں اور بابا کو ٹھنڈا برف لگا پانی پینے کی عادت ہے۔ برف جمانے کے لیے کیسے کیسے جتن نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ فریج آ جائے گا تو انھیں بغیر کسی پریشانی کے چوبیس گھنٹے ٹھنڈا پانی میسر ہو گا...... اور زینب! میرے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے لیے ڈھیر سارے گہنے بنواؤں گا۔ بہت سے کپڑے لے کر دوں گا اور سب کے سب گلابی رنگ کے اہاں، اسے گلابی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

رنگ بہت پسند ہے۔ ویسے تو وہ کوئی بھی رنگ پہن لے اس پر بہت کھلتا ہے مگر گلابی رنگ میں تو وہ آسمان سے اتری حور معلوم ہوتی ہے۔

میں سوچوں میں گم تیز تیز ہاتھ چلا رہا تھا جب اچانک مجھے دیوار کی طرف ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ میں نے رک کر اس روشنی کو غور سے دیکھا اور پلٹ کر راجو کو آواز دی جو مجھ سے تھوڑے ہی فاصلے پر دیوار میں ہتھوڑے سے بھاری ضربیں لگا رہا تھا۔ میں نے اسے دو تین آوازیں دیں مگر وہ ایسا منہمک تھا کہ اس نے میری آواز نہ سنی۔ میں نے اسے بلانے کا ارادہ ترک کر دیا اور ہاتھوں کی مدد سے جلدی جلدی دیوار کو توڑنے لگا۔ چند لمحوں میں وہاں اتنی جگہ بن گئی تھی کہ وہاں سے رینگ کر دوسری جانب نکلا جا سکتا تھا۔ اب میں اپنے تجسس پر مزید قابو نہیں پا سکتا تھا اسی لیے میں نے ہیلمٹ اتار کر ایک جانب رکھا اور اچک کر دیوار پر چڑھ گیا پھر دونوں ہاتھوں پیروں کی مدد سے رینگتا رینگتا دیوار کی دوسری جانب نکل آیا۔

گھپ اندھیری کان سے نکلنے کے بعد سورج کی تیز روشنی میں قدرتی طور پر میری آنکھیں ذرا سی دیر کو چندھیا سی گئیں اور جب میں بمشکل کچھ دیکھنے کے قابل ہوا تو حیرت کی شدت سے گنگ سا ہو گیا۔ میں اگر یہ کہوں کہ اس وقت میں جنت میں کھڑا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ تاحد نگاہ دلکش اور نظروں کو خیرہ کر دینے والا سبزہ ہی سبزہ بکھرا تھا۔ قریب ہی چاندی کی سی رنگت والی صاف و شفاف آبشار گر رہی تھی اور اس سے اڑنے والی پانی کی ننھی ننھی بوندیں گھاس پر موتیوں کی مالا سی بن رہی تھی۔ رنگ برنگے پھولوں کی دلکش خوشبو سے سارا ماحول معطر تھا جبکہ درختوں پر لال لال رس بھریوں کے خوشے الگ ہی بہار دکھا رہے تھے۔ پورا ماحول جیسے نور اور پاکیزگی کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ میں دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا آگے بڑھا۔ میں نے بچپن میں اماں سے الہ دین اور جادو کا چراغ کی کہانی کئی مرتبہ سنی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جب اس کا سوتیلا چچا اسے تہ خانے میں بند کر کے چلا جاتا ہے تو الہ دین ٹہلتا ٹہلتا ایسی ہی کسی دنیا میں نکل جاتا ہے۔ اس وقت میں خود کو ایسی ہی کسی طلسماتی کہانی کا کردار محسوس کر رہا تھا۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ اسی علاقے میں پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے کے باوجود میں کبھی اس جنت نظیر جگہ پر نہیں آیا بلکہ یہاں آنا تو درکنار کبھی کسی سے اس جگہ کے متعلق نہ کچھ جانا تھا اور نہ کچھ سنا تھا۔

میرے رگ و پے میں عجیب سی سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ میں نے ذرا سا جھک کر جھرنے کے پانی کو ہتھیلیوں کی کٹوریوں میں بھر لیا اور ایک گھونٹ بھرا۔ میرا رواں رواں جیسے تازگی سے بھر گیا۔ میں نے اپنی زندگی میں بھی اتنا خالص اور مزیدار پانی نہیں پیا تھا بلکہ اسے محض پانی کہنا تو اس کی توہین تھی! وہ تو امرت جل تھا! خاص امرت جل! آب حیات جو مُردوں میں بھی زندگی کی روح پھونک دے۔ اب میں ترنگ میں آ گیا تھا۔ اپنا پسندیدہ گانا گنگناتے ہوئے میں آگے بڑھا اور اُچک کر درخت سے لٹکتی رسیلی رس بھری کا ایک خوشہ توڑا اور منہ میں بھر لیا ۔۔۔ واہ!!! ایک مرتبہ پھر میرا انگ انگ جھوم اٹھا۔ مجھے بن پیے ہی نشہ سا ہونے لگا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ایسی مزیدار رس بھری تو پورے روئے زمین پر کہیں نہیں پائی جاتی ہوگی۔ میں بے اختیار کھاتا ہی چلا گیا اور جب کھا کھا کر تھک گیا تو مجھے یاد آیا کہ مجھے اپنے ساتھیوں کو بھی یہ جگہ بتانی چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا اسی سوراخ کی جانب چل پڑا جس کے ذریعے میں رینگتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔

ابھی میں سوراخ سے چند قدم ہی دور تھا جب مجھے محسوس ہوا کہ میرے پیروں تلے زمین ہلکی سی ہلی ہے۔ میں ابھی رک کر جائزہ ہی لے رہا تھا کہ ایک کانوں کو شق کر دینے والا دھماکا ہوا۔ آواز دیوار کی دوسری جانب سے آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی زمین کی گڑگڑاہٹ کی خوفناک آوازیں آنے لگیں۔ ایک کان کن ہونے کے ناتے جو خیال سب سے پہلے میرے ذہن میں آیا، وہ تھا 'میتھین گیس'۔ گو میں اس خطرے سے آگاہی تو حاصل تھی لیکن فوری طور پر اس سے بچاؤ کی کوئی ترکیب نہیں کی جا سکتی تھی سوائے اس کے کہ اس جگہ سے فوری طور پر نکل جایا جائے ورنہ یہ مہلک گیس منٹوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور کر سکتی تھی۔

میں دیوانہ وار دوڑتا ہوا دیوار تک پہنچا اور اچھل کر سوراخ میں داخل ہو گیا اور تیز رفتاری سے گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا دوسری جانب پہنچا۔

میں نے ہلکا سا سر نکال کر اس طرف جھانکا تو مجھے سب سے آگے چاچا غفور کا خوفزدہ سا چہرہ نظر آیا۔ ان کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ میرے بدترین خدشات کی تصدیق ہو چکی تھی یعنی زمین کی گڑگڑاہٹ اس بات کی علامت تھی کہ نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ہیں اور میتھین گیس ان لوگوں کے گرد تیزی سے موت کا شکنجہ کس رہی ہے۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر چاچا غفور کو آواز لگائی جس پر ان کے علاوہ میں نے صابر، کریم اور اپنے دیگر ساتھیوں کو بھی چونک کر اپنی سمت دیکھتے پایا۔ حیرت انگیز طور پر ان میں سے کوئی بھی آگے نہیں بڑھا۔ میں نے جھنجلا کر دوبارہ آواز لگائی۔ ''کس بات کا انتظار کررہے ہو؟ ایک منٹ بھی اور ٹھہرے تو تم لوگوں کی لاشیں یہاں پڑی ہوں گی۔ جلدی آگے بڑھو اور میرا ہاتھ تھامو۔'' میری بات سننے کے بعد جیسے وہ سارے ہوش میں آگئے۔ سب سے پہلے آصف نے میری جانب ہاتھ بڑھایا اور میں نے اسے اوپر کھینچ لیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم سب صحیح سلامت دیوار کے اس پار والی جنت میں بیٹھے تھے۔ اس جگہ کو دیکھ کر ان کی بھی میری والی حالت ہوئی تھی۔ سب نے پہلے خوب اچھی طرح گھوم پھر کر اس جگہ کا جائزہ لیا۔ ہم میں سب سے عمر رسیدہ اور تجربہ کار چاچا غفور ہی تھے جن کی زبان بھی حیرت کے مارے گنگ تھی۔ انھوں نے پُر یقین لہجے میں بتایا کہ آج سے پہلے انھوں نے بھی اس جگہ کے بارے میں نہیں سنا۔ جب وہ سارے گھوم گھوم کر تھک گئے تو نرم نرم، ریشمی گھاس پر براجمان ہوگئے۔ آصف اس گفتگو میں شامل نہیں ہوا تھا بلکہ وہ کافی دیر سے مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے پہلے تو اس کی حرکت کو نظرانداز کیا مگر جب اس کا گھورنا جاری رہا تو میں نے تنگ آکر پوچھ ہی لیا۔ ''کیا بات ہے بھائی؟ کیوں اتنی دیر سے مجھے پولیس والی نظروں سے گھور رہا ہے؟''

آصف نے مجھے ویسے ہی گھورتے ہوئے ایک عجیب وغریب سوال داغا۔ ''تم یہاں کب آئے؟ میرا مطلب ہے کہ تم اس کان میں کب آئے؟'' میں نے کچھ حیرت اور کچھ پریشانی سے اس کی طرف دیکھا۔ دراصل مجھے ایک لمحے کو یہ خدشہ ہوا تھا کہ کہیں میتھین گیس نے اس کے حواسوں پر تو اثر نہیں کردیا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو تم؟ تمھارا مطلب ہے کہ تم مجھے یہاں پہلی بار دیکھ رہے ہو؟''

مگر اس سے پہلے کہ آصف میری بات کا جواب دیتا اچانک راجو بول پڑا۔ ''میں سمجھتا ہوں۔ دراصل یہ پوچھنا چاہ رہا ہے کہ تم تو پچھلے دو ڈھائی ہفتوں سے کام پر نہیں آئے پھر آج اس دھماکے کے بعد اچانک کہاں سے برآمد ہوگئے؟''

راجو کے منہ سے یہ بے سروپا بات سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ میتھین گیس نے ان کے اعصاب کو بہت بری طرح متاثر کردیا ہے جبھی تو وہ ایسی بہکی بہکی باتیں کررہے تھے۔

باقی افراد خاموشی سے میرے جواب کے منتظر تھے۔

میں نے ان سب کے چہروں پر ایک نظر ڈالی پھر گلا کھنکھار کر گویا ہوا۔ ''دیکھو دوستو! اس وقت یہ باتیں اہمیت نہیں رکھتیں کہ میں اچانک کہاں سے آیا اور یہ کونسی جگہ ہے۔ اس وقت ہمیں جلد از جلد کسی ہسپتال کا رخ کرنا چاہیے کیونکہ تم سب لوگوں کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔''

اب کے بولنے کی باری خاموش طبع کریم کی تھی۔ ''وہ تو ٹھیک ہے مگر پہلے ہماری بات کا جواب تو دو!''

مجھے کم از کم کریم سے اس سوال کی اُمید نہیں تھی جبکہ وہ صبح ٹرین میں میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا اور میں نے اس کو متوجہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ میں نے کچھ زچ آنے والے انداز میں اس سے کہا۔ ''تم تو اپنی پریشانیوں کی وجہ سے ویسے ہی گم صم رہتے ہو۔ تمھیں تو یاد بھی نہیں ہوگا کہ صبح میں ٹرین میں تمھارے ساتھ ہی بیٹھا تھا اور نہ صرف......''

کریم نے تقریباً چلاتے ہوئے مجھے ٹوکا۔ ''کیا کہا؟ کیا کہا؟ تم صبح ٹرین میں میرے ساتھ بیٹھے تھے؟ میں تو کھڑکی والی سیٹ کے برابر بیٹھا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ سیٹ پورا سفر خالی ہی رہی!''

میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''دیکھا میں کہتا تھا نا کہ تمھیں اپنے آس پاس کا ہوش ہی کب رہتا ہے۔ یقین نہیں آتا تو صابر سے پوچھ لو۔ میں کان میں صبح سے اس کے برابر ہی کھڑا کام کررہا ہوں۔''

میں نے صابر کی جانب اپنے بیان کی تصدیق کے لیے نگاہ اٹھائی تو جواب دینے کے بجائے اس کا منہ حیرت کی زیادتی سے کھل گیا۔ بمشکل اٹکتے اٹکتے اس کے منہ سے برآمد ہوا۔ ''تم میرے برابر میں کب تھے؟ میرے قریب تو اقبال کام کررہا تھا۔ تم تو اپنی طبیعت کی وجہ سے کئی دنوں سے کام پر ہی نہیں آرہے۔''

اس کی یہ بات سن کر میں بری طرح جھنجلا گیا اور ابھی کوئی سخت بات کہنے ہی جارہا تھا کہ اتنی دیر سے خاموش بیٹھے چاچا غفور نے ہاتھ اٹھا کر مجھے کچھ کہنے سے روک دیا۔ چاچا غفور نہ صرف میرے بزرگ تھے بلکہ بابا کے بھی دیرینہ دوست تھے۔ اسی لیے میں نے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کردیا البتہ غصہ میرے چہرے سے ہویدا تھا۔

چاچا غفور اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیررہے تھے اور

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety
پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1
پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

ان کی آنکھیں دور آسمان میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا وہ اپنی بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ کے چناؤ میں الجھے ہوئے ہوں۔ چند منٹ اسی خاموشی میں گزر گئے پھر وہ اپنے مخصوص گمبھیر لہجے میں ہم سے مخاطب ہوئے۔ ''میرے بچو! تمہاری باتیں سننے کے بعد اور حالات و واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے میں ایک نتیجے پر پہنچا ہوں۔'' اس کے بعد وہ ذرا سی دیر کو خاموش ہوئے پھر سلسلۂ کلام کو وہیں سے جوڑتے ہوئے بولے۔ ''کل رات کو میرے پاس شہاب کے والد (میرے بابا) کا فون آیا تھا۔ وہ بے تحاشا رو رہا تھا اور مجھ سے دعا کی درخواست کر رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ شہاب کو انوکھی نوعیت کا گردن توڑ بخار ہو گیا ہے اور ڈاکٹرز کے پاس فی الحال اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اس نے سسکتے ہوئے بتایا کہ شہاب کے دماغ نے مکمل طور پر کام کرنا چھوڑ دیا ہے اور اب آخری اُمید کے طور پر اس کو مصنوعی تنفس کی مشینوں پر ڈال دیا گیا ہے یعنی جب تک اسے مصنوعی تنفس دیا جاتا رہے گا اس کی سانسیں چلتی رہیں گی اور اس ہٹاتے ہی وہ اس دنیا سے ناتا توڑ جائے گا دعا کرو کہ وہ صحت یاب ہو جائے۔ میں نے اسے تسلی دی اور یہ یقین دلایا کہ اللہ کی ذات پر مکمل ایمان رکھے۔ سخت مایوسی میں بھی دعائیں معجزے کا کام کر جاتی ہیں۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ آج کام سے واپسی پر میں شہاب کو دیکھنے ہسپتال ضرور آؤں گا۔ میں تم لوگوں کو بھی اس کی طبیعت کے بارے میں آگاہ کرتا مگر اس سے پہلے ہی یہ حادثہ ہو گیا۔''

اتنا کہہ کر چاچا غفور نے سر جھکا لیا۔ ہم سب حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ چاچا کے بقول میں اس وقت ہسپتال میں پڑا اپنی موت و بقاء کی جنگ لڑ رہا تھا مگر میں تو یہاں موجود تھا بلکہ آج تو میں خود کو ہمیشہ سے زیادہ چست و توانا محسوس کر رہا تھا، بھلا کوئی قریب المرگ مریض ایسا محسوس کر سکتا ہے؟ مجھے تو اب چاچا کی دماغی حالت پر بھی شبہ ہونے لگا تھا۔ سب گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے جب اقبال نے یہ سکوت توڑا۔ ''چاچا غفور آپ کی بات سے کیا ہم یہ نتیجہ اخذ کریں کہ ہمارے سامنے اس وقت شہاب نہیں بلکہ اس کی روح کھڑی ہے؟'' میں نے چونک کر اقبال کی شکل دیکھی اور اس سے پہلے کہ اس کی اس احمقانہ بات کا کوئی کرارا سا جواب دیتا، راجو بول پڑا۔ ''نہیں! مجھے لگتا ہے چاچا کچھ اور کہنا چاہ رہے ہیں۔ ان کو لگتا ہے کہ ہم سب مر چکے ہیں اور اس وقت عالمِ برزخ جیسی کسی جگہ پر ہیں۔ یقین نہیں آتا تو چاچا غفور سے پوچھ لو۔'' راجو نے بات ختم کی تو سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

چاچا غفور نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''ہاں!! یہی مشیتِ ایزدی ہے میرے بچو! اسی لیے صبر اور حوصلے سے کام لو۔'' یہ سن کر سدا کا بے نیاز اور خاموش مزاج کریم چیخ اٹھا۔ ''میں کیسے مان لوں کہ ہم سب مر چکے ہیں؟ آپ اتنی بڑی بات کیسے کہہ سکتے ہیں چاچا؟''

چاچا نے اس کی بدتمیزی نظر انداز کر دی۔ وہ بھی معاملے کی سنجیدگی کو سمجھ رہے تھے اور ایسی صورتِ حال میں کریم کا یوں بھڑکنا جائز بھی تھا۔ چاچا غفور نے اس کی بات سن کر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولے۔ ''اگر یوں غصہ دکھا کر اور چیخ چلا کر حقیقت بدلی جا سکتی تو میں تم سب کو یہی کرنے کا مشورہ دیتا مگر تقدیر کا لکھا اٹل ہے اور کوئی اسے نہیں ٹال سکتا۔ شہاب کے بقول وہ صبح سے ہمارے ساتھ، ہمارے آس پاس ہی موجود تھا مگر ہم میں سے کسی نے بھی اسے نہیں دیکھا، نہ اس کی موجودگی کو محسوس کیا اور نہ ہی اس کی آواز سنی البتہ کان میں ہونے والے دھماکے کے بعد اچانک ہی وہ نہ صرف نظر آنے لگا بلکہ یہ ہمیں اپنے ساتھ ایک ایسی جگہ بھی لے آیا جو ہم نے اس علاقے میں آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھی اور نہ اپنے بڑے بوڑھوں سے اس کا ذکر سنا۔ یہ سارے واقعات اسی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ شہاب سمیت اب ہم میں سے کوئی بھی اس دنیا میں نہیں رہا۔''

چاچا کی بات کے اختتام پر کریم اپنے بازوؤں میں سر چھپائے بے آواز رو رہا تھا۔ باقی لوگوں کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک ہم سب جوش سے بھرپور تھے۔ زندگی ہمارے جسموں میں حرارت بن کر دوڑتی تھی اور ہم آنے والے کل کے لیے آنکھوں میں بڑے بڑے خواب سجائے بیٹھے تھے مگر موت نے ہم سے سب چھین لیا تھا اور ہم کسی بے بس پنچھی کی طرح اس کے شکنجے میں پھنسے کراہ رہے تھے۔ مجھے اماں اور بابا کی یاد آئی اور میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ کیا میں دوبارہ کبھی ان مہربان چہروں کو دیکھ نہیں پاؤں گا۔ کیا میں کبھی اماں کی نرم گرم آغوش میں سو نہیں سکوں گا۔ بابا کے شفقت بھرے سینے سے لگ نہیں سکوں گا؟ اور زینب! میرے منہ سے کراہ سی نکل گئی اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ وہ کیسی کیفیت تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

یوں لگتا ہے جیسے میرے جسم کا کوئی ٹکڑا کٹ کر الگ ہوگیا ہو اور یہ سوچ کر تکلیف اور بڑھ رہی تھی جب یہ پتا ہو کہ اس کرب و اذیت کا سلسلہ اب ابدی ہے۔

سب اپنی قسمت پر بیٹھے آنسو بہا رہے تھے جب اچانک کریم اپنی جگہ سے اٹھا اور دیوانوں کی طرح اس دیوار کی جانب بھاگا جس کے ذریعے ہم لوگ یہاں تک پہنچے تھے۔ چاچا غفور کے ہوش دلانے پر صابر اور آصف بھی اس کے پیچھے دوڑے۔ کچھ دور جا کر انھوں نے کریم کو جالیا۔ چند لمحے تو ان کے درمیان تھوڑی سی کشمکش ہوتی نظر آئی۔ کریم جنونیوں کی طرح چلاتا ہوا کچھ بول رہا تھا مگر دور ہونے کی وجہ سے ان کی آوازیں ٹھیک طور پر ہم تک نہیں پہنچ پا رہی تھیں۔ ہم لوگ خاموشی سے بیٹھے ان کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد صابر دوڑتا ہوا ہماری جانب واپس آگیا۔ اس وقت اس کا چہرہ اندرونی جذبات کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے پھولی پھولی سانسوں کے درمیان بڑی مشکلوں سے اٹکتے اٹکتے جو بات کی اس کا مفہوم یہ تھا کہ کریم یہ چاہ رہا ہے کہ اسی سوراخ کے ذریعے دوسری جانب چلا جائے اور اگر چاچا غفور کی بات درست ہے تو دوسری جانب ہماری لاشیں تو ضرور پڑی ہوں گی۔ اگر وہ ہم نے دیکھ لیں تو ہم چاچا کی بات درست مان لیں گے اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر ہمیں اپنی جانیں بچانے کے لیے فوری طور پر کوششوں کا آغاز کرنا ہوگا۔

اس بات نے گویا ہمارے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ ہمارے اندر ایک مرتبہ پھر جینے کی آرزو جاگ اٹھی۔ سب تیز تیز قدم اٹھاتے دیوار کی جانب بڑھنے لگے۔ طے یہ پایا کہ ہم اپنے چہروں پر اپنی قمیصیں لپیٹ کر کان میں جائیں گے کیونکہ اگر چاچا غفور کی بات غلط نکلتی ہے اور ہم واقعی زندہ ہیں تو دوسری جان پہنچتے ہی مہلک گیس کا شکار ہو کر بلاشبہ مر جائیں گے۔ ہم سب نے اپنی قمیصیں اتار کر چہروں پر ڈھاٹے کی طرح کس لیں اور ایک ایک کر کے اس سوراخ میں داخل ہوگئے۔ میں سب سے پیچھے تھا جبکہ میرے آگے راجو تھا۔ ایک دوسرے کے پیچھے رینگتے ہوئے ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ شدید اندرونی خلفشار کی بدولت میرا سانس تیز تیز چل رہا تھا اور جسم پسینے سے تر تھا۔ شاید باقیوں کی بھی یہی حالت تھی کیونکہ راجو نے ایک لمحے کو رک کر رومال سے اپنا ماتھا پونچھا تھا۔ اس کے بعد وہ رومال اس کی جیب سے نیچے گر گیا مگر وہ بغیر دیکھے آگے بڑھ

گریٹر تھل کینال

تھل میں پانی کی فراہمی کا ایک عظیم منصوبہ کہا گیا تھا کہ اس منصوبے کی منظوری مئی 2002ء کو ارسا نے دی۔ گریٹر تھل کینال منصوبہ سات سال میں مکمل ہوگا۔ اس پر 30 ارب روپے لاگت آئے گی اور اس میں 8500 کیوسک پانی چھوڑا جا سکے گا۔ یہ نہر خریف کے موسم میں چھ ماہ کے لیے چلے گی، اس کے لیے 96 4ء 2 ملین ایکٹر فٹ پانی مختص کیا گیا۔ اس میں سے 1873ء کے معاہدے کے تحت ملے گا، جب کہ 624 ملین ایکٹر پانی سیلابی پانی کے حصے سے ملے گا۔ اس نہر سے 3ء 15 لاکھ ایکٹر رقبہ سیراب ہوگا۔ یہ رقبہ جھنگ، خوشاب، بھکر اور لیہ کے چار اضلاع میں واقع ہے۔

مرسلہ: نسرین صدیقی، حیدرآباد

گیا۔ میں نے وہ رومال اس کو دینے کی غرض سے تھاما ہی تھا جب مجھے لگا جیسے کسی نے مجھے آواز دی ہو۔ زینب نے ہولے سے میرا نام پکارا تھا۔ ''شوبی!'' وہ مجھے پیار سے اکثر شوبی کہہ کر بلاتی تھی۔

میں نے اسے اپنا وہم جان کر سر جھٹکا۔ بھلا اس تنگ و تاریک جگہ پر زینب کا کیا کام! ابھی میں آگے بڑھا ہی تھا کہ دوبارہ میرے کانوں سے زینب کی آواز ٹکرائی۔ ''شوبی پلیز مت جاؤ!'' اس بار آواز غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ آواز زینب کی ہی ہے۔ آواز میری دائیں جانب سے آ رہی تھی اسی لیے میں سب کچھ بھول کر دائیں طرف مڑ گیا۔ میں بیقراری سے زینب کو آوازیں دے رہا تھا جب مجھے آنسوؤں میں ڈوبی اماں کی آواز بھی سنائی دی۔ ''ہائے میرا بچہ، میری جان! اپنی ماں کو چھوڑ کر مت جا۔ یا اللہ رحم کر! اس دکھیاری کی فریاد سن لے۔'' اس کے آگے آواز مدھم پڑ گئی مگر مجھے بے چین کر گئی۔ میں پاگلوں کی طرح چاروں ہاتھوں، پیروں پر رینگتا آگے بڑھنے لگا۔ اب مجھے ایک تواتر سے اماں، بابا اور زینب کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ سب رو رہے تھے، بلک رہے تھے اور مجھے کہیں جانے سے روک رہے تھے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا تھا مگر میں چیخ چیخ کر انھیں آوازیں دینے لگا تھا۔ میری

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر رواں تھا۔

اچانک میرے سامنے روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ ایک لمحے کو مجھے لگا جیسے میں اندھا ہو گیا ہوں۔ ابھی میں اسی پریشانی میں تھا کہ میرے وجود کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور کوئی ان دیکھی طاقت مجھے آگے کو کھینچنے لگی۔ میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی اور اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا میں اڑتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میں فضا میں ہاتھ پیر چلا رہا تھا۔ انتہائی عجیب سی صورتِ حال تھی، میرے آس پاس سے دیوار شوں شوں کی آواز کے ساتھ گزر رہی تھی۔ اسی لمحے مجھے اپنے سامنے تیز روشنی کا ایک ہالہ سا نظر آیا جو اتنا چمکدار تھا کہ میں نے اپنے چہرے کو ہاتھوں کے پیچھے چھپا لیا۔ میں جیسے ہی اس روشنی کے ہالے میں داخل ہوا میری رفتار خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔ میرے پورے جسم کو رہ رہ کر جھٹکے لگ رہے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا گویا میرا دل کسی بھی لمحے سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آ جائے گا۔ میرے کانوں میں بہت سی آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں جیسے بہت سے نادیدہ افراد میرے آس پاس موجود ہوں۔

پھر مجھے یوں لگا.... گویا میری رفتار کچھ دھیمی پڑ رہی ہو اور پھر ہوتے ہوتے وہ نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ میں جو اس وقت خلاء میں اڑ رہا تھا اچانک نیچے گرنے لگا۔ میرے منہ سے چیخوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میرا دل بند ہو جاتا مجھے یوں لگا جیسے میرا جسم پوری طاقت سے کسی ٹھوس سطح سے ٹکرایا ہو جس کے نتیجے میں مجھے بری طرح جھٹکا لگا اور جسم میں انتہائی شدید تکلیف کی وجہ سے مجھے یوں لگا جیسے میرا جسم کئی حصوں میں بٹ گیا ہو۔ میں نے اپنی آنکھیں مضبوطی سے بند کر رکھی تھیں اور بے طرح چلا رہا تھا جب مجھے بالکل قریب سے اماں کی آواز سنائی دی۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے، مولا تیرا احسان ہے جو تو نے میرے بچے کو نئی زندگی عطا کی۔" اور میں نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔

یہ کیا؟ میں تو ہسپتال کے اسی بستر پر دراز تھا جہاں پچھلے پندرہ روز سے پڑا تھا۔ اماں، بابا اور زینب میرے سرہانے ہی کھڑے تھے جبکہ ان کے چہرے آنسوؤں سے تر تھے۔ میرے ذہن میں سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ "کوئلے کی کان، دھماکا اور میرے ساتھی۔ وہ...... وہ لاشیں! اوہ، خدا کے لیے انھیں بچاؤ!!" میں دھیمے دھیمے بڑبڑا رہا تھا۔

ڈاکٹر نے غور سے مجھے دیکھا اور بابا کی طرف مڑ گیا۔ "کیا آپ کا بیٹا کسی کان میں مزدور ہے؟"

بابا نے جلدی جلدی سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "جی ہاں، ڈاکٹر صاحب یہ کوئلے کی کان میں مزدوری کرتا ہے مگر پتا نہیں یہ کون سے دھماکے اور لاشوں کی بات کر رہا ہے۔ میری تو سمجھ نہیں آ رہا۔" ڈاکٹر نے ٹھنڈی سانس بھر کر بابا کی جانب دیکھا اور بولا۔ "میں نے اپنے کیریئر کے دوران میں بہت سے ایسے کیسز دیکھے ہیں جن کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا قریب قریب ناممکن ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ وجود نہیں رکھتے بلکہ ان کی حیثیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔" بابا نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ڈاکٹر کی جانب دیکھا تو وہ بولا۔ "میرا مشورہ ہے کہ آپ اسی وقت فون کر کے پتا کیجیے کہ کہیں کان میں کوئی دھماکا تو نہیں ہوا ہے۔"

میں نے یہ سب کچھ سنا اور پھر دھیرے دھیرے دواؤں کے زیر اثر بے سدھ ہو گیا۔ اس کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو زینب میرے سرہانے ہی موجود تھی۔ اسی کی زبانی مجھے پتا لگا کہ میں موت کے منہ میں جا کر واپس آیا ہوں۔ ڈاکٹرز نے تو میری موت کی تصدیق کر دی تھی مگر اس کے کچھ دیر بعد ہی میرے دل نے معجزانہ طور پر کام کرنا شروع کر دیا اور میں زندگی کی طرف واپس لوٹ آیا۔ میں ابھی ہسپتال میں ہی ایڈمٹ تھا اور ہسپتال کے کمرے میں موجود ٹی وی پر خبریں دیکھ رہا تھا۔ انہی کے ذریعے مجھے پتا چلا کہ آج سے ایک ہفتہ قبل کوئلے کی کان میں میتھین گیس کا دھماکا ہوا تھا جس کے نتیجے میں شدید جانی نقصان ہوا تھا۔ گو یہ اُمید بہت کم تھی کہ اب کوئی زندہ بچا ہو مگر پھر بھی امدادی ٹولیاں وہاں دن رات کوششوں میں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے اپنے ساتھی بہت شدت سے یاد آ رہے تھے اور میرا رُواں رُواں خدا کے حضور دعا گو تھا کہ وہ سارے خیریت سے ہوں اور انھیں کوئی نقصان نہ پہنچا ہو۔

لیکن حقیقت کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ان میں کوئی بھی نہیں بچا تھا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور میں مسلسل ایک ہی بات سوچے جا رہا تھا کہ وہ سب کیا تھا۔ ان مرے ہوئے لوگوں کے درمیان خود میں نے اپنے آپ کو کیوں دیکھا۔ اس حادثے کو کن جذبات کے ساتھ کس طرح دیکھا؟ کیا میری روح نے بھی میرا جسم چھوڑ دیا تھا؟ کیا واقعی مجھے نئی زندگی ملی ہے؟ یہ سوال آج بھی ہنوز برقرار ہے اور جواب نہیں مل رہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

من کے میلے

جناب معراج رسول
السلام علیکم
کچھ لوگ من کے میلے ہوتے ہیں، ان کا دل کبھی صاف نہیں ہوتا۔ میرا سابقہ بھی کچھ ایسے ہی لوگوں سے پڑا ہے۔ وہ میرے خونی رشتے دار ہیں پھر بھی مجھے ان سے نفرت ہے۔ وجہ میری آپ بیتی ہے۔

اظفر علی
(نواب شاہ)

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

میری ماں انتہائی کم صورت عورت تھی۔ یہ تو لوگوں کا خیال ہے۔ میرے لیے تو ماں دنیا کی خوب صورت ترین ہستی تھی۔ ماؤں کو رنگ روپ اور نین نقش سے نہیں بلکہ ان کی ممتا سے پرکھا جاتا ہے۔ ان کی ممتا اتنی خوب صورت ہوتی ہے کہ ان کی ظاہری شکل وصورت ثانوی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔

میری ماں دنیا کی نظر میں کالی کلوٹی، موٹی بھدی اور بدشکل تھی لیکن مجھے وہ اپنی جان سے زیادہ چاہتی تھی۔ اکثر

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

محلے والے کہتے تھے کہ انیسہ تو اتنی کالی کلوٹی ہے یہ گڈو اتنا خوب صورت کیسے ہوگیا۔ تیرا بیٹا تو یہ لگتا ہی نہیں ہے۔

اس وقت ماں کے چہرے پر عجیب سا کرب نظر آتا۔ وہ مجھے سینے سے بھینچ کر کہتی۔ ''گڈو میرا ہی بیٹا ہے۔ گڈو اتنا خوب صورت کیسے ہے۔ اس سوال کا جواب تو اللہ ہی دے سکتا ہے۔''

ماں کے مقابلے میں بابا زیادہ خوش شکل تھے۔ ان کا رنگ گندمی تھا۔ کالے سیاہ بال اور نقوش تیکھے تھے۔ وہ اگر پڑھے لکھے ہوتے اور کوئی معقول ملازمت کر رہے ہوتے تو مزید نکھر جاتے۔

بابا ٹرک ڈرائیور تھے۔ وہ پندرہ پندرہ بیس بیس دن گھر سے باہر رہتے تھے۔ اس لیے ماں میرے زیادہ قریب تھی۔ وہی مجھے نہلاتی، دھلاتی، بہترین کپڑے پہناتی اور اچھے سے اچھا کھلاتی، اس نے کبھی میری کوئی فرمائش رد نہیں کی تھی۔ وہ بس مجھے خوش دیکھنا چاہتی تھی۔

ہم سندھ کے ایک چھوٹے سے شہر نوشہرو فیروز میں رہتے تھے۔ وہاں ہمارا چھوٹا سا لیکن پختہ مکان تھا۔

بابا جب ٹرک لے کر وہاں آتے تو کچھ دن گھر میں بھی رہتے تھے۔ وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب وہ آتے تو مجھے ساتھ لیے لیے گھومتے، میرے ساتھ کھیلتے تھے اور مجھے مٹھائیاں اور اچھے اچھے کھلونے دلاتے تھے۔ اس حسرت زدہ علاقے میں شاید میں واحد بچہ تھا جس کے پاس سیل سے چلنے والے کھلونے تھے۔

ماں کی محبت کا اندازہ اس سے لگالیں کہ میری خاطر اس نے اپنا گھر بیچ کر نواب شاہ میں ٹھکانا بنالیا۔

میں اسکول جانے کے قابل ہوگیا تھا اور نوشہرو فیروز میں ان دنوں کوئی اچھا اسکول نہیں تھا۔ ماں اس سے پہلے راولپنڈی اور لاہور جیسے بڑے شہروں میں رہ چکی تھی۔ وہ ان دنوں لوگوں کے بنگلوں پر کام کرتی تھی۔ یہ میری پیدائش سے پہلے کی بات ہے۔ شاید اس وقت تو ماں کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے لاہور اور راولپنڈی میں بچوں کو اسکول جاتے دیکھا تھا۔ وہ مجھے بھی کسی انگلش میڈیم اسکول میں پڑھانا چاہتی تھی۔ نواب شاہ میں بہ قول ماں کے دو چار اچھے اسکول تھے۔ ان کی فیس بہت زیادہ تھی لیکن بابا نے کسی نہ کسی طرح میرا داخلہ نواب شاہ کے ایک انگلش میڈیم اسکول میں کرادیا۔

میں نے اسکول جانا شروع کیا تو مجھے بہت اچھا لگا۔ وہ دنیا ہی اور تھی۔ اب تک میں نے عسرت زدہ اور مفلوک الحال بچے دیکھے تھے۔ بوسیدہ کپڑوں میں گلیوں کی خاک اڑاتے اور گالم گلوچ کرنے والے بچے۔

میرے اسکول کے بچے بہت صاف ستھرے اور مہذب تھے۔ میری ٹیچرز بھی بہت اچھی تھیں اور مجھے پسند بھی کرتی تھیں کیونکہ میں اپنا سبق ہمیشہ ایک ہی دفعہ میں یاد کرلیتا تھا۔

ماں روزانہ مجھے اسکول چھوڑنے اور لینے آیا کرتی تھی۔ وہ مجھے گود میں اٹھانے کی کوشش کرتی تو میں برا مان جاتا اور کہتا۔ ''اماں! تم مجھے اب تک بچہ ہی سمجھتی ہو۔ میں اب بڑا ہوگیا ہوں۔''

میری بات سن کر ماں کے کالے سیاہ رنگ میں سرخی سی دوڑ جاتی۔

ایک دن ماں مجھے اسکول چھوڑ کر واپس گئی تو میرے کلاس کے ایک لڑکے نے مجھ سے کہا۔ ''یار افشر تمہاری نوکرانی تو بہت اچھی ہے، تمہارا بہت خیال رکھتی ہے۔''

مجھے اچانک غصہ آگیا۔ اس نے میری ماں کو نوکرانی کہا تھا۔ میں نے اچانک اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا اور بولا۔ ''وہ میری نوکرانی نہیں، ماں ہے سمجھے، آیندہ اگر میری ماں کے لیے کچھ کہا تو میں تمہارے دانت توڑ دوں گا۔''

وہ روتا ہوا ٹیچر کے پاس چلا گیا۔ وہ ٹیچر اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ جاوید زیادہ تر اس ٹیچر کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ٹیچر جاوید کی سگی خالہ تھی۔

جاوید کی شکایت پر ٹیچر تنتناتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے منہ پر دو تین زناٹے دار تھپڑ رسید کردیے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ٹیچر کی یہ حرکت پرنسپل صاحب بھی دیکھ رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے لیکن میں انہیں ضبط کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

پرنسپل صاحب اپنے آفس سے نکل کر تیزی سے وہاں پہنچے اور درشت لہجے میں بولے۔ ''مس بشریٰ! آپ نے اس بچے کو کیوں مارا ہے؟''

بشریٰ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس اسکول میں ٹیچرز کو مارنے کی اجازت نہیں تھی۔ پھر بشریٰ نے تو مجھے کلاس سے باہر مارا تھا۔

''سر...... اس نے جاوید کو مارا تھا۔'' بشریٰ نے تھوک نگل کر کہا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' پرنسپل صاحب نے قدرے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

نرم لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"میرا نام اظفر ہے سر۔" میں نے جواب دیا اور پرنسپل صاحب کی ہمدردی پا کر، آنسو بہہ نکلے جنہیں میں نے خود پر جبر کر کے چھپایا تھا۔

"رومت بیٹا۔" پرنسپل صاحب نے کہا۔ "تمہاری لڑائی ہوئی تھی جاوید سے؟"

"نو سر، جاوید نے میری ماں کو نوکرانی کہا تھا۔"

پرنسپل صاحب، جاوید کی طرف مڑے۔ "تم نے کہا تھا اظفر کی ماں کو نوکرانی؟"

جاوید بری طرح گھبرا گیا اور بولا۔ "سر میں سمجھا کہ وہ......"

"شٹ اپ!" پرنسپل صاحب نے اسے ڈانٹ دیا پھر وہ ٹیچر بشریٰ سے مخاطب ہوئے۔ "مس بشریٰ اسکول کے رولز اینڈ ریگولیشن تو جانتی ہیں ناں؟"

"سوری سر۔" بچوں کے سامنے اس بے عزتی پر بشریٰ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"سوری مجھ سے نہیں اظفر سے کریں۔" پرنسپل صاحب نے کہا۔

"نو سر، مس مجھ سے بڑی ہیں میں ان کو بہت پسند بھی کرتا ہوں۔ مجھے مار لیا تو کیا ہوا؟"

مس بشریٰ نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور بولی۔ "اظفر تم بہت اچھے ہو بیٹا۔"

بات آئی گئی ہو گئی لیکن زندگی میں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ میں اپنی ماں کی برائی نہیں سن سکتا۔

اسکول جاتے ہوئے مجھے دو سال ہو گئے تھے۔ میں اب کلاس نو میں تھا۔ ماں نے مجھے چھوڑنے اور گھر لے جانے کے لیے ایک تانگے والے سے بات کر لی تھی۔ اس تانگے میں کئی بچے میرے ساتھ اسکول جایا کرتے تھے۔ پھر یوں ہی دن گزرتے رہے اور میں پڑھتا رہا۔

ان دنوں میری عمر پندرہ سال تھی۔ میں اسکول سے واپس آیا ہی تھا کہ رمضان آ گیا۔ رمضان، بابا کے ٹرک پر کلینر تھا۔ وہ خاصا حواس باختہ نظر آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے رمضان تو......"

"بھابی، ظلم ہو گیا۔ بھائی اصغر کی دوسرے ٹرک والوں سے لڑائی ہو گئی ہے اور وہ لوگ بھائی اصغر کو مار رہے ہیں۔"

"تم بابا کو اکیلا چھوڑ کر یہاں آ گئے؟" میں نے غصے سے کہا اور کھانا چھوڑ کر ٹرک اڈے کی طرف بھاگا۔ میرے پیچھے پیچھے اماں بھی تھیں۔

بابا شدید زخمی تھے۔ لوگوں نے ان کے درمیان بیچ بچاؤ کرا دیا تھا۔ بابا کے سر پر چوٹ آ گئی تھی۔ ہم لوگ بابا کو لے کر اسپتال بھاگے۔ وہ سرکاری اسپتال تھا جہاں جان پہچان کے بغیر کوئی کسی پر توجہ نہیں دیتا۔ میرے ایک کلاس فیلو خورشید کے والد ڈاکٹر تھے اور اس اسپتال میں تھے۔ میں اکثر خورشید کے گھر چلا جاتا تھا اس لیے اس کے والد سے واقف تھا۔ میں نے ایک وارڈ بوائے سے پوچھا۔ "یہ ڈاکٹر اسحاق صاحب کہاں ہوتے ہیں۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔"

"ڈاکٹر اسحاق اوپر کی منزل پر بیٹھے ہیں۔" وارڈ بوائے نے جواب دیا۔

میں پوچھتا ہوا ڈاکٹر انکل تک پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے اور بولے۔ "اظفر بیٹا خیریت تو ہے۔ تم یہاں کیسے؟"

"انکل! میرے بابا ایک حادثے میں زخمی ہو گئے ہیں۔"

"ارے کیسے؟" ڈاکٹر صاحب ایک دم کھڑے ہو گئے۔ "کہاں ہیں وہ؟"

"وہ ایمرجنسی وارڈ میں پڑے ہیں۔ کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں ہے۔"

"رومت بیٹا۔" ڈاکٹر صاحب نے اپنا سفید کوٹ اور اسٹیتھس اسکوپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب کو ایمرجنسی میں دیکھ کر ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ وہ بہت سینئر ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے بابا کا معائنہ کیا، پھر فوراً مجھ سے کہا کہ ان کے لیے بلڈ کا بندوبست کرو۔ پھر کچھ سوچ کر بولے۔ "تم کہاں بھاگ دوڑ کرو گے، میں خود ہی بندوبست کر لوں گا۔"

بابا کو فوراً آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا اور ڈاکٹر صاحب نے ان کے مختلف لیب ٹیسٹ لکھ کر دے دیے۔

بابا کی چوٹ کافی گہری تھی۔ ان کا خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔

میں دروازے کے شیشے سے پلک جھپکائے بغیر انہیں دیکھ رہا تھا۔

رات گئے انہیں ہوش آیا تو میں نے اماں کو بتایا۔ ڈاکٹرز کے روکنے کے باوجود ہم دونوں آئی سی یو میں چلے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

گئے۔ بابا کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ اماں کو وہ کچھ کہہ کر وہ بولے۔ ''نسیمہ مجھے لگتا ہے کہ میں زندہ نہیں بچوں گا۔ تو اس پرائی امانت کو اس کے گھر پہنچا دینا۔''

''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو ڈرائیور صاحب!'' اماں انہیں ہمیشہ ڈرائیور صاحب کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔

''میری بات کان کھول کر سن لے نسیمہ ہم کسی دوسرے کا اجاڑ کر اپنا گھر کیسے آباد کر سکتے ہیں۔ میری اس بات کو میری وصیت سمجھ لے۔ میں...... تجھ سے......'' ان کی حالت بگڑنے لگی تو فوراً ایک نرس آگے بڑھی اور بولی۔

''آپ لوگ مریض کو ڈسٹرب مت کریں۔ پلیز باہر جائیں۔''

میں اماں کے ساتھ باہر آ گیا۔ اماں کے ساتھ میں بھی آنسو بہا رہا تھا۔

پھر بابا کو ہوش نہ آ سکا۔ صبح تک انہوں نے دم توڑ دیا۔

بابا کی تدفین کے بعد میں لٹا پٹا سا گھر آ گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں دھاڑیں مار مار کے روؤں لیکن اماں کی وجہ سے میں رو نہیں رہا تھا۔ بابا یا اماں کا کوئی قریبی رشتے دار تو تھا نہیں۔ بس محلے والے تھے یا پھر بابا کے کچھ ڈرائیور اور مکینک دوست۔ وہ سب لوگ دوسرے ہی دن واپس اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اب میں اور اماں اکیلے رہ گئے۔

میں اب بچہ نہیں رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ بابا کی موت کے بعد زندگی ہمارے لیے دوبھر ہو جائے گی۔ بابا کا ٹرک بھی سنبھال نہیں سکتا تھا کہ اس وقت میری عمر صرف بارہ سال تھی۔ میں محنت مزدوری کر سکتا تھا یا پھر بابا کے مستری دوست کے ورک شاپ پر کام کر سکتا تھا۔ میں دن رات اسی فکر میں گھلتا رہتا تھا۔

مجھے اکثر بابا کی آخری گفتگو یاد آتی تھی۔ انہوں نے کس امانت کا ذکر کیا تھا جو اماں کے پاس تھی۔

ایک دن میں نے اماں سے پوچھ بھی لیا۔ ''اماں، بابا تم سے کس امانت کی بات کر رہے تھے؟''

اماں میری بات سن کر چونک اٹھی، پھر وہ مجھے سینے سے لگا کر رونے لگی اور روتے روتے بولی۔ ''بیٹا وہ امانت تو ہے۔''

''وہ امانت میں ہوں؟'' میں الجھ کر بولا۔ ''مجھے صاف صاف بتاؤ ماں آخر بات کیا ہے؟''

''ہاں بیٹا۔'' اماں نے کہا۔ ''وہ امانت تو ہے۔ تو میرا بیٹا نہیں ہے۔''

اماں کے الفاظ تھے یا بم کا گولہ۔ مجھے اس لمحے واقعی ایسا لگا تھا جیسے میرے سر پر کسی نے بم پھوڑ دیا ہو۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ اماں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

اماں نے جلدی سے مجھے پانی پلایا اور میری ہتھیلیاں سہلانے لگیں۔

کافی دیر بعد میری حالت کچھ سنبھلی۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اماں کا بیٹا نہیں ہوں۔ شاید اماں نے مجھ سے کوئی مذاق کیا تھا۔

میں نے اماں سے کہا۔ ''اماں! یہ مذاق ہے نا؟''

''نہیں بیٹا۔'' اماں پھر آنسو بہانے لگی۔ ''یہ مذاق نہیں ہے۔''

''پھر مجھے بتاؤ اماں میں کس کا بیٹا ہوں۔'' میں چیخ کر بولا۔

اماں نے خلا میں تکتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

''یہ اب سے آٹھ نو برس پہلے کی بات ہے۔ ہم لوگ ان دنوں پنڈی میں رہتے تھے۔ اصغر نے شادی کے بعد بہت محنت کی تھی اور کچھ ہی دن پہلے قسطوں پر ٹرک خریدا تھا۔ وہ ٹرک لے کر جاتا تو کئی کئی روز گھر کی شکل نہ دیکھتا۔ میں اکیلے گھر میں پڑی پڑی بیزار ہو جاتی تھی۔ میری شادی کو چار سال ہو چکے تھے لیکن ابھی تک میں اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔

میری پڑوسن کا شوہر کسی بڑے ڈاکٹر کا ڈرائیور تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم اپنا اور بھائی اصغر کا میڈیکل چیک اپ کرا لو تا کہ معلوم تو ہو کہ خرابی کیا ہے۔ اس خرابی کا علاج بھی کیا جا سکتا ہے۔

میری سمجھ میں اس کی بات آ گئی۔ میں نے سوچ لیا کہ اب جب بھی اصغر ٹرک لے کر پنڈی آئے گا میں اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس جاؤں گی۔ اصغر آیا تو وہ بہت خوش تھا۔ اس ٹرپ میں اسے بہت فائدہ پہنچا تھا۔ وہ میرے لیے کپڑے، چوڑیاں اور بہت سی چیزیں لے کر آیا تھا۔

کھانے کے بعد وہ مجھ سے بولا۔ ''نسیمہ، کاش ہمارا کوئی بچہ بھی ہوتا تو یہ گھر اتنا سونا سونا نہ ہوتا۔ اب جیسی اس سوہنے رب کی مرضی۔'' اس نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

''اللہ نے یہ نہیں کہا ہے کہ تم ہاتھ پیر ڈال کر بیٹھ جاؤ۔ انسان کو پہلے تو خود محنت کرنا چاہیے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

''کیسی محنت نسیمہ۔'' اصغر نے پوچھا۔ ''تو کہنا کیا چاہتی ہے؟''

''میری ہمسائی بلقیس کا شوہر کسی بہت بڑے ڈاکٹر کا ڈرائیور ہے۔ وہ ہمیں ڈاکٹر صاحب کے پاس لے جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''پر ہم ڈاکٹر کے پاس جا کر کیا کریں گے؟'' اصغر نے کہا۔ ''کیا تو بیمار ہے؟''

''ہم صرف پتا کرنے جائیں گے کہ ہم میں کوئی خرابی تو نہیں ہے جو اولاد نہیں ہوتی۔'' میں نے کہا۔

بات اصغر کی سمجھ میں آ گئی اور وہ دوسرے ہی دن ڈاکٹر کے پاس چلنے کو تیار ہو گیا۔

وہ بہت بڑے ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے ہم دونوں کے ٹیسٹ کرائے اور دوسرے دن آنے کو کہا۔

''تو نے فضول میں اتنے پیسے ضائع کرا دیے نسیمہ۔'' اصغر نے اسپتال سے واپس آنے کے بعد کہا۔

''فضول میں۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''اب ہمیں کم سے کم یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں کوئی خرابی ہے یا اللہ کی طرف سے دیر ہے۔''

دوسرے دن ہماری ٹیسٹ رپورٹس آ گئیں۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ اصل خرابی اصغر میں ہے۔ وہ کبھی باپ نہیں بن سکتا ہے۔

''ڈاکٹر صاحب!'' ہم نے کہا۔ ''اس کا کوئی علاج بھی تو ہوگا۔''

''یہی تو خرابی ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ دنیا میں بے شمار لوگ اس خرابی میں مبتلا ہیں، اگر یہ مرض قابلِ علاج ہوتا تو دنیا کا کوئی دولت مند آدمی بے اولاد نہ ہوتا۔''

میں چکرا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اصغر نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ خود بھی بہت افسردہ تھا۔

گھر آ کر بھی وہ کھویا کھویا سا رہا اور سارا دن گھر میں پڑا رہا۔

دوسرے دن شام کو اس نے مجھ سے کہا۔ ''نسیمہ! مجھے بہت افسوس ہے کہ میں تیری خواہش پوری نہ کر سکا۔ اب اس کا بس ایک حل ہے۔''

''کیسا حل؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''میں...... میں...... تجھے...... طلاق دے...... دوں۔'' اصغر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تو اپنی خواہش کو دوسری شادی کے بعد پورا کر سکتی ہے۔''

شوکت عزیز

ماہرِ اقتصادیات، وزیرِ اعظم پاکستان۔

کراچی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم سینٹ پیٹرک اسکول کراچی میں حاصل کی، پھر ایبٹ آباد پبلک اسکول میں داخلہ لیا۔ گارڈن کالج راولپنڈی سے گریجویشن کی۔ انسٹیٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن یونیورسٹی آف کراچی سے ایم بی اے کی ڈگری لی۔ 1969ء میں سٹی بینک کراچی سے انہوں نے ملازمت کا آغاز کیا۔ 1975ء میں بیرونِ ملک چلے گئے اور فلپائن، اردن، یونان، امریکا، برطانیہ، ملائیشیا، سنگاپور اور سعودی عرب میں ملازمت کی اور افریقن ریجن کے سربراہ بھی رہے۔ 1999ء میں جنرل پرویز مشرف نے انہیں وزارتِ خزانہ، اقتصادی امور پلاننگ و ڈویلپمنٹ اور ریونیو ڈویژن کا قلمدان سونپا۔ وہ کابینہ کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے۔ چودھری شجاعت نے جون 2004ء میں وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا تو انہوں نے بھی انہیں اس عہدے پر برقرار رکھا۔ 1996ء میں ایشین پرنسج کونسل نیوجرسی (امریکا) نے انہیں پروفیشنل آف دی ایئر کا خطاب دیا۔ گلوبل نیویارک امریکا کی طرف سے آنر آف اچیومنٹ دیا گیا۔ یورومنی اور بینکرز میگزین نے انہیں سال 2001ء کا بہترین وزیر خزانہ کا ایوارڈ دیا۔ جون 2004ء کو وزیرِ اعظم جمالی مستعفی ہوئے تو چودھری شجاعت نے انہیں وزیرِ اعظم کے عہدے کے لیے نامزد کیا اور وہ اگست 2004ء میں پاکستان کے وزیرِ اعظم بنے۔

مرسلہ: ناہید اختر لاہور

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | PAKSOCIETY

"آئندہ ایسی غلط بات زبان سے کبھی نہ نکالنا اصغر۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "میں اتنی مطلبی نہیں ہوں کہ اولاد کی خاطر دوسری شادی کرلوں۔ اللہ نے ہمیں اولاد نہیں دی تو کیا ہوا۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ اس میں اللہ رب العزت کی کوئی مصلحت ہی ہوگی۔ ہم کوئی بچہ گود لے کر بھی تو پال سکتے ہیں۔ شہر میں بہت سے ادارے ہیں جو بے اولادوں کو اولاد کی دولت سے مالا مال کردیتے ہیں۔"

پنڈی میں کئی ادارے تھے۔ میں نے باری باری ہر ادارے کا چکر لگایا لیکن ان کی شرائط بہت تھیں۔ کئی جگہ صرف لڑکی ہی دے رہے تھے۔ اصغر کہتا تھا کہ میں کسی دوسرے کی اولاد پالوں گا تو پھر بیٹا کیوں نہ لوں؟

دن اسی طرح روکھے پھیکے گزرتے رہے۔ پھر ایک دن اصغر ٹرک لے کر نکل گیا اور میں تنہائی کے عذاب سے لڑتی رہی۔ ان دنوں میں بہت بدمزاج ہوگئی تھی۔ کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتی تھی۔ پہلے سب محلے میں میری قدر کرتے تھے۔ اب محلے کی عورتیں مجھ سے کترانے لگیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں پاگل ہوجاؤں گی۔ کبھی کبھی تو میں یہ بھی سوچنے لگتی تھی کہ اصغر کی بات مان لوں اور اس سے طلاق لے کر دوسری شادی کرلوں۔ پھر فوراً ہی میں خود کو ملامت کرتی کہ ایسا گھٹیا خیال میرے ذہن میں آیا ہی کیوں؟

اصغر واپس آیا تو میری حالت دیکھ کر بہت زیادہ فکرمند ہوگیا۔ وہ اب میرا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ گھمانے پھرانے باہر بھی لے جاتا تھا۔

اس دن وہ اپنے کسی ملنے والے کے پاس جارہا تھا۔ اس نے مجھے بھی ساتھ لے لیا تھا۔

ایک گلی گھومتے ہی مجھے ایک خوب صورت اور گورا چٹا بچہ نظر آیا مجھے اس لمحے نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے چیل کی طرح جھپٹ کر بچے کو اپنی گود میں اٹھالیا۔ بچہ اس اچانک افتاد سے خوف زدہ ہوگیا اور رونے لگا۔ میں نے جلدی سے چمکار کے اسے چپ کرایا۔

"نسیمہ اب اس بے چارے کو جانے دے۔ دیکھ تیرے اس پیار سے یہ کتنا ڈر گیا ہے۔" اصغر نے کہا۔

"نہیں" میں نے جنونی انداز میں کہا۔ "یہ بچہ مجھے اللہ نے دیا ہے۔ میں اسے واپس نہیں کروں گی۔"

"نسیمہ تو ہوش میں تو ہے؟ تو کسی کا بچہ کیسے لے سکتی ہے۔ بچے اغوا کرنا تو بہت بڑا جرم ہے۔ تو اس بچے کو......"

"نہیں، میں کچھ نہیں جانتی۔" میں نے جنونی انداز میں چیخ کر کہا۔

اصغر گھبرا گیا اور بولا۔ "اچھا یہاں سے تو نکل۔"

میں نے بچے کو کندھے پر ڈالا اور اسے لے کر تیزی سے مین روڈ پر نکل آئی۔

میں نے فوراً ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ گئی۔ اصغر بھی بے بسی سے ہونٹ کاٹتا ہوا ٹیکسی میں سوار ہوگیا۔

وہ بچہ بہت سیدھا سادہ تھا۔ میرے کندھے سے لگے لگے سوگیا۔

رات کا اندھیرا بہت سرعت سے پھیل رہا تھا۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر بس اس گول مٹول بچے ہی کو تکے جارہی تھی۔

"چلنا کہاں ہے ماں جی؟" ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔

"بھائی تو ایسا کر ہمیں راجا بازار تک پہنچا دے۔" اصغر نے ڈرائیور سے کہا۔

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تو اصغر نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھ ہی نہیں سکی تھی کہ اصغر راجا بازار کیوں جارہا تھا؟

اصغر نے راجا بازار سے کچھ پہلے ہی ٹیکسی رکوادی اور ہم لوگ بچے کو لے کر نیچے اتر گئے۔ میں نے اصغر سے پوچھا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو۔ سیدھے گھر ہی چلتے۔"

"تیرا دماغ اس وقت کام نہیں کررہا ہے۔" اصغر نے کہا۔ "ہم اس بچے کو لے کر وہاں جاتے تو محلے والے بیس قسم کے سوالات کرتے کہ بچہ کس کا ہے۔ کہاں سے ملا؟ پھر بچے کے گھر والے الگ شور کریں گے۔ پنڈی چھوٹا سا شہر ہے۔ یہاں سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

"پنڈی چھوٹا سا شہر ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں، کراچی اور لاہور کے مقابلے میں تو چھوٹا ہی ہے۔" اصغر نے کہا۔ پھر مجھ سے بولا۔ "سن تو یہاں رک۔ میں گھر سے تیرا ضروری سامان لے کر آتا ہوں۔ ہمیں اب یہ شہر چھوڑنا پڑے گا۔"

میں دھک سے رہ گئی۔ مجھے اپنا گھر چھوڑنا پڑے گا؟ میں اس گھر میں تو بیاہ کر آئی تھی۔ گھر کی ایک ایک دیوار سے مجھے محبت تھی۔

میں نے کم زور لہجے میں کہا۔ "اصغر گھر چھوڑنا ضروری ہے کیا؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''ہاں ضروری ہے۔'' اصغر نے کہا۔ ''ورنہ پولیس ہم سے خود چھڑا دے گی۔''

''میں اپنا گھر نہیں چھوڑوں گی۔'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تو پھر اس بچے کو چھوڑنا پڑے گا۔'' اصغر نے کہا۔ ''گھر کا کیا ہے ہم جہاں بھی جا کر رہیں گے وہ اپنا گھر ہو جائے گا۔''

اس دوران میں ہم ایک واقف کار کے گھر تک پہنچ گئے تھے۔

وہاں بوڑھی سی ایک عورت تھی ایک جوان لڑکا تھا اور ایک اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ بوڑھی عورت نے مجھے ویران ویران نظروں سے گھورا۔ اصغر فوراً بولا۔ ''آپا نوری میں ہوں اصغر۔''

''اصغر!'' بڑھیا نے کہا پھر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک نمودار ہوئی۔ ''اچھا اصغر، آ جا اندر آ جا۔''

ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ بڑھیا نے جھک کر چارپائی پر چادر بچھا کر ہمیں بٹھا دیا۔

وہ بہت صابر بچہ تھا۔ وہ شاید بھوکا تھا۔ اس کے باوجود رو نہیں رہا تھا۔ میں نے اسے چارپائی پر لٹایا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور دوبارہ میرے سینے سے لگ گیا۔

مجھے بے ساختہ اس بچے پر پیار آ گیا۔ اس لمحے ایسا لگا جیسے وہ میرا اپنا خون ہو۔ میں نے بھی اسے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

''یہ بھوکا ہو گا۔ میں اس کے لیے کھانے کو کچھ لاتا ہوں۔''

''ڈبل روٹی اور دودھ موجود ہے۔ اس وقت کہاں جاؤ گے؟'' آپا نوری نے کہا۔

''آپا نوری، میں نسیمہ کو شہر گھمانے لایا تھا کہ ٹرک خراب ہو گیا۔''

''تو نسیمہ کو ٹرک پر گھمانے لایا تھا؟'' آپا نوری نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''نہیں آپا نوری، آئے تو ہم ٹیکسی پر تھے۔'' اصغر نے کہا۔

''مجھے صبح نکلنا تھا اس لیے میں نے اڈے سے ٹرک بھی لے لیا تھا۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''یہ نسیمہ تو گڈو کو کھانا کھلا میں ٹرک کسی مستری کے حوالے کر کے آتا ہوں۔''

اصغر وہاں سے چلا گیا۔ مجھے تو اس بچے کے بھولپن پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ پہلے تو تھوڑا سا رویا تھا۔ اس کا سر میرے شانے سے چپکا ہوا تھا۔ میں نے اسے دودھ میں ڈبل روٹی ملا کر کھلائی تو اس نے آرام سے کھا لیا۔

اصغر دو گھنٹے میں واپس آیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تمام ضروری سامان لے آیا ہوں۔ بعد میں آ کر مکان بیچ دوں گا۔

پھر اس نے آپا نوری سے اجازت لی اور مجھے لے کر باہر نکل گیا۔ گلی کے نکڑ پر اس کا ٹرک کھڑا تھا۔ اس میں گھر کا تمام سامان بھرا ہوا تھا۔ وہاں سے ہم چلے نواب شاہ، پھر نوشہرو فیروز آ گئے۔'' وہ بچہ تم ہو بیٹا۔''

☆......☆

اماں کے منہ سے یہ داستان سن کر میں گم صم ہو گیا۔ پھر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہ عورت میری ماں نہیں ہے؟ اس نے مجھے اغوا کیا تھا، اس کے باوجود یہ مجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہے۔ اس نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر مجھے اچھا کھلایا، اچھا پہنایا، اچھے اسکول میں تعلیم دلائی۔ بابا مجھ پر اپنی جان نچھاور کرتے تھے۔ یہ دونوں اچانک میرے لیے اجنبی ہو گئے تھے لیکن میرا دل نہیں مان رہا تھا۔

''اماں۔'' میں نے پوچھا۔ ''تم ان لوگوں کو جانتی ہو جن کی میں اولاد ہوں؟''

''میں نے تجھے جس علاقے سے اٹھایا تھا وہاں بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ تیرے منہ سے چوٹی نرام دی نکلتا تھا۔ ہو سکتا ہے تو چوہدری نظام علی کہنا چاہتا ہو۔''

''تم ان کے پاس جاؤ گی تو وہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔'' میں نے اماں کو ڈرایا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اماں مجھے خود سے جدا کرے۔

''بیٹا! میں ان کے پیر پکڑ کے معافی مانگ لوں گی۔ اب اگر وہ مجھے پولیس کے حوالے کرتے ہیں تو کر دیں۔ تو نے سنا نہیں یہ تیرے باپ کی وصیت تھی۔ اصغر کی وصیت تھی کہ تجھے تیرے گھر پہنچا دوں۔''

''اماں، یہ بتاؤ بابا نے اس کام میں تمہارا ساتھ کیوں دیا۔ وہ تو بہت سچے اور کھرے آدمی تھے۔''

''بیٹا وہ میری دیوانگی سے ڈر گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اولاد کے بغیر میں پاگل ہو جاؤں گی۔ اس لیے تو انہوں نے راتوں رات وہ علاقہ چھوڑ دیا۔ بس اب تو زیادہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مت سوچ اور جانے کی تیاری کر۔ میں نے تیرے لیے سوٹ کیس خالی کردیا ہے۔ اس میں اپنے سب اچھے اچھے کپڑے رکھ لے۔''

''اماں، بھلا وہ لوگ کیسے یقین کریں گے کہ میں ان کا وہی بیٹا ہوں جو برسوں پہلے اغوا ہوگیا تھا۔ میری تو شکل بھی بہت بدل گئی ہے۔''

''میرے پاس تیرے کپڑے ہیں، تیرے گلے میں سونے کی چین میں ایک تعویذ پڑا تھا۔ وہ تعویذ ہے پھر میں نے اس وقت تیری کئی تصویریں اتاری تھیں۔ ان دنوں مجھے خوف تھا کہ کوئی تجھے مجھ سے چھین لے گا۔ یہ ہی سوچ کر میں نے تیری کئی تصویریں بنوالی تھیں کہ اگر تو نہ رہا تو تیری تصویریں تو میرے پاس ہوں گی۔''

جب میں نے دیکھا کہ اماں کے پاس میری ہر بات کا جواب موجود ہے تو میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''اماں جی میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ میں تم سے دور ہونا نہیں چاہتا۔''

''دیکھ بیٹا اگر تیرے ماں باپ نے مجھے اجازت دی تو میں تجھ سے ملنے آتی رہوں گی۔ میں دوبارہ پنڈی میں ٹھکانا بنالوں گی۔''

میں اماں سے لپٹ کر رونے لگا لیکن اماں کا دل نہ پسیجا۔ انہیں اپنے شوہر سے کیے ہوئے وعدے کا ان کی آخری خواہش کا زیادہ خیال تھا۔

دو دن بعد اماں پنڈی جانے کو تیار ہوگئیں۔ میرا سامان دو سوٹ کیسوں میں تھا۔ ایک تھیلا اماں نے بھی لے لیا تھا۔ اس میں ان کے کپڑے تھے۔

وہ سارا راستہ مجھے سمجھاتی رہیں کہ بیٹا وہاں کوئی ایسی بات مت کرنا جس سے وہ لوگ یہ سوچیں کہ میں نے تجھے صحیح تربیت نہیں دی ہے۔ وہ بڑے لوگ ہوں گے۔ اس علاقے میں بڑے لوگ رہتے ہیں۔ میں نے تجھے اچھی تعلیم دلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر بھی تو احتیاط کرنا۔ تیرے دوسرے بہن بھائی بہت اچھے اسکولوں میں پڑھتے ہوں گے۔

ہم لوگ سہ پہر کے وقت راولپنڈی پہنچ گئے۔ اماں کے کہنے پر میں وہیں ویٹنگ روم میں اپنا بہترین لباس پہن کر تیار ہوگیا۔ مجھے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کسی غریب اور پسماندہ گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اماں نے ٹیکسی پکڑی اور اس علاقے میں جا پہنچیں جہاں سے انہوں نے مجھے اٹھایا تھا۔ وہاں واقعی بہت بڑی بڑی شاندار کوٹھیاں تھیں۔ ہر کوٹھی میں دو دو تین تین گاڑیاں موجود تھیں، دروازے پر مسلح چوکیدار تھے۔

وہیں ایک کوٹھی کے چوکیدار سے اماں نے پوچھا۔ ''بھائی چودھری نظام دین کی کوٹھی کون سی ہے؟''

''وہ جو بیرسٹر ہیں؟'' چوکیدار نے پوچھا۔

اماں نے بغیر سمجھے بوجھے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''وہ جو بڑی سی کوٹھی نظر آرہی ہے؟'' چوکیدار نے وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک کوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ ''جس میں پام کے درخت ہیں اور جس کے سامنے سیاہ رنگ کی گاڑی کھڑی ہے۔ وہی چودھری نظام دین صاحب کی کوٹھی ہے۔''

''اماں، پتا نہیں یہ وہی چودھری نظام دین ہیں یا کوئی اور ہیں۔''

اماں میری بات نہیں سن رہی تھیں۔ وہ راستوں کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ خود کلامی کے انداز میں بولیں۔ ''ہاں، یہی جگہ ہے......تو......یہاں ملا تھا مجھے...... یہ ہی چودھری نظام دین ہیں۔''

ہم اس کوٹھی کی طرف بڑھے تو میں اس کی شان و شوکت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وسیع و عریض پھاٹک پر پیتل کے چمکدار 11 حروف والی نیم پلیٹ لگی تھی اور چودھری نظام دین ایڈووکیٹ کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔

ہمارے وہاں پہنچتے ہی ایک مسلح چوکیدار باہر آگیا اور درشت لہجے میں اماں سے بولا۔ ''ہاں مائی کیا بات ہے؟''

مجھے اس کا لہجہ بہت ناگوار گزرا لیکن میں خاموش رہا۔ اماں نے کہا۔ ''مجھے چودھری نظام دین صاحب سے ملنا ہے۔''

''کلائنٹ سے نہیں ملتے۔'' چوکیدار نے نخوت سے کہا۔

''کس سے نہیں ملتے؟'' اماں چوکیدار کی بات سمجھ نہیں سکی لیکن میں سمجھ گیا میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''ہم لوگ کلائنٹ نہیں ہیں۔'' پھر میں نے اسی لہجے میں انگریزی میں کہا۔ ''ہم نواب شاہ سے آئے ہیں اور چودھری صاحب سے ملنا بہت ضروری ہے۔ جاؤ جا کر انہیں اطلاع دو۔''

چوکیدار میرے لہجے اور خاص طور پر میری انگریزی سے بری طرح مرعوب ہوگیا اور بولا۔ ''آپ اندر آجائیں اور اپنا سامان تو یہاں رکھ دیں۔ میں چودھری صاحب کو

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

اطلاع دیتا ہوں۔ آپ کا نام سر؟"

"میرا نام اظفر ہے۔" میں نے یوں کہا جیسے چودھری صاحب مجھے جانتے ہوں۔

اس کے جانے کے بعد اماں نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "بیٹا تو تو خوب گٹ پٹ کر لیتا ہے۔ میری محنت رائیگاں نہیں گئی تو اس چوکیدار سے ایسے بات کر رہا تھا جیسے تو اس کوٹھی کا مالک ہو۔"

اس وقت چوکیدار لوٹ آیا اور بولا۔ "آیئے چودھری صاحب آپ لوگوں کو بلا رہے ہیں۔ وہ لان میں بیٹھے ہیں۔ شام کی چائے وہ لان میں پیتے ہیں۔"

ہم اس کے پیچھے چل دیے۔ کچھ دور جا کر چوکیدار نے ایک طرف اشارہ کیا اور بولا۔ "وہ بیٹھے ہیں چودھری صاحب۔"

میں نے دیکھا باوقار سے ایک صاحب سفید براق کرتے شلوار میں ملبوس لان میں بیٹھے تھے۔ ان کی رنگت سرخ و سفید اور چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ ان کے ساتھ باوقار سی ایک خاتون بھی موجود تھیں۔ وہ ساڑی میں ملبوس تھیں اور چہرے پر سنہرے فریم کا نفیس سا چشمہ تھا۔ پھر وہاں تو دس سال کی خوب صورت سی ایک لڑکی اور تقریباً تیرہ سال کا ایک لڑکا بھی موجود تھا۔ لڑکے پر نظر پڑتے ہی میں چونک اٹھا۔ اس کے چہرے میں میری مشابہت تھی۔

اماں نے آگے بڑھ کر چودھری صاحب کو سلام کیا۔

اماں کا سلام کا جواب دے کر چودھری صاحب نے مجھ پر نظر ڈالی تو بری طرح چونک اٹھے۔ وہ خاتون بھی مجھے دیکھ کر چونکیں۔ پھر مجھے مزید غور سے دیکھنے لگیں۔

"چودھری صاحب! آج میں آپ کی ایک امانت لوٹانے آئی ہوں۔" اماں نے کہا۔

"میری امانت؟" چودھری صاحب نے کہا۔ "میری کون سی امانت، تم کون ہو؟"

"برسوں پہلے آپ کا ایک بیٹا گم ہو گیا تھا؟" اماں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔" وہ باوقار خاتون جلدی سے بولیں۔ "ہمارا بیٹا سجو دس سال پہلے گم ہو گیا تھا۔"

"ریحانہ مجھے بات کرنے دو۔" چودھری صاحب نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ پھر اماں سے بولے۔ "ہاں گم ہو گیا تھا پھر؟"

"میں آپ کا وہی بیٹا لوٹانے آئی ہوں۔" اماں نے کہا۔

"کک...... کہاں ہے میرا سجو...... میرا ساجد، کہاں ہے وہ؟" باوقار خاتون تڑپ کر بولیں۔

"تم اندر جاؤ۔" چودھری صاحب نے ان خاتون سے کہا جو یقیناً میری ماں تھیں۔ پھر وہ اماں سے مخاطب ہوئے۔ "تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ ساجد ہی ہے۔"

"اس لیے کہ میں نے ہی اب سے دس سال پہلے اسے اغوا کیا تھا۔" اماں نے کہا۔ "میرے پاس اس کے وہ کپڑے ابھی تک موجود ہیں جو اس نے اس روز پہن رکھے تھے۔" اماں نے اپنے تھیلے سے میرا نیکر اور ٹی شرٹ نکالتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے سونے کی چین اور تعویذ بھی نکال کر چودھری صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ "اور یہ اس وقت کی تصویریں ہیں جب میں نے ساجد کو اغوا کیا تھا۔" اماں نے تصویروں کا ایک لفافہ چودھری صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

چودھری صاحب نے وہ چیزیں دیکھیں اور اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ "ہاں یہ میرا سجو ہے۔" انہوں نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

پھر میری سگی ماں نے بھی "میرا سجو" کہتے ہوئے مجھے سینے سے لگا لیا اور زار و قطار رونے لگیں۔

پھر وہ بچی اٹھی جو اب تک خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ "بھیا! میں افشین ہوں۔ مجھے پہچانا آپ نے؟"

میں اسے کیسے پہچان سکتا تھا۔

اس موقع پر میرے علاوہ ہر شخص رو رہا تھا۔ میری آنکھوں کے تو آنسو ہی خشک ہو چکے تھے۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے یہ صدمہ تھا کہ اب اماں مجھے یہاں چھوڑ کر چلی جائے گی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" چودھری صاحب نے اماں سے پوچھا۔

"میرا نام نسیمہ ہے جی۔" اماں نے کہا۔

"تم جانتی ہو کہ کسی کو اغوا کرنا کتنا بڑا جرم ہے؟"

"جانتی ہوں جی۔" اماں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں نے اظفر کو اس کے گھر پہنچا دیا اب چاہے آپ مجھے جیل بھجوا دیں۔"

"تمہارا شوہر کیا کام کرتا ہے؟" چودھری صاحب نے پوچھا۔

"میرا شوہر فوت ہو چکا ہے جی۔" اماں نے کہا۔ "وہ ٹرک چلاتا تھا اس کا اپنا ٹرک تھا جی۔" پھر اماں کچھ سوچ کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

www.paksociety.com

بولی۔ ''چودھری صاحب آپ اظفر کا نام بدلیے گا نہیں، اسکول میں یہی نام لکھا ہوا ہے۔''

میری ماں نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر بٹھا لیا تھا۔

چودھری صاحب نے میری طرف غور سے دیکھا، پھر مجھ سے بولے۔ ''اظفر یہاں آؤ۔''

''جی چودھری صاحب!'' میں اٹھ کر ان کے پاس چلا گیا۔

''بے وقوف میں تیرے لیے چودھری صاحب نہیں ہوں مجھے پاپا کہو بیٹا۔''

''پاپا!'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''میرے لیے کیا حکم ہے چودھری صاحب۔'' اماں نے پوچھا۔ ''میں رکوں یا......''

''دل تو چاہ رہا ہے کہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں۔'' پاپا نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن تم نے اظفر کو لوٹا کر اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ لیکن تم کہاں جاؤ گی؟''

''اپنے گھر جاؤں گی۔'' اماں نے افسردگی سے کہا۔

''ہمیں ایک کام کرنے والی کی ضرورت ہے۔'' پاپا نے کہا۔ ''تم چاہو تو......''

''نہیں۔'' میں نے اچانک بلند لہجے میں کہا۔ ''اماں یہاں کام نہیں کرے گی۔''

''بیٹا، میں کب کام کرنا چاہتی ہوں۔ تو پریشان مت ہو۔ میرے پاس کام کرنے کو وقت ہی کہاں ہے۔''

''کیوں تم کیا کرتی ہو۔'' پاپا شاید میری بات پر کچھ خجل سے ہو گئے تھے۔

''نواب شاہ میں میرا دودھ گھی کا کاروبار ہے۔'' اماں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ ''میرے پاس سولہ بھینسیں اور چار گائیں ہیں۔''

پھر اماں نے اٹھ کر مجھے سینے سے لگایا اور بولیں۔

''اظفر بیٹا! اب یہ بھی تیرا گھر ہے اور...... یہ...... یہی...... تیرے ماں باپ ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اماں رو پڑی۔ ''مجھے جب بھی موقع ملے گا میں یہاں آتی رہوں گی مگر مجھے تیری کوئی شکایت نہ ملے اظفر، ورنہ مجھے بہت صدمہ ہوگا۔'' اماں نے آنسو پونچھے اور میری طرف دیکھے بغیر مین گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی میرا دل مٹھی میں لے کر مسل رہا ہو۔ پھر بے اختیار میری آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔

افشین نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ''آؤ بھیا میرے کمرے میں چلو میں تمہیں اپنے کھلونے دکھاؤں گی۔''

''نہیں ہجو میرے ساتھ جائے گا۔'' وہاں موجود لڑکے نے کہا۔

''نہیں رشو بھائی!'' افشین نے کہا۔ ''اب آپ کی دھاندلی نہیں چلے گی۔''

''آپ کا نام رشو ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا نام راشد ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''رشو تو میرا نک نیم ہے۔''

اچانک گیٹ پر ہارن سنائی دیا۔ پھر گیٹ کھلا اور چمچماتی ہوئی ایک ٹویوٹا اندر داخل ہوئی۔ وہ گاڑی پورچ میں جا کر رک گئی۔ پھر اس کے دروازے کھلے اور اسمارٹ سا ایک لڑکا اور چست جینز میں ملبوس ایک لڑکی اتری۔ وہ دونوں ہنستے ہوئے لان کی طرف آئے۔ اس لڑکے کے چہرے میں پاپا کی شباہت تھی۔

''آؤ ماجد بیٹا!'' مما خوش دلی سے بولیں۔ ''آج کا دن تو بہت مبارک ہے۔''

''ایسا کیا خزانہ مل گیا مما؟'' ماجد نے پوچھا۔

''بیٹا آج مجھے میرا کھویا ہوا بیٹا مل گیا ہے لیکن اب اس کا نام ہجو نہیں بلکہ اظفر ہے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ ''اظفر یہ تمہارے بڑے بھائی ماجد ہیں۔''

ماجد کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ میں نے بھی اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔

''اظفر بیٹا! یہ تمہاری آپی نورین ہیں۔'' مما نے لڑکی سے میرا تعارف کرایا۔

''نورین گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتی رہی۔ اس کا چہرہ بھی بے تاثر تھا۔ گویا میرے وہاں آنے سے ان لوگوں کو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی بلکہ میری آمد ناگوار گزری تھی۔''

''مما! آپ بھی کن خیالات میں کھوئی رہتی ہیں۔'' ماجد نے کہا۔ ''کل تک آپ کو ہجو خوابوں اور خیالوں میں نظر آتا تھا اب اسے سچ مچ گھر لے آئی ہیں۔''

''میرا نام ہجو نہیں بلکہ اظفر ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

''میں تم سے بات نہیں کر رہا ہوں۔'' ماجد نے مجھے جھڑک دیا۔

''ماجد، بچہ برسوں بعد گھر آیا ہے اور تو نے رشو کی طرح اسے بھی جھڑکنا شروع کر دیا۔''

''آؤ ناں بھیا!'' افشین نے کہا۔ ''میرے کمرے میں چلو۔''

میں بوجھل قدموں اور بوجھل دل کے ساتھ اس کے کمرے میں چلا گیا۔

اس کے کمرے میں ہر طرف کھلونے بکھرے ہوئے تھے مختلف قسم کی گڑیوں کے علاوہ تقریباً ہر کھلونا موجود تھا۔ میں اس کے کھلونے دیکھتا رہا۔ پھر رشو بھی وہاں آ گیا اور وہ مجھے اپنی سائیکلنگ کے واقعات سنانے لگا۔ پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''بس...... اظفر کبھی تم نے اسپورٹس سائیکل چلائی ہے؟ میرے پاس اسپورٹس سائیکل موجود ہے۔''

میں نے اس سے کہا۔ ''اب نواب شاہ جاؤں گا تو اپنی سائیکل لے آؤں گا۔''

اس وقت ایک ملازمہ کمرے میں آئی اور بولی۔ ''بابا لوگ، چلو سب ڈائننگ ٹیبل پر۔''

ہم سب کمرے سے نکل کر ڈائننگ ٹیبل پر آ بیٹھے۔

بابا ماجد سے مخاطب تھے۔ ''اس کیس کا قانونی پہلو کوئی نہیں ہے۔'' وہ انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ ''میں اس عورت کو اریسٹ بھی کرا دیتا تو کیا ہوتا؟''

''لیکن پاپا!'' ماجد نے کہا۔ ''اس عورت کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ آپ کا کھویا ہوا بیٹا ہی ہے۔'' ماجد بھی رواں انگریزی بول رہا تھا۔

''بیٹا اس نے جو ثبوت مجھے دیے ہیں وہ کافی ہیں اگر میں انہیں ماننے سے انکار بھی کر دیتا تو کیا ہوتا، وہ عورت اسے لے کر واپس چلی جاتی۔''

''پاپا پھر بھی آپ کو انویسٹی گیٹ تو کرنا چاہیے۔'' نورین نے کہا۔ ''ایسے کسی کو بھی اپنا بیٹا بنا کر گھر میں رکھ لیں گے۔'' نورین بھی انگریزی میں بات کر رہی تھی۔ وہ سب یہ سمجھ رہے تھے کہ مجھے انگریزی نہیں آتی۔ آ بھی کیسے سکتی تھی۔ ان کے نزدیک تو میں جاہلوں، گنواروں میں پلا بڑھا تھا۔

''یہ بات سو فیصد درست ہے کہ وہ ہمارا بیٹا ہے۔'' پاپا نے کہا۔ ''لیکن یہ جاہل لڑکا ہماری فیملی میں ایڈجسٹ بھی ہو سکے گا یا نہیں مجھے صرف یہ پریشانی ہے۔''

''اس عورت کو چھوڑنا نہیں چاہیے تھا۔'' نورین نے کہا۔

''اس عورت کو پکڑ کر بھی کیا کرتا۔ میں اسے دو چار سال کی سزا کرا دیتا اس کے بعد...... اس کے بعد بھی یہ ہمارے سروں پر مسلط رہتا۔'' پاپا نے میری طرف اشارہ کیا۔

میرے پورے جسم میں سرد لہریں اٹھنے لگیں۔ یہ الفاظ اس شخص کے تھے جو میرا سگا باپ تھا۔ اس سے لاکھوں کروڑوں گنا اچھا تو وہ شخص تھا جس سے میرا خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔

''پاپا!'' نورین نے کہا۔ ''مما بتا رہی تھیں کہ وہ کوئی غریب عورت تھی۔ اس کا شوہر بھی ٹرک ڈرائیور تھا۔ یہ تو اسی ماحول میں پلا ہوگا۔ اسے مینرز کیسے آئیں گے؟''

''نورین بیٹا اس سلسلے میں تمہیں ہی مدد کرنا ہوگی۔ اسے مینرز سکھانا ہوں گے انگریزی سکھانا ہوگی۔'' مما نے کہا۔

''میں؟'' نورین نے نخوت بھرے انداز میں کہا۔ ''نو وے مما۔ میں اسے آدمی نہیں بنا سکتی۔''

میں بہت دیر سے برداشت کر رہا تھا۔ نورین کا یہ جملہ تو گویا اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا ثابت ہوا۔ میں بپھر کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں نے یہاں آ کر آپ کے لیے پرابلم پیدا کر دیے۔'' میں نے بھی یہ جملہ انتہائی شستہ اور رواں انگریزی میں کہا تھا۔ ان سب کے چہروں کے رنگ اڑ گئے اور وہ بغلیں جھانکنے لگے۔ ''میں غربت میں پلا بڑھا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میرے پیرنٹس نے مجھے بہت ناز و نعم میں پالا ہے۔ رہی بات مینرز

شمارہ اگست 2016ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش...... آپ کا انتخاب

☆ اول: تحفہ ...... مسز ندیم (کراچی)

☆ دوم: ذرا سوچیں ...... جنید احمد (کراچی)

☆ سوم: روایتوں کے شکار ...... زیتون خان (کراچی)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

کی تو نورین صاحبہ آپ میں مینرز کی بہت کمی ہے آپ چاہیں تو میں آپ کو سکھا سکتا ہوں جہاں تک میرے جاہل ہونے کا سوال ہے میں جس اسکول میں پڑھا ہوں اس کا معیار آپ لوگوں سے کسی طور کم نہیں ہے۔'' میں مسلسل انگریزی میں زہر اگل رہا تھا۔ ''میرے ساتھ ایڈجسٹ کرنا واقعی اتنا بڑا مسئلہ ہے تو آپ نے اس وقت میری ماں سے کیوں نہ کہا۔ وہ عورت غریب ہے، پسماندہ ہے لیکن آپ سب سے کہیں بہتر ہے چوہدری صاحب۔ آپ کا یہ محل، عزت آپ کو مبارک ہو میں اپنی ماں کے پاس واپس جا رہا ہوں۔''

''بجو...... اظفر...... میری بات سن بیٹا...... میں......''

''ممّا! آپ میری ماں نہیں ہیں میری اماں تو وہ عورت ہے جس نے مجھے اپنی زندگی سے بڑھ کر چاہا ہے۔'' میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے پھر جاتے جاتے بولا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں کچھ زیادہ ہی بول گیا اور آپ کا ڈنر بھی ڈسٹرب کیا۔ پلیز آپ لوگ کھانا کھائیں۔'' یہ کہہ کر میں باہر نکل گیا۔

میرے دونوں سوٹ کیس ابھی تک چوکیدار کے کمرے میں ہی رکھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر چوکیدار کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے سوٹ کیس لیے اور اس وسیع و عریض اور شاندار عمارت سے باہر نکل آیا جس میں رہنے والے انسانی رشتوں اور جذبوں سے ناآشنا تھے۔

باہر آنے کے بعد میں نے گرد و پیش پر نظر دوڑائی تو مجھے اس کوٹھی کے ٹیرس پر افشین نظر آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اس نے ہاتھ لہرا کر مجھے خدا حافظ کہا۔ میں نے بھی جواب میں ہاتھ لہرا دیا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اس سنگلاخ دیواروں اور بے دل لوگوں کے درمیان ایک محبت کرنے والی بہن بھی رہتی ہے۔

☆......☆

میں گھر پہنچا تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ گھر میں گھپ اندھیرا تھا۔ ایک لمحے کو تو میں یہ سوچ کر لرز گیا کہ کہیں اماں یہاں سے چلی تو نہیں گئی؟ میں نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے دوسری مرتبہ ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

اندر سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر اماں کی مانوس آواز سنائی دی۔ ''کون ہے؟''

''میں ہوں اماں!'' میں نے کہا۔ ''دروازہ کھولو۔''

اماں پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی اور خود کلامی کے انداز میں بولیں۔ ''میں شاید واقعی پاگل ہو گئی ہوں پہلے تو مجھے ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اب تو ایسا لگ رہا ہے جیسے گڈو مجھے پکار رہا ہے۔ یہ میرا وہم میری جان لے لے گا۔''

''اماں یہ تمہارا وہم نہیں ہے۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''میں دروازے پر موجود ہوں، دروازہ کھولو۔''

''اظفر!'' اماں نے بے یقینی سے کہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ مجھے سامنے دیکھ کر وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی اور روتے ہوئے بولی۔ ''اظفر یہ تو ہی ہے نا بیٹا؟''

''ہاں اماں میں ہی ہوں اظفر، لیکن تم نے پورے گھر میں اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟''

''میرے تو دل میں، دماغ میں ہر جگہ اندھیروں کا راج ہے بیٹا، یہ باہر کا اندھیرا تو مجھے محسوس ہی نہیں ہوا۔'' یہ کہہ کر اماں نے ہاتھ بڑھا کر صحن کا سوئچ آف کر دیا۔ ''آ اندر چل، میں تیرے لیے روٹی تو ڈال لوں، بھوکا بھی ہوگا۔''

میں اماں کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ گھر کا سارا سامان بندھا رکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اماں یہاں سے کہیں جانے والی ہے۔

''اماں یہ سارا سامان کیوں باندھ رکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بیٹا! میں پنڈی جا رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اب پنڈی میں تیرے نزدیک ہی رہوں گی لیکن تُو تو خود آ گیا۔''

''مجھے اس جہنم میں کیوں چھوڑ کر آئی تھی اماں؟'' میں نے کہا پھر اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا اور کہا۔ ''اماں اب میں ہمیشہ آپ کے پاس ہی رہوں گا۔ ہمیشہ...... اپنی اماں کے پاس رہوں گا۔''

اماں نے پیار سے مجھے گلے لگا لیا اور ممتا کی گرماہٹ سے میری روح تک سرشار ہو گئی۔ بعد میں چوہدری صاحب نے بہت کوشش کی، پولیس کی بھی مدد لی لیکن میں نے ان کی ہر چال کو ناکام بنا دیا۔ میرے لیے میری ماں ہی سب کچھ ہے۔ ہاں کبھی کبھی پنڈی جا کر افشین کو کسی ریسٹورنٹ میں بلا کر مل لیتا ہوں۔ میں اب پہلے سے زیادہ خوش ہوں۔ اپنی کہانی میں بہت کم لوگوں کو سناتا ہوں۔ جو بھی سنتا ہے یہی کہتا ہے کہ تیری کہانی پر تو ایک ہٹ فلم بن سکتی ہے۔ قارئین کیا خیال ہے، کسی فلم میکر سے رابطہ کروں؟

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY